PAKISTAN A NEW HISTORY
پاکستان
ایک نئی تاریخ
مترجم : محمد عاطف علیم
آئن ٹالبوٹ

آئن ٹالبوٹ

مترجم: محمد عاطف علیم

تخلیقات: 6 بیگم روڈ، مزنگ، لاہور۔ فون: 042-37238014
ای میل: takhleeqat@yahoo.com www.takhleeqatbooks.com

نام کتاب : پاکستان ایک نئی تاریخ
ناشر : ''تخلیقات'' لاہور
اہتمام : لیاقت علی
سن اشاعت : 2014ء
ٹائٹل : سہیل احمد
پرنٹر : زاہد بشیر پرنٹرز، لاہور
ضخامت : 424 صفحات
قیمت : -/450 روپے

انتساب

لوئی اور مارٹن کے نام

فہرست عنوانات

پیش لفظ اور اظہار تشکر

تیرہ برس ہونے کو آئے ہیں جب میں تاریخ پاکستان کے حوالے سے اپنی پہلی تصنیف کو ضبط تحریر میں لایا تھا۔ ہرسٹ کی جانب سے ''پاکستان: ایک جدید تاریخ'' کی پہلی اشاعت کا دوسرا ایڈیشن بعد از نظر ثانی منظر عام پر آچکا ہے۔ مذکورہ کتاب کا اختتام اس بات پر ہوا تھا کہ ''مزید تقسیم اور عدم استحکام'' سے صرف خواتین، اقلیتوں اور دیہی و شہری غریب آبادی جیسے ماضی میں نظر انداز کیے جانے والے طبقات کی حقیقی سیاسی شرکت کو یقینی بنا کر ہی بچا جاسکتا ہے۔ یوں نا صرف 1947 کے ناآسودہ عہد کی تکمیل ممکن ہوسکے گی بلکہ اس طرح یہ امید بھی برآئے گی کہ پاکستان موثر انداز میں شدید معاشی، سماجی اور ماحولیاتی چیلنجوں سے عہدہ برا ہوسکتا ہے۔ اب جبکہ اکیسویں صدی کی پہلی دہائی کو گذرے ہوئے بھی کئی سال بیت چکے ہیں، چند ڈرامائی کردار تبدیل ہوچکے ہیں۔ بے نظیر بھٹو کی المناک موت کے بعد گورننس کے سٹرکچرل مسائل اور معیشت کے معاملات جن پر میں نے مذکورہ کتاب میں توجہ مرکوز کی تھی ناصرف ابھی تک توجہ کے طالب ہیں بلکہ پہلے سے زیادہ نازک صورت اختیار کرچکے ہیں۔

زیر نظر تصنیف پاکستان کے شدت اختیار کرتے ہوئے مسائل کی عکاس ہے۔ پاکستان کے ساتھ میری محبت اور بہت سے پاکستانیوں کے ساتھ میری دوستی نے ان مسائل کو لگی لپٹی رکھے بغیر بیان کرنا میرے لئے تکلیف دہ بنا دیا ہے۔ تاہم ان سے

صرف نظر کرنا بھی ممکن نہیں ہے۔ اگر اس ملک میں کچھ بہت اچھا ہے یعنی یہاں کے لوگوں کی کشادہ دلی اور مہمان نوازی اور نوجوانوں کا جوش و جذبہ تو اسے مستقبل کی بے یقینی کے سایوں میں محفوظ رہنا ہوگا۔ یہ کتاب جلی سرخیوں سے ماوراء ہونے اور اس تسلسل اوران امکانات کو بے نقاب کرنے کی کوشش ہے جنہوں نے پاکستان کی تاریخ کے دشوار گذار سفر کی تشکیل کی ہے۔ اس میں اس مواد کی تشریح وعکاسی کا کام سونپنے کی کوشش کی گئی ہے جس نے میری گذشتہ تصنیفات کی تشکیل کی تھی۔ اس خوبی اور اس کی حتی الامکان اپ ڈیٹنگ نے زیر نظر کتاب میں تازہ کاری کے رنگ بھرے ہیں۔ مقصد ہے گذشتہ چھ دہائیوں کے دوران پیش آنے والے اہم سنگ ہائے میل اور رجحانات کو نمایاں کرنا۔ خاص طور پر اس میں پاکستانی سیاست اور معیشت میں فوج کی بڑھتی ہوئی مداخلت پر زور دینا۔ عوامی زندگی میں اسلام کے کردار کے گرد گھومتے مسائل کا احاطہ کرنا۔ مرکزیت پسند رجحانات اور مقامی شناختوں کے درمیان بڑھتے ہوئے تناؤ اور جمہوریت کیلئے بلند آہنگ مطالبے پر توجہ مبذول کرنا اور داخلی تبدیلیوں پر مرتب ہوتے جیوپولیٹیکل اثرات کو موضوع بحث بنانا۔ بنیادی طور پر یہ ناکامیوں کا مطالعہ ہے۔۔۔ گورننس سیاسی و معاشی ترقی اور سب سے بڑھ کر ایک جداگانہ مسلم ریاست کے منصوبے سے وابستہ امیدوں کی ناکامی۔۔۔ کتاب کے مواد میں یہ آشکار کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ یہ سب کچھ پہلے سے طے شدہ تھا نہ ہی مقسوم تھا۔ اس قسم کے مہلک خیالات کے ساتھ ہم تاریخ کے پیچیدہ عمل، انفرادی کرداروں اور ریاست کے اپنے داخلی امکانات کے ساتھ انصاف نہیں کرسکتے۔ یہاں جس انداز فکر کو اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے وہ ہمیں یہ آسانی فراہم کرتی ہے کہ پاکستان کو مستقبل میں درپیش گھمبیر بحرانوں کا ادراک کرتے ہوئے یہ جانا جاسکتا ہے کہ ترجیحات کے ازسرنو تعین اور اداروں کی تشکیل نو کی صورت میں ابھی تک امکانات کا در کھلا ہے جو ریاست کو اس قابل بناسکتا ہے کہ وہ نا صرف اس گھمبیرتا کے ساتھ نبرد آزما ہوسکتی ہے بلکہ سیاسی اور معاشی استحکام بھی حاصل کرسکتی ہے۔

زیر نظر کام پاکستان کی تاریخ کے بارے میں میرے ذاتی خیالات کی عکاسی

کرتا ہے جو برسوں پر محیط میری علمی مصروفیات کا ماحصل ہے۔ میرے اس کام کو نا صرف کتاب ہذا میں درج بہت سے حوالہ جات سے بلکہ بے شمار رسمی و غیر رسمی تدریسی تبادلوں سے تقویت ملی ہے۔ درج ذیل تمام حضرات کلی طور پر میرے خیالات کے ساتھ ہم آہنگ نہیں ہیں تاہم اس کے باوجود میں ان سب کے کنٹری بیوشن کا کھلے عام اعتراف کرتا ہوں۔ ان میں : پروفیسر افتخار ملک، پروفیسر یونس صمد، پروفیسر محمد وسیم، پروفیسر عمران علی، پروفیسر گورہرپال سنگھ، پروفیسر فرانسس رابنسن اور پروفیسر فرزانہ شیخ شامل ہیں۔

آخر میں میں مائیکل ڈائر کا شکریہ ادا کرنا چاہوں گا جنہوں نے شعبہ تاریخ کی بھاری ذمہ داریوں کے باوصف مجھے اس کتاب کو لکھنے پر آمادہ کیا۔ تاہم حقائق کے بیان میں کسی کوتاہی کا تنہا میں خود ذمہ دار ہوں۔

آئن ٹالبوٹ

ساؤتھمپٹن، جولائی 2011

تعارف

2 مئی 2011 کو اسامہ بن لادن کی موت نے دنیا بھر میں زلزلے کی کیفیت برپا کردی تھی۔ امریکہ کا خفیہ آپریشن جس کا پہلے سے پتا نہ چلایا جاسکا، ایبٹ آباد کے قریب پاکستان ملٹری اکیڈمی سے پیدل کی مسافت پر موجود ایک احاطے میں وقوع پذیر ہوا۔ پاکستان نے بار بار دعویٰ کیا تھا کہ القاعدہ کا رہنما افغانستان میں روپوش ہے۔ اس کی ایبٹ آباد میں طویل عرصے سے موجودگی نے بین الاقوامی دہشت گردی میں پاکستان کی "معاونت" کے حوالے سے شدید ردعمل کو جنم دیا۔ تاہم واشنگٹن کا یہ ادراک ایک "سرد اطمینان" ثابت ہوا کہ اسامہ کی موجودگی سے پاکستانی فوج کے سربراہ باخبر تھے نہ آئی ایس آئی کے سربراہ کو کچھ معلوم تھا۔ اگر پاکستان ایک "بدمعاش ریاست" نہیں تب بھی یہ تیزی سے ناکام ریاست کے درجے کی طرف تیزی سے بڑھ رہا ہے۔

ایبٹ آباد والے معاملے سے پانچ برس پیشتر ایک ریٹائرڈ آرمی آفیسر رالف پیٹر نے اس شک کا اظہار کیا تھا کہ نسلی و قومیتی تحریکوں کی طویل آویزش کے شکار صوبہ بلوچستان اور صوبہ خیبر پختونخوا باقی ملک سے علیحدہ ہوسکتے ہیں۔ پاکستان میں اسے سازشی نظریے اور امریکی عزائم سے تعبیر کیا گیا(۱)۔ پاکستانی امور کے سینئر ماہر سٹیفن کوہن نے 2004 میں شائع ہونے والی اپنی کتاب "دی آئیڈیا آف پاکستان" میں خبردار کیا تھا کہ مسائل سے دوچار ریاست کو بحران میں گھرنے سے بچانے کیلئے بڑے پیمانے پر تبدیلی کی ضرورت ہے(۲)۔ اس کے بعد تو گویا پاکستانی ریاست کے مستقبل

کے بارے میں مایوسانہ پیش گوئیوں کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہوگیا۔ مثال کے طور پر دہلی میں واقع انسٹی ٹیوٹ فار ڈیفنس سٹڈیز اینڈ ایلیسس نے "Whither Pakistan" کے نام سے ایک رپورٹ جاری کی تھی استحکام کے پہلو بہ پہلو داخلی شکست و ریخت اور "لبنانیت" (Lebanonizing) کے امکانات کا خدشہ ظاہر کیا گیا تھا(۳)۔ امریکہ کے سابق تجزیہ کار بروس ریڈل اور اسلام آباد میں خدمات سرانجام دینے والے امریکی سفارتکار جون آرشمٹ نے بھی پاکستان کے مستقبل میں جھانکنے کی کوشش کی(۴)۔ ریڈل نے نہایت کھلے انداز میں پاکستان کی جغرافیائی حدود میں اسلامی امارات کے قیام کا شبہ ظاہر کیا تھا۔ اسامہ بن لادن والے سانحے سے کچھ ہی عرصہ قبل بروک انسٹی ٹیوٹ نے سٹیفن کوہن کے پاکستان کے مستقبل کے حوالے سے سٹیفن کوہن کے ایک مقالے اور اس کے مختلف کانفرنسوں میں پڑھے جانے والے مضامین کے مجموعے "Pakistan's Future: The Bellagio Papers" (۵) کے حوالے سے ایک بہت عالمانہ اور متاثر کن تجزیاتی رپورٹ جاری کی تھی۔

اپنے مختلف انداز کے باوجود ان مطالعات میں مشترکہ طور پر اس خیال کی بازگشت سنائی دیتی ہے کہ پاکستان ایک بہت بڑے بحران کے دہانے پر کھڑا ہے اور اس کے نیوکلیائی ہتھیاروں اور دہشت گردی کے خلاف جنگ میں اس کے کلیدی کردار نے اسے مرکزی اہمیت کی حامل ریاست کا درجہ عطا کردیا ہے(٦)۔ ریاست کی ناکامی علاقائی اور عالمی استحکام پر معکوس اثرات مرتب کرے گی۔ فرینڈز آف ڈیموکریٹک پاکستان کے امدادی کنسورشیم کے قیام اور امریکی کانگریس کے کیری لوگر ایکٹ کے تحت غیر فوجی اخراجات کے سلسلے میں تعاون اس ادراک کے پالیسی ردعمل تھے کہ پاکستان اس قدر اہم ہے کہ اسے ناکام نہیں ہونا چاہیے۔ فاٹا۔۔۔ جو سات قبائلی ایجنسیوں باجوڑ، مہمند، دیر، کرم، اورکزئی، شمالی وزیرستان اور جنوبی وزیرستان پر مشتمل ہے۔۔۔ کی مغرب کے سیکورٹی مفادات کے حوالے سے بڑھتی ہوئی اہمیت نے بھی پالیسی بریف (۷) اور فاٹا سسٹین ایبل ڈویلپمنٹ پلان 2015-2007 جیسے اقدامات کے سلسلے کو جنم دیا(۸)۔

پالیسی اور ینٹیڈ کاموں کے ذریعے پاکستان کے ''مسئلے'' پر توجہ مرکوز کی گئی بجائے اس کے کہ ملک اور اس کے لوگوں کو ان کے اپنے تناظر میں سمجھنے کی کوشش کی جاتی (۹)۔ اس لٹریچر کے زیادہ تر حصے کو عدم استحکام کی جڑوں اور ریاست کے عسکریت پسند گروپوں کے ساتھ روابط کا کھوج لگانے کیلئے وقف کیا گیا ہے (۱۰)۔ مثال کے طور پر رابرٹ لوئی نے اس کے اپنے الفاظ میں ''پاکستان کے ناکام معاشی ٹیک آف'' اور پاکستان کے اندر بڑھتی ہوئی دہشت گردی کے درمیان تعلق ثابت کرنے کی کوشش کی ہے (۱۱)۔ وہ اداروں کی غیر لچک پذیری اور ناقص گورننس کو معاشی ترقی کی ناکامی کی وجوہات میں شمار کرتا ہے۔ اس امر نے ایسا ماحول پیدا کر دیا ہے جس میں ''آبادی کا بڑا حصہ فرسٹریشن اور تھکاوٹ کا شکار ہو چکا ہے'' اور پاکستان ''دہشت گردوں کے پنپنے کیلئے ''زرخیز زمین'' میں تبدیل ہو چکا ہے (۱۲)۔ دوسری جانب نیازی نے یہ استدلال پیش کیا کہ معاشی ترقی کے اہداف کو حاصل کرنے میں ناکامی سے زیادہ وسائل کی ناہموار تقسیم ہے جس نے ملک میں عسکریت پسندی کو ہوا دی ہے۔ یہ ناہموار ترقی ہے جس نے چھوٹے صوبوں میں پسماندگی کو تقویت بخشی ہے۔ اس کے ساتھ ہی ریاست نے پختون اور بلوچ قوم پرستی کا توڑ کرنے کیلئے اسلام کو سیاسی ہتھیار کے طور پر استعمال کرنے کی پالیسی اپنا رکھی تھی جس کی کسی نہ کسی حد تک پنجاب کے غلبے کی حامل پاکستانی ریاست میں موجود سیاسی اور معاشی ناہمواری کے اندر جڑیں پیوست ہیں (۱۳)۔ اسی طور یوسف بھی سماجی و معاشی تقسیم کو عدم استحکام کے ساتھ منسلک کرتے ہیں۔ وہ خاص طور پر تعلیم کے حوالے سے اس معاملے پر اپنی توجہ مرکوز کرتے ہیں۔ بطور خاص اشرافیہ کی جانب سے اس کے حال پر چھوڑا جانے والا سرکاری سکولوں کا نظام ہے جس کا بدترین معیار اور مغرب دشمن رجحانات ''طالبانائزڈ پاکستان'' کے امکانات کو ہوا دینے کا باعث بن رہے ہیں (۱۴)۔

تاہم یہ کرسٹائن فلیئر ہیں جنہوں نے خصوصی طور پر تعلیم اور عسکریت پر تحقیق کی ہے (۱۵)۔ انہوں نے تشدد کی راہ ہموار کرنے کے سلسلے میں مدارس کی جانب سے درپیش خطرات کے حوالے سے بعد از نائن الیون مغرب کے مفروضات پر سوالات

اٹھائے ہیں جبکہ ساتھ ہی یہ بھی تسلیم کیا ہے کہ مٹھی بھر معروف مدارس کے جہادیوں کے ساتھ تعلقات ہیں (۱۶)۔ طارق رحمان کی جانب سے کیے جانے والے متعدد سروے (۱۷) کی بنیاد پر اس خاتون نے اس بات کو اجاگر کیا ہے کہ مدارس کے طلبہ کے علاوہ سرکاری سکولوں میں عسکری رویوں کی پرورش کی جاتی ہے (۱۸)۔ مزید براں یہ ثابت کرنے کیلئے کہ مدارس کی رسائی میں غیر معمولی حد تک اضافہ ہو چکا ہے، وہ طاہر اندرابی کے 2005 میں کیے جانے والے کام کا حوالہ دیتی ہے (۱۹)۔ وہ غربت اور مدارس میں دی جانے والی تعلیم کے بارے میں بھی سوال اٹھاتی ہے جو اس سلسلے میں تحریر کیے جانے والے بہت سے لٹریچر کی مشترکہ خصوصیت ہے (۲۰)۔ عسکریت پسندوں کی بھرتی کا تخمینہ لگانے کے دوران وہ استدلال پیش کرتی ہے کہ مدارس کیڈر کے کچھ گروپ خود کو تفویض کیے جانے والے اس پیچیدہ کام کی انجام دہی کیلئے ناموزوں ہیں۔ ایسی عسکری تنظیمیں جن میں علاقائی سطح پر فعال ہونے کی صلاحیت ہے، مثال کے طور پر لشکر طیبہ، زیادہ سہولت کے ساتھ اعلیٰ تعلیم یافتہ اور خوشحال گھرانوں سے تعلق رکھنے والے نوجوانوں کو بھرتی کر سکتی ہیں۔ دوسری جانب سپاہ صحابہ پاکستان جیسی فرقہ پرست تنظیمیں ہیں جن کی آپریشنل رسائی محدود ہے اور وہ زیادہ تر مدارس سے نکلنے والے کیڈر پر انحصار کرتی ہیں جو متحارب فرقے کے جنگجوؤں کے خلاف زیادہ جوش سے بھرا ہوا ہوتا ہے (۲۱)۔

پاکستان میں برطانیہ کے سابق ہائی کمشنر سر ہنری سائنٹ نے تاریخی حوالے سے ایک زیادہ وقیع پالیسی رپورٹ جاری کی ہے (۲۲)۔ وہ تصدیق کرتے ہیں کہ ''قدیم داخلی مسائل ملک کے ابتدائی برسوں کی یادگار ہیں''۔ وہ Whither Pakistan رپورٹ سے بھی اختلاف کرتے ہوئے تسلیم کرتے ہیں پاکستان نے دوسرے ملکوں کی خاطر بہت بھاری قیمت ادا کی ہے (۲۳)۔ سائنٹ محتاط انداز میں اس امید کا اظہار کرتے ہیں کہ پاکستان بیرونی مشاورت، مالی معاونت اور متعلقہ بیرونی عناصر کی وسیع تر ان پٹ کی مدد سے دورس، شدید اور واضح سمت کی حامل کوششوں کے نتیجے میں فوری طور پر اپنے داخلی معاملات کو درست کر سکتا ہے (۲۴)۔

اس کی نسبت کہیں زیادہ کمزور تاریخی تفہیم ہمیں زاہد حسین کی کتاب "Frontline Pakistan: The Struggle with Militant Islam" میں ملتی ہے(۲۵)۔ کتاب ہذا میں پاکستان کو درپیش موجودہ عسکری خطرات کے پیچھے موجود طویل عرصے سے کارفرما عناصر کے بارے میں بہت محدود بحث ملتی ہے۔ کتاب کا فوکس ماضی قریب میں پرویز مشرف کی فوجی حاکمیت(1999-2008) سے شروع ہوتا ہے جو اس کی حکومت کے اسلامی انتہا پسندی کے خلاف مبہم ردعمل کو اجاگر کرتا ہے۔ جمہوریت کی جانب لوٹ جانے کی بات کے ساتھ ان کی یہ تفہیم ریاست اور عسکریت پسندی کے درمیان طویل مدتی رشتوں کو نمایاں کر کے پیش کرنے میں زیادہ کامیاب دکھائی نہیں دیتی۔ وہ اس حقیقت پر بھی زور نہیں دیتے کہ نا صرف فوجی بلکہ جمہوری حکومتوں نے بھی سٹریٹجک مقاصد کیلئے جہادی عناصر کو پروان چڑھانے میں اپنا کردار ادا کیا تھا۔ حسن عباس (۲۶) اور حسین حقانی بھی زاہد حسین کے اس خیال کی توثیق کرتے دکھائی دیتے ہیں کہ ریاست کی انتہاپسندی کے ساتھ گٹھ جوڑ کے خاتمے کی کلید جمہوریت ہی ہے۔ دونوں لکھاری فوجی حکومتوں کے حوالے سے اپنے تجزیئے کا دائرہ ایوب خان(1958-69) اور ضیاء الحق(1977-88) کے ادوار تک پھیلاتے ہیں۔ حسین حقانی ضیاالحق کے دور میں پاکستان کے ابھرتے ہوئے سیاسی ماڈل کی وضاحت کیلئے ''ملا ملٹری گٹھ جوڑ'' کی اصطلاح تراشتے ہیں (۲۷)۔

پالیسی تجزیہ کاروں نے 2008-09 کے دوران پاکستان کے قلب پنجاب میں سرکاری تنصیبات اور'' آسان اہداف'' پر حملوں کے بعد نام نہاد پنجابی طالبان کے ظہور کے نتیجے میں پیدا ہونے والے نئے مسئلے پر اپنی توجہ مرکوز کرنا شروع کر دی ہے۔ اس سلسلے میں حال ہی میں حسن عباس، ریکونین اور اپادیا (۲۸) کا کام منظر عام پر آیا ہے۔ اس میں متشدد سنی گروپوں کے پہلے سے موجود ڈھیلے ڈھالے اتحاد کی حیثیت سے جو پہلے سے فرقہ ورانہ سرگرمیوں اور کشمیر جہاد میں مصروف تھا، پنجابی طالبان کا تجزیہ کیا گیا ہے(۲۹)۔ حالانکہ اس کی زیادہ تر بھرتی جنوبی پنجاب کے علاقوں سے ہوتی ہے تاہم ڈیرہ غازی خان، رحیم یار خان، بہاولپور، مظفر گڑھ جیسے اضلاح کے دیہی علاقوں میں شدید غربت کے عنصر کی موجودگی کے باوجود ان وجوہات پر اختلاف رائے پایا جاتا ہے جو اس علاقے کو انتہاپسندی کا گڑھ بنانے کی ذمہ دار ہیں (۳۰)۔ پاکستان نیشنل ہیومن ڈویلپمنٹ رپورٹ 2003 میں انکشاف کیا گیا ہے کہ پنجاب کا کوئی بھی ضلع پاکستان کے 91 اضلاح کے آخری درجے کے ایک تہائی اضلاع کی فہرست میں شامل نہیں ہے(۳۱)۔

کرسٹائن فلئیر اور ہیلری سائنٹ کی بہترین سمجھی جانے والی پالیسی اورینٹڈ تحریر کو آسانی کے ساتھ پاکستان اور اس کے عوام کے سٹیریو ٹائپ خاکے کی درجہ بندی میں شامل کیا جاسکتا ہے۔ یہ تحریر اس ملک کی رنگارنگی اور قوت کو نظر انداز کرتی ہے جسے نہایت آسانی کے ساتھ یک رنگی اسلامی اصطلاحوں کے تنگ خانے میں بند کر دیا جاتا ہے۔ حال ہی میں منظر عام پر آنے والے مجموعے "Pakistan: Beyond the Crisis State" جس کی تدوین ملیحہ لودھی نے کی ہے، میں پاکستان کے تاریخی ارتقاء اور اس کے سیکورٹی، گورننس اور معاشی چیلنجوں کے حوالے سے موجودہ مسائل کے ٹکڑوں کو جوڑ کر کامیابی کے ساتھ ان مسائل کو ایڈریس کیا گیا ہے(۳۲)۔

یوں یہ تصنیف امریکہ میں ہونے والے ان مطالعات میں اختیار کیے جانے والے غائتی طرز فکر سے گریز کرتی ہے جو پاکستان کو ابتدا سے ہی ایک ناکام ریاست کی جانب بڑھنے کے تصور میں محدود رکھتے ہوئے دیکھنے کی عادی ہے۔ اس کے برعکس ملیحہ لودھی اور اس کی کتاب کے مضمون نگار پاکستان کے مسائل کو قابل تسخیر سمجھتے ہیں گو کہ یہ مسائل اصلاحات کے ایسے تدریجی لیکن دور رس عمل کے متقاضی ہیں جو گورننس، تعلیم، معیشت اور سول ملٹری تعلقات کی تجدید نو پر منحصر ہو۔ اس کتاب میں وکلاء کی تحریک، ابھرتے ہوئے درمیانے طبقے اور ایک نئے میڈیا سے تقویت حاصل کرنے والے سماجی تحرک کو تبدیلی پیدا کرنے والے رجحان کے طور پر دیکھا گیا ہے۔ مذکورہ کتاب میں پاکستان کے باثروت اور متنوع ثقافتی ورثے کی جانب بھی اشارہ کیا گیا ہے جو ایک اور امید افزاء جائزے کے الفاظ میں ''جمہوری شہریت کے ساتھ جڑے ہوئے کثیر القومی(Pluristic) متبادل کی بقاء کا باعث بن سکتا ہے''(۳۳)۔

ملیحہ لودھی کا مجموعہ اپنے دائرہ کار میں پھیلاؤ کا حامل ہے۔ جب پاکستان کے مستقبل کی پیش بینی کی بات ہوگی تو بہت سے تجزیہ کار اگلے تین سے پانچ سال کی مدت سے آگے جانے سے گریز کریں گے۔ اس اپروچ کی ایک نمایاں مثال جوناتھن پیرس کی تصنیف ہے۔ وہ پاکستان کو اگلے چند برسوں کے دوران اپنے مسائل سے نبرد آزما دیکھتا ہے جس کے دوران ملک کسی بڑے پیمانے پر اصلاحات کرنے کے قابل نہیں ہوگا۔ اس کی بجائے وہ خود رو نسلی خطرات اور طالبان کے قبضے کے خطرے کا مقابلہ کرنے میں مصروف نظر آئے گا (۳۴)۔ پیرس تنقید کیلئے ایک آسان ہدف ہے جیسا کہ ماضی میں جیمز مل ہوا کرتا تھا۔ اس نے اس کی ناکامیوں کے بارے میں ماہرانہ تجزیہ دینے سے پہلے کبھی برصغیر کی دھرتی پر قدم بھی نہیں رکھا تھا (۳۵)۔ پاکستان کے حوالے سے حال ہی میں منظر عام پر آنے والے کئی دیگر ماہرین اس کی ثقافت کے بارے میں بہت زیادہ جانکاری کے بعد ہی اس حوالے سے اپنا پیشہ ورانہ کیریر تشکیل دے سکتے ہیں۔ تھنک ٹینک ماہرین میں سے چند ہی ایسے ہیں جو تاریخ کے حوالے سے ضروری تربیت سے لیس ہوتے ہیں یا اس تناظر میں پاکستان کے معاصر بحران کا جائزہ لیتے ہیں۔ پالیسی اور ینٹیڈ کام، جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں، پاکستان اور اس کے عوام کو خود ان کے اپنے تناظر میں سمجھنے کی بجائے پاکستان کے ''مسئلے'' کو ایڈریس کرتا ہے (۳۶)۔ میں اس سے پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ اس طرح کی جانکاری شدید اہمیت کی حامل ہے۔ خاص طور پر اس لیے بھی کہ پاکستان پیچیدہ اور کثیر الجہتی مسائل کا سامنا کر رہا ہے (۳۷)۔

پاکستان کا تاریخی مطالعہ ظاہر کرتا ہے کہ بظاہر انتشار کی کیفیت اور بحرانی واقعات کے باوجود 1947 سے اب تک بہت کچھ ایسا ہے جو تبدیل نہیں ہوا ہے۔ بہت سے سیاسی خاندان جو نوآبادیاتی دور میں نمایاں تھے وہی آج بھی سیاسی عہدوں پر متمکن دکھائی دیتے ہیں۔ یہ سیاسی کلاس بدستور قومی مفاد کی بجائے اپنی محدود ذاتی اغراض کے ساتھ بندھی ہوئی ہے۔ پروگرام اور پالیسیوں کی بجائے شخصیات اور ان کی سرپرستی بدستور سیاست پر حاوی دکھائی دیتی ہے۔ مزید براں مسائل جو معاصرانہ تجزیوں پر حاوی

ہیں مثال کے طور پر انتظامیہ اور مقننہ کے مابین اختیارات کی تقسیم یا ریاست کی جانب سے عسکریت پسندی کو بطور سٹریٹجک اثاثوں کے اپنانے جیسے معاملات ریاست کی تشکیل کے وقت سے چلے آرہے ہیں۔ قیام پاکستان کے ابتدائی چند ماہ کے دوران ہی مثال کے طور پر سندھ اور اس وقت کے شمال مغربی سرحدی صوبے کی منتخب حکومتوں کو بانی پاکستان اور ملک کے پہلے گورنر جنرل محمد علی جناح کی جانب سے برطرف کر دیا گیا تھا۔ جبکہ فوج نے جموں و کشمیر کو بھارتی قبضے سے آزاد کرانے کیلئے قبائلی جہادیوں کو استعمال کیا تھا (۳۸)۔ بعد کے برسوں میں اپنائی جانے والی پالیسی کے حوالے سے جو تبدیل ہوا وہ تھا فنڈنگ کے ذرائع کو محفوظ بنانے کیلئے جہادی گروپوں کی جانب سے اپنی صلاحیت اور پھیلاؤ کو بڑھانا۔

چند تاریخی موضوعات کی جانب رخ کرنے سے پہلے جن سے کتاب ہذا میں اکثر و بیشتر سابقہ پڑے گا، یہ خبردار کرنا ضروری ہے کہ پاکستان کی بقاء کے حوالے سے مفروضات محض نائن الیون کے بعد کے منظر نامے سے مشروط نہیں ہیں۔ برطانوی سرکاری اہلکار اور کانگریسی سیاستدان قیام پاکستان کے وقت سے ہی یکساں طور پر اس کی بقاء کے بارے میں شکوک وشبہات کا اظہار کیا کرتے تھے۔ ان شکوک کی جڑیں مسلمان ریاست کی معاشی اہلیت میں پیوست تھیں۔ موجودہ انڈرسٹینڈنگ کے مطابق کانگریس کی ہندوستان کی تقسیم پر بعد میں ہونے والی آمادگی کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ سردار پٹیل جیسی شخصیات یہ سمجھتی تھیں کہ پاکستان اپنے قیام کے فوری بعد انہدام کا شکار ہو جائے گا جس کے بعد مسلم لیگ کی شرمسار قیادت کو کانگریس کی اپنی شرائط پر ری یونی فکیشن پر آمادہ کیا جائے گا۔ پٹیل غلطی پر تھا لیکن یقینی طور پر پارٹیشن کونسل میں اس کی موجودگی جو 3 جون کے پلان کو قبول کرنے کے بعد ممکن ہوئی تھی کی وجہ سے اسے پاکستان کے ناموافق معاشی امکانات کا ادراک ہوا تھا (۳۹)۔

پاکستان میں بڑھتی ہوئی علاقائی اور طبقاتی کشمکش اور تناؤ نے جو 1960 کی دہائی میں ہونے والی غیر متوازن ترقی کا نتیجہ ہے، جوشیلے نوجوان طارق علی کو 1970 میں یہ کہنے پر اکسایا کہ صرف عوامی انقلاب ہی پاکستان کو بکھرنے سے بچا سکتا

ہے(۴۰)۔وہ حکمران اشرافیہ کی سٹرکچرل اصلاحات متعارف کرانے کی عدم صلاحیت پر اتنے ہی شکوک وشبہات کا اظہار کرتا تھا جتنا معاصر تجزیہ نگار کرتے ہیں جنہیں خوف ہے کہ شدید عدم مساوات کے نتیجے میں پیدا ہونے والے داخلی دباؤ سوشلسٹ انقلاب کی بجائے کسی طرح کے اسلامی انقلاب کی صورت میں پھوٹ پڑیں گے۔ذوالفقار علی بھٹو کے دور میں ہونے والی محدود اصلاحات کے نتیجے میں پیدا ہونے والی مایوسی، جو دائیں بازو کے نظریات کی حامل فوج اور اس کے مذہبی اتحادیوں کی قوت میں اضافے کا باعث بنی، نے طارق علی کو1983 میں پاکستان کی بقاء کے بارے میں مزید سوالات اٹھانے پر مجبور کردیا(۴۱)۔بعد کی تقریباً تین مشکلات سے پر دھائیوں میں پاکستان اپنے مسائل کے ساتھ بدستور دست وگریبان رہا۔ایک مورخ کیلئے یہ ضروری ہوجاتا ہے کہ وہ ریاست کی بقاء کی جڑوں کی کھوج لگائے اور اس کے ساتھ ہی اس سوال کا جواب تلاش کرنے کی کوشش بھی کرے کہ آخر کیوں یہ ملک اپنے قیام کے بعد سے مسلسل بحرانوں کا شکار چلا آرہا ہے۔

موجودہ دور میں پاکستانی ریاست کے بارے میں مختلف تجزیئے کیے جارہے ہیں جن میں اسے ''ناکام ریاست''، ''ناکامی سے دوچار ریاست''، ''مشکلات کی شکار ریاست'' اور ''ناتواں ریاست'' جیسے القابات سے نوازا جارہا ہے۔ضروری ہے کہ ان تجزیوں کے ساتھ آزادی کے بعد ہونے والی تبدیلیوں کا تاریخی تجزیہ جوڑا جائے جو ناصرف اس کو درپیش مسلسل بحرانوں کی وجوہات پر بلکہ اس کی قوت مدافعت پر بھی روشنی ڈال سکے۔اس تجزیئے کیلئے ضروری ہے کہ یہ تجزیہ کافی حد تک جدید اصولوں کی بنیاد پر کیا جائے تاکہ یہ تاریخی قوسین(Historical Trajectories) کا کھوج لگا سکے اور سیاسیات کی تشکیل کے تصور کے مطابق کھیل کا رخ بدل دینے والے واقعات کے تسلسل اور ان میں ہونے والی تبدیلیوں کو شناخت کرسکے۔کیا پاکستان کے موجودہ بحران کی جڑیں حالیہ اور بہت حد تک ان دیکھی تبدیلیوں میں پیوست ہیں، چاہے وہ نائن الیون جیسے سوچے سمجھے حادثے ہوں، اسامہ بن لادن کی بظاہر پناہ کا معاملہ ہو یا 2005 میں زلزلہ یا 2010 میں عظیم سیلاب جیسی قدرتی آفات ہوں؟معکوس طور پر کیا یہ ناصرف

داخلی جہتوں بلکہ خارجی جہتوں کے حوالے سے تاریخ کے جبر کا نتیجہ ہے؟ کیا بحران کو سٹرکچرل معاشی اصلاحات کو متعارف کرانے اور جمہوری استحکام کے حصول میں مجموعی ناکامی کے طور پر دیکھا جاسکتا ہے؟اتنی ہی اہم بات وہ سوالات ہیں جو پاکستان کی قوت مدافعت کے بارے میں اٹھائے جاسکتے ہیں۔یہ کہ کیا درمیانے طبقے اور سول سوسائٹی کا حالیہ پھیلاؤ جمہوریت کی بنیادوں کو مضبوط کرنے کا باعث بن سکتا ہے؟ کیا دیہی علاقوں میں دولت مند اور محروم طبقوں کے درمیان موجود رشتوں کو بیک وقت ایک جانب بڑھتی ہوئی عدم مساوات کے ذریعے دائمی عدم استحکام اور دوسری جانب طاقت کے عدم توازن کے خلاف کارفرما عوامی تحریکوں کے خلاف بند باندھنے کے حوالے سے دیکھا جاسکتا ہے؟اسی طور کیا نسلی تقسیم اور فرقہ واریت اسلامی انقلاب کے خلاف ایک بیرئر کی حیثیت سے کردار ادا کرتے ہوئے بیک وقت سماجی ہم آہنگی کے امکانات معدوم کرتی اور تشدد کی حوصلہ افزائی کرتی ہے؟اور آخر میں یہ کہ کیا آبادی میں اضافے کی موجودہ رفتار بمع تیز رفتار شہر کاری(Urbanization) اپنے جلو میں تعلیم، روزگار اور ماحولیاتی دباؤ کو لیے حتمی طور پر پاکستان کی مسائل سے نبرد آزما ہونے کی صلاحیت پر ضرب لگانے کا باعث بنے گی؟

ان سوالات کا ہمہ جہت تاریخی تجزیئے کے اندر جائزہ لیا جائے گا جو پاکستان کی ترقی کے پانچ کلیدی معاملات کو فوکس کرتا ہے۔ان معاملات میں اس کی تاریخی وراثت، سول ملٹری تعلقات، خارجی جہت، مرکز اور صوبوں کے درمیان تعلقات اور پاکستان کی عوامی زندگی میں اسلام کا کردار شامل ہیں۔ان میں اول الذکر نوآبادیاتی دور کی وراثت اور تقسیم کے فوری بعد بہت بڑے پیمانے پر ہونے والی نقل مکانی اور اس کے ریاست کی تشکیل اور قومی تعمیر پر مرتب ہونے والے اثرات سے متعلق ہے۔یہ وہ دیرینہ داخلی مسائل کی دوررس وجوہات ہیں جن کی جانب سائٹ کی تصنیف "Tranforming Pakistan" میں اشارہ کیا گیا ہے۔اپنی گذشتہ تصنیفات کے حوالے سے میں بیان کروں گا کہ اگرچہ پہلی نظر میں انڈیا اور پاکستان کو برطانوی راج سے گورننس کی ایک جیسی ورثے ملے تھے لیکن درحقیقت ان کی نوعیت ایک دوسرے سے یکسر مختلف تھی

کیونکہ شمال مغربی ہندوستان میں اس علاقے کا بہت بڑا حصہ جس نے مغربی پاکستان کی تشکیل کی برطانیہ کی ''سیکورٹی سٹیٹ'' کا کردار ادا کر رہا تھا۔وہ سمجھوتے جو مسلم لیگ کو اس علاقے کی جاگیردار اور قبائلی اشرافیہ کے ساتھ کرنا پڑے نیز 48-1947 کی نقل مکانی نے گورننس کی اس روایت کو مستحکم کیا جس نے سیاسی نمائندگی اور جمہوری سفر پر انتظامیہ کی کارکردگی اور سیکورٹی کے معاملے کو مضبوط تر کر دیا۔

تاریخی ورثے نے پاکستان کی ترقی کی دوسری بڑی تھیم،سول ملٹری تعلقات کو ملٹری کے حق میں موڑنے کے سلسلے میں بہت اہم کردار ادا کیا۔اب یہ بات ایک جانی پہچانی حقیقت بن چکی ہے کہ سول حکومتوں کے ادوار میں بھی فوج پردے کے پیچھے رہتے ہوئے خارجہ پالیسی اور سلامتی کے امور کے حوالے سے بے پناہ اثر و رسوخ استعمال کرتی رہی ہے۔مذکورہ بالا علاقوں میں سویلین کی اختیارات سے دستبرداری رضا کارانہ بھی ہوسکتی ہے جیسا کہ حالیہ زرداری۔کیانی دور میں دیکھنے میں آیا ہے اور اس کھینچا تانی کا شاخسانہ بھی ہوسکتی ہے جس کا مظاہرہ 1990 کی دہائی میں ہوا تھا۔مثالی طور پر فوج سٹریٹجک معاملات اور اپنے ادارہ جاتی مفادات کو ویٹو کرنے کی طاقت اپنے ہاتھ میں رکھتے ہوئے گورننس کے روزمرہ امور منتخب سیاسی قیادت کو سونپنے کیلئے تیار ہے۔ایبٹ آباد وقوعے کے فوری بعد کی صورتحال میں پارلیمان اور میڈیا کے اندر فوج پر غیر معمولی تنقید دیکھنے میں آئی تھی۔تاہم پیپلز پارٹی کی زیر قیادت حکومت نے فوج کے اثر و رسوخ کو محدود کرنے کیلئے کوئی قدم نہیں اٹھایا۔مزید براں جبکہ عسکریت پسندوں کے خلاف فوجی ایکشن کے حق میں رائے عامہ میں کمی ہوئی اس کے باوجود فوج کے خود اپنے بارے میں اس دائمی تصور کو اس وقت تقویت ملی جب PEW سروے کے مطابق 79 فیصد رائے دہندگان نے قرار دیا کہ فوج کی ملکی معاملات پر گرفت ابھی تک مضبوط ہے(۴۲)۔حقیقت یہ ہے کہ فوج کا ریاست پر غاصبانہ کردار اس کے نجات دہندہ ہونے کے کردار پر غالب ہے۔اس نے سویلین اداروں اور کاروباری سرگرمیوں میں اپنے بازو دور تک پھیلا رکھے ہیں۔یہ ہمیشہ سیاسی جواز حاصل کرنے اور سٹرکچرل اصلاحات کرنے کی تگ و دو میں رہی ہے۔ایک جدید طاقت کی صورت اختیار کرنے کی

بجائے اس نے ہمیشہ روایتی انداز کو برقرار رکھا ہے۔اتھارٹی کے اس پیٹرن نے اب تک کئی طرح کے اہم نتائج کو جنم دیا ہے۔

اول یہ کہ فوج نے اس ضرورت کا ادراک کرلیا ہے کہ اگر عدم مقبولیت اور کرپشن اس کے وقار کو داغ دار کرنا شروع کر دے تو اسے حکمت عملی کے طور پر بیرکوں میں واپس چلے جانا چاہیے۔اس بات کی روشنی میں مارشل لاء کے ''معیادی تمدن'' (Periodic Civilization) اور کمزور جمہوریت کی واپسی کے عمل کو سمجھا جاسکتا ہے۔دوم یہ کہ مارشل لاء کے ابتدائی دنوں کے دوران بھی اس ٹیکنوکریٹس کی مہارت نیز سویلین سیاسی سپورٹ اور قانون کی چھتری کی مدد سے حاصل ہونے والے کسی نہ کسی حد تک حاصل ہونے والے جواز کی ضرورت کا احساس کیا جاتا رہا ہے۔اول الذکر سپورٹ زیادہ تر مذہبی جماعتوں اور رجعت پسند جاگیرداروں کی جانب سے جبکہ موخر الذکر سپورٹ عدلیہ کے ایک حصے کی جانب سے پیش کی جاتی رہی ہے۔اس سپورٹ کی موجودگی سے ہمیں لاطینی امریکہ اور افریقہ کے ملکوں کی نسبت نرم خو آمریت کی نوعیت کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔سوم سویلین کے برعکس فوج کی جانب سے اعلیٰ تر انتظامیہ یا معاشی بندوبست کی فراہمی میں نااہلی نے پاکستان کی گورننس میں نشیبی سپائرل بنانے میں بہت اہم کردار ادا کیا ہے۔اس حقیقت کے باوجود ناصرف فوج بجائے خود بلکہ پاکستانی معاشرے کا ایک بہت بڑا حصہ اسے ریاست کے سب سے زیادہ کارآمد ادارے اور استحکام کے ضامن کے طور پر دیکھتا ہے۔

فوج تسلسل کے ساتھ اپنے قومی نکتہ نظر کا اپنے سیاسی حریفوں کے محدود ذاتی مفادات کے ساتھ موازنہ کرتی رہتی ہے۔تاہم اس نے ٹیکسیشن کے کلیدی شعبے میں کبھی بھی ایک جدت پسند طاقت کے طور پر عمل نہیں کیا۔پاکستان کی محض ایک فیصد آبادی براہ راست ٹیکس ادا کرتی ہے۔معاملات کی اس افسوسناک صورت نے ریاست کو اپنی آبادی کو بنیادی خدمات کی فراہمی کے قابل نہ ہونے میں بہت اہم کردار ادا کیا ہے۔خواندگی کی کم ترین شرح نے معاشی ترقی اور جمہوریت کے استحکام کے امکانات کو دھندلا کر رکھ دیا ہے۔

پاکستان کا تجربہ ناصرف نیکیشن کے شعبے میں بلکہ اپنی ترقی کی صورت گری کے سلسلے میں بیرونی عوامل کی اہمیت کے اعتبار سے بھی دوسرے ممالک سے کی مثالوں سے متضاد ہے۔ہم جانتے ہیں کہ قبل ازیں ہیلری سائٹ نے 'پاکستان کی جانب سے دوسروں کی خاطر بھاری قیمت ادا کرنے' کے رویئے کی جانب اشارہ کیا تھا۔وہ خصوصی طور پر ضیاء حکومت کے ساتھ مغرب کی جانب سے پینگیں بڑھانے اور سرد جنگ کے دوران سوویت یونین کے خلاف پاکستانی سرزمین کو بین الاقوامی اسلامی جہاد کیلئے استعمال کرنے کی حوصلہ افزائی کرنے کا حوالہ دے رہا تھا۔بعد میں ہونے والی تبدیلیوں کے نتیجے میں عسکریت پسندی کا ''جوابی وار'' عدم استحکام کے کلیدی عنصر کے طور پر سامنے آیا ہے۔کوئی تجزیہ کار اپنے تاریخی تجزیئے میں گہرائی پیدا کرتے ہوئے پاکستان کی تشکیل کے فیصلہ کن برسوں کے دوران جمہوریت کو کمزور کرنے کے عمل کو جزوی طور پر پاکستانی فوج کے ابھرتی ہوئی طاقت کے ساتھ مغرب کی دوستی کے نتیجے کے طور پر دیکھ سکتا ہے۔1950 کی دہائی میں ہی یہ عمل امریکہ کی جانب سے 500 ملین ڈالر کے امدادی پیکج کے ساتھ ہی شروع ہوگیا تھا۔امریکی امداد نے ایوب خان کی آمریت کو مستحکم کرنے میں اتنا ہی اہم کردار ادا کیا تھا جتنا اس نے جنرل ضیاء الحق کی اقتدار پر گرفت مضبوط کرنے کے سلسلے میں کیا تھا۔پاک امریکہ تعلقات میں ایک مستقل قدر پاکستان کی ''عدم سپاس گذاری'' کے حوالے سے واشنگٹن کی فرسٹریشن رہی ہے۔موجودہ اینٹی امریکہ جذبات کی موجودگی ایک طے شدہ حقیقت ہے۔اسامہ بن لادن کی موت کے بعد ہونے والے Pew ریسرچ سنٹر کے ایک سروے کے مطابق صرف بارہ فیصد رائے دھندگان نے امریکہ کے حق میں مثبت جذبات کا اظہار کیا تھا۔پانچ دہائیاں قبل اسی طرح کے معاملات درپیش تھے۔امریکیوں نے 1950 کی دہائی کے آخر میں معیشت کو اپنے قدموں پر کھڑا کرنے اور پاکستان کی امریکہ کے دفاعی اتحادی کی حیثیت سے سوویت یونین کو تنہا کرنے کے منصوبے کی تکمیل کیلئے ایوب خان کی حکومت کو امداد فراہم کی تھی۔جب امریکہ نے پہلی مرتبہ بھارت کو اکتوبر 1962 میں چین کے ہاتھوں شکست کے بعد اسے بڑے پیمانے پر ہتھیار فراہم کیے تھے تو اس پر ناصرف پاکستان کی قومی

اسمبلی میں شدید احتجاج ہوا تھا بلکہ یو ایس آئی ایس سنٹر کراچی کی لائبریری پر حملہ ہوا تھا اور راولپنڈی میں غیر ملکیوں کی جانی مانی آماجگاہ فلیش مین ہوٹل پر پتھراؤ کیا گیا تھا(۴۳)۔

واشنگٹن کی نسبت پاکستان کے بھارت کے ساتھ تعلقات کے سلسلے میں تاریخ کا بوجھ دو چند ہے۔نوآبادیاتی دور کے آخری دنوں کے ہندوستان میں کانگریس اور مسلم لیگ کے درمیان شدید عدم اعتماد برصغیر کی تقسیم پر منتج ہوا تھا۔تقسیم نے اس عدم اعتماد کو بین الاقوامی حیثیت دے دی تھی کیونکہ یہ اپنے جلو میں انسانوں کا بڑے پیمانے پر قتل عام، ہجرت، اثاثوں کی تقسیم کے معاملے پر تنازعات اور سابق ریاست جموں وکشمیر کے تنازعے پر پہلی پاک بھارت جنگ لے کر آئی تھی (۴۴)۔بعد میں مزید تصادموں اور پراکسی جنگ نے اعتماد کے اس بحران کو مزید گہرا کردیا۔2001 میں افغانستان میں بھارت کے بڑھتے ہوئے اثر ورسوخ نے اسلام آباد کے اس خوف میں اضافہ کردیا کہ اس عمل کی وجہ سے سیاسی بے چینی کے شکار بلوچستان صوبے میں سیکورٹی کے مسائل میں مزید اضافہ ہوجائے گا۔پاکستان کے داخلی عدم استحکام اور بحرانوں کا جائزہ لیتے ہوئے Whither Pakistan رپورٹ اس بات کو حیران کن طور پر نظرانداز کرتی ہے۔تاہم اس کے باوجود کہا جاسکتا ہے کہ جنوبی ایشیا کی بڑھتی ہوئی اجارہ دار طاقت کی حیثیت سے بھارت پاکستان کے سیکورٹی تحفظات کو دور کرنے کیلئے کچھ اقدامات اٹھا سکتا تھا۔اعتماد کی کمی تسلسل کے ساتھ پاکستان اور بھارت کے درمیان تعلقات کی خرابی کا باعث رہی۔بہت سے مصنفین کا خیال ہے کہ دونوں ملکوں کے درمیان تعلقات میں بہتری بذات خود پاکستان کے اندر جمہوری عمل کی مضبوطی اور خطے کے استحکام کا باعث بن سکتی ہے۔جبکہ پاکستان کے سٹریٹجک اثاثوں نے مغرب کے دماغوں میں اضطراب کی لہریں دوڑادی ہیں۔بھارت نے بھی اپنے دیرینہ حریف کی نیوکلیائی چھتری اور سزا سے محروم اسلامی پراکسی کے استعمال کا جواب دینے کیلئے کولڈ سٹارٹ کے نام سے سٹریٹجک ڈاکٹرائن اپنا رکھا ہے(۴۵)۔

بھارت کے بارے میں پاکستان کی تشویش اور تلخی نے کشمیر کے حوالے سے

اسے ''مستقل انجماد'' کی حالت میں لاکھڑا کیا ہے۔سابق پرنسلی ریاست جموں وکشمیر کی برصغیر کے دو ناراض ہمسائیوں کیلئے اہمیت نے اقوام متحدہ کے ایجنڈے پر موجودہ قدیم ترین تنازعے کے حل کی ہر کوشش کا راستہ بند کردیا ہے۔چند تجزیہ نگاروں کی نظر میں پاکستان کا بھارت کے ساتھ شدید نوعیت کا یہ جھگڑا تباہ کن غلطی کا حامل ہے۔اس نے ناصرف کشمیر کے بارے میں بھارت کے رویئے میں سختی پیدا کردی ہے اور طاقت ور ریڈیکل اسلامی گروپوں کا فرینکن سٹین عفریت تخلیق کیا ہے بلکہ داخلی سلامتی کے خطرات کی وجہ سے پاکستان کی ریاست کیلئے اپنے شہریوں کو بنیادی خدمات کی فراہمی کے سلسلے میں بھی مشکلات سے دوچار کردیا ہے(۴۶)۔

افغانستان اور چین بھی گہرے طور پر پاکستان کی داخلی تبدیلیوں پر اثر انداز ہوئے ہیں۔اس بات پر ایک عام اتفاق رائے ہے کہ پاکستان کی جانب سے سوویت یونین کے افغانستان پر قبضے کے خلاف جہاد کے استعمال کے نتیجے میں پیدا ہونے والے ''جوابی وار'' کے اثرات نے پاکستان میں ایک جہادی منظر نامے کی تشکیل کی ہے۔کشمیر کے تنازعے نے ،جیسا کہ ہم پنجابی طالبان کے تذکرے میں بیان کر چکے ہیں،اس منظر نامے کی تشکیل میں اہم کردار ادا کیا ہے۔1980 کی دہائی میں افغانستان سے پاکستان میں ہونے والی بڑے پیمانے پر ہجرت کے اثرات کو بہت کم سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے ۔یہ اس دہائی میں ہونے والی تیز رفتار شہر کاری(Urbanization) اور پاکستان کے اہم ترین شہر اور مختلف نسلی گروہوں کی آماجگاہ کراچی میں نسلی تنازعات اور تشدد کے حالات کو پیدا کرنے کے سلسلے میں کلیدی کردار کی حامل ہے۔

مشرف کے دور میں پاکستان اور افغانستان کے درمیان کشیدہ تعلقات کے بارے میں تبصروں میں تسلسل کے ساتھ دونوں ملکوں کے درمیان دیرینہ تناؤ اور اس حقیقت کو، کہ افغانستان میں طالبان کے ظہور سے بہت پہلے سٹریٹجک اثاثوں کی حیثیت سے اسلامی جہادیوں کو اپنے مغربی ہمسائے میں سرگرم کردیا تھا، نظرانداز کر دیا گیا ہے۔کابل نے 1947 میں دونوں ملکوں کے درمیان نوآبادیاتی دور میں ہونے والے اس معاہدے کو مسترد کردیا تھا جس کے نتیجے میں ڈیورنڈ لائن کی تخلیق عمل میں آئی تھی۔اس

نے پختونستان کے مطالبے کی حمایت کے علاوہ اقوام متحدہ میں پاکستان کی رکنیت کے خلاف ووٹ دیا تھا۔آنے والے دنوں میں جب نیٹو سیکورٹی کی ذمہ داری افغان نیشنل آرمی کو منتقل کرے گی تو افغانستان مستقبل کے بحرانوں کا منبع ثابت ہوسکتا ہے یا بصورت دیگر خطے میں استحکام کے عمل میں تعاون کرسکتا ہے۔اسی طرح پاکستان جھگڑوں کا پیدا کنندہ(Conflict-maker) یا امن کا پیامبر(Peace-broker) ثابت ہوسکتا ہے۔

چین کو پاکستان میں عام طور پر ایک ''دیرینہ دوست'' قرار دیا جاتا ہے۔چین کے قابل اعتماد دوست ہونے کو امریکہ کے ساتھ پریشان کن تعلقات کے سلسلے میں موازنے کے طور پر دیکھا جاتا ہے۔خاص طور پر جب اسامہ بن لادن کے معاملے کے بعد پاکستان اور امریکہ کے درمیان تعلقات تاریخ کی پست ترین سطح پر پہنچ گئے تھے تو اس وقت کے وزیر اعظم یوسف رضا گیلانی نے پاکستان اور چین کے تعلقات کی ساٹھویں سالگرہ کے موقع کو بیجنگ کا دورہ کرنے کیلئے بہانے کے طور پر استعمال کیا تھا۔انہوں نے ناصرف اس بات کی زبانی یقین دہانی حاصل کی کہ پاکستان اور چین کے درمیان دوطرفہ تعلقات کی سطح بلند تر ہوجائے گی بلکہ اس دوران ایک کو پروڈکشن معاہدے کے تحت پچاس جے ایف تھنڈر لڑاکا طیاروں کی کھیپ حاصل کرنے کے وعدوں کو بھی حتمی شکل دی گئی۔گیلانی کے دورے نے جس میں ان کی صدر ہو جنتاؤ کے ساتھ ملاقات بھی شامل تھی، نے پاکستان میں ان لوگوں کو مضبوط کیا جو بیجنگ کے ساتھ زیادہ سے زیادہ مضبوط تعلقات کے حامی ہیں۔چین نے درحقیقت پاکستان کے دوسرے بڑے تجارتی پارٹنر کی حیثیت سے یورپی یونین کی جگہ لے لی ہے۔اگرچہ چین اور پاکستان کے درمیان باہمی تجارت کا حجم سالانہ سات ارب ڈالر کے قریب ہے جو چین اور بھارت کے درمیان تجارت کے مجموعی حجم سے کہیں کم ہے جو 2012 میں بڑھ کر 100 ارب ڈالر کی سطح تک پہنچ چکی تھی۔مزید یہ کہ 2010 تک پاکستان کو چار ارب ڈالر کے تجارتی خسارے کا سامنا تھا۔چین پاکستان میں ایک اہم سرمایہ کار کی حیثیت سے اپنے اثر ورسوخ کو استعمال کرتا ہے۔جبکہ مستقبل میں اہم ترین معاشی وفوجی ضامن کے طور پر چین پر انحصار پاکستان کو امریکہ کے ساتھ تعلقات کے بوجھ سے نجات دلا دے

گا، یہ پاکستان کی بیرونی سٹریٹجک مفادات پر انحصار کو دائمی صورت دے دے گا اور بھارت کے ساتھ تعلقات میں مزید پیچیدگیاں پیدا کر دے گا (۴۷)۔

مرکز اور صوبوں کے درمیان تناؤ کی کیفیت پاکستان کی ترقی کے سفر میں ایک اور مستقل خصوصیت رہی ہے۔ بعد از آزادی کے دور کے اوائل میں ہی اردو کو قومی زبان بنانے کے حوالے سے موجود ''پاکستانیت'' کے خلاف مشرقی بنگال میں پائی جانے والی مزاحمت نے علیحدگی کی تحریک کو جنم دیا تھا۔ مشرقی بنگال کی جیوٹ انڈسٹری سے حاصل کیے جانے والے زرمبادلہ کی تقسیم کے حوالے سے وہاں معاشی تنفر بھی پیدا ہوا۔ بلوچستان میں گیس انڈسٹری کی ترقی کے بعد قدرتی وسائل پر مرکز کے قبضے کے حوالے سے بھی اسی طرح کے معاشی تنفر نے جنم لیا۔ پانی کی تقسیم کے تنازعات بھی پنجاب اور سندھ جیسے صوبوں کے درمیان کشیدگی کو پیدا کرنے کا باعث ثابت ہوئے۔ پنجاب کے ساتھ وابستہ فوج کے مفادات نے بھی دوسرے صوبوں کی اشرافیہ کو پاکستان میں ''پنجابیت'' کے فروغ کی بات کرنے پر اکسایا (۴۸)۔

پاکستان کے اوائل دنوں میں ہی 1948 میں فوج کو بلوچ قبیلوں کے خلاف تصادم میں جھونک دیا گیا تھا۔ بعد ازاں 1958 اور 1962 کی بے چینی نے مزید تصادمات کی راہ ہموار کی۔ یہ تصادم 77-1973 کے درمیانی عرصے کے دوران ہونے والے بڑے تصادم کا پیش لفظ تھے جس کے دوران باغی قبائلیوں کے خلاف 70 ہزار فوجی نفری کو لا کھڑا کیا گیا۔ 10-2009 کے دوران فاٹا اور سوات میں طالبان کے خلاف ہونے والی فوجی کارروائی کے دوران ہلاکتوں کی تعداد پانچ ہزار بلوچ شہریوں اور ساڑھے تین ہزار فوجیوں کی ہلاکت کے مقابلے میں بہت کم ہے (۴۹)۔ سب سے خونریز تصادم جو فوج اور سویلین آبادی کے درمیان ہوا وہ بلاشبہ 1971 میں مشرقی پاکستان میں ہونے والی فوجی کارروائی تھی جس کے نتیجے میں ملک ٹوٹ گیا۔ وہاں ہونے والی مسلح کارروائی جسے آپریشن سرچ لائٹ کا نام دیا گیا تھا کا مقصد سول نافرمانی کی تحریک کے نتیجے میں علیحدگی کے دہانے پر پہنچے ہوئے صوبے کا کنٹرول دوبارہ حاصل کرنا تھا۔ اس فوجی کارروائی کے کمانڈر جنرل ٹکا خان تھے جنہیں ''بنگال کا قصائی'' کے

خطاب سے سرفراز کیا گیا (۵۰)۔ اس کی جانب سے بعد ازاں بحالی کا عمل قومی سلامتی کے نام پر ریاستی دہشت گردی کو کمزور جواز فراہم کرنے کی محض ایک بیکار کاوش تھا۔

صدر زرداری کی حکومت نے اپنی خود ساختہ قومی مفاہمت کی پالیسی کے ایک حصے کے طور پر مرکزی محصولات کی تقسیم اور اختیارات کی نچلی سطح پر منتقلی کے مطالبات کے حوالے سے چند مدتوں پرانی صوبائی ناراضگیوں کو دور کرنے کی کوشش کی ہے۔ بلوچستان میں سیکورٹی کے بڑھتے ہوئے معاملات اور اس کے ساتھ ساتھ انتظامیہ اور عدلیہ کے درمیان پائے جانے والے مسائل نے اٹھارہویں ترمیم اور ساتویں قومی مالیاتی کمیشن کے سمجھوتے کے باعث پیدا ہونے والی تبدیلیوں کی اہمیت کو گھٹا دیا ہے۔ موخر الذکر نے نا صرف اپنے اتفاق رائے سے ہونے والے سمجھوتے کے ذریعے نئی راہیں تراشی ہیں بلکہ قومی بجٹ میں مجموعی صوبائی حصے کو بھی بڑھا دیا ہے۔ اسی طرح اس میں چھوٹے صوبوں کا حصہ پنجاب کی نسبت کہیں زیادہ ہو گیا ہے۔ اٹھارہویں ترمیم کے ذریعے پختون عوام کے دیرینہ مطالبے کو تسلیم کرتے ہوئے شمالی مغربی سرحدی صوبے کا نام خیبر پختونخوا رکھا گیا۔ علاوہ ازیں اس نے کنکرنٹ لسٹ کا خاتمہ کرنے کے ذریعے اختیارات کی مرکزیت کو بھی کم کیا ہے۔ کنکرنٹ لسٹ میں وفاقی قوانین کو صوبائی قانون سازی کے عمل پر برتری حاصل ہوا کرتی تھی۔ صوبائی محسوسات کے اس ادراک کے نتائج کا ابھی ظہور میں آنا باقی ہے۔ پریشانی کی بات یہ ہے کہ یہ اقدامات اتنی تاخیر سے کیے گئے ہیں کہ ان کی مدد سے بلوچستان کے دکھوں کا مداوا مشکل ہو چکا ہے۔ اور یہ کہ گورننس میں سالہا سال کے انحطاط کا مطلب ہے کہ صوبوں کو اختیارات کی منتقلی پر موثر عمل درآمد کیلئے انتظامی صلاحیت بہت حد تک کمزور ہو چکی ہے۔

پانچویں غالب تاریخی تھیم کا تعلق اسلام کے کردار کے ساتھ ہے۔ پاکستان مذہب کے نام پر بنایا گیا تھا۔ تاہم اس کے باوصف پاکستان کی عوامی زندگی میں اسلام کے کردار کے حوالے سے ایک مبہم ترکہ آگے منتقل کیا تھا۔ کیا پاکستان شمالی ہندوستان کے مسلمانوں کیلئے ایک وطن کی حیثیت کا حامل ہوگا یا یہ اسلامی مملکت ہوگی؟ یہ سوالات ابھی تک جواب طلب ہیں۔ اور نتیجے میں ان سوالات نے اس چیز کی تخلیق میں حصہ لیا ہے

جسے پاکستان کے شناختی بحران کا نام دیا جاسکتا ہے۔یہ چیز نسلی، لسانی اور قومی وفاداریوں کے رول پر بھی اثر انداز ہوئی ہے(۵۱)۔

پاکستانی معاشرے کا طویل مدتی رجحان مذہبی طور پر زیادہ سے زیادہ رجعت پسند ہوتا رہا ہے۔اس وراثتی رجحان کا ضیاء دور میں ہونے والی ریاستی اسلامائزیشن سے اتنا تعلق نہیں ہے جتنا تبلیغی جماعت، جماعت اسلامی اور تنظیم اسلامی جیسی مذہبی تنظیموں کی سرگرمیوں کے ساتھ ہے۔رجعت پسندی کو بہرحال انتہاپسندی کے ساتھ خلط ملط نہیں کرنا چاہیے جو چند افراد کے چھوٹے چھوٹے گروہوں پر مشتمل ہے۔عسکریت پسندی کی حمایت محض مخصوص تعلیمات کے پھیلاؤ کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ یہ ملک کے عدالتی نظام سے مایوسی اور وسیع تر سماجی و معاشی ناہمواریوں کے خلاف نفرت کا نتیجہ ہے۔پاکستان کے سیکولر وژن کے ساتھ وابستگی ایک اقلیتی نکتہ نظر ہے جو محدود تعداد میں مغربی طرز تعلیم کی حامل اشرافیہ سے مخصوص ہے۔جہادی مائنڈ سیٹ اور سب کلچر کو پروان چڑھانے والی صورتحال، جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، موجودہ دور کے مطالعہ پاکستان میں غالب ترین عنصر کی حیثیت سے موجود ہے۔یہ ذہن نشین کرنا ضروری ہے کہ برصغیر کے ان علاقوں میں جو بعد میں پاکستان کا حصہ بنے جہادی سرگرمیوں کی تاریخ بہت پرانی ہے، یہاں تک کہ نوآبادیاتی دور سے قبل بھی ان کا مشاہدہ کیا جاسکتا ہے۔مزید یہ کہ فرقہ واریت جو عسکریت پسندوں کو پیدا کرنے کی سکہ بند طور پر زرخیز زمین رہی ہے کی جڑیں تاریخ میں پیوست ہیں اور ضیاالحق کے دور سے، جو بہت سے معاصر مطالعات کا نکتہ ارتکاز ہے، بہت پیچھے تک پھیلی ہوئی ہیں۔یہ بھی لازمی ہے کہ پاکستانی علاقوں میں تصوف کے زیراثر اسلام کی مستند کثیر القومی روایات کو بھی نظرانداز نہ کیا جائے۔

مندرجہ بالا پانچوں بڑی تھیم جان بوجھ کر تقویمی ترتیب کے اندر رہتے ہوئے پیش کی گئی ہیں۔یہ تاریخی حادثات کی اہمیت کو اجاگر کرتے ہوئے پاکستان کی ترقی کی غایتی سمجھ بوجھ کا رد پیش کرتی ہے۔نوآبادیاتی دور سے ''وائسریگل ازم'' کے ترکے کے باوجود مطلق العنانیت کوئی ناگزیر مقدر نہیں تھی بلکہ 1950 کی دہائی میں ہونے والی متعدد کلیدی تبدیلیوں کا شاخسانہ تھی۔کتاب ہذا کا پہلا باب پاکستان کی سرزمین اور لوگوں کے

بارے میں گہری بصیرت فراہم کرتا ہے۔اس باب کا یہ بھی مقصد ہے کہ قاری طویل مدتی معاشی، ماحولیاتی اور جغرافیائی چیلنجوں سے آگاہ ہوسکے جو موجودہ سیکورٹی چیلنجوں کی گرد میں کہیں کھو چکے ہیں۔اس سے آگے چل کر باب نمبر دو کا موضوعاتی بیان آتا ہے جو پاکستان کی ترقی کی پہلی دہائی کا احاطہ کرتا ہے۔آجکل اس دور کو ریاست کی آگے چل کر ہونے والی جمہوریت کے استحکام اور ایک سیاسی نظام کی تشکیل جو چھوٹے صوبے اور قومیتوں کی آرزوؤں کے ساتھ ہم آہنگ ہوسکے، کی جدوجہد کے سلسلے میں سنگ میل کے طور پر جانا جاتا ہے۔تیسرا باب پاکستان کے پہلے فوجی حکمران ایوب خان کے دور حکومت کا تجزیہ پیش کرتا ہے۔یہ پاکستان کے بنیادی مسائل کے بارے میں ایوب خان کے ریسپانس کا جائزہ لینے کے علاوہ مستقبل میں فوج کے سویلین اور مذہبی اتحادیوں کے ساتھ تعلقات کے ترکے کی چھان پھٹک بھی کرتا ہے۔چوتھا باب ذوالفقار علی بھٹو کے دور کا احاطہ کرتا ہے۔اس میں یہ بحث شامل ہے کہ یہ دور پاکستان کو جمہوریت کے نئے راستے پر گامزن کرنے کیلئے ایک ضائع شدہ موقع تھا۔یہ باب ممکنہ ٹرننگ پوائنٹ کی ناکامی کی وضاحت کرتا ہے نا صرف بھٹو کی اپنی شخصیت اور اس کی تخلیق کردہ پاکستان پیپلز پارٹی کی ادارہ جاتی ناکامی کے حوالے سے بلکہ بنیادی سماجی و معاشی نیز سیاسی مسائل کے حوالے سے بھی جنہیں تشنہ تکمیل چھوڑ دیا گیا۔پانچواں باب بھٹو کے قاتل جنرل ضیاالحق کے کیریر اور ترکے کا تجزیہ کرتا ہے۔یہ باب اس کے دور اقتدار کے منفی ترکے کی وضاحت کرتا ہے لیکن ساتھ ہی یہ انتباہ بھی کرتا ہے کہ پاکستان کے تمام تر موجودہ برائیوں کا ملبہ جنرل ضیاء کے دروازے پر نہیں پھینکا جاسکتا۔گو کہ ضیاء کا اسلام کا بے دریغ استعمال رسوائے زمانہ ہے تاہم جناح کے بعد آنے والے تمام حکمران اپنی داخلی طاقت کو سہارا دینے کیلئے اور پاکستان کے سٹریٹجک مفادات کو آگے بڑھانے کیلئے اسلام اور مذہبی گروہوں کو استعمال کرنے کی روایت پر کاربند رہے ہیں۔چھٹا باب وضاحت کرتا ہے کہ ضیاء کی موت کے بعد کی دہائی میں جمہوریت کیوں مستحکم نہ ہوسکی۔یہ باب اس امر کی تشریح کرتا ہے کہ ملک کی سیاست کا بہت بڑا حصہ مستقبل پر نگاہ جمانے کی بجائے ماضی میں پھنسا رہا کیونکہ اس دور میں بھٹو اور ضیاء کی باقیات کے

درمیان طاقت کی رسہ کشی شروع ہوگئی تھی۔ساتواں باب پاکستان کے معاصر دور میں جھانک کر دیکھتا ہے اور مشرف حکومت کی کامیابیوں اور ناکامیوں کا مرقع پیش کرتا ہے۔پاکستان کے مسائل کے ایک حصے کو نائن الیون کے بعد بین الاقوامی حالات کا شاخسانہ قرار دیا جاسکتا ہے۔یہ باب اس دور کے ایک طویل مدتی تناظر کو اختیار کرنے کی ضرورت کی جانب بھی اشارہ کرتا ہے۔آٹھواں باب زرداری کی صدارت کا معاصر چیلنجوں اور طویل مدتی تاریخی تسلسل کی روشنی میں تجزیہ کرتا ہے۔یہ باب ایبٹ آباد کے وقوعے کے سول ملٹری تعلقات پر اثرات کا ابتدائی نوعیت کا جائزہ بھی لیتا ہے۔اور آخر میں کتاب کا اختتامیہ پاکستان کے طویل مدتی آبادیاتی، ماحولیاتی اور انفراسٹرکچرل چیلنجوں اور امکانات پر غور کرنے کیلئے موجودہ سیکورٹی بحران سے ماوراء جانے کی بات کرتا ہے۔

☆☆☆

حوالہ جات

۱۔ Ralph Peters, "Blood Border: How a Better EAst Would Look", Armed Forces Journal, June 2006, http://www.armedforcesjournal.com/2006/06/1833899.

۲۔ Stephen P. Cohen, The Idea of Pakistan (Washington, DC: The Brooking Institution, 2004)

۳۔ Institute for Defence Strudies and Analysis, Whither Pakistan, http://www.idsa.in/book/whitherpakistan

۴۔ Bruce Riedle, "Armageddon in Islamabad; 23 June 2009, The National Interest Online, http://www.nationalinterest.org/printerfriendly.aspx?id=21644; John R. Schmidt, "The Unrevelling of Pakistan, June-July 2009, Survival: Global Politics and Strategy http:// www. iiss.org/publications/survival/survival-2009/year2009

۵۔ Stephen P. Cohen, "The Futue of Pakistan (Washington, DC: The Brookings Institutions, January 2011) Stephen P. Cohen, "The Futue of Pakistan, The Bellagio Papers http://www.brookings.edu/media/files/rl/papers/2010-09 _ bellagio_conference_papers_papers/09_bellagio_papers.pdf

۶۔ Pivotal States ان ریاستوں کو کہتے ہیں جو کامیابی یا ناکامی کے کسی فیصلہ کن موڑ پر کھڑی ہوں اور جن کا مقدر علاقائی اور عالمی استحکام کے سلسلے میں شدید اہمیت کا حامل ہو۔ملاحظہ کیجئے رابرٹ چیز، ایملی ہل اور پاؤل کینیڈی کی کتاب The Pivotal

States: A New Framework for US. Policy in the Developing World (New York: www.Norton, 1999)

۷۔ ملاحظہ کیجئے PSRU کا بریف: کاشف سعید اور معمر احمد سید، Conflict: Transformation and Development in Pakistan's North Western Territories, Brief no. 33 (24 May 2008); Ian Talbot, The Future Prospect for FATA,; James Ravill, Pakistan's Tribal Areas: An Agency by Agency Assessment; Shaun Gregory, Towards a Containment Strategy in the FATA.

۸۔ مثال کے طور پر ملاحظہ کیجئے، Civil Secreteriate Federally Administrative Tribal Areas 2007, FATA Sustainable Development Plan 2007 - 15, Govenment of Pakistan, Peshawar, http://www.worldsecuritynetwork.com/documents/bookletonfatasdp2006-15.pdf

۹۔ پاکستان میں نئے سیکورٹی مفادات کے بارے میں جاننے کیلئے دیکھیے، Jessica Stern, "Pakistan's Jihad Culture, Foreign Affairs 79, 6 (Nov. Dec. 2000, pp 115-26.

۱۰۔ مثال کے طور پر ملاحظہ کیجئے سی فیئر کی کتاب، "Militant Recrutment in Pakistan: Implication for Al Qaeda and Other Organizations, Studies in Conflict and Terrorism (Nov. Dec. 2004)

۱۱۔ R. Looney, "Failed Economic Takes Off and Terrorism: Conceptualising a Proper Role for US Assistance to Pakistan: Asian Survey 44, 6 (Nov. Cec. 2004) pp. 771-93

۱۲۔ ایضاً

۱۳۔ T. Niazi, "Modernization, Modernity and Fundamentalism: The Pakistani Experience" International Journal of Contemporary

Sociology, 43, 1, (2006) pp. 125 - 50

۱۴۔ M.Yusuf, "The Prospects of a Talibanized Pakistan" (The Brooklings' Intitutions, 2007) http://www.brooklings.edu/opinions/2007/0831pakistan_yusuf.aspx

۱۵۔ C. Fair, "Militant Recrutment in Pakistan: A New Look at the Militancy - Madrassah Connections", Asia Policy 4 (July 2007) pp. 107 - 34

۱۶۔ یہ کسی حد تک مارک سیجمین کی گذشتہ تحریر Understanding Terror Network (Philadelphia: University of Pennsylvania Press 2004) کو آگے بڑھاتی ہے۔

۱۷۔ پروفیسر طارق رحمان کی تحریر "Pluralism and Intolerance in Pakistani Society: Attitude of Pakistani Students Towards the Religious "Others", 29: http://www.aku.edu/news/majorevents/ismcconf-tr.pdf

۱۸۔ C. Fair, "Militant Recrutment in Pakistan pp 124

۱۹۔ اندرابی کی رپورٹ میں شائع شدہ ہاؤس ہولڈ ڈیٹا اور سکولوں میں ہونے والے ایک سروے کو استعمال کیا گیا ہے جس میں انکشاف کیا گیا تھا کہ پاکستانی سکولوں میں ہونے والے کل داخلوں کے ایک فیصد سے بھی کم مدارس سے تعلق رکھتا ہے۔

۲۰۔ اس نوعیت کی اپروچ کیلئے بلاحظہ فرمایئے انٹرنیشنل کرائسس گروپ کی رپورٹ:
:Pakistan: Karachi's Madrassas and Violent Extremism". ICG Islamabad/Brussels 2007 http://www.crisisgroup.org/library/documents/asia/south_asia/130_pakistan_karachi.pdf

۲۱۔ C. Fair, "Militant Recrutment in Pakistan pp. 120

۲۲۔ Hillary Synnott, Transforming Pakistan: Ways Out of Instability

۲۳۔ ایضاً۔

۲۴۔ ایضاً۔

۲۵۔ Zahid Hussain, Frontline Pakistan: The Struggle with Militant Islam (New York: Columbia University Press, 2007)...Frontline Pakistan: Path to Catastrophe and the Killing of Banazir Bhutto (London: I.B Taurus, 2008)

۲۶۔ Hassan Abbas, Pakistan's Drift into Extremeism: Allah, The Army and America's War on Terror (Armonk, NY: M.E Sharpe, 2005)

۲۷۔ Hussain Haqqani, Pakistan Between Mosque and Military (Washington DC: Camegie Endowment for Peace, 2005)

۲۸۔ Katja Riikonen, "Punjabi Taliban and the Secterian Groups in Pakistan", PSRU Brief 55 (12 Feb. 2005), Hassan Abbas, " Defining the Punjabi Taliban Network", CTC Sentinel 2, 4 (April 2009. pp. 1-4, PK Upadhayay, "From FATA to South Punjab: The Looming Leap of Islamic Radicalism in Pakistan", Institute for Defence Studies and Analysis, 30 Nov. 2009

۲۹۔ ان میں قابل ذکر ہیں سپاہ صحابہ پاکستان، لشکر جھنگوی، جیش محمد۔

۳۰۔ جنوبی پنجاب میں غربت کا احوال اور اس کی شدت کے بارے میں جاننے کیلئے ملاحظہ کیجئے لیلیٰ خالد، علی چیمہ اور مناسم پٹنم کی تحریر "Evidence from Punjab, Lahore Journal of Economics, Special Edition (Sep. 2008), pp. 163-81

۳۱۔ ملاحظہ کیجئے صفیہ آفتاب کی تحریر، "Poverty and Militancy", PIPS Journal of Conflict and Peace Studies (Oct. - Dec. 2008), pp. 66-86

۳۲۔ Maleeha Lodhi, (ed.), Pakistan: Beyond the Crisis State

(London: Hurst, 2011)

۳۳۔ Farzana Sheikh, " Making Sense of Pakistan" (London: Hurst, 2009)

۳۴۔ Jonathan Paris, Prospects for Pakistan (London: Legatum Institute, 2010)

۳۵۔ مل کی کتاب دی ہسٹری آف برٹش انڈیا ۱۸۱۸ میں تین جلدوں میں شائع ہوئی تھی، مل نے کبھی ہندوستان کی سرزمین پر قدم نہیں رکھا تاہم اس کے باوجود وہ لندن میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے مراسلات کا ممتحن مقرر کر لیا گیا تھا۔

۳۶۔ Jesica Stern, "Pakistan's Jehad Culture:, Foreign Affairs 79, 6 (NOv. - Dec. 2009

۳۷۔ ملاحظہ کیجئے آئن ٹالبوٹ کی کتاب، پاکستان: اے ماڈرن ہسٹری، دوسرا ایڈیشن (لندن: ہرسٹ، ۲۰۰۹)

۳۸۔ Praveen Swami, India, Pakistan and the Secret Jehad: The Covert War in Kashmir, 1947 - 2004 (London: Routledge, 2006)

۳۹۔ Ian Talbot and Durharpal Singh, The Partition of India (Cambridge: Cambridge University Press, 2009), p. 38

۴۰۔ Tariq Ali, Pakistan: Military Rule or People's Power (New York: William Morrow & Company, 1970)

۴۱۔ Tariq Ali: Can Pakistan Survive?: The Death of a State (Harmondsworth: Penguin, 1983)

۴۲۔ روزنامہ ڈان، انٹرنیٹ ایڈیشن، ۲۲ جون ۲۰۱۱۔

۴۳۔ American Embassy Karachi to Department of state, 16 and 21 Nov. 1962, 790. National Archives at College Park

۴۴۔ Ian Talbot and Durharpal Singh, The Partition of India

(Cambridge: Cambridge University Press, 2009), p. 38

۴۵۔ Rabia Akhtar and Nazir Hussain, "Safety and Securty of Pakistan's Nuclear Assets" in Usama Butt and N. Elahi (ed.) Paksitan's Quagmire: Security, Strategy and the Future of the Islamic - Nuclear Nation (New York: Continuum, 2010)

۴۶۔ Timothy D. Hoyt, " Pakistani Nuclear Doctrine and the Danger of Strategic Myopia" Asian Survey, 41, 6 (Nov.- Dec. 2001)

۴۷۔ بھارت کے وزیر دفاع اے کے انٹونی نے گیلانی کے چین کے دورے کے دوران پاکستان اور چین کے درمیان بڑھتے ہوئے دفائی تعلقات پر شدید تحفظات کا اظہار کیا تھا اور دھمکی دی تھی کہ بھارت کو بھی اپنی دفائی صلاحیت میں اضافہ کرنا پڑے گا۔ملاحظہ کیجئے ڈان، انٹرنیٹ ایڈیشن، ۱۲ مئی، ۲۰۱۱۔

۴۸۔ Yunus Samad, "Pakistan of Punjabistan: Crisis of National Identity in Gurharpal Singh and Ian Talbot (ed.), Punjabi Identity: Continuity and Change (New Dehli: Manohar, 1996)

۴۹۔ Frederic Grare, "Pakistan: The Resurgence of Baluch Nationalism"

۵۰۔ William Van Schendel, A History of Bangladesh (Cambridge: Cambrdge University Press, 2009)

۵۱۔ Alyssa Ayres, Speaking Like a State: Language and Natonalism in Pakistan (Cambridge: Cambrdge University Press, 2009)

۵۲ ۔ ملاحظہ کیجئے آئن ٹالبوٹ کی کتاب، پاکستان: اے ماڈرن ہسٹری، دوسرا ایڈیشن (لندن: ہرسٹ، ۲۰۰۹)۔

☆☆☆

1

پاکستان

زمین، لوگ، معاشرہ

یہ باب پاکستان کی ترقی کے عمل میں اس کے محل وقوع اور فطری ماحول کے اثرات کا تجزیہ پیش کرتا ہے۔یہ ایک ایسے معاشرے کی جانب سے فراہم کیے جانے والے چیلنجوں کا کھوج بھی لگائے گا جہاں ہر نسل کے بعد آبادی میں دوگنا اضافہ ہوجاتا ہے۔آخر میں یہ آزادی کے بعد سے ریاست کے ارتقاء کی صورت گری کے سلسلے میں سماجی ڈھانچوں اور عقائد کے اثرات کا تجزیہ بھی کرتا ہے۔اپنی کھوج کے دوران یہ ایسے سوالات کا جائزہ بھی لے گا کہ ''کیا پاکستان اپنے جغرافیے کا اسیر ہے؟''، ''پاکستان میں کثیر القومیت کے کون سے ذرائع ہیں؟''، ''ہجرت نے پاکستان کے سیاسی ارتقاء پر کیا اثرات مرتب کیے ہیں؟''، ''اسلام کس طور پر قوم کی سائیکی پر اثر انداز ہوا ہے؟''۔

جیو پولیٹیکل تناظر:

پاکستان کے خلیج فارس کے مشرق اور روس، چین اور بھارت کی جغرافیائی قربت میں ہونے کی وجہ سے حساس جیو پولیٹیکل صورتحال نے اسے ''گیریزن سٹیٹ'' کا درجہ دے رکھا ہے جس میں فوج کا کردار ناگزیر طور پر غالب ہے(۱)۔عسکریت کے ناقدین نے پاکستان کو ایک دائمی ''غیر محفوظ ریاست'' (Insecurity State) میں بدلنے کیلئے فوج کو بھارت کے ساتھ دشمنی اور مغربی علاقائی سٹریٹجک معاملات جو پہلے سرد

جنگ اور بعد ازاں دہشت گردی کے خلاف جنگ کی کوکھ سے پھوٹے تھے، کا رخ اپنے
فائدے کی جانب موڑنے پر مائل دیکھا ہے۔ ریاست کے طاقت ور اداروں کی حیثیت
سے فوج کی پوزیشننگ اور ری پوزیشننگ کی قیمت بجائے خود پاکستان کے طفیلی
(Neo-vassal status) ہونے کی صورت میں ادا کرنا پڑی ہے (۲)۔

یہ حقیقت کی پاکستان کا وجود برطانوی ہندوستان کی ایمپائر کو تراش کر عمل میں
لایا گیا تھا بجائے خود امر کی غمازی کرتی ہے کہ اس کی تاریخ اپنے عظیم الجثہ ہمسائے کے
ساتھ تعلقات سے شدید متاثر رہی ہے۔ بھارتی رویہ اس حقیقت کے ساتھ رنگا ہوا ہے
کہ وہاں پاکستان کو ایک ایسی ریاست کے طور پر دیکھا جاتا ہے جسے بھارت ماتا کے
ٹکڑے کر کے وجود میں لایا گیا تھا۔ جبکہ پاکستان میں یہ ناگزیر خوف غالب رہا ہے کہ
بھارت 1947 کی تقسیم کا نام ونشان مٹانا چاہتا ہے۔ ملک کے مشرقی بازو کی بنگلہ دیش کی
صورت میں علیحدگی نے اس خوف میں مزید شدت پیدا کر دی ہے۔ پاکستان 1947 کی
تقسیم کے نتیجے میں ایک ایسے ملک کے طور پر ظہور پذیر ہوا تھا جس کے مشرقی اور مغربی
بازوؤں کے درمیان ایک ہزار میل تک پھیلی ہوئی بھارتی سرزمین حائل تھی۔ جبکہ یہ
حقیقت ہے کہ اس ''جغرافیائی مضحکہ خیزی'' (پاکستانی ریاست کی ہیت ترکیبی کی
تفصیلات کیلئے ملاحظہ کیجئے دوسرا باب) کسی بھی طور ڈھاکہ کی وفاقی دارالحکومت، پہلے
کراچی اور پھر اسلام آباد، کے ساتھ فاصلوں میں کمی نہ لاسکی اور اس دوری نے بنگالی
سیاسی اشرافیہ کے احساس محرومی کو شدید تر کر دیا تھا۔ ''جب میں ڈھاکہ سے کراچی آتا
ہوں تو ایک عجیب سے احساس میں گھر جاتا ہوں'' یہ الفاظ مشرقی پاکستان کے اس وقت
کے وزیر اعلیٰ عطاالرحمٰن نے 1956 میں کہے تھے۔ ان کا مزید کہنا تھا: ''اپنی دماغی
کیفیات سے علی الرغم میں واضح طور پر محسوس کرتا ہوں کہ میں کسی غیر ملک میں قیام پذیر
ہوں۔ جب میں زیورچ، جینوا یا لندن جاتا ہوں تو ان احساس کا اتنی شدت سے شکار
نہیں ہوتا ہوں جتنا کہ میں اپنے ہی ملک میں رہتے ہوئے محسوس کرتا ہوں کہ گویا میں
کسی غیر ملک میں ہوں'' (۳)۔ ان احساسات کی جڑیں دونوں بازوؤں کے درمیان
پائی جانے والے مختلف جغرافیائی رنگ ڈھنگ، زمین کی ملکیت کے نظاموں اور آبادی

کے گھنے پن میں بہت فرق تھا نیز یہ حقیقت بھی اپنی جگہ پر تھی کہ مشرقی پاکستان کی آبادی
میں ہر پانچ میں سے ایک غیر مسلم تھا جبکہ مغربی پاکستان میں یہی تناسب تیس اور ایک کا
تھا۔ مشرقی بازو سے محرومی کے بعد پاکستان کو آبادی کے لحاظ سے نقصان کا صدمہ اٹھانا
پڑا۔ اس باعث ملک کو ثقافتی اور معاشی حوالے سے اپنے ہمسائے کے طور پر جنوبی ایشیا
کی بجائے زیادہ شدت کے ساتھ مشرق وسطیٰ کی جانب دیکھنے کی ترغیب ملی۔ اس وقت
تو اس بات کا ادراک نہ کیا گیا تاہم وفاقی حکومت کی جانب سے 1971 میں مشرقی
پاکستان میں اردو بولنے والے بہاری آبادی سے تعلق رکھنے والے رضا کاروں کے
استعمال نے بعد میں بھارت کے خلاف دشمنی کی آگ میں جھونکنے کیلئے سٹریٹجک
اثاثوں کے طور پر اسلامی عسکریت پسندوں کو استعمال کرنے کے تصور کی حوصلہ افزائی کی
(۴)۔ مشرقی بازو کے الگ ہونے کی وجہ سے بھارت کے مقابلے میں پاکستان بہت
زیادہ کمزور ہو گیا تاہم اس کے باوجود اس دشمنی کی شدت میں کمی نہ آسکی جس کی جڑیں
مسئلہ کشمیر میں پیوست ہیں۔

جہاں پاکستان کا بھارت کے ساتھ کشمیر کے معاملے پر جاری سرحدی تنازعہ
گذشتہ چھ دہائیوں سے دونوں ملکوں کے درمیان بداعتمادی کی علامت رہا ہے وہیں
اسے افغانستان کے ساتھ سرحدی تنازعہ بھی وراثت میں ملا ہے۔ جولائی 1949 میں
افغان پارلیمان نے ڈیورنڈ لائن کی سرحد کو رسمی طور پر مسترد کر دیا جسے برطانوی نے
1893 کو برطانوی راج کی حد بندی کرنے کیلئے امیر عبدالرحمٰن کے ساتھ بات چیت
کے ذریعے طے کیا تھا۔ کابل نے ان سرحدی علاقوں کا دعویٰ کر دیا جسے اس نے پاکستان
کے ہاتھ ''کھویا'' تھا۔ آزادی کے فوری بعد پاکستان کی کمزور پوزیشن کو مدنظر رکھتے
ہوئے یہ ایک سنجیدہ نوعیت کا خطرہ تھا۔ اس لیے بھی کہ یہ مطالبہ ڈیورنڈ لائن کے پار
پختون قوم پرستوں کی حمایت کے تناظر میں کیا گیا تھا جو پختون کی ریاست تشکیل دینے
کا مطالبہ کر رہے تھے۔ افغانستان میں 31 اگست کی تاریخ کو سرکاری طور پر ''عظیم تر
پختونستان'' کی سالانہ تقریبات کے طور پر منانے کا اعلان بھی کر دیا گیا۔ عظیم تر
پختونستان کا نعرہ نا صرف پاکستان کی تقسیم کے ذریعے پختون علاقوں کو شامل کر کے

افغان ریاست کی قوت کو بڑھانے کی غرض سے گھڑا گیا تھا بلکہ اس کا مقصد یہ بھی تھا کہ افغانستان کے اندر ہزارہ، ازبک اور تاجک قومیتوں کے مقابلے میں پختون قومیت کی برتری کو مستحکم کیا جاسکے۔کابل کے ان ارادوں نے پاکستان کے عدم تحفظ میں اضافہ کردیا جبکہ پہلے ہی 1947-48 میں بھارت کے خلاف ہونے والی جنگ کے نتیجے میں پاکستان کی قومی سلامتی کی صورتحال تشویش ناک ہوچکی تھی۔ جیو پولیٹیکل صورتحال کے تقاضے بھی ایک مضبوط فوج کے قیام کیلئے مزید حوصلہ افزائی کا موجب بنے۔آزادی کی ایک دہائی پورا ہونے سے بھی پہلے افغانستان اور پاکستان علاقے میں سرد جنگ کے اتحادی نظام کا حصہ بن گئے۔پاکستان امریکہ کی زیر سرپرستی قائم تنظیم سنٹرل ٹریٹی آرگنائزیشن(CENTO) کا حصہ بن گیا۔اگر چہ افغانستان اور بھارت نے غیر جانبدار ہونے کی حیثیت برقرار رکھی تاہم وہ سوویت یونین سے بھاری مقدار میں امداد وصول کرتے رہے۔سویت امداد نے کابل اور نئی دہلی کے درمیان قریبی روابط کی حوصلہ افزائی کی جس نے پاکستان اور افغانستان کے درمیان متحارب تعلقات میں مزید کشیدگی کے رنگ بھر دیئے۔

سرد جنگ کے دوران اور نائن الیون کے بعد ہونے والی دہشت گردی کے خلاف جنگ کے دوران پاکستان نے اپنی جغرافیائی پوزیشن کی وجہ سے بین الاقوامی تنازعات میں خود "فرنٹ لائن" کے طور پر موجود پایا۔اکتوبر 2001 کی جنگ میں جس نے طالبان کی حکومت کو اقتدار سے محروم کیا پاکستان کا تعاون بہت زیادہ اہمیت کا حامل تھا۔جبکہ نیٹو 2006 سے اب تک طالبان کی زیر قیادت بغاوت کو کچلنے میں مصروف ہے، پاکستان ایک اہم اتحادی کے طور پر خدمات سرانجام دے رہا ہے۔2010-11 تک مغربی ممالک کی فوجوں کیلئے سپلائی کیے جانے والے تمام ایندھن کا چالیس فیصد اور 80 فیصد کارگو پاکستان کے راستے سے ہی فراہم کیا جارہا تھا۔

چند مصنفین تو اس حد تک چلے گئے ہیں کہ انہوں نے پاکستان کو اپنے جغرافیے کا قیدی قرار دے دیا ہے۔1980 سے علاقے کی جیو پولیٹیکل صورتحال پاکستان کیلئے بہت سے معاشی فوائد کا باعث بنی ہے تاہم ہتھیاروں کے پھیلاؤ سے پیدا ہونے

والے "Blow Back Effects" کی وجہ سے ملک کو داخلی عدم استحکام، افغان مہاجرین کی غول در غول آمد اور اسلام کے نام لیوا عسکریت پسندوں اور فرقہ پرستوں کی بڑے پیمانے پر حمایت کی صورت میں بھاری قیمت بھی ادا کرنا پڑی ہے۔1980 کی دہائی میں امریکہ کی جانب سے افغانستان میں سوویت یونین کے خلاف "جہاد" کی حوصلہ افزائی کی حکمت عملی نے پاکستان کی ریاست کے اسلامی جنگجوؤں کے ساتھ اتحاد کی ابتدا نہیں کی تھی تاہم اس کے نتیجے میں ان کی قوت میں اضافے کے سلسلے میں بہت شدید اثرات مرتب ضرور کیے تھے۔امریکہ کی جانب سے ان کی قوت میں اضافہ کی وجوہات کچھ یوں ہیں: اول علاقے میں بہت بڑی تعداد میں غیر ملکی جنگجوؤں کو لا بٹھانا، دوم ملک میں ہتھیاروں کے انبار لگا دینا، سوم پاکستان کی آئی ایس آئی کی طاقت اور اثر و رسوخ میں اضافے اور اس کے عسکری گروپوں کے ساتھ تعلقات، اور چہارم ایک ایسا نمونہ فراہم کرنا جسے آگے چل کر پاکستان نے پوسٹ سوویت افغانستان میں برتری حاصل کرنے اور کشمیر میں بھارت کو ہزیمت سے دوچار کرنے کیلئے استعمال کرنا تھا۔

نائن الیون کے بعد سے بھارت کی افغانستان میں بڑھتی ہوئی ترقیاتی امداد کے نتیجے میں جس کے بارے میں پاکستان کا خیال ہے کہ اس کا مقصد اس پر غلبہ حاصل کرنا ہے، ملک گھیرے میں آنے کے خوف میں مبتلا ہے۔2007 تک افغانستان کو امداد فراہم کرنے کے سلسلے میں امریکہ کے بعد بھارت کا دوسرا نمبر ہے۔مزید یہ کہ نان پختون اقلیتیں جو روایتی طور پر اپنی امداد کیلئے بھارت کی جانب دیکھتی ہیں حامد کرزئی کی حکومت میں نمایاں قوت حاصل کرچکی ہیں۔اس کی وجہ سے پیدا ہونے والی بے چینی نے طالبان کی بغاوت کو تیز کردیا ہے کیونکہ اٹھارہویں صدی کے وسط میں افغانستان کی تشکیل کے وقت سے ہی ملک پختون غلبے کا حامل رہا ہے ماسوائے ان مختصر وقفوں کے جب حبیب اللہ دوم اور پوسٹ سوویت عہد کی برہان الدین ربانی حکومت میں تاجکوں نے اقتدار پر غلبہ حاصل کرلیا تھا۔نام نہاد پختونستان خطرے کے زوال کے بعد سے پاکستان خود کو افغانستان میں پختونوں کے فطری اتحادی کے طور پر دیکھتا ہے۔افغانستان میں پختون عسکریت پسندوں کی حمایت کے ذریعے افغانستان میں اپنے اثر و رسوخ کو

قائم رکھنے کی پالیسی 1979 میں سوویت حملے کے بعد سے چلی آ رہی ہے۔ اس وقت اسے مغربی اور سعودی اتحادیوں کی جانب سے بے پناہ حمایت بھی حاصل ہوئی تھی۔ یہ پالیسی آج دن تک برقرار رہے جس کے حوالے سے اسلام آباد اپنے سٹریٹجک مفادات اسلام پسند اور دیوبندی عسکریت پسندوں کے گروپوں کے ذریعے پورا کرنے کیلئے کوشاں ہیں۔ ان میں 2005 کے بعد سے طالبان کی حامد کرزئی حکومت کے خلاف بغاوت میں شریک گلبدین حکمت یار، ملا عمر اور خود طالبان سے لے حقانی نیٹ ورک تک مختلف گروپ شامل ہیں۔

قبائلی علاقہ جات جو سات ایجنسیوں مہمند، باجوڑ، خیبر، کرم، اورکزئی، شمالی وزیرستان اور جنوبی وزیرستان پر مشتمل ہے، افغانستان کی مشرقی سرحد کے حساس علاقے میں 280 میل طویل پہاڑی سلسلوں کی صورت میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اس علاقے میں پاکستان اور افغانستان کے تعلقات ہمیشہ کشیدہ نوعیت کے رہے ہیں۔ موجودہ افغانستان اپنے آپ کو اس علاقے میں موجود اسلامی عسکریت پسندوں کی جانب سے تسلسل کے ساتھ ہونے والے کراس بارڈر حملوں کے نشانے کے طور پر پیش کرتا ہے تاہم یہ ون وے ٹریفک کا معاملہ نہیں ہے۔ مثال کے طور پر پاکستانی فوج کو 1961 میں افغانستان کی جانب سے باجوڑ پر لشکر کشی کو پسپا کرنا پڑا تھا۔

پاکستان نے افغان سرحد پر موجود قبائلی علاقوں کو بفر زون قرار دینے کی برطانوی حکومت کی پالیسی کو برقرار رکھا ہے جس کے تحت وہاں پر بالواسطہ طور پر حکومت کی جاتی تھی اور وہاں پر قبائلی جرگوں کے توسط سے کام کرنے والے پولیٹیکل ایجنٹ کے ذریعے استحکام کو یقینی بنایا جاتا تھا۔ انگریزوں کے مزید ترکے میں فرنٹیر کرائم ریگولیشن (FCR) کے ذریعے اجتماعی سزا کے نظام کا نفاذ اور قبائلی علاقوں کے قلب میں فوج کی مستقل موجودگی سے گریز شامل ہے۔ نوآبادیاتی دور کی ایک اور تاریخی وراثت ہے افغانستان سے ملحقہ پختون قبائلی علاقوں میں علماء کے ذریعے قبائلی بغاوت کو ہوا دینا۔ اس روایت کو 1831-1786 کے دوران سید احمد بریلوی کی سکھ حکومت کے خلاف جہاد کے ساتھ منسلک کیا جاسکتا ہے۔ برطانوی حکومت کے خلاف 1893 اور 1897 میں

ہڈا ملا کے جہاد کو علاقے میں نوآبادیاتی توسیع کے خلاف قرار دیا جاسکتا ہے۔ ہڈا ملا اور اس کے جانشینوں نے مذہبی احیا پسندی کو پیر اور مرید کے درمیان روایتی تعلق سے ابھرنے والی عقیدت مندی کے ساتھ جوڑا تھا۔ پختون معاشرے میں پیر کا اثر نا صرف ان کے تقدس اور تعلیمات کی وجہ سے ہوتا ہے بلکہ قبائلی اور گروہی تنازعات میں ان کی غیر جانبدار ثالثی کی بنا پر بھی ہوتا ہے۔ اس علاقے میں بغاوتوں کا سلسلہ نوآبادیاتی دور کے آخر تک برقرار رہا جن میں فقیر اپی کی مہمیں بھی شامل ہیں۔ آزادی کے فوری بعد کابل کی امداد و تعاون سے اسے پختونستان کی علیحدگی کی تحریک کا حصہ بھی بننا تھا۔

انگریزوں کے خلاف جہاد کو مریدوں، طالبوں اور مقامی دیہاتیوں پر مشتمل مسلح لشکروں نے شروع کیا تھا۔ موجودہ پاکستان میں جاری بغاوتوں کو سمجھنے کیلئے ناصرف جدید ریاست کی توسیع کے خلاف اسلام کے نام پر طویل قبائلی مزاحمت کی تاریخ سے آگاہی ضروری ہے بلکہ اس حقیقت کو جاننا بھی اہم ہے کہ اول نوآبادیاتی دور کے جہاد میں قبائلی تحرک اور اسلامی اغراض کے عناصر شامل تھے؛ دوم انتظامی گرفت سے آزاد قبائلی علاقے، جنہیں یاغستان کہہ کر پکارا جاتا تھا (جس کا مطلب ہے باغیوں کی سرزمین)، مسلح کارروائیوں کیلئے ایک مثالی میدان جنگ کی حیثیت کے حامل ہیں؛ سوم قبائلی علاقوں کے ملا دیوبند کے ساتھ رشتوں کے ساتھ منسلک رہے ہیں جو جنگ عظیم اول میں پان اسلامک موومنٹ کے حامی و مددگار رہے ہیں(۵)۔ تسلسل سے یہ عناصر قبائلی علاقوں میں افغان جنگ، جو مقامی آبادی کی تحریکوں اور غیر ملکی عسکریت پسندوں کی موجودگی سے عبارت ہے، سے پیدا ہونے والی لاتعلقی کے ساتھ بقائے باہمی کے تعلق کے حامل ہیں۔

قبائلی علاقوں میں القاعدہ سے منسلک غیر ملکی عسکریت پسندوں کے خلاف کارروائی کیلئے پاکستانی افواج کی تعیناتی سے پیدا ہونے والی کسی پیشگی ادراک سے عاری پیچیدگی کے بارے میں اس کتاب میں آگے چل کر بات کی جائے گی۔ یہاں پر یہ کہنا کافی ہے کہ پاکستان کے اندر پیدا ہونے والی عسکریت پسندی جس کا رخ افغانستان کی بجائے خود پاکستان کی جانب ہے، کی جزوی طور پر وضاحت ملک میں

ہونے والی سیاسی اور سماجی تبدیلیوں سے اس علاقے کی مکمل طور پر علیحدگی کے تناظر میں کی جاسکتی ہے۔ چھٹے پانچ سالہ منصوبے میں فاٹا کو پاکستان کا سب سے زیادہ ترقی سے محروم علاقہ قرار دیا گیا تھا جہاں پر بالغوں کی شرح خواندگی محض پندرہ فیصد ہے۔اس چیز نے یہاں انتہا درجے کی سماجی رجعت پسندی کو جنم دیا اور ریاست کی توسیع کے خلاف ملاؤں کی زیر قیادت بغاوتوں کی تاریخ کی تشکیل کی ہے۔2005 کے بعد سے تعلیمی اخراجات میں ڈرامائی اضافے کے باوجود عسکریت پسندی اور اس کے خلاف ریاستی اقدامات اور ان کے نتیجے میں آبادی کی نقل مکانی کے حوالے سے 10-2009 میں فاٹا کے بارے میں Annual Census Report میں انکشاف کیا گیا ہے کہ اس عرصے کے دوران حکومت کے پرائمری سکولوں میں سکولوں سے اخراج کی شرح لڑکوں میں 63 فیصد اور لڑکیوں میں 77 فیصد رہی ہے(۶)۔

پاکستان کا جیو پولیٹیکل محل و وقوع معاشی مواقع فراہم کرنے کے ساتھ ساتھ سٹریٹجک خطرات کا بھی حامل ہے۔ پاکستان تجارت اور توانائی کی ترسیل کا گڑھ ہوسکتا تھا اگر علاقے کے دیگر ممالک کے ساتھ اس کے تعلقات میں بہتری آجاتی کیونکہ پاکستان علاقے کے دیگر ملکوں ایران، افغانستان اور بھارت کے درمیان رابطے کے پل کا کام کرسکتا ہے۔نئی دہلی نے امریکی دباؤ پر خود کو پاک ایران گیس پائپ لائن کے منصوبے سے علیحدہ کرلیا ہے۔امریکی پریشانی کو جون 2010 میں منظور ہونے والے Comprehensive Iran Sanctions Accountability and Disinvestment Act کے ذریعے ادارہ جاتی حیثیت دی جاچکی ہے(۷)۔

دسمبر 2010 میں اشک آباد میں ترکمانستان۔افغانستان۔پاکستان۔بھارت (TAPI) نیچرل گیس پائپ لائن پراجیکٹ کے تناظر میں کیا گیا تھا۔اس منصوبے کے تحت تکمیل کے بعد بحیرہ کیسپین کے علاقے سے ان ملکوں کو سالانہ تیس ارب کیوبک فٹ گیس فراہم کی جانا تھی۔اس منصوبے کے تحت بچھائی جانے والی گیس پائپ لائن کو مشرقی افغانستان کے حساس اور جنگ زدہ علاقے میں سے گذارا جانا تھا جس کی راہ میں ہلمند اور بلوچستان کے علاقے آتے۔اس منصوبے کے تحت افغانستان کو ناصرف

ٹرانزٹ روٹ فیس کے طور پر سالانہ ایک کروڑ ساٹھ لاکھ ڈالر ملنا تھے، جو اس کے سالانہ قومی ریونیو کے نصف کے قریب بنتے ہیں، اور ملازمت کے بھی بے تحاشہ مواقع پیدا ہونا تھے بلکہ پاکستان اور بھارت کو صاف گیس بھی فراہم ہونا تھی (۸)۔امریکہ کے دفتر خارجہ نے TAPI کے روٹ کو استحکام کا حامل کاریڈور قرار دیا تھا جو علاقے کے ہمسائیہ ملکوں کو معاشی ترقی اور خوشحالی کے بندھن میں باندھ سکتا ہے(۹)۔اس بات سے پاکستان کے ایک نمایاں دفاعی تجزیہ نگار نے بھی اتفاق کیا ہے جو TAPI کو جنوبی ایشیا میں سیکورٹی کے معاملات کی ازسرنو صورت گری کرنے کے امکانات کا حامل ہے اور جیو پولیٹکل دشمنیوں کو باہمی طور پر فائدہ بخش جیو اکنامکس میں تبدیل کرنے کی صلاحیت کا حامل ہے(۱۰)۔

ثقافتی اور قدرتی وسائل:

پاکستان کا محل و وقوع اسے سالانہ مون سون کی غیر یقینی خودسری کے رحم و کرم کا شکار بھی بناتا ہے۔اس کی معیشت مون سون کی بارشیں کم ہونے کے باعث بھی متاثر ہوتی ہے یا 2010 کی سیلابی تباہ کاریوں کی طرح غیر متوقع طوفانی بارشوں کی صورت میں بھی اسے بھاری قیمت ادا کرنا پڑتی ہے۔اس سے قبل 1993 میں آنے والے بڑے سیلابوں نے ملک کے مالیاتی ذخائر کو تقریباً تباہ کر کے رکھ دیا تھا۔2010 میں آنے والے تباہ کن سیلابوں نے ملک کی پہلے سے نازک صورت حال سے دوچار معیشت کی کمر توڑ کر رکھ دی تھی۔جنوبی پنجاب اور سندھ کی دیہی آبادی عظیم دریائے سندھ کے پانیوں میں غرقاب ہونے کے خطرے سے دوچار رہتی ہے جبکہ خیبر پختونخوا اور قبائلی علاقوں کے رہنے والے اکثر دریائے کابل اور اس کے معاون دریاؤں میں آنے والے سیلابوں کا شکار بننے کے خطرے کا سامنا کرتے ہیں۔جنگلات کی کٹائی نے ان خطرات کو دوچند کردیا ہے۔

ماحولیاتی تبدیلی خشک سالی کا بھی سبب بن سکتی ہے۔بلاشبہ ملک کی ساحلی پٹی اور میدانی علاقوں میں سالانہ بارشوں کا تناسب پہلے ہی دس سے پندرہ فیصد کے درمیان

کم ہو چکا ہے۔پانی کی مینجمنٹ کے مسائل اور پانی پر پنجاب اور سندھ جیسے صوبوں اور بھارت اور پاکستان کے درمیان پانی کے معاملے پر تنازعات بہت زیادہ اہمیت کے حامل ہو چکے ہیں۔کچھ اندازوں کے مطابق پانی کی قلت اور نکاسی آب کی وجہ سے پیدا ہونے والی بیماریاں پہلے ہی انسانی جانوں کی قیمت کے علاوہ سالانہ سو ارب ڈالر کی معاشی قیمت ادا کرنے کا باعث بن چکی ہیں(۱۱)۔پانی سے پیدا ہونے والی بیماریوں کے نتیجے میں ہر روز 600 کے لگ بھگ بچے لقمہ اجل بن جاتے ہیں۔

کچھ ماہرین کے خیال میں بڑھتی ہوئی آبادی کے ساتھ ساتھ پانی کا بے دردی سے استعمال اور بدانتظامی کا مطلب یہ ہے کہ 2025 تک پاکستان خشک سالی کا شکار ہوسکتا ہے جبکہ اسے پانی کی سالانہ 100 ارب کیوبک فٹ کی کمی کا سامنا بھی ہے(۱۲)۔اس قسم کا منظر نامہ ناقابل تصور انسانی اور سیاسی قیمت ادا کرنے کا باعث بن سکتا ہے۔2010 میں شائع ہونے والی میپل کرافٹ انوائرمینٹل رسک رپورٹ کے مطابق پاکستان کو ماحولیاتی تبدیلیوں کی وجہ سے خطرات کے شکار 170 ممالک میں سے پاکستان کا نمبر 16 واں ہے۔یہ شدید خطرات سے دوچار کیٹگری میں شامل ہے جس میں بھارت اور بنگلہ دیش اس سے آگے ہیں جبکہ فہرست میں علاقے کے دیگر ملکوں میں نیپال اور افغانستان بھی شامل ہیں(۱۳)۔سال2010 میں پاکستان میں ریکارڈ درجہ حرارت 53.5 درجہ سنٹی گریڈ نوٹ کیا گیا تھا۔کچھ اندازوں کے مطابق یہاں درجہ حرارت میں اضافے کی سالانہ شرح 0.6 اور ایک درجہ سنٹی گریڈ کے درمیان ہے۔

پاکستان کی جغرافیائی پوزیشن جیسا کہ ہم نے نوٹ کیا ہے اسے علاقائی تجارت کے مرکز اور وسط ایشیا کے سپلائی روٹ اور بجلی کے سلسلے میں بھارت تک روٹ کا درجہ دیتی ہے۔ملک قدرتی وسائل سے بھی مالا مال ہے۔صوبہ سندھ دنیا کے کوئلے کے چند بڑے ذخائر میں سے ایک سے سرفراز ہے۔بلوچستان تانبے کے بہت بڑے ذخائر کا حامل ہے۔ان قدرتی وسائل کے علاوہ ملک نے بڑے زرعی وسائل کو بھی ترقی دی ہے اور اس حوالے سے پاکستان کاٹن کی پیداوار کے اعتبار سے دنیا میں چوتھے اور ڈیری پروڈکشن کے اعتبار سے پانچویں نمبر پر ہے جو بڑے پیمانے پر مشرق وسطیٰ میں برآمد

کردی جاتی ہے۔پاکستان نے بلوچستان کے مقام سوئی سے قدرتی گیس کے ذخائر بھی دریافت کیے ہیں۔تاہم پاکستان کے توانائی کے ذخائر اس مقدار میں نہیں ہیں کہ اس کی اپنی ضروریات کو پورا کرسکیں جبکہ اس وقت تک بھی ملک میں چالیس فیصد گھرانے ایسے ہیں جنہیں بجلی تک رسائی حاصل نہیں ہے۔2009-10 کے اقتصادی سروے میں بتایا گیا ہے کہ توانائی کی کمی کی وجہ سے ملک کو سالانہ دو فیصد جی ڈی پی خسارے کا سامنا کرنا پڑتا ہے(۱۴)۔ملک میں بہت سے کارخانے ایسے ہیں جو اپنی آمدن کو بجلی کی ناقابل اعتماد فراہمی سے بچانے کیلئے خود اپنے جنریٹر استعمال کررہے ہیں۔اکتوبر2010 میں ایک نجی کنسلٹنٹ کی رپورٹ کے مطابق پاکستان کو اگلے دس برسوں میں بجلی کے بحران پر قابو پانے کیلئے اپنی بجلی کی پیداواری صلاحیت میں 20 ہزار میگاواٹ کا اضافہ کرنا پڑے گا جس پر 32 ارب ڈالر لاگت آئے گی۔یہ ایک بہت بڑا چیلنج ہے۔اگر اس ہدف کو زیادہ تر مقامی وسائل سے پورا کرنے کی کوشش کی جائے تو اس میں کئی سیاسی پیچیدگیاں حائل ہوجائیں گی جو ماضی میں مزید ڈیموں کی تعمیر اور ہائیڈروتوانائی کی فراہمی کے سلسلے میں اتفاق رائے حاصل کرنے میں ناکامی کا باعث رہی ہیں۔بلوچستان جس کی آبادی ملک کی مجموعی آبادی کا محض سات فیصد ہے قدرتی گیس کی فراہمی کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔علاوہ ازیں یہ کوئلے اور تانبے کے ذخائر سے بھی مالا مال ہے لیکن کچھ بلوچ قوم پرست ریاست کی جانب سے اپنے صوبے کے نوآبادیاتی طرز پر استحصال کی بات کرتے ہیں۔جیسا کہ پچھلی نسل کے بنگالی قوم پرست دعویٰ کرتے تھے کہ بنگال کی خام پٹ سن کی آمدنی کو مقامی آبادی کی فلاح و بہبود پر خرچ کرنے کی بجائے قومی مفادات کی بھینٹ چڑھایا جارہا ہے۔

آبادی:

دنیا کے کسی اور خطے میں ریاست کے سائز کے اعتبار سے جس کی آبادی اٹھارہ کروڑ سے زیادہ ہے(۱۶)،فوج کی نفری کم و بیش پانچ لاکھ نفوس پر مشتمل ہے اور جی ڈی پی کا حجم 160 ارب ڈالر سے زیادہ ہے،پاکستان ایک بڑی طاقت ہوتا۔دوسری

جانب بھارت اپنی ایک ارب سے زیادہ آبادی جس میں سے دس لاکھ افراد مسلح افواج کا حصہ ہیں اور جس کا جی ڈی پی پاکستان کی نسبت آٹھ گنا زیادہ ہے اسے کمزور کرنے کی کوششوں میں ہے اور اس عمل میں اس نے عدم تحفظ کے احساس کو دائمی بنادیا ہے جس سے پاکستان کی پوری تاریخ عبارت ہے۔گوکہ پاکستان بھارت کے رقبے، فوج کے حجم اور معاشی طاقت میں کسی طرح بھی اس کا مقابلہ نہیں کرسکتا تاہم اس کی آبادی اور معیشت نے 1947 کے بعد سے بہت تیز رفتاری سے ترقی کی ہے۔1951 میں ہونے والی مردم شماری کے مطابق موجودہ بنگلہ دیش کو شامل کرکے پاکستان کی مجموعی آبادی سات کروڑ 30 لاکھ تھی۔آج کے اپنے ایک بازو سے محروم پاکستان ساڑھے اٹھارہ کروڑ آبادی کے ساتھ آبادی کے لحاظ سے دنیا کا چھٹا بڑا ملک ہے۔یہاں آبادی میں اضافے کی سالانہ شرح 2.2 فیصد ہے جبکہ اس کے مقابلے میں اس کے ہمسایہ ممالک بھارت اور چین کی آبادی میں اضافے کی سالانہ شرح علی الترتیب 1.4 اور 0.6 فیصد ہے۔پاکستان کی آبادی کا نصف 15 سال سے کم عمر افراد پر مشتمل ہے۔کچھ اندازوں کے مطابق ملک میں 25 سال سے کم عمر افراد کی آبادی دس کروڑ نفوس سے بھی زیادہ ہے جو دنیا بھر میں نوجوانوں کی سب سے بڑی آبادی ہے۔یہ توانا اعداد و شمار ریاست کی قوت مدافعت کی ایک بڑی وجہ ہیں۔تاہم نوجوانوں کی بے روزگاری یا نیم بے روزگاری کو بھی نسلی و اسلامی عسکریت پسندی اور ملک میں جاری تشدد کی بلند ترین لہر کے ساتھ منسلک کیا جاتا ہے(۱۷)۔نوجوانوں کی آبادی کے بہت زیادہ حجم کو ڈیموگرافک منافع سے تعبیر کیا جاسکتا ہے جو ملک کی معاشی ترقی میں اضافے کا باعث ہے یا بصورت دیگر یہ ایک ٹائم بم بھی ثابت ہوسکتا ہے، اگر ریاست انہیں تعلیم کی دولت سے سرفراز کرنے اور ان کی صلاحیتوں کو استعمال کرنے میں ناکام رہے(۱۸)۔

آبادی میں تیز رفتاری سے اضافہ پاکستان کی اپنے شہریوں کو تعلیم فراہم کرنے میں بری کارکردگی میں حصہ دار ہے۔گوکہ ناکامیوں کا یہ سلسلہ بنیادی لحاظ سے تاریخی طور پر ٹیکس وصولی کی کم ترین سطح اور تعلیم و صحت کے شعبوں پر دفاعی اخراجات کو ترجیح دینے کا شاخسانہ ہے(۱۹)۔ملک میں شرح خواندگی آبادی کے 55 فیصد کے لگ

بھگ ہے گوکہ اس کے اندر بھی جنسی بنیادوں پر بہت زیادہ عدم توازن پایا جاتا ہے۔ہر تین میں سے محض ایک عورت خواندہ ہے جبکہ ہر پانچ میں سے ایک سے قدرے زیادہ کی شرح سے خواتین لیبر فورس میں شامل ہیں(۲۰)۔سال 2007-8 میں ملک کی کل افرادی قوت 51.78 ملین میں سے عورتوں کی تعداد 10.96 ملین تھی(۲۱)۔پاکستان سال 2007-8 میں صنفی بنیادوں پر ترقی کے انڈیکس کے اعتبار سے دنیا کے 138 ممالک میں سے 125 ویں نمبر پر تھا اور عورتوں کی Empowerment کیلئے اٹھائے جانے والے اقدامات کے لحاظ سے دنیا کے 93 ممالک میں سے 82 ویں نمبر پر تھا(۲۲)۔اگلے ہی برس ملاکنڈ ڈویژن اور خیبر پختونخوا کے چند دیگر علاقوں میں سلامتی کی صورتحال بگڑنے کی وجہ سے لڑکیوں کو تعلیم سے دور رہنا پڑا تھا۔ایک اخباری رپورٹ کے مطابق اس عرصے کے دوران سوات کی تقریباً 80 ہزار طالبات کا تعلیمی سلسلہ منقطع ہوگیا تھا(۲۳)۔پاکستان کے خیبر پختونخوا اور فاٹا جیسے زیادہ پسماندہ علاقوں میں عورتوں کی ناخواندگی کی بدنامی کی حد تک کم شرح (اول الذکر کیلئے عورتوں کی شرح خواندگی محض 18 اور موخر الذکر کیلئے تین فیصد) نے خاندانی منصوبہ بندی کے بارے میں نیم دلی سے شروع کیے جانے والے خاندانی منصوبہ بندی کے پروگرام کی ناکامی کو اظہر من الشمس کردیا ہے۔ایک رپورٹ میں انکشاف کیا گیا ہے کہ دیہی علاقوں سے تعلق رکھنے والی عورتوں کی صرف اٹھارہ فیصد تعداد جاندانی منصوبہ بندی کے جدید طریقے استعمال کرتی ہے(۲۴)۔ہر سال دو لاکھ کے قریب عورتوں کو غیر محفوظ اسقاط حمل کی وجہ سے ہسپتال داخل کروانا پڑتا ہے جس پر کم از کم دو کروڑ 20 لاکھ ڈالر کے اخراجات آتے ہیں(۲۵)۔عورتوں کی تعلیم میں ڈرامائی پیش رفت ناگزیر ہے جو نا صرف صنفی مساوات کے مسئلے کو حل کرنے کیلئے لازمی ہے بلکہ اس کی وجہ سے آبادی میں اضافے کے دیرینہ مسئلے کی رفتار کو آہستہ کرنے میں بھی مدد ملے گی۔بنگلہ دیش کا شرح پیدائش میں اضافے کو کم کرنے کے سلسلے میں پاکستان کی نسبت ریکارڈ بہت بہتر ہے۔اس کا براہ راست سہرا نا صرف خاندانی منصوبہ بندی کے سلسلے میں موثر پالیسی کا نفاذ کے سر بندھتا ہے جس کی تشکیل میں این جی اوز کا بہت موثر کردار ہے (پاکستان میں این جی اوز 13 فیصد

خاندانی منصوبہ بندی کی خدمات فراہم کرتی ہیں) بلکہ اس کی ذمہ دار عورتوں کو تعلیم کی دولت اور معاشی خود مختاری سے سرفراز کرنے کیلئے اپنائی جانے والی پالیسیاں بھی ہیں۔ کچھ اندازوں کے مطابق پاکستان میں مانع حمل خدمات کی طلب اور رسد میں 25 فیصد کا فرق موجود ہے۔ اس کے نتائج فرٹیلیٹی میں کمی کی آہستہ رفتار اور ان ششدر کردینے والے اعداد و شمار سے ظاہر ہے جن کے مطابق ہر سات میں سے ایک پریگنیسی کا انجام اسقاط حمل کی صورت میں نکلتا ہے(۲۶)۔

موجودہ شرح 2.0 فیصد سالانہ کی رفتار سے آبادی میں اضافہ مستقبل میں بحرانی تناسب میں تبدیل ہوسکتا ہے۔ آبادی کی شماریات کے چند ماہرین کا اندازہ ہے کہ اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ اکیسویں صدی کے وسط تک پاکستان کی مجموعی آبادی بڑھ کر ساڑھے 33 کروڑ ہوجائے گی۔ یوں پاکستان دنیا کا چوتھا سب سے زیادہ آباد ملک بن جائے گا(۲۷)۔ فوری طور پر آبادی میں اضافے کی بلند شرح دولت کی تقسیم کے بارے میں معاشی پالیسیوں کی عدم موجودگی کے باعث شدید غربت میں اضافے کا باعث بن رہی ہے۔ صورتحال یہ ہے کہ ہر پانچ میں سے ایک پاکستانی غربت کی لکیر سے نیچے زندگی گذار رہا ہے۔ پاکستان کی آبادی کا 60 فیصد حصہ دو ڈالر سے بھی کم روزانہ آمدنی پر گذارا کرنے پر مجبور ہے(۲۸)۔

غربت کا یہ منظر نامہ بھی پورے ملک میں یکساں نہیں ہے بلکہ اس معاملے میں بھی مختلف علاقوں کی حالت مختلف ہے۔ ملک میں غربت کی سب سے شدید حالتیں قبائلی علاقوں، اندرون سندھ اور بلوچستان میں پائی جاتی ہیں۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ وہ علاقے جو نوآبادیاتی دور میں خوشحال اور قدرے ترقی یافتہ ہوا کرتے تھے ان کی حالت آج بھی ملک کے باقی حصوں کی نسبت کہیں بہتر ہے۔ متحدہ ہندوستان کی سابق نیم خود مختار ریاستوں کا معاملہ بھی کچھ اس سے ملتا جلتا ہے۔ تقسیم کے بعد ریاست سے الحاق کرنے والی کئی ریاستیں غربت اور افلاس کے گڑھ (Pockets) ہیں جبکہ کئی ایسی ریاستیں بھی ہیں جو نوآبادیاتی دور میں بھی خوشحال اور ترقی یافتہ تھیں اور آج بھی وہ نسبتاً ترقی یافتہ اور برطانوی ہندوستان کے اضلاع سے کسی طرح کم نہیں ہیں (بھارتی تناظر

میں اس کی ایک مثال ریاست میسور کی ہے)۔ برطانوی ہندوستان کی دو ریاستیں خیر پور اور بہاولپور جنہوں نے پاکستان کے ساتھ الحاق کیا، کو بھی مثال کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہے۔ یہ دونوں ریاستیں انگریزی عہد میں خوشحال اور ترقی یافتہ ریاستوں میں شمار کی جاتی تھیں کیونکہ یہ دونوں اپنے ہمسائیہ برطانوی ہندوستان کے صوبوں کے ساتھ مل کر آبپاشی اور مواصلات کے نظاموں کو شیئر کرتی تھیں۔ ان کے برعکس شمال میں واقع ریاستیں امب، چترال اور دیر ان ریاستوں کی مثالیں پیش کرتی ہیں جو شمالی مغربی سرحدی صوبے کے برطانوی اضلاع سے ترقی کی دوڑ میں بہت پیچھے تھیں۔ ریاست سوات کی شرح خواندگی 1951 میں صرف 1.75 فیصد تھی (۲۹)۔ ریاست دیر کے نواب نے اپنی ریاست میں تعلیم پر پابندی عائد کررکھی تھی کیونکہ اس کی دانست میں یہ اس کی حاکمیت کو کمزور کرنے کا باعث بن سکتی تھی جس کی رو سے وہ اپنے علاقے کی تمام اراضی کا یک وتنہا مالک تھا(۳۰)۔ تاہم بلوچستان کی ریاستیں اپنے کمزور ترین مواصلاتی نظام اور خانہ بدوشانہ طرز زندگی کے باعث یقینی طور پر ان تمام ریاستوں سے زیادہ پسماندہ تھیں جنہوں نے پاکستان کے ساتھ الحاق کیا(۳۱)۔ خاران اور لسبیلہ کی ریاستوں میں 1949 تک صرف ایک ایک مڈل سکول تھا (۳۲)۔ وہ بھی صرف لڑکوں کی تعلیم کیلئے تھا۔ خود مختار پرنسلی سٹیٹس اور برطانوی علاقوں کے درمیان موجود سماجی اور معاشی حوالوں سے شدید عدم توازن نے ان ریاستوں کی اہم سٹریٹیجک لوکیشن کے ساتھ مل کر ان ریاستوں کیلئے ملک کی تقسیم کے بعد نئے ملک پاکستان میں یکجان ہونے کے سلسلے میں شدید پیچیدگیاں پیدا کردیں۔ بلوچستان میں ریاست قلات کے استثنیٰ کے ساتھ انتہائی کم درجے کے سیاسی شعور اور سماجی ترقی کے تمام منفی اشاریوں کے ساتھ مل کر صورتحال کو بہت مایوس کن بنادیا تھا۔

پاکستان کے خوشحال ترین علاقوں مثلاً پنجاب کے دیہی علاقوں کی صورتحال بھی چنداں خوش کن نہیں تھی۔ یہاں بھی دیہی اور شہری علاقوں کے درمیان سماجی ترقی کی ایک وسیع خلیج حائل تھی۔ پاکستان کے دیہی علاقوں میں زندگی کی بنیادی سہولیات کی شدید کمی اور روزگار کے مواقع کی قلت نے ملک کے معاشی پروفائل میں ایک نئے

معاشی عامل کا اضافہ کردیا۔ یہ تھا ایک نیا سماجی و سیاسی بحران یعنی بہت بڑے پیمانے پر نقل مکانی۔ دیہات سے شہروں کی طرف نقل مکانی کا سب سے بڑا ہدف کراچی جبکہ اس سے قدرے کم لاہور تھا کیونکہ یہ دونوں شہر میگا سٹی بننے کی جانب گامزن ہو چکے تھے۔ اس نقل مکانی کا سلسلہ ہنوز جاری ہے اور مستقبل میں اس رجحان میں مزید اضافہ دیکھنے میں آئے گا جس کی وجہ سے ان شہروں کے حجم میں اضافے کے ساتھ دیگر شہری مراکز کے پھیلاؤ میں بھی اضافہ ہوگا۔ اس حد تک کہ محتاط اندازوں کے مطابق ۲۰۳۰ تک ملک کی آدھی آبادی شہروں میں رہ رہی ہوگی۔ اس کے باوجود پاکستان کی دیہی آبادی میں بھی مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔

ملک کی زراعت ابھی تک کل قومی پیداوار کے محض ۲۰ فیصد حصے اور ملک کی افرادی قوت کے چالیس فیصد حصے کو روزگار فراہم کرنے کی ذمہ دار ہے۔ ملک میں گندم اور چاول کی بھاری مقدار میں پیداوار صرف اس وجہ سے ممکن ہے کہ یہاں پر دنیا کا سب سے بڑا نہری نظام موجود ہے جو ۱۶ ملین ہیکٹر اراضی کو آبپاشی کی سہولت فراہم کرتا ہے۔

ہجرت

پاکستان ترقی کی راہ پر گامزن سوسائٹی ہے۔ اس کی پیدائش برصغیر کے دو مسلم اکثریتی صوبوں بنگال اور پنجاب کی تقسیم کے نتیجے میں ممکن ہوئی۔ تقسیم کے ساتھ ہی پھوٹ پڑنے والے فسادات کے نتیجے میں بیسویں صدی کی سب سے بڑی انسانی نقل مکانی وجود میں آئی (۳۳)۔ اس عظیم انتشار کا سب سے بڑا مظہر پنجاب کے دونوں اطراف ۹۰ لاکھ افراد کی وہ نقل مکانی تھی جو اگست سے دسمبر ۱۹۴۷ کی مختصر ترین درمیانی مدت کے درمیان وقوع پذیر ہوئی۔ دوسری جانب ہندوستان سے آنے والے مسلمانوں کی سندھ میں آبادکاری ۱۹۵۰ کے عشرے تک جاری رہی۔ ۱۹۵۱ تک کراچی میں آباد ہونے والے یو پی کے اردو سپیکنگ مہاجر مسلمانوں کی تعداد شہر کی کل آبادی کے نصف تک پہنچ چکی تھی۔ جیسا کہ ہم آگے چل کر تفصیل سے جائزہ لیں گے کہ سندھ کے

ریگزاروں میں یو پی۔ اردو سپیکنگ جزیرے کی تخلیق نے مستقبل کے سیاسی منظرنامے پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اپنے یو پی کے اردو سپیکنگ بھائیوں کے برعکس مشرقی پنجاب سے ہجرت کر کے آنے والے مسلمانوں کے فوری اور بلا دقت ثقافتی اور لسانی انجذاب نے اس حقیقت کو بھلا دیا کہ سب سے بڑی ہجرت کہیں اور نہیں مغربی پنجاب میں ہوئی تھی جہاں فسادات کے دوران پچاس لاکھ افراد نے پاکستان میں آ کر پناہ لی۔

مشرقی پنجاب سے ہجرت کر کے آنے والے لوگ مغربی پنجاب کے نہری علاقوں کے شہروں، قصبوں اور دیہات کی ان زرعی زمینوں پر آباد ہو گئے جو سکھ کاشتکار اپنے پیچھے چھوڑ کر گئے تھے۔ یہاں فوری طور ان کی تعداد کل آبادی کے پچاس فیصد تک پہنچ گئی۔ پنجابی آبادکاروں نے یہاں مسلم لیگ کے مرکزی دھارے کے علاوہ انتہا پسند فرقہ وارانہ اسلامی دھڑوں کے حلقہ ہائے نیابت قائم کر لیے۔ یہ لوگ کشمیر کاز کے بھی پرجوش علمبردار تھے۔ اس بات نے نا صرف ۱۹۴۷ میں بہت بڑی تعداد کشمیری مہاجرین کی پنجاب کے ان علاقوں میں آبادکاری کی راہ ہموار کی مشرقی پنجاب میں سکھوں کے ہاتھوں لگنے والے گہرے زخموں نے انہیں مستقل طور پر اینٹی انڈیا موقف کا جوشیلا حامی بنا دیا۔ پاکستان کی سیاست میں پنجابی مہاجرین کے عنصر کو ہمیشہ نظر انداز کیا گیا ہے جبکہ درحقیقت اس عنصر نے ان طویل مدتی عوامل کی تشکیل میں کلیدی کردار ادا کیا ہے جو عصری سیکورٹی تجزیوں میں بہت کم جگہ پا سکے ہیں۔

آزادی کے بعد سے داخلی نقل مکانی نے پاکستان کے منظرنامے میں ایک اہم فیچر کا اضافہ کیا ہے اور سیاسی صورت گری کی تشکیل میں مدد دی ہے۔ یہ تو طے ہے کہ دیہاتوں سے شہروں کی جانب نقل مکانی بہت بڑے پیمانے پر ہوتی رہی ہے لیکن اس کے ساتھ ہی دیہاتوں سے بڑے قصبوں میں بھی نقل مکانی کا سلسلہ جاری رہا ہے جسے نقل مکانی کے عمل میں ایک ستون کی حیثیت دی جا سکتی ہے۔ جبکہ ملک کی مجموعی آبادی میں ۱۹۴۷ سے ۱۹۸۱ کے درمیانی عرصے میں ۲۵۰ فیصد تک اضافہ ہوا ہے، اس مدت کے دوران شہری آبادی میں اضافے کی شرح ۴۰۰ فیصد تک جا پہنچی ہے۔ کراچی کی آبادی

جو ۱۹۴۷ میں پانچ لاکھ ہوا کرتی تھی بڑھتے بڑھتے ۲۰۰۷ میں ایک کروڑ تیس لاکھ نفوس کو چھو چکی تھی۔اس وقت تک لاہور کی آبادی پچاس لاکھ جبکہ چھ دیگر شہروں کی آبادی دس لاکھ تک پہنچ چکی تھی (۳۴)۔اندازوں کے مطابق پاکستان کی شہری آبادی 2050 تک بڑھ کر سو ملین یعنی دس کروڑ کی حد کو چھو لے گی جس میں کراچی اور لاہور میگا سٹی کی حیثیت میں علی الترتیب ۱۹ ملین اور ۱۰ ملین نفوس پر مشتمل ہوں گے۔شہروں اور قصبوں میں نقل مکانی کرنے والی کمیونٹیوں کی بہت بڑے پیمانے پر موجودگی نے نئی اور جدید اربن کلاس تخلیق کرنے کی بجائے دیہی طرز زیست کے نیٹ ورکس کی توسیع کی صورت اختیار کر رکھی ہے۔خاص طور پر بڑے قصبے غیر متوقع طور پر شہری معاشرت کے مغربی تصور سے کہیں زیادہ دیہی ماحول کی نمائندگی کرتے ہیں۔افغانستان میں طالبان کے ظہور کے ساتھ ساتھ پاکستان بھر میں پختون آبادی کی نقل مکانی کو اسلام کے شدت پکڑتے ہوئے ''راسخ العقیدہ'' طرز فکر میں قبائلی روایات اور رجحانات کو متعارف کرانے والے فیکٹر کے طور پر دیکھا جاسکتا ہے (۳۵)۔

نوے کی دہائی میں کراچی کے سیاسی خلفشار کو (جس نے ۲۰۱۰ تک بغاوت کی نہایت خطرناک علامات ظاہر کرنا شروع کر دی تھیں۔) اس وقت تک سمجھنا ناممکن ہے جب تک اس حقیقت کا ادراک نہ کیا جائے کہ یہ شہر محض ہندوستان سے آئے ہوئے مہاجروں کا شہر نہیں رہا بلکہ دنیا میں پختون آبادی پر مشتمل تیسرا بڑا شہر ہے اور یہاں بلوچوں کی آبادی کوئٹہ شہر سے بھی زیادہ ہے۔وسائل پر قبضے کیلئے لسانی بنیادوں پر جدوجہد جس میں جرائم پیشہ مافیاز سرگرم کردار ادا کر رہے ہیں، شہر کی تشدد پر مبنی شہرت کو دوچند کرنے میں اپنا حصہ ڈال رہی ہے۔گو کراچی جس طرح آتش فشاں کا دہانہ بنا ہوا ہے اس کی کوئی نظیر نہیں ملتی تاہم یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ پاکستان کا کوئی بھی ایسا علاقہ نہیں جو مکمل طور پر ہم آہنگی اور یک رنگی کی تصویر پیش کرتا ہو باوجود اس امر کے کہ صوبائیت پر مبنی سیاست میں ہم آہنگی کا بہت ڈھنڈورا پیٹا جاتا ہے۔مثال کے طور پر کوئٹہ کی چالیس فیصد کے قریب آبادی پختون قومیت پر مشتمل ہے۔اسی طرح پنجاب کے شہروں مثلاً لاہور، گوجرانوالہ اور سیالکوٹ وغیرہ میں اچھی خاصی کشمیری آبادی موجود

ہے۔افغانستان میں روس کے قبضے کے نتیجے میں وہاں سے ۳۰ لاکھ افغانوں کا ریلا پاکستان میں امڈ آیا تھا۔فاٹا کے قبائلی علاقوں سے مقامی آبادی کی اندرون ملک بے دخلی پاک فوج کے آپریشنوں کی ایک نمایاں خصوصیت رہی ہے۔اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ کراچی میں ۲۰۱۰ سے جاری پرتشدد بغاوت کے پیچھے قبائلی علاقے سے آنے والے پختونوں کی تعداد میں نمایاں اضافہ بھی ایک فیکٹر کے طور پر موجود ہے۔روزگار کیلئے نقل مکانی کرنے والوں اور فوجی کارروائیوں سے متاثر ہونے والوں کے ساتھ ساتھ ۲۰۱۰ میں آنے والا تباہ کن سیلاب بھی داخلی نقل مکانی کے عمل میں ایک اہم عنصر کی حیثیت رکھتا ہے۔آخر میں یہ کہ بلوچستان میں حالیہ باغی کارروائیوں کے دوران ہونے والی پرتشدد کارروائیوں اور ٹارگٹ کلنگ کے نتیجے میں صوبے سے ایک لاکھ آباد پنجابی آبادکاروں کی نقل مکانی ایک ایسا معاملہ ہے جسے بہت کم رپورٹ کیا گیا ہے (۳۶)۔

پاکستان سے بیرون ملک نقل مکانی نے ملک کی معیشت اور بیرونی دنیا میں اس کے امیج پر بہت گہرے اثرات مرتب کیے ہیں۔نوآبادیاتی دور میں پاکستان کے مستقبل کے قلب پنجاب سے خاصی معقول تعداد میں نقل مکانی کا عمل ہوا تھا۔اس نقل مکانی میں صوبے کے غریب شمالی علاقے کے مسلمان راجپوتوں اور وسطی اضلاع سے سکھ جاٹوں نے حصہ لیا تھا۔انہوں نے اس نقل مکانی کے دوران پہلی مرتبہ اپنے آبائی وطن سے دور دراز کی زمینوں سے آشنائی حاصل کی تھی اور بین الاقوامی ہجرت کے کلچر کو تخلیق کیا تھا۔نقل مکانی کی ایک روایت آسام کے علاقے سلہٹ میں بھی رہی ہے جو آجکل کے بنگلہ دیش کا ایک ضلع ہے۔اس کے دوران آبادی کے غریب ترین طبقات نے ملاحوں کا کیریر اپنایا تھا جس نے انہیں بیرون ملک زندگی گذارنے کے مواقع فراہم کیے۔آزادی کے بعد بھی ہجرت یا نقل مکانی کے ابتدائی پیٹرن جاری رہے جس کے دوران پنجاب اور مشرقی بنگال سے بہت سے لوگوں نے بین الاقوامی نقل مکانی میں حصہ لیا۔اس کے بعد منگلا ڈیم کی تعمیر کے نتیجے میں آزاد کشمیر کے ضلع میر پور سے مقامی لوگوں کے انخلاء کے بعد خاصی بڑی تعداد میں آبادی کی بین الاقوامی نقل مکانی بھی دیکھنے میں آئی (۳۷)۔

ان بین الاقوامی نقل مکانیوں کے دوران شمالی امریکہ، یورپ اور برطانیہ مستقل تارکین وطن کے مراکز بن گئے تھے۔تاہم ۱۹۷۰اور ۱۹۸۰ کے عشروں میں بہت سے لوگوں نے مختصر مدتی کنٹریکٹس پر مشرق وسطیٰ کا بھی رخ کیا تھا۔اس کے نتیجے میں بلاشبہ پاکستان کی مڈل کلاس کے حجم اور اس کے سرمائے میں قابل ذکر اضافہ ہوا۔ان نقل مکانیوں کے نتیجے میں خاص طور پر مشرق وسطیٰ کے ممالک میں کام کرنے والے نودولتیا طبقے کی ریل پیل کے نتیجے میں سماجی سطح پر پیدا ہونے والی فرسٹریشن سے جو نفسیاتی ردعمل سامنے آیا اسے پاکستانی معاشرے میں ''دبئی چلو'' تھیم میں بہت اچھی طرح سمویا گیا تھا(۳۸)۔

سعودی عرب اور متحدہ عرب امارات میں کام کرنے والے پاکستانی ملک میں زرمبادلہ کے بہاؤ کا سب سے زیادہ حصہ بھیجتے ہیں۔مثال کے طور پر جولائی ۲۰۱۰ سے جولائی ۲۰۱۱ کے مالی سال کے دوران ملک میں ہونے والی ۳۔۵ ارب ڈالر کی وصولیوں کا نصف انہی دوخطوں میں آباد پاکستانیوں کی جانب سے آیا تھا(۳۹)۔تاہم مغرب میں مستقل طور پر آباد پاکستانی بھی اپنے آبائی وطن میں خاصی بڑی تعداد میں زرمبادلہ ہر سال بھیجتے ہیں۔بین الاقوامی نقل مکانی کے ثقافتی اثرات اس کے معاشی اثرات تلے دب کررہ گئے ہیں اور ان کا بہت کم تذکرہ کیا جاتا ہے۔ملک میں بڑھتی ہوئی مذہبی سخت گیری ۱۹۷۰ کے عشرے میں سعودی عرب اور خلیجی ملکوں کی طرف افرادی قوت کی نقل مکانی کے بعد ہی شروع ہوئی تھی۔پاکستانی طرز کے اسلام کی ''عربیت'' (Arabization) کے بارے میں تمام جائزے ایرانی انقلاب کے ردعمل کے طور پر سیاسی تناظر میں سعودی وہابیت کی ایکسپورٹ اور افغانستان پر روسی قبضے پر اپنی توجہ مرکوز کرتے ہیں(۴۰)۔ایسا کرتے ہوئے جائزہ نگار بہت بڑی تعداد میں ان تیل اور تعمیراتی کمپنیوں میں کام کرنے والے پاکستانی محنت کشوں کو نظر انداز کردیتے ہیں جو اپنے ملک لوٹتے ہوئے نا صرف خوشحالی سے مالا مال ہوتے ہیں بلکہ وہ یہاں مقبول ''فوک اسلام'' کے متضاد سخت گیر سعودی طرز کے اسلام کے ساتھ اپنی وابستگی کو بھی اپنے ساتھ لے کر آتے ہیں۔

برطانیہ تارکین وطن کی سب سے بڑی تعداد کا حامل ملک ہے جہاں ۲۰۰۱ میں ہونے والی

مردم شماری کے مطابق پاکستان یا بنگلہ دیش سے تعلق رکھنے والے تارکین وطن کی تعداد دس لاکھ سے تجاوز کر چکی ہے(۴۱)۔امریکہ میں ۱۹۶۵ سے اب تک جنوبی ایشیا سے ترک وطن کر کے آنے والے افراد کی بڑھتی ہوئی تعداد میں سے غالب حصہ بھارت سے آنے والوں کا ہے۔تاہم امریکہ میں پاکستانی پروفیشنل کلاس بھی ایک اہم حیثیت اختیار کر چکی ہے جو زیادہ تر انجینئرز، ماہرین تعلیم اور خاص طور پر میڈیکل کے پیشہ سے تعلق رکھنے والے پیشہ ور پاکستانیوں پر مشتمل ہے۔امریکہ میں پاکستانی تارکین وطن کی تعداد متنازعہ ہے۔امریکہ میں مردم شماری سے حاصل ہونے والے اعداد و شمار کے مطابق امریکہ میں مستقل مقیم پاکستانیوں کی تعداد تقریباً بیس لاکھ ہے تاہم اس میں تعلیمی اداروں میں زیر تعلیم افراد اور دوسری یا تیسری نسل سے تعلق رکھنے والے افراد شامل نہیں ہیں۔اگر انہیں بھی شمار کیا جائے تو یہ تعداد ۷۰ لاکھ سے بھی تجاوز کر جائے گی۔گو کہ بیرون ملک مقیم پاکستانی برادری قومی سیاست میں اس قدر اہم کردار ادا نہیں کر سکی جتنا کہ مثلاً تامل تارکین وطن نے ایل ٹی ٹی ای کی سپورٹ کے سلسلے میں سرگرم کردار ادا کیا تھا،اس کے باوجود پاکستان کی تمام سیاسی جماعتوں کی بیرون ملک شاخیں کام کر رہی ہیں۔بے نظیر بھٹو کی خود ساختہ جلاوطنی کے دوران لندن اور دبئی پیپلز پارٹی کے دو جڑواں مراکز کی حیثیت اختیار کر گئے تھے۔لندن بلوچ قوم پرستوں کی قیام گاہ کا کام بھی کر رہا ہے۔ایم کیو ایم کو اس کے قائد الطاف حسین لندن میں ہی بیٹھ کر چلا رہے ہیں جہاں اس کا باقاعدہ سیکرٹیریٹ موجود ہے۔سابق صدر پرویز مشرف نے اکتوبر ۲۰۱۰ میں لندن میں ہی اپنی پارٹی آل پاکستان مسلم لیگ کی بنیاد رکھی تھی۔لندن کے بعد برطانیہ میں ہی پاکستانی سیاست کی سرگرمیوں کا دوسرا بڑا مرکز برمنگھم ہے جہاں پاکستانیوں کی سب سے بڑی تعداد آباد ہے۔

بیرون ملک پاکستانی برادری اپنی ترسیلات زر کے ذریعے ملک کی معیشت کا ایک اہم ذریعہ ہونے کے علاوہ ملک کی بڑی سیاسی جماعتوں کی سپورٹ اور ملک میں فلاحی سرگرمیوں کا نہایت اہم ذریعہ بھی ہے جیسا کہ ۲۰۰۵ کے زلزلے اور ۲۰۱۰ کے سیلاب میں موصول ہونے والی امداد کا ایک بہت بڑا حصہ انہی غریب الوطن پاکستانیوں

کی جانب سے آیا تھا۔بیرون ملک آباد پاکستانیوں میں سے امریکہ میں مقیم پاکستانی برادری امیر ترین ہے جو ترسیلات زر کی صورت اپنے ملک سب سے بڑی رقومات بھیجتی ہے (۲۰۰۸/۲۰۰۷ تک ۳۔۷ارب ڈالر سالانہ)(۴۲)۔اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ ۱۹۸۰ کے عشرے اور اس کے بعد آنے والی دو دہائیوں کے دوران پاکستان کی تیز رفتار ترقی میں بیرون ملک پاکستانیوں کی جانب سے آنے والی رقومات کا بہت بڑا کردار تھا۔اس کی وجہ سے ہاؤسنگ اور ٹرانسپورٹ کی طلب میں بہت زیادہ اضافہ ہوا تھا۔ ۷ جولائی ۲۰۰۵ میں برطانیہ میں پیدا ہونے والے پاکستانی اوریجن کے حامل نوجوانوں جنہوں نے پاکستان میں انتہاپسند مساجد کا دورہ کیا تھا اور ان کے اسلامی انتہا پسندوں کے ساتھ خفیہ روابط تھے، کی جانب سے لندن میں بم دھماکوں کی کارروائی اور اس کے بعد مئی ۲۰۱۰ میں نیویارک کے ٹائمز سکوئر کو بم سے تباہ کرنے کی ناکام کوشش ایسے واقعات ہیں جو بیرون ملک پاکستانیوں کے اپنے وطن کے ساتھ تعلق کے سلسلے میں پریشان کن عنصر کی حیثیت رکھتے ہیں۔اس حوالے سے ہونے والی تحقیقات کے دوران یہ بات بھی سامنے آئی کہ سواتی طالبان کا ترجمان مسلم خان برطانیہ پلٹ تھا جو بوسٹن کے علاقے میں پینٹر اور ڈیکوریٹر کے طور پر کام کیا کرتا تھا۔

سماجی ڈھانچہ اور سماجی تنظیم

پاکستانی معاشرے کی ایک نمایاں خصوصیت دولت کی تقسیم نیز بنیادی اشیاء اور صحت، تعلیم اور نکاسی آب جیسی بنیادی خدمات تک رسائی کے سلسلے میں شدید عدم مساوات ہے۔زندگی کی بنیادی سہولیات کی فراہمی ایک ایسے ماحول میں مزید محدود ہوجاتی ہے جس میں آبادی کا صرف ایک فیصد حصہ براہ راست ٹیکسوں کی ادائیگی کرتا ہے۔۲۰۱۰ کے سیلاب میں پاکستان کی امداد کرنے والے مغربی ڈونرز نے اس بات پر زور دیا تھا کہ پاکستان اس مسئلے کو حل کرے اور اپنے وسائل میں اضافہ کرے۔سماجی بہبود کے پروگراموں کی فنڈنگ کا بہت بڑا حصہ بین الاقوامی امداد پر مشتمل ہے۔اس حقیقت کی سنگینی کو اس مثال سے واضح کیا جاسکتا ہے کہ یو ایس ایڈ خاندانی منصوبہ بندی

کے حوالے سے جاری پروگراموں کیلئے سالانہ ۴۵ ملین ڈالر فراہم کرتا ہے جبکہ حکومت پاکستان کی جانب سے اس شعبے کو بہت کم وسائل فراہم کیے جاتے ہیں۔بڑے زمینداروں کا سیاسی اثر ورسوخ پاکستان میں زرعی ٹیکس کو متعارف کرانے اور ملک میں ٹیکسوں کی وصولی کی شرح کو جی ڈی پی کے ۹۔۰۰ فیصد تک بڑھانے کے سلسلے میں بہت بڑی رکاوٹ بنا ہوا ہے۔۱۹ کروڑ لوگوں کے اس ملک میں رجسٹرڈ ٹیکس دھندگان کی کل تعداد صرف ۲۔۷ ملین یعنی ۲۷ لاکھ ہے جبکہ زراعت جو پاکستان کی جی ڈی پی کے ایک تہائی کی ذمہ دار ہے ٹیکس ریونیو کی مد میں صرف ایک فیصد فراہم کرتی ہے۔اس کا نقصان صنعت کے شعبے کو اٹھانا پڑ رہا ہے جس کے ٹیکسوں کا حصہ جی ڈی پی میں اس کی کنٹری بیوشن سے تین گنا زیادہ ہے۔

دولت مندوں کو ٹیکسوں کے جال میں لانے میں ناکامی نے جمہوریت کو استحکام دینے کی کوششوں کو گزند پہنچائی ہے اور یہ بات اس مفروضے کو آگے بڑھانے اور مضبوط کرنے کے سلسلے میں بہت اہم ثابت ہورہی ہے کہ صرف اسلامائزیشن ہی سماجی انصاف کی فراہمی کا واحد ذریعہ ہے۔۱۹۸۰ کی دہائی میں ریاست کی سرپرستی میں ہونے والے اسلامائزیشن کے عمل میں عدل و انصاف کو فروغ دینے کی بجائے اسلام کے تعزیری پہلوؤں پر زور دیا گیا تھا۔۸۰ کی دہائی اور اس کے بعد اکیسویں صدی کے ابتدائی برسوں کے دوران ہونے والی تیز رفتاری معاشی ترقی کے ادوار کے دوران ''ٹرکل ڈاؤن ایفکیٹس'' دیکھنے میں آئے جس کے نتیجے میں شرح زندگی میں اضافہ اور آبادی کے کچھ طبقات کا غربت کی سطح سے بلند ہونے کا عمل دیکھنے میں آیا تھا۔اس کے باوجود سندھ اور بلوچستان میں شدید ترین غربت پر ان ادوار میں آنے والی خوشحالی اپنا سایہ ڈالنے میں ناکام رہی۔

پاکستان میں غربت کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لینا مشکل کام ہے نا صرف اس وجہ سے کہ یہاں سروے ڈیزائن ناقص ہے بلکہ اس وجہ سے بھی کہ سرکاری اعداد و شمار حد درجے گمراہ کن ہیں۔عالمی بنک نے ۲۰۰۴۔۰۵ میں شائع ہونے والی ایک رپورٹ میں اندازہ لگایا تھا کہ پاکستان کی ۲۸۔۳ فیصد آبادی خط غربت سے نیچے زندگی

گذار رہی ہے۔ یہ ایک عمومی جائزہ ہے جو صوبوں کے درمیان اور شہری و دیہی تقسیم کے درمیان موجود شدید معاشی تفریق کی آئینہ داری نہیں کرتا۔ سوشل پالیسی ڈویلپمنٹ سنٹر نے ۲۰۔۲۰۰۱ میں اس حوالے سے ایک جائزہ پیش کیا تھا جس کا اظہار درج ذیل ٹیبل میں کیا گیا ہے۔

جدول ا: صوبوں میں غربت کا جائزہ (فی صد)

صوبہ	مجموعی	دیہی	شہری		
			صوبائی دارالحکومت	بڑے شہر	چھوٹے شہر/قصبے
پنجاب	۲۶	۲۴	۱۸	۲۲	۴۳
سندھ	۳۱	۳۸	۱۰	۲۳	۴۰
خیبر پختونخوا	۲۹	۲۷	۲۸_۴۱		
بلوچستان	۴۸	۵۱	۱۴_۴۴		

ہم آئندہ صفحات میں دیکھیں گے کہ کیسے اور کس حد تک ناہموار ترقی نے قومی تعمیر کے عمل کو ابتر کرنے میں اپنا کردار ادا کیا ہے۔ یقینی طور پر پنجاب کی پاکستان میں غالب حیثیت کو تسلیم کرانے کا عمل نا صرف اس خطے کے فوج کے ساتھ گٹھ جوڑ کی وجہ سے شروع ہوا بلکہ اس کے پیچھے ایک اور اہم ترین وجہ یہ بھی تھی کہ یہ کراچی کے استثنٰی کے ساتھ ملک کے دیگر تمام حصوں سے زیادہ ترقی یافتہ رہا ہے۔ حال ہی میں عسکریت پسندی اور غربت کے درمیان تعلق کے تانے بانے کو تلاش کرنے پر توجہ مرکوز کی گئی ہے(۴۳)۔ اس سلسلے میں اس جانب توجہ مبذول کی گئی ہے کہ فاٹا جس کی ۶۰ فیصد سے زیادہ آبادی خط غربت سے نیچے زندگی بسر کر رہی ہے، کی شرح خواندگی محض ۱۷ فیصد اور اس میں خرچ ہونے والی فی کس سرکاری رقوم کی قومی اوسط کا ایک تہائی ہے، دہشت

گردی اور مذہبی انتہا پسندی کا سب سے بڑا مرکز ہے(۴۴)۔ عسکریت پسندوں کی بھرتی کا دوسرا بڑا مرکز جنوبی پنجاب ہے۔ گو کہ اس کے غریب ترین اضلاع مثلاً ڈیرہ غازی خان اور مظفر گڑھ وغیرہ صوبے کے خوشحال اضلاع سے ترقی اور خوشحالی کی دوڑ میں بہت پیچھے ہیں اس کے باجود یہاں غربت کی شدت اس قدر خوفناک نہیں ہے جتنی کہ مثلاً اندرون سندھ اور بلوچستان میں ہمیں دکھائی دیتی ہے۔ تاہم اس کے باوجود ان دونوں صوبوں کا کوئی ایک بھی علاقہ مذہبی عسکریت پسندی کا مرکز نہیں ہے۔ پنجاب کا انسانی ترقی کے لحاظ سے سب سے پسماندہ ضلع مظفر گڑھ ہے جو ۲۰۰۳ تک پاکستان کے ۹۱ اضلاع کی فہرست میں ۵۹ نمبر پر تھا(۴۵)۔ یہ بات درست ہے کہ غربت اور بے روزگاری عسکریت پسندی کے فروغ میں بنیادی کردار ادا کرسکتے ہیں تاہم اس عمل کو مذہبی، فرقہ ورانہ اور تاریخی عوامل کے پیچیدہ امتزاج کا تجزیہ کرنے سے ہی سمجھا جاسکتا ہے۔

شدید غربت اور عدم مساوات کے باوجود یہ تصور کرنا غلط ہے کہ پاکستان کوئی جامد معاشرہ ہے۔ گورننس کے سلسلے میں حکومتوں کی بہت بڑی ناکامیوں کے باجود گذشتہ دہائیوں میں ہونے والی معاشی ترقی پاکستان میں ایک توانا اور ترقی کرتی ہوئی مڈل کلاس کے ظہور کا باعث بنی ہے۔ اندازوں کے مطابق ملک میں اس وقت ایسے افراد کی تعداد ۳۵ ملین تک جا پہنچی ہے جن کی فی کس آمدنی ۹۰۰،۱ ڈالر تک ہے(۴۶)۔ پاکستان میں معاشرے کا کوئی درمیانی جسد واحد موجود نہیں ہے بلکہ یہ معاشرہ پیشوں، آمدنی، ذات برادریوں، زبان اور جنس کے خانوں میں بٹا ہوا ہے۔ پاکستان کی مڈل کلاس میں ''جدیدیت پسند'' اور ''روایت پسند'' دونوں قسم کے رجحانات پائے جاتے ہیں۔ اس میں روایتی سوچ والے عناصر بھی موجود ہیں اور زمانے کے جدید تقاضوں کا ساتھ دینے والے لوگ بھی ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ مڈل کلاس کے مجموعی طور پر رجحانات اس حد تک ''مغربیت'' پسند نہیں ہیں جس قدر کہ جاگیردار طبقے کے نوجوانوں میں دکھائی دیتے ہیں۔ بلاشبہ ماضی کی دہائیوں میں جو نہایت اہم تبدیلیاں وقوع پذیر ہوئی ہیں ان میں سے ایک پاکستان کی تعلیم یافتہ مڈل کلاس خواتین میں راسخ العقیدہ ''الہدیٰ'' تحریک کی

مقبولیت بھی ہے(۴۷)۔اس تحریک سے وابستہ خواتین میں عربی لباس عبایئہ کو خاصی پذیرائی حاصل ہوئی ہے۔پاکستان کی مڈل کلاس میں جس سب سے زیادہ مشترکہ عنصر کو فروغ حاصل ہوا ہے وہ ہے کنزیومرازم یعنی صارفیت جس کی جھلک ہم گاڑیوں، ٹیلی ویژن سیٹوں اور موبائل فون کی خریداری میں واضح طور پر دیکھ سکتے ہیں۔ ہر دو میں سے ایک پاکستانی موبائل فون کا خریدار ہے اور یہ شرح خطے میں سب سے زیادہ ہے۔سول سوسائٹی نے ٹیلی میڈیسن نیٹ ورک قائم کیا ہے(جھروکا ٹیلی ہیلتھ کیئر) جس نے دور دراز کے علاقوں میں علاج معالجے کیلئے کام کرنے والے کارکنوں کو بڑے شہروں میں موجود ڈاکٹروں کے ساتھ براہ راست رابطے کی سہولت فراہم کردی ہے۔الیکٹرونک کی اشیاء پر اخراجات کرنے کے علاوہ پاکستانی مڈل کلاس نجی تعلیمی اداروں اور نجی شعبے میں قائم پرائیویٹ ہسپتالوں کے کاروبار کو مستحکم کرنے کا باعث بھی بن رہی ہے۔تعلیم اور صحت کے شعبے میں نجی طور پر قائم یہ دونوں سہولتیں شہری زندگی کے منظر نامے کا ایک نمایاں وصف بن چکی ہیں۔ایک اندازے کے مطابق ملک میں صحت کی سہولیات کا تقریباً ایک تہائی حصہ نجی شعبے کی جانب سے فراہم کیا جارہا ہے۔

مڈل کلاس کے بڑھتے ہوئے رسوخ نے الیکٹرونک میڈیا کی نشریات کو فروغ دینے میں بھی اہم کردار ادا کیا ہے جو موجودہ پاکستان کی ایک اور نمایاں خصوصیت بن چکی ہیں۔وہ دن ہوا ہوئے جب پاکستانی ناظرین کو سرکاری ٹیلی ویژن اور ریڈیو کے متبادل کے طور پر بی بی سی کی ورلڈ سروس اور بھارتی دور درشن چینل کی دھندلی نشریات پر انحصار کرنا پڑتا تھا۔پاکستان میں آزاد اور زیادہ سے زیادہ اثر و رسوخ حاصل کرنے کی کوشش میں مبتلا الیکٹرانک میڈیا اس میڈیا کی لاٹھی کے سہارے چلتی دنیا کے کسی بھی حصے سے زیادہ سیاسی تقاضا بن چکا ہے۔تاہم یہ بھی حقیقت ہے کہ نئے کیبل نیٹ ورکس نے کئی صورتوں میں پاکستان میں پہلے سے موجود مذہبیت کا تنقیدی جائزہ لینے کی بجائے اس کی معاشرے میں جڑیں گہری اور مضبوط کرنے میں بہت بڑا کردار کیا ہے اور کچھ ناقدین کے خیال میں پاکستانی میڈیا ملک میں نہایت طاقتور مغرب دشمنی کے جذبات کو ہوا دینے میں پیش پیش رہا ہے(۴۸)۔میڈیا کی بڑھتی ہوئی پہنچ اور رسائی نے ملک میں

"سازشی نظریات" کے فروغ میں بھی حصہ لیا ہے جو پاکستان کی شہری زندگی میں ایک مرغوب ترین رجحان کے طور پر موجود ہے۔کچھ مبصرین کے مطابق سازشی نظریات پاکستانی معاشرے میں پائی جانے والی وسیع تر قومی بے چینی کے اظہار کی ایک شکل ہے جو پاکستان کے حقیقی مسائل کی جڑوں سے انکار اور نتیجتاً انہیں حل کرنے سے گریز کی صورت میں پیدا ہوئی ہے۔پاکستان میں سازشی تھیوریوں کی تخیلاتی دنیا میں زندگی بسر کرنے کی ایک اہم علامت اس وقت سامنے آئی جب ایک بین الاقوامی پول میں یہ انکشاف کیا گیا کہ جب سروے میں شریک دو تہائی پاکستانیوں نے اپنے اس یقین کا اظہار کیا کہ ایبٹ آباد میں امریکی فوجیوں کے آپریشن کے نتیجے میں مارا جانے والا شخص اسامہ بن لادن نہیں بلکہ اس کی ڈمی تھا۔حد یہ ہے کہ پاکستان کے سابق آرمی چیف جنرل ریٹائرڈ مرزا اسلم بیگ ناصرف اس خیال کے حامی ہیں بلکہ وہ اس بات پر بھی یقین رکھتے ہیں کہ اسامہ بن لادن بہت پہلے افغانستان کے کسی مقام پر مارا جاچکا تھا اور یہ کہ ۲ مئی ۲۰۱۱ کو ہونے والا ایپی سوڈ پاکستان کو بدنام کرنے کی امریکی سازش تھی(۴۹)۔اسی واقعے کے حوالے سے گردش کرنے والی ایک اور سازشی تھیوری کے مطابق اسامہ بن لادن کو قتل کرنے کیلئے امریکی فوجیوں کی کارروائی دراصل پاکستان کے ایٹمی اثاثوں پر حملے کی پریکٹس تھی۔جب اس مہینے کے آخر میں اس وقت کی امریکی وزیر خارجہ ہیلری کلنٹن نے پاکستان کا دورہ کیا تو ایک موقع پر انہوں نے کہا "اینٹی امریکن ازم اور سازشی تھیوریاں مسائل کو حل کرنے میں مدد نہیں دے سکتیں"(۵۰)۔

جہاں تک سیاسی منظر نامے کا تعلق ہے مڈل کلاس کے ذہنوں میں موجود ابہام کا مطلب یہ ہے کہ کوئی ایک واحد پارٹی اس کی نمائندہ بن کر سامنے نہیں آسکتی۔لاہور میں رہنے والے ووٹر بھرپور طریقے سے پاکستان مسلم لیگ (نواز) کو سپورٹ کرتے ہیں۔کراچی میں یہ نسلی خطوط پر تقسیم ہیں۔وہاں پختون کاروباری طبقہ نیشنل عوامی پارٹی (اے این پی) کو سپورٹ کرتا ہے اور مہاجر کاروباری طبقہ متحدہ قومی موومنٹ (ایم کیو ایم) کا حامی ہے جو کچھ عرصہ پہلے تک مہاجر قومی موومنٹ کے نام سے جانی جاتی تھی۔خیال یہ ہے کہ آئندہ انتخابات میں ملک بھر میں مڈل کلاس کے زیادہ روایت پسند

افراد جماعت اسلامی یا دیوبندی مکتب فکر کی جماعت جمعیت العلماء اسلام کو ووٹ دیں گے (یہ سطور ۱۱ مئی ۲۰۱۳ میں ہونے والے عام انتخابات سے قبل تحریر کی گئی تھیں۔مترجم)۔ پاکستانی مڈل کلاس چاہے اس کا حجم ہمسائیہ ملک انڈیا کی مڈل کلاس کی نسبت کتنا ہی مختصر کیوں نہ ہو لیکن وہ اپنے ملک کی سماجی اور معاشی ترقی میں ایک اہم ایکٹر کی حیثیت حاصل کر چکی ہے، اس حقیقت کے باوجود کہ وہ قومی سیاست میں طاقت حاصل کرنے سے ابھی تک محروم ہے جس کی وجہ پاکستان کے ریاستی اقتدار پر جاگیر دار اشرافیہ اور برادریوں کے سربراہوں کی گرفت ہے۔

پاکستان میں اس بات کا بہت چرچا ہے کہ جاگیرداروں کا سیاسی اثر و رسوخ ملک میں جمہوریت کو کمزور کرنے کے سلسلے میں بہت اہم فیکٹر کے طور پر موجود ہے(۵۱)۔ ''جاگیردار'' کی ڈھیلی ڈھالی اصطلاح میں بڑے زمینداروں اور قبائلی سرداروں دونوں پر مشتمل اشرافیہ کو شامل کیا جاتا ہے۔ان دونوں کے مفادات نا صرف سرمایہ دارانہ خطوط پر کاشت کاری بلکہ ایگری بزنس اور شہری جائیدادوں کی خرید و فروخت اور رئیل سٹیٹ ڈویلپمنٹ کے ساتھ وابستہ ہیں۔مزید براں تمام ''جاگیردار'' اپنے ناقدین کے خیال کے برعکس اپنے مزارعین سے ووٹ حاصل کرنے کیلئے مقامی طور پر قائم جابرانہ نظام پر انحصار نہیں کرتے ہیں۔پنجاب کے بعض حصوں میں سماجی و معاشی تبدیلیوں نے بھارت کی طرح ایسے حالات پیدا کر دیئے ہیں کہ جہاں اشرافیہ کو قیادت کی فراہمی کے ذریعے لوگوں کے ساتھ اپنے تعلقات کی ''تجدید'' کرنا پڑتی ہے اور ووٹرز بھی سیاسی اشرافیہ سے حاصل ہونے والے فوائد میں زیادہ سے زیادہ اضافے کیلئے موجودہ سیاسی قیادت کو تبدیل کر سکتے ہیں۔

پاکستان کے جاگیردار طبقے کی اگر کوئی حقیقی علامت ہے تو وہ ہے سندھ کا وڈیرا۔انہیں اس حوالے سے دیکھا جاتا ہے کہ وہ اپنی طاقت کو سماجی و معاشی اصلاحات بشمول اپنے علاقوں میں تعلیم کی فراہمی کو ویٹو کرنے کیلئے استعمال کرتے ہیں۔انہیں زرعی اصلاحات کا راستہ روکنے اور دیہی ٹیکسوں کے نفاذ میں رکاوٹ بننے نیز ترقیاتی بجٹ کو اپنے مقاصد کیلئے استعمال کرنے کے سلسلے میں بھی مورد الزام ٹھہرایا جاتا

ہے۔ذوالفقار علی بھٹو کے مخالفین ان پر الزام لگاتے ہیں کہ انہوں نے کبھی سندھی پس منظر کے حامل وڈیروں کے جبر اور زیادتیوں کو روکنے کی کوشش نہیں کی(۵۲)۔وڈیرہ شاہی پر سارا زور لگادینے والے یہ بات بھول جاتے ہیں کہ حالیہ دہائیوں میں سندھ اور پنجاب میں اراضی کے مالکان کا ایک نیا طبقہ جنم لے چکا ہے جو بیوروکریسی اور فوج سے تعلق رکھتا ہے۔اس کے علاوہ یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ دیہات میں محض زمین کی ملکیت ہی سیاسی طاقت کا واحد جواز نہیں ہوتی۔وہاں حقیقی معنوں میں موثر اور طاقت ور ہونے کیلئے قبیلے یا برادری کی سربراہی اور 'عزت' کے تصور کا حامل ہونا بھی ضروری ہے۔اس بات سے ہمیں یہ سمجھنے میں مدد ملے گی کہ کیوں قبائلیت کے اندر عورتوں کی جنسیت پر۔۔۔جو خاندان کی ''غیرت'' کو معرض خطر میں ڈال سکتی ہے۔۔۔کنٹرول ضروری سمجھا جاتا ہے۔مذہبی مقدسات پر کنٹرول بھی دیہی طاقت کے ستونوں میں شامل ہے۔نو آبادیاتی دور میں صوفی درگاہوں اور طاقت کے درمیان گٹھ جوڑ کا ڈیوڈ گلمارٹن اور سارہ انصاری جیسے لکھاریوں کی تحریروں میں سراغ لگایا جا سکتا ہے(۵۳)۔۲۰۰۸ میں قائم ہونے والی پیپلز پارٹی کی حکومت کے وزیر اعظم یوسف رضا گیلانی اور وزیر خارجہ شاہ محمود قریشی دونوں کا تعلق ملتان کے سربرآوردہ گدی نشین خاندانوں سے تھا۔حالیہ مطالعات اس جانب اشارہ کرتے ہیں کہ اسلام پسند شد و مد کے ساتھ پیروں کے اثر و رسوخ کو چیلنج کر رہے ہیں اور ان کا چیلنج صرف ''مزار پرستی'' کے خلاف راسخ العقیدگی کی روایتی مزاحمت پر مبنی نہیں ہے بلکہ وہ اس جاگیردارانہ ڈھانچے کو بھی چیلنج کر رہے ہیں جو ان گدی نشینوں کی طاقت کا محور و مرکز ہے(۵۴)۔

قبائلی قیادت اور برادری کی سربراہی کے حوالے سے دو اہم نکات پر غور ضروری ہے۔یہ بات کسی سے ڈھکی چھپی نہیں ہے کہ بلوچستان میں قبائلی سردار خیبر پختونخوا کے قبائلی سرداروں کی نسبت کہیں زیادہ اپنے قبیلوں پر استبدادی طاقت کے مالک ہیں۔جنوبی پنجاب میں ایسے بہت سے قبائلی سردار موجود ہیں جو نسلی طور پر بلوچ ہیں۔اس کی ایک بہترین مثال ڈیرہ غازی خان کے لغاری سردار ہیں۔بلوچستان سے باہر اگر دیکھیں تو سندھ کا وڈیرہ سب سے زیادہ ''قبائلی طاقت'' کا مالک ہے۔برادریوں

کا مضبوط ترین نیٹ ورک وسطی پنجاب میں موجود ہے جہاں پر اراضی کی ملکیت کی حامل کمیونٹیاں موجود ہیں۔ برادری کا نیٹ ورک پنجاب کے کچھ شہروں اور قصبوں میں بھی پوری آب و تاب کے ساتھ موجود ہے۔ مثال کے طور پر لاہور کی سیاست میں ارائیں اور کشمیری برادری کے درمیان کش مکش بہت نمایاں طور پر دکھائی دیتی ہے۔

پاکستانی جاگیرداری کے ناقدین نے چار ایسے اہم اثرات کی نشاندہی کی ہے جنہوں نے سیاسی اجارہ داریوں کی حوصلہ افزائی کی ہے۔ اول جاگیردار اشرافیہ اور دیہی عوام کے درمیان وسیع تر معاشی اور سماجی خلیج جس نے موخر الذکر کو شدید طور پر غیر سیاسی بنادیا ہے۔ ووٹ ''مقامی طور پر قائم استبدادی نظام'' کی پیدا کردہ فضا کے ذریعے حاصل کیے جاتے ہیں۔ دیہی عوام خاص طور پر مزارعین اپنے ''وڈیرا سائیں'' کی مخالفت کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ دوم دائمی حیثیت کے حامل جاگیردارانہ طاقت سے جڑے ہوئے تعلقات جو تعاون کی بجائے دھونس دھاندلی، تشدد اور زبردستی پر مبنی سیاسی کلچر کو پیدا کرنے کے ذمہ دار ہیں۔ سوم، پاکستانی سیاست کا مقامی اور کسی خاص شخص کی ذات سے وابستہ کردار جس کی جڑیں جاگیردارانہ بالادستی کے تصور کے اندر پیوست ہیں۔ یہ وہ فیکٹر ہے جو کمزور سیاسی اداروں کی تشکیل میں کارفرما ہے اور جو جمہوریت کے استحکام میں ایک بڑی رکاوٹ کے طور پر موجود ہے۔ چہارم، جاگیر دار طبقہ کسی سیاسی ایجنڈے پر عمل پیرا ہونے کی بجائے اپنی مقامی بالادستی کو بڑھانے کی فکر میں مبتلا رہتا ہے۔ اس کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ ماضی کی طرح آئندہ بھی دیہی اشرافیہ کا ایک بہت بڑا حصہ ہمیشہ آمرانہ حکومتوں کو قانونی جواز فراہم کرنے کیلئے دل و جان سے آمادہ رہے گا۔ علماء کے ایک طبقے کی ہمراہی میں جاگیردار طبقے نے ہمیشہ مارشل لاء کی بی ٹیم کا کردار ادا کرنے کیلئے سرگرمی سے خود کو پیش کرنے کی روایت کو برقرار رکھا ہے۔

سیاسی تجزیہ نگار محمد وسیم نے حال ہی اس حوالے سے بحث کی ہے کہ جاگیرداروں کی بجائے درحقیقت یہ دائیں بازو کی مڈل کلاس ہے جس نے جمہوریت کو ناکام بنانے یا اسے کمزور کرنے کی سازشوں میں سرگرم کردار ادا کیا ہے(۵۵)۔ اس کا

موقف ہے کہ مڈل کلاس کی ایک غالب تعداد کا تعلق دائیں بازو کے نظریات کے ساتھ ہے گو کہ وکلا، لکھاری اور دانشوروں پر مشتمل ایک معمولی سی اقلیت اس کلاس کے اندر جمہوریت نواز عنصر کی حیثیت سے اپنا وجود برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ دائیں بازو کے حامیوں کی بڑی تعداد فوجی افسران، بیوروکریٹس، انجینئروں، ڈاکٹروں، کارپوریٹ منیجروں، انفرمیشن ٹیکنالوجی کے ماہرین اور کاروباری حضرات پر مشتمل ہے اور ان تمام لوگوں کے نظریات شدید طور پر رجعت پسندانہ ہوتے ہیں۔ دوسری جانب وہ جاگیردار طبقے کی مزاحمتی اور مربیانہ خصوصیات کا اعتراف کرتے ہوئے دیکھتے ہیں کہ روایتی جاگیردار اشرافیہ کی غیر واحدانی یا رنگارنگ لسانی و نسلی رشتوں کے ساتھ زیادہ وابستگی ہے اور وہ کمیونٹی اور مذاہب کی حد بندیوں سے ماوراء ہو کر اپنے اتحاد تشکیل دیتے ہیں۔ یہ کلاس مسجد اور مدرسہ کی بجائے پیر اور درگاہ کے اسلام کے ساتھ وابستہ ہے۔ اس کے برعکس مڈل کلاس شدید اینٹی انڈیا جذبات کی حامل پاکستانی قومیت اور اسلام کی راسخ العقیدگی جو پان اسلام ازم اور شدید مغرب دشمنی کے جذبات کے ساتھ جڑی ہوئی ہے، کی جڑواں آئیڈیالوجی کے ساتھ وابستہ ہے۔ دائیں بازو کی مڈل کلاس عوام کی مرکزیت کی بجائے ریاست کی مرکزیت کے حامل وژن کی علم بردار ہے جس کی محافظت کے فرائض فوج اور بیوروکریسی پر مشتمل اسٹیبلشمنٹ نے اپنے ذمے لے رکھے ہیں۔ وسیم اس حوالے سے مزید کہتے ہیں کہ ذوالفقار علی بھٹو کے استثنیٰ کے ساتھ پاکستان کے آمرانہ اختیارات کے حامل حکمران تمام کے تمام مڈل کلاس سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے پاس بیچنے کیلئے یہی ایک سودا تھا کہ جمہوریت کو جاگیرداروں نے اغواء کر رکھا ہے، سیاست دان کرپٹ ہوتے ہیں اور پاکستانی معاشرہ ابھی جمہوریت کے قابل نہیں ہے۔ وسیم کے خیالات اس مقبول عام خیال کا بہت مفید استرداد فراہم کرتے ہیں کہ پاکستان میں مڈل کلاس کا ابھار جمہوریت اور لبرل ازم کے فروغ کا ضامن ثابت ہوگا(۵۶)۔ بلاشبہ یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ اسلام کی بنیاد پرستانہ وہابی اور دیوبندی تعبیرات اپنے ''عدل، اسلامی بھائی چارہ کے خوشنما نعروں اور اس کے دعوے کہ شریعت کا نفاذ ہی سماجی انصاف کا واحد ذریعہ ہے'' کے دعوے کے ساتھ ابھرتی ہوئی مڈل کلاس

کے اس حصے کیلئے خاص طور پر کشش رکھتی ہیں جسے جاگیر داروں نے اقتدار کی راہداریوں سے دور کررکھا ہے۔جیسا کہ میتھیو نیلسن نے عالمانہ انداز میں استدلال کیا ہے کہ جاگیر دار طبقے کی سب سے اہم سرگرمی یہ رہی ہے کہ عورتوں کو جائیداد کا حق دینے کے سلسلے میں شریعت کے احکامات کو جبر، قانونی حوالے سے تاخیری حربوں اور سیاسی اثر و رسوخ کے ملغوبے کے ذریعے بے اثر کیا جائے۔نیلسن کے نزدیک پنجابی دیہی پس منظر میں سیاسی اثر ورسوخ اس صلاحیت میں مضمر ہے کہ کیسے نوآبادیاتی دور کے بعد نافذ ہونے والے قوانین کو بے اثر کیا جائے جنہوں نے برطانوی راج کی جانب سے قبائلی رواج کو تقویت بخشنے والے قوانین کو پس پشت ڈال دیا ہے۔وہ ماورائے قانون سیاسی احتساب کی غیر رسمی صورتوں کو جمہوریت کے استحکام کے سلسلے میں ضرر رساں اثرات کا حامل سمجھتا ہے(۵۷)۔اس کا موقف نہ صرف ویسم کے موقف کو چیلنج کرتا ہے بلکہ ان تمام لوگوں کے خیالات کو بھی چیلنج کرتا ہے جو ضلعی عدالتوں کے نظام کے بارے کی ناقص کارکردگی کے بارے میں غیر واضح اور غیر حقیقی رائے کے حامل ہیں اور جو موجودہ پاکستان کے تناظر میں نوآبادیاتی ترکے کو اداروں کی وراثت کے محدود تصور کے اندر رکھ کر دیکھتے ہیں۔

زبان اور شناخت

پروفیسر طارق رحمان نے بہت باریک بینی سے اچانک بہت زیادہ اہمیت اختیار کرجانے والی اردو زبان کی تاریخ کا جائزہ لیا ہے۔یہ زبان انیسویں صدی کے وسط میں ہندوستان سے آہستہ آہستہ بے دخل کردی جانے والی زبان فارسی کی جگہ علمی اور ادبی حلقوں اور اس کے ساتھ ہی عوام میں مقبول ہونا شروع ہوئی اور پھر جلد ہی مسلمان اشرافیہ کیلئے شائستگی اور تمدن کا معیار اور ان کیلئے ''تمغہ امتیاز'' بن گئی(۵۹)۔اس کے ارتقائی سفر کی اہم ترین منزل یہ تھی کہ قیام پاکستان کے بعد اسے ملک کی قومی زبان کا درجہ دے دیا گیا۔یہ اس حقیقت کے باوجود تھا کہ آزادی کے وقت صرف سات فیصد آبادی اسے مادری زبان کی حیثیت سے بولتی تھی۔جیسا کہ ہم دوسرے

باب میں دیکھیں گے کہ ابتدائی برسوں میں بنگالی زبان کو جو ۱۹۴۷میں پاکستانیوں کی اکثریت کی زبان تھی اردو جیسا مرتبہ دینے سے انکار کردیا گیا۔یہ وہ فیکٹر تھا جو ملک کے مشرقی اور مغربی بازوؤں کے درمیان کشیدگی کی ابتدا ثابت ہوا۔

۱۹۰۰ میں اردو کے دفاع کیلئے وجود میں آنے والی'' انجمن دفاع اردو'' کی کوششوں کے نتیجے میں اردو نوآبادیاتی ہندوستان میں مسلمانوں کی سیاسی شناخت کی بہت اہم علامت بن گئی۔اردو کے دفاع کیلئے تشکیل پانے والی یہ انجمن یوپی میں ہندی زبان کے احیاء کی کوششوں کے ردعمل کا نتیجہ تھی۔یوپی کی ہندو اشرافیہ نے ۱۸۵۸ میں مسلمان اشرافیہ کی کوششوں کے نتیجے میں یوپی میں اردو کو سرکاری زبان کی حیثیت دے دی تھی۔اس اقدام کے بعد ہندو اشرافیہ نے اسے مسلمانوں کی جانب سے اپنی سیاسی طاقت میں اضافے کا ذریعہ سمجھتے ہوئے ہندی زبان کو اردو کے مساوی درجہ دلانے کیلئے کوششیں شروع کردیں۔ہندو انتہا پسندوں نے اس وقت کی یوپی کی حکومت کا یہ فیصلہ تبدیل کرانے کیلئے عوامی سطح پر ایک زبردست اور جارحانہ مہم شروع کردی۔۱۸۸۲ میں حکومت ہند نے کمیشن برائے قومی زبان تشکیل دیا جس کا مقصد صوبوں میں قومی زبانوں کے معاملے کو طے کرنا تھا۔ہندو انتہا پسندوں نے اس کمیشن کی سفارشات پر اثر انداز ہونے کیلئے جو کوششیں کیں ان میں سے ایک یہ تھی کہ ۶۷ ہزار افراد سے ۱۱۸ یادداشتوں پر دستخط کرائے گئے جن میں یوپی کے اندر ہندو آبادی کی اکثریت کو جواز بناتے ہوئے ہندی کو ذریعہ تعلیم کے طور پر رائج کرنے کا مطالبہ کیا گیا تھا۔یوں انیسویں صدی کے اختتامی برسوں میں ہندی اردو تنازعہ نے ہندوستان کے قومی منظر نامے میں نمایاں جگہ حاصل کرلی۔

اردو ہندی تنازعہ نے انیسویں صدی کے ابتدائی برسوں میں شدت اختیار کرلی جس کی وجہ شمال مغربی صوبوں کے لیفٹیننٹ گورنر سر اے پی میک ڈونل کا اردو دشمنی پر مبنی رویہ تھا۔سرکاری طور پر اپنائے جانے والے ان رویوں کے نتیجے میں لسانیت کی ایک ایسی ہوا چلی کہ ہندو اور مسلمان دو مختلف لسانی گروہوں میں بٹ گئے۔اردو مسلمانوں اور ہندی ہندوؤں کی شناخت کے طور پر جانی جانے لگیں۔اس لسانی تنازعے

نے خاص طور پر شمالی ہندوستان میں مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان سماجی طور پر بھائی چارے کی فضا کو سخت نقصان پہنچایا۔

اردو نا صرف یوپی کی مسلمان اشرافیہ کی مادری زبان تھی بلکہ یہ پورے ہندوستان میں طبقہ اعلیٰ کے مسلمانوں کی پسندیدہ زبان کی حیثیت بھی رکھتی تھی اور ان حلقوں میں وسیع پیمانے پر بولی اور لکھی جاتی تھی۔ دوسری جانب عوامی سطح پر مختلف علاقوں میں مسلمان بہت سی زبانیں بولتے ہیں جن میں پنجابی اور بنگالی کو سب سے بڑی زبانوں کی حیثیت حاصل ہے۔ برطانوی حکومت نے ۱۸۵۴ سے ہی پنجاب میں اردو کو سرکاری زبان کا درجہ دے رکھا تھا جس کے نتیجے میں پنجابی زبان کی ترقی کو شدید نقصان پہنچا۔ برطانوی حکومت کا یہ فیصلہ کہنے کو تو ''انتظامی سہولت'' کیلئے کیا گیا لیکن درحقیقت اس کے پیچھے شدید تاریخی اور ادبی حیثیت رکھنے والی ''فرسودہ'' پنجابی زبان کے خلاف سرکاری اور اشرافیہ کی سطح پر پائے جانے والے تعصبات کارفرما تھے (۶۰)۔

اردو کے ساتھ وابستگی نوآبادیاتی ہندوستان میں مسلمانوں کے علیحدگی پسند رجحانات کے سلسلے کی ایک اہم کڑی ثابت ہوئی تھی۔ ان ساری کوششوں کے باوجود نوزائیدہ مملکت پاکستان میں اردو پاکستان کے قومی تشخص کو ابھارنے کے سلسلے میں ان علاقائی زبانوں کی نسبت بہت کم اثر کی حامل ثابت ہوئی جو لسانی شناخت کی حیثیت سے مستحکم حیثیت کی حامل تھیں۔ تشخص کی سیاست کے عمل میں کسی ایک زبان کو مرکزی حیثیت دینے کے عمل نے علاقائی زبانوں کے کردار کو تقویت بخشی۔ یہ عمل خاص طور پر سندھ میں بہت توانا انداز میں ہوا جہاں مقامی سطح پر اردو بولنے والے مہاجروں کی آمد اور قومی سطح پر اردو پنجابی اشرافیہ کے سیاسی غلبے کے ردعمل کے طور پر سندھی زبان مزاحمتی تحریک کا نشان بن گئی (۶۱)۔ مزاحمت کا یہ عمل پورے پاکستان میں پایا جاتا ہے البتہ پنجاب میں سرائیکی بولنے والے علاقوں کے استثنیٰ کے ساتھ اس حوالے سے عام طور پر خاموشی اختیار کرنا مناسب سمجھا گیا۔ یہ رویہ پنجابی کو مشرف بہ اردو کرنے کی نوآبادیاتی روایت کے بطن سے پھوٹا تھا۔ اس سے یہ بھی منعکس ہوتا ہے کہ پنجاب کا علاقہ ریاست پاکستان کا اصل وارث اور مالک بن چکا تھا۔ پنجاب کی حکمران اشرافیہ نے بڑے پیمانے

پر ریاست کی سیاسی طاقت اور معاشی بالادستی کی قیمت پر ثقافتی قوم پرستی پر سمجھوتا کرنے کیلئے تیاری کر لی تھی۔

پاکستان میں سماجی طور پر لوگوں کے ایک دوسرے کے رابطوں کے نتیجے میں وجود میں آنے والے داخلی نقل مکانی کے عمل نے یقینی طور پر اردو کی حیثیت کو تقویت بخشی اور اسے ایک رابطے کی زبان کے طور پر مستحکم کر دیا۔ چھوٹے صوبوں میں زبان کے سیاسی استعمال کی وجہ سے بہر حال یہ عمل لامحدود نہیں ہو سکا۔ دوسری جانب ۸۰ کی دہائی میں شہری سندھ میں مہاجر سیاسی شناخت کے ابھرنے کے نتیجے میں اردو پاکستانی قومیت کی علامت بننے کی بجائے ایک لسانی شناخت کی حد تک محدود ہو کر رہ گئی۔

سندھی زبان دوسری علاقائی علامتوں مثلاً سندھی ٹوپی، اجرک، سندھی شاعری اور صوفی ازم کے ہمراہ بہت طویل عرصے سے شناخت کی سیاست کا ایک لازمی جزو بن چکی تھی۔ بلاشبہ کافی کی صورت میں یہ سندھی شاعری تھی جس نے سندھ کی قدیم تاریخ کی موجودگی میں سندھی زبان کی روایات کی تشکیل کی تھی۔ سندھ کے دانشور، لکھاری اور قوم پرست سیاستدان جی ایم سید نے ۱۹۷۰ میں انہی قدیم تاریخی روایات کو جواز بناتے ہوئے سندھیوں کیلئے الگ وطن سندھو دیش کا نعرہ بلند کیا تھا۔ جبکہ اس کے سیاسی موقف کے پیچھے پنجابی سندھی سیاسی غلبہ قوت محرکہ کے طور پر کارفرما تھا (۶۲)۔ یہاں تک کہ جی ایم سید نے ۱۹۴۰ کی دہائی میں ہی یہ پیش گوئی کر دی تھی کہ پاکستان پنجابی غلبے کا حامل ملک ہوگا۔ ۱۹۳۲ میں سکھر بیراج کی تعمیر کے ساتھ ہی پنجاب سے کاشتکاروں کو جب سندھ کی زمینوں کو آباد کرنے کیلئے یہاں لایا گیا تو سندھ میں اس کے خلاف شدید ردعمل دیکھنے میں آیا تھا۔ تاہم اس عمل کا ۱۹۴۷ میں انڈیا سے ہجرت کر کے کراچی میں آباد ہونے والی بہت بڑی اردو بولنے والی آبادی کے ساتھ موازنہ نہیں کیا جا سکتا۔

نوآبادیاتی دور میں سندھی زبان کیلئے عربی رسم الخط رائج کیا گیا حالانکہ اس سے قبل سندھی زبان دیوناگری اور گورمکھی میں تحریر کی جاتی تھی۔ آزادی کے وقت سے ہی سندھی زبان کے ایکثوسٹ ریاست کے ساتھ تصادم کی حالت میں آ گئے تھے۔ جنرل ضیاء کے دور میں سرکاری پالیسیوں کی مرکزیت پسندی اور اسلامائزیشن کے خلاف

مزاحمت کے پیچھے سندھی ثقافتی شناخت کا طاقتور احساس کارفرما تھا جسے سندھی زبان کے ایک شاعر نیاز ہمایونی کی شاعری میں واضح طور پر دیکھا جاسکتا ہے۔جی ایم سید پاکستانی ریاست کے ساتھ اپنی طویل اور سخت مزاحمت کے باوجود ضیاء کے خلاف چلائی جانے والی تحریک سے لاتعلق رہے جس کی بڑی وجہ ان کے پیپلز پارٹی کے ساتھ معاندانہ تعلقات تھے۔ستم ظریفی یہ ہے کہ انہی دنوں جولائی ۱۹۸۴ میں کراچی کے اردو بولنے والوں نے اس سرکردہ سندھی قوم پرست کی ۸۱ویں سالگرہ منائی۔

اس وقت کے شمال مغربی سرحدی صوبے اور آج کے خیبر پختونخوا میں بولی جانے والی پشتو زبان نوآبادیاتی دور سے آج تک پختون قومی تشخص کا جزو لاینفک رہی ہے۔اگرچہ یہ بھی حقیقت ہے کہ پشتو سے قبل پختون اشرافیہ کی زبان فارسی اور اخلاقی ضابطوں کا مجموعہ پختون ولی شناخت کے دو اہم عناصر کے طور پر موجود تھے (۶۳)۔ نوآبادیاتی دور میں انگریزوں کی جانب سے اردو کو ایک قومی زبان کی حیثیت سے مسلط کرنے کے ردعمل کے طور پر خان عبدالغفار خان کی زیر قیادت سرخپوش تحریک نے پشتو کو نوآبادیاتی حکمرانوں کے خلاف مزاحمت کی علامت کے طور پر پشتو کو اپنالیا۔بعد ازاں جب پشتو زبان، پختون ولی اور اسلام کے ہمراہ پختون شناخت کا حوالہ ٹھہری تو پختونوں کے خلاف ہندکو بولنے والے مسلمانوں اور صوبے کی ہندو اور سکھ آبادی کے مزاحمت کے جذبات پیدا ہوگئے۔پاکستانی ریاست نے پشتو کو اسی طرح شک وشبہ کی نظروں سے دیکھنا شروع کیا جیسا کہ اس کے نوآبادیاتی پیشرو دیکھا کرتے تھے۔اس کی وجہ وہ معاندانہ جذبات تھے جو افغانستان کی حکومت پاکستان کے خلاف رکھتی تھی اور اس کی ایک اور وجہ افغان حکومت کی وہ پالیسی تھی جس کے تحت اس نے دری زبان کو پیچھے دھکیل کر پشتو کو پشتون قومیت کے غلبے کے اظہار کیلئے پیش کرنا شروع کیا تھا۔۱۹۵۰ اور ۶۰ کی دہائیوں میں پختونستان کی علیحدگی پسند تحریک کے دوران پشتو کو پختون عوام کی امنگوں کا آئینہ دار قرار دے کر بہت زیادہ اہمیت دی گئی تھی۔بعد کے برسوں میں پختونوں کی پاکستانی ریاست کے ساتھ یک جہتی کی فضا قائم ہونے کے بعد اردو کو بھی اہمیت حاصل ہونا شروع ہوگئی۔تاہم اس کے ساتھ ساتھ پشتو نے بھی شناخت کی

سیاست اور زیادہ خودمختاری کے مطالبے کے تناظر میں اپنی علامتی اہمیت کو برقرار رکھا ہوا ہے۔خودمختاری کے ان جذبات کے اظہار کی ایک صورت حال ہی میں صوبے کے نام کی تبدیلی بھی ہے۔

جہاں تک بلوچستان کی بات ہے تو وہاں بلوچی زبان کی نسبت قبائلی سماجی ڈھانچہ زیادہ اہمیت کا حامل رہا ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ بلوچستان کے کثیر السانی منظرنامے نے واحد زبان کے فروغ کے امکانات کو محدود کردیا ہے۔اس کا لسانی اکھٹا صرف سبی، ژوب اور پشین جیسے علاقوں میں بھاری تعداد میں پشتو بولنے والی پشتون آبادی کی موجودگی بلکہ براہوی بولنے والے بلوچ عوام کی اچھی خاصی تعداد کا حتمی نتیجہ ہے۔بلاشبہ بلوچ سیاست میں بہت زیادہ اہمیت کے حامل خان آف قلات کے خاندان کی زبان بلوچی کی بجائے براہوی ہے بلکہ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ بلوچ قوم پرست ایک الگ وطن کی جدوجہد کے دوران اپنی فکری رہنمائی کیلئے میر نثار خان کی جانب دیکھتے ہیں جس نے اٹھارہویں صدی کے نصف میں ریاست قلات کی بنیاد رکھی تھی۔جمالی قبیلہ کے علاوہ دیگر ایسے قبیلے جو سرائیکی بولتے ہیں خود کو بلوچ قرار دیتے ہیں۔نوآبادیاتی دور میں برطانوی حکومت کے زیرانتظام بلوچستان کے علاقے میں اردو کو ایک مستند لسانی ذریعے کی حیثیت حاصل ہوچکی تھی۔قیام پاکستان کے بعد سے پاکستانی ریاست اردو کو اتحاد اور قومی یکجہتی کے ایک آلہ کی حیثیت سے اردو کو استعمال کرتی آئی ہے۔بلوچ اشرافیہ کے درمیان اردو کی مقبولیت، بلوچی زبان کی علمی وادبی زبان کی حیثیت سے ناکافی حیثیت اور براہوی اور بلوچی کے درمیان تقسیم ایسے عوامل ہیں جنہوں نے قبائلیوں وفاداریوں اور معاشی وسماجی تضادات کو بڑھاوا دیا ہے، بجائے اس کے کہ بلوچی زبان پاکستانی ریاست کے خالف قوم پرستوں کیلئے قوت محرکہ کا کام دیتی۔

چھوٹی قومیتوں کی جانب سے نسلی، لسانی اور مذہبی بنیادوں پر سیاسی شناختوں کے خلاف ریاست کا جدید انداز کا ردعمل ناصرف جنوبی ایشیا میں بلکہ تمام ترقی پذیر دنیا میں مطلق العنانیت کو فروغ دینے کے سلسلے میں بہت بڑا فیکٹر رہا ہے۔خاص طور پر

بھارت کے مقابلے میں پاکستان کے سیاسی طور پر باشعور نسلی گروہوں کی محدود رینج جمہوری استحکام کیلئے کم تر درجے کے خطرے کی حیثیت سے موجود ہے۔ بہت سے علماء اس حوالے سے بات کر چکے ہیں کہ بھارت کے پیچیدہ نسلی ڈھانچے نے جمہوریت کو فروغ دینے اور اسے مستحکم کرنے کیلئے ایک مددگار عامل کی حیثیت سے کردار ادا کیا ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ نسلی اکائیوں نے اس بات کی احتیاط کی ہے کہ کوئی ایک طاقتور نسلی گروہ ریاست پر غلبہ حاصل کرنے میں کامیاب نہ ہو جائے (۶۴)۔

مذہب

پاکستان کی ریاست نے نا صرف نظریاتی وجوہات کی بنا پر بلکہ خود کو جواز فراہم کرنے کیلئے بھی ہمیشہ اسلامائزیشن کے عمل کی سرپرستی کی ہے۔ محمد عبد القدیر اور دیگر مصنفین نے اس عمل کو تین ادوار میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا دور ۱۹۴۷ سے ۱۹۷۱ تک، دوسرا ۱۹۷۲ سے ۱۹۷۷ تک اور تیسرا ۱۹۷۷ سے آج تک کے عرصے پر محیط ہے (۶۵)۔ اسلامائزیشن کے یہ ادوار بہت زیادہ واضح ہیں گو کہ عمومی طور پر اس عمل کو ایک مسلسل اور شدت پکڑتے ہوئے عمل کے طور پر بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ ایک اور مصنف ہانسن نے اس فہرست میں ایک چوتھے دور کا اضافہ کیا ہے جو ۹/۱۱ سے شروع ہوتا ہے۔ اس نئے دور میں اسلامی سماجی تحریکیں جو ریاست کے ساتھ بڑھتے ہوئے تصادم کی حالت میں ہیں نے عوامی زندگی کو ان کی اپنی خود ساختہ تعبیرات کے مطابق اسلامی تعلیمات کے تابع کرنے کی کوششیں تیز کر دی ہیں (۶۶)۔ ریاست کی جانب سے مذہب کو اپنے مقاصد کیلئے فروغ دینے اور استعمال کرنے کی کوششوں کے ساتھ ساتھ اس نے اپنے علاقائی سٹریٹیجک مفادات کو آگے بڑھانے کیلئے عسکریت پسند مسلح گروہوں کے ساتھ بھی اتحاد تشکیل دیئے ہیں (۶۷)۔ یہ عمل جیسا کہ ہم اگلے ابواب میں دیکھیں گے پاکستان کی پوری تاریخ میں مستقل نوعیت کا حامل رہا ہے گو کہ اس میں شدت بظاہر ۱۹۹۰ کی دہائی میں آئی تھی۔ تجزیہ نگاروں نے اس منظر نامے کی تشکیل میں جسے پاکستان کا جہادی منظر نامہ کہا جاتا ہے اس عمل کے کردار پر تفصیل سے روشنی ڈالی

ہے (۶۸)۔

کچھ سکالروں نے "گمشدہ نسل" کے بارے میں بات کی ہے جو جنرل ضیاء کے دور کی تعلیمی اصلاحات کے مرتب ہونے والے اثرات کا ایک لازمی نتیجہ ہے (۶۹) اور موجودہ عدم برداشت کے شواہد کو اس دور میں تنگ نظر راسخ العقیدگی کو مسلط کرنے کی کوششوں کی کامیابی کے ساتھ منسلک کیا ہے (۷۰)۔ جیسا کہ ہم بعد میں دیکھیں گے کہ نائن الیون کے بعد بہت سے مغربی سکالروں نے مدارس اور شدت پسندی کی ممکنہ حوصلہ افزائی کو اپنی تحقیقات کا فوکس ٹھہرایا ہے (۷۱)۔ تاہم اس کے نتیجے میں اردو میڈیم سرکاری سکولوں میں رائج نصاب کے اثرات کو نظروں سے اوجھل نہیں ہونا چاہیے جن میں اسلام کو پاکستانی قومیت کے ساتھ منسلک کیا جاتا ہے اور جن کی بنیاد شدید طور پر اینٹی ہندو اور اینٹی انڈیا ہے (۷۲)۔ یہ بھی اہم بات ہے کہ الہدیٰ اور تبلیغی جماعت جیسی تنظیموں کی سرگرمیوں کے نتیجے میں پیدا ہونے والے اور روز بروز بڑھتے ہوئے شخصی ہمدردانہ جذبات کو عسکریت پسندی اور انتہا پسندی کے ساتھ خلط ملط نہیں کر دینا چاہیے۔

موخر الذکر کی جڑیں نوآبادیاتی دور میں پیوست ہیں جبکہ الہدیٰ ایک حالیہ تحریک ہے جس کا مقصد طبقہ اعلیٰ سے تعلق رکھنے والی عورتوں کو اچھی مسلمان خواتین کی حیثیت سے ان کے حقوق و فرائض کے بارے میں آگاہ کرنا ہے۔ اس تحریک کی بنیاد ۱۹۹۴ میں ایک خاتون ڈاکٹر فرحت ہاشمی نے رکھی تھی جب وہ برطانیہ سے واپس پاکستان رہائش پذیر ہوئی تھیں۔ اس کے علاوہ ایک اور بات یاد رکھنے کی ہے جس کی جانب ڈیوڈ ہانسن نے حال ہی میں اپنی ایک تحریر میں اشارہ کیا کہ بہت سے شہری مسلمان بھلے کتنے ہی ریڈیکل اور انتہا پسندانہ سوچ کے حامل ہوں لیکن ان میں سے بہت کم افراد ایسے ہوتے ہیں جو پر تشدد رویوں کو اپنا لیں (۷۳)۔

ایک خصوصی پہلو جس کی جانب ہانسن نے اپنے تھیس "انتہا پسندانہ موقف اور معتدل رویئے" نے خاص توجہ دی ہے وہ یہ ہے کہ بڑھتی ہوئی راسخ العقیدگی اور تنگ نظری کے باوجود ملک میں ہونے والے عام انتخابات میں کبھی اچھی کارکردگی کا مظاہرہ نہیں کیا ہے۔ اس میں صرف ۲۰۰۲ کو ہونے والے انتخابات تھے جن میں ان مذہبی

جماعتوں کے ایما پر ریاست نے خفیہ مداخلت کی تھی۔اسلامی جماعتوں نے بے شمار مواقع پر حکومتوں پر اثر انداز ہونے میں کامیابی حاصل کی، ہے لیکن ایسا صرف ان کی سٹریٹ پاور اور اسٹیبلشمنٹ کے ساتھ ان کے خصوصی تعلقات کی وجہ سے ہوا ہے نہ کہ پاکستانی ووٹروں کو اپنے موقف کے حق میں قائل کرنے کی بنا پر۔

اسلامی جماعتوں کے درمیان شدید نوعیت کی تفریق ان کی انتخابات میں بری کارکردگی کا باعث ثابت ہوئی ہے۔اندرونی دھڑے بندی کے ساتھ ساتھ فیوڈل غلبے نے ہمیشہ ان کے انتخاباتی اثرات کو محدود رکھنے میں کردار ادا کیا ہے۔دیوبندی مکتبہ فکر کی نمائندہ جماعت جمعیت العلماء اسلام نے خیبر پختونخوا کے بہت کم ووٹروں کو متاثر کرنے میں کامیابی حاصل کی ہے۔اس کی سب سے اہم حریف جمعیت العلماء پاکستان ہے جو بریلوی مکتبہ فکر کی نمائندگی کرتی ہے۔جماعت اسلامی جس کی بنیاد ۱۹۴۱ میں مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی نے رکھی تھی اور جس نے مطالبہ پاکستان کی مخالفت کی تھی کلی طور پر شہری مڈل اور لوئر کلاس میں اپنی ہمدردیاں رکھتی ہے۔جماعت اسلامی کی ایک ذیلی طلبہ تنظیم اسلامی جمعیت طلباء بھی ہے جو زیادہ متشدد اور تنگ نظر نظریات اور رجحانات کی حامل ہے۔جنرل ضیاء کے دور میں اس طلبہ تنظیم کو سرکاری سرپرستی حاصل تھی جس کی وجہ سے اس نے ملک کے کئی کیمپسوں پر قبضہ جمالیا تھا اور وہ اس وقت اپنا قبضہ برقرار رکھنے کی جدوجہد میں مصروف ہے۔

موجودہ پاکستانی اسلام کی ایک اہم خصوصیت فرقہ واریت ہے۔اس کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ مغرب کا یہ خوف کہ آگے چل کر پاکستان مذہبی انتہا پسندوں کے قبضے میں آجائے گا محض خیال خام ہے۔فرقہ واریت نے ملک میں فرقہ ورانہ گروپ کے جدید ترین ہتھیاروں سے مسلح ہونے اور سیاسی سرپرستیوں کی وجہ سے ملک میں جاری تشدد کی لہر میں اپنا بھرپور حصہ ڈالا ہے۔اس حقیقت کی جانب بہت زیادہ توجہ مبذول نہیں کی گئی ہے کہ فرقہ واریت کے علمبردار گروپ مستقل طور پر انتہا پسند جہادی تحریک کیلئے بھرتی کرنے والے کیمپوں کا کردار ادا کر رہے ہیں۔

فرقہ واریت نا صرف سنی اکثریت اور ۲،۵ فیصد آبادی کی حامل شیعہ اقلیت کے درمیان

مسلح کارروائیوں کی ذمہ دار ہے بلکہ یہ بنیاد پرست دیوبندی اور بریلوی فرقے جو صوفی اسلام کا پیروکار ہے، کے درمیان خون ریزی کی ذمہ دار بھی ہے۔کٹر عقائد کے حامل بے لچک اسلام کی جانب سے "صوفی اسلام" یا "عوامی اسلام" کو گہنانے یا اس پر غلبہ پانے کے کوششوں کو سعودی عرب کی ریاست کی جانب سے دیوبندی اور اہل حدیث مصلحین کی سرپرستی کے لازمی نتیجے کے طور پر دیکھا جاتا ہے۔صوفی اسلام پر غلبہ پانے کی کوششوں کی تفہیم کے سلسلے میں اس بات کا ادراک ضروری ہے کہ تصوف کے نقشبندی اور چشتی سلسلوں کے اندر ریفارمڈ اور احیائی اسلام کی روایت سے جڑے ہوئے افراد ابھی تک صوفی درگاہوں پر حاضری اور راسخ العقیدہ نکتہ نظر کو یکجا کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں(۷۴)۔تاہم ۲۰۰۵ کے بعد سے ملک میں پیروں پر قاتلانہ حملوں اور صوفیاء کے مزاروں پر دہشت گردی کی کارروائیوں کا خطرناک رجحان دیکھنے میں آیا ہے۔ اکتوبر ۲۰۰۸ میں سوات کے طالبان نے ایک بریلوی مذہبی شخصیت پیر ثناالله کو قتل کر دیا تھا اور اس کے دو ماہ بعد اس کی لاش کو قبر سے نکال کے مینگورہ کے پھانسی چوک میں سولی پر لٹکا دیا تھا(۷۵)۔۲۰۱۰ میں لاہور میں حضرت داتا گنج بخش اور پاکپتن میں حضرت بابا فرید گنج شکر کے مزاروں کو بم دھماکوں اور خودکش حملوں سے تباہ کرنے کی کوششیں کی گئیں۔اسی اثنا میں کراچی میں عقیدت مندوں کیلئے مرکزی اہمیت کے حامل عبداللہ شاہ غازی کے مزار کو بھی دہشت گردی کا نشانہ بنایا گیا تھا۔جولائی ۲۰۱۰ کے اوائل میں جب دہشت گردوں نے لاہور میں حضرت داتا گنج بخش کے مزار پر بیک وقت دو خودکش حملے کیے جن میں ۴۵ افراد جان سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے، تو اس پر پنجاب اور سندھ میں عوام کا شدید ردعمل دیکھنے میں آیا تھا اور دہشت گردی کی اس کارروائی کے خلاف غم و غصہ میں بھرے ہوئے لوگ سڑکوں پر نکل آئے تھے۔اب جبکہ اس نوعیت کے حملے بہت کم ہو رہے ہیں ایک اور خطرناک رجحان تیزی سے مقبولیت حاصل کر رہا ہے اور وہ ہے دیوبندی اور اہلحدیث فرقے سے منسلک لوگوں کی جانب سے بریلیوں کی مساجد پر قبضے کرنا۔۲۰۰۷ میں سامنے آنے والی ایک رپورٹ میں بتایا گیا تھا کہ صرف کراچی میں کم از کم ۱۰۰ بریلوی مسلک کی مساجد پر مخالف فرقے کے مسلح گروہوں نے زبردستی قبضہ

کرلیا تھا۔

اس قسم کے تشدد کو واضح طور پر ماضی کی روایات میں پیوست دیکھا جاسکتا ہے۔ گوکہ پاکستان نے نوآبادیاتی دور سے ہی منقسم اور متحارب اسلام کی روایت ورثے میں حاصل کی تھی لیکن احیاء پسندی کا سراغ شمالی ہند میں مغلیہ سلطنت کے عہد زوال اور اٹھارہویں صدی کے دہلی کے عالم شاہ ولی اللہ (۱۷۰۳۔۶۲) کی تحریروں میں پایا جاسکتا ہے جن کی مثال کے طور پر صوفی درگاہوں پر ہونے والی عبادات کے خلاف تحریریں آج بھی حوالے کے طور پر استعمال کی جاتی ہیں۔ تاہم یہ حقیقت ہے کہ سنی اسلام میں احیاء پسندی نے ایسٹ انڈیا کمپنی کی طاقت کے ظہور کے ساتھ ہی تقویت حاصل کرنی شروع کردی تھی۔

نوآبادیاتی ہندوستان میں مذہبی احیاء پسندی کے پھیلاؤ کے حوالے سے بہت سا علمی کام بکھرا پڑا ہے (۷۷)۔ آئندہ چل کر وجود میں آنے والے پاکستان میں اس کی سب سے توانا روایت پنجاب میں ملتی ہے۔ گوکہ انیسویں صدی کے آخر میں عیسائی کمیونٹی میں اضافے کی وجہ سے اس میں ہنگامی طور پر تیزی آگئی تھی لیکن اس کے علاوہ مقامی مصلحین کی ایک دوسرے کے ساتھ مقابلہ بازی کی فضا نے بھی اس میں کہیں زیادہ اہم کردار ادا کیا تھا۔ انیسویں صدی کے آخر میں سکھ سنگھ سبھا اور تبلیغی جماعت ہندو مصلحین کی ان کوششوں کے ردعمل کے طور پر قائم ہوئی تھیں جن کے تحت بھرپور کوشش کی گئی تھی کہ ہندومت سے دوسرے مذاہب میں داخل ہوجانے والی نچلی ذات کے ہندوؤں کو دوبارہ ہندو دھرم کے دائرے میں داخل کیا جائے۔ اس سلسلے میں قائم ہونے والے ہندو دھرم کے فرقے آریا سماج ہندو دھرم کی ان فرسودہ دھارمک تعلیمات کو تبدیل اور انہیں عام انسانوں کیلئے قابل قبول بنانے کی کوشش کی گئی تھی جو عیسائی مشنریوں کے حملوں کا بطور خاص ہدف تھیں۔ ان میں خاص طور پر توہمات کا سلسلہ اور دھرم کے نام پر عورتوں کے ساتھ بدسلوکی شامل تھی۔ اس حوالے سے ہندو دھرم کو جدیدیت کے تقاضوں کے مطابق ڈھالنے کیلئے مذہبی تعلیمات اور رسومات کو ''معقولیت'' کا تابع کرنے اور دھرم میں جابجا ہونے والے منفی اختراعات پر توجہ

مبذول کی گئی تھی۔

برطانوی ہندوستان میں مسلم احیاء نے دیوبندی، وہابی اور بریلوی مکتبہ ہائے فکر کی بنیاد رکھی۔ یہ وہی فرقے ہیں جو آج کے پاکستان میں ایک دوسرے کے ساتھ حالت جدل میں ہیں۔ یقیناً ان کے درمیان مسابقتی سرگرمیاں اس احیاء کی نمایاں خصوصیت تھی۔ فرانسس رابنسن نے اسلامی شناخت پر پرنٹنگ پریس کے اثرات پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے (۷۸)۔ ان مختلف کتب ہائے فکر سے وابستہ علماء اپنے اپنے اسلام کی تعبیرات کی حقانیت کو ثابت کرنے، اسے فروغ دینے اور ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کیلئے شد و مد سے مصروف تھے۔ فرقہ واریت ان احیائی کوششوں کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے چلنا شروع ہوگئی تھی۔ بہت سی کتابیں مصلحین کی صوفی درگاہوں کے کلٹ پر تنقید اور ایک اور اصلاحی تحریک احمدیت کے خلاف مزاحمت کے گرد گھومتی ہیں۔ احمدی تحریک اسلام کی موجودہ صورت کی بہت سی خصوصیات اور احیائی خطوط کو اپنے اندر سموئے ہوئے تھی تاہم اس کے بانی مرزا غلام احمد (۱۸۳۹۔۱۹۰۸) نے خود پر وحی نازل ہونے کا ذکر کرکے عملاً حضرت محمد کے نبیء آخر الزماں ہونے کے تصور کی نفی کردی جس نے دوسرے مذہبی عالموں کو مشتعل کردیا۔

احیائی کوششوں کے نتیجے میں سامنے آنے والی تحریکوں میں دیوبندی تحریک سب سے توانا اور بااثر تھی جس کی وجہ اس کے تعلیمی اداروں کا منظم نظام اور اپنے خیالات کی ترویج کیلئے نئے ذرائع اختیار کرنے کا رجحان تھا (۷۹)۔ یہ تحریک جو یوپی کے شہر سہارن پور کے ایک قصبے دیوبند کے نام پر بنائے گئے ایک دینی مدرسے سے شروع ہوئی تھی جلد ہی اس کی شہرت اردگرد کے علاقوں میں پھیلنے لگی۔ برطانوی ہند کے مرکزی صوبوں سے دور شروع ہونے والی اس تحریک نے مدرسے کے بانی مولانا محمد قاسم نانوتوی (۱۸۳۲۔۸۰) اور مولانا رشید احمد گنگوہی (۱۸۲۸۔۱۹۰۵) کو یہ موقع فراہم کیا کہ وہ اسے برطانوی حکومت کے اثر سے آزاد رہ کر آگے بڑھا سکیں۔ دیوبندی مدرسہ میں ذریعہ تعلیم انگریزی تھا نہ جدید علوم کی تعلیم دی جاتی تھی۔ اس مدرسے کے نصاب اور تدریس کا سارا زور نیک اعمال اور ذاتی اصلاح پر تھا اور یہ صوفی اسلام، شیعہ

اسلام اور سرسید احمد خان (۹۸۔۱۸۱۷) کی جدید طرز زندگی اور جدید علوم کی ترویج کے حوالے سے اپروچ کے یکساں مخالف تھے۔نوآبادیاتی دور کے پنجاب میں لاہور، جالندھر اور لدھیانہ دیوبندی اثرات کے حامل اس تحریک کے اہم علاقائی مراکز تھے۔مسلمان شہری نچلے درمیانہ طبقے میں شیعہ اور احمدی مسالک کے خلاف مخاصمانہ رویئے کو فروغ دینے کی روایت پر اس تحریک کا بہت زور رہا ہے۔۱۹۲۹ سے یہ تحریک مجلس احرار نامی ایک سیاسی تحریک کی سرگرمیوں میں اپنے وجود کا اظہار کرنا شروع ہوگئی تھی۔مجلس احرار نے اصل شہرت احمدیوں کی مخالفت اور کشمیر کی ریاست میں مسلمانوں کے حقوق کیلئے آواز اٹھانے کے سلسلے میں حاصل کی۔اس کا انہیں فائدہ یہ ہوا کہ آنے والے دنوں میں اس تحریک کو اپنی سرگرمیوں کے سلسلے میں لاہور میں مقیم بہت بڑی تعداد میں کشمیری برادری کی ہم نوائی میسر آ گئی۔بعد میں تحریک پاکستان کے حوالے سے اپنے موقف اور نئے ملک کے قیام کی مخالفت کی وجہ سے اس تحریک کی شہرت کا سورج گہنا گیا لیکن بعد میں مجلس احرار نے سپاہ صحابہ پاکستان کی صورت میں نیا جنم لیا۔سپاہ صحابہ کی انسپریشن کا مرکز ومحور یہی تحریک احرار رہی ہے اور اس مذہبی جماعت نے اسی شہری طبقے میں مقبولیت حاصل کی جو مجلس احرار کا دست و بازو رہ چکا تھا۔اس کے حمایتیوں میں زیادہ تر تقسیم کے دوران ہجرت کر کے پنجاب میں آباد ہونے والی کشمیری، ارائیں اور شیخ برادریاں شامل تھیں۔

۱۹۲۶ میں دیوبندی عالم مولانا محمد الیاس نے ایک مذہبی تحریک تبلیغی جماعت کی بنیاد رکھی جس نے جنوب مشرقی پنجاب کے علاقے میوات میں عقائد کے اعتبار سے نیم مسلمان میو آبادی کے عقائد کی اصلاح کرنے سے اپنی تبلیغی سرگرمیوں کی ابتدا کی(۸۰)۔اس وقت دنیا بھر میں اس کے چھ کروڑ سے زیادہ مقلدین موجود ہیں جبکہ اس تحریک کا ہیڈ کوارٹر بنگلہ دیش میں ڈھاکہ کے قریب واقع ہے اور یورپ میں اس کا اہم ترین مرکز ڈیوزبری میں واقع مرکزی جامع مسجد ہے۔جنرل ضیاء الحق نے بہت پرجوش انداز میں اس تحریک کی سرپرستی کی اور پاک فوج کے افسران اور جوانوں میں اس کی تبلیغی سرگرمیوں کی بھی حوصلہ افزائی کی۔پاکستان میں اس کی بڑھتی ہوئی حمایت کا

اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ رائے ونڈ میں واقع اس کے مرکز میں ہر سال منعقد ہونے والے اجتماع میں دس لاکھ سے زیادہ افراد شرکت کرتے ہیں۔گو کہ بظاہر یہ تحریک مکمل طور پر غیر سیاسی ہے اور اس نے خود کو تبلیغ دین اور فرد کی ذاتی اصلاح اور اس کی زندگی کو روز آخرت کے تقاضوں کے مطابق ڈھالنے کی کوششوں کی حد تک محدود رکھا ہوا ہے تاہم عجیب بات یہ ہے کہ مارچ ۲۰۰۴ میں میڈرڈ میں ہونے والے بم دھماکوں اور جولائی ۲۰۰۵ میں لندن کے بم دھماکوں کے ملزمان کا اس جماعت کی سرگرمیوں کے ساتھ متعلق ہونے کے شواہد سامنے آئے تھے۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ جب تحریک پاکستان سے وابستہ مسلمان اپنی انسپریشن سرسید احمد خان کی مسلمانوں کو جدید تعلیم کی جانب راغب کرنے کیلئے چلائی جانے والی علی گڑھ تحریک سے حاصل کر رہے تھے،علماء حضرات کی اکثریت خاص طور پر وہ جو دارالعلوم دیوبند کے ساتھ وابستہ تھے، تحریک پاکستان اور مطالبہ پاکستان کی مخالفت کر رہے تھے۔اس کی وجہ اس کی سیکولر قیادت اور علاقائی قوم پرستی تھی جو ان کے احیائے اسلام کی کوششوں اور مسلم امہ کی یکجائی کے تصور سے متصادم تھی(۸۱)۔لہٰذا اس صورت میں تحریک پاکستان کا مذہبی حوالے سے عوام کے جذبات کو متحرک کرنے کیلئے سارا انحصار صوفی اسلام کے نام لیواؤں پر تھا اور تحریک پاکستان کو جدید تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کیلئے اس کا انحصار علی گڑھ تحریک کی دانشورانہ سپورٹ پر تھا۔

مسلم لیگ کی کانگریس کے ساتھ محاذ آرائی کے دوران اس کی قیادت کو پاکستان کی عوامی زندگی میں اسلام کے کردار کو گہرائی میں جا کر سمجھنے اور جاننے کا موقع نہیں ملا۔اس بات نے پاکستان کی مخالفت کرنے والے دیوبندی مکتبہ فکر کے علماء کو موقع فراہم کیا کہ وہ تقسیم کے بعد ہندوستان سے ہجرت کر کے پاکستان آ جائیں اور اس نئی مملکت میں اپنے فرقہ پرستانہ عقائد کی ترویج اور اس ملک میں اپنی طرز کے اسلام کے نفاذ کیلئے کام کریں۔جیسا کہ ہم اس سلسلے میں آگے چل کر دیکھیں گے کہ اسلام کی متضاد تشریحات وتعبیرات نے ملک میں فرقہ پرستانہ کشیدگی کا راستہ ہموار کر دیا۔ریاست کی زیر سرپرستی اوپر سے نیچے تک معاشرے کو مخصوص طرز کے اسلام میں رنگنے کی کوششوں

نے جنرل ضیاء کے دور میں نقطہ انتہا کو چھولیا۔ایران میں برپا ہونے والے شیعہ انقلاب کے فوری بعد شیعہ اسلام کے ابھار کا توڑ کرنے کیلئے ریاست کی جانب سے ملک کو سنی رنگ میں رنگنے کی کوششوں نے پاکستان میں شیعہ سنی تنازعہ کو شدید کردیا۔۱۹۷۹ میں مفتی جعفر حسین نے پاکستان میں تحریک نفاذ فقہ جعفریہ نامی شیعہ تنظیم کی بنیاد رکھی۔اس تنظیم کے قیام کا مقصد ''سنیت'' کو رائج کرنے کی کوششوں کی مزاحمت اور ملک میں فقہ جعفریہ کے نفاذ کیلئے جدوجہد کرنا تھا۔اس کے جواب میں چھ سال کے بعد جھنگ شہر میں دیوبندی مکتبہ فکر سے تعلق رکھنے والے ایک مولوی مولانا حق نواز جھنگوی (۹۰۔۱۹۵۲) نے انجمن سپاہ صحابہ کی بنیاد رکھی جس کا نام بعد میں سپاہ صحابہ پاکستان رکھ دیا گیا۔حق نواز جھنگوی مجلس احرار کے جارحانہ طرز عمل اور شعلہ بیانی سے بہت متاثر تھا۔سب سے پہلے اس کا نام احمدیت کے خلاف چلنے والی تحریک کے دوران ابھر کر سامنے آیا۔اس تحریک کے نتیجے میں اس وقت کی حکومت نے ایک آئینی ترمیم کے ذریعے ۳۰ جون ۱۹۷۴ کو احمدیوں کو کافر قرار دے کر ان کی سرگرمیوں پر پابندی عائد کردی تھی۔سپاہ صحابہ کو دیوبندی مدارس اور ریاست کی جانب سے پشت پناہی حاصل تھی کیونکہ جنرل ضیاء شیعہ خطرے کو محدود کرنا چاہتا تھا جو ۱۹۷۹ میں زکواۃ اور عشر آرڈی نینس کے اجراء کے بعد ملک بھر میں احتجاج کرنے میں مصروف تھا۔

حق نواز نے شیعہ زمینداروں اور خلیجی ملکوں میں مقیم پاکستانیوں کی پشت پناہی کے حامل دونوں متحارب گروہوں کے درمیان بڑھتی ہوئی کشیدگی کے نتیجے میں اپنے ضلع جھنگ کو اپنی طاقت کا مرکز بنالیا۔وہ دونوں فرقوں کے درمیان مسلح تصادموں کے دوران ۱۹۹۰ میں ہونے والے ایک بم دھماکے کے نتیجے میں مارا گیا جس کے ردعمل نے سپاہ صحابہ پاکستان کے بطن سے لشکر جھنگوی نامی مسلح اور متشدد تنظیم کو جنم دیا۔افغانستان میں انہی دنوں افغان جنگ میں لڑنے والے مسلح گروپوں کے اقتدار پر قبضے کے نتیجے میں ان تنظیموں کو مزید تقویت حاصل ہوئی اور انہوں نے افغانستان کو تربیتی سہولتوں کے حصول کیلئے اپنا بیس کیمپ بنالیا۔جنرل مشرف نے اپنے دور اقتدار میں سپاہ صحابہ اور لشکر جھنگوی دونوں پر پابندی لگادی لیکن ان تنظیموں سے وابستہ جنگجوؤں نے اس کے فوری

بعد ''پنجابی طالبان'' نامی تنظیم کی بنیاد رکھ دی (ملاحظہ کیجئے ساتواں باب)۔

ایک اور عسکریت پسند تنظیم لشکر طیبہ کا تعلق بھی پنجاب سے ہے اور اس کا ہیڈ کوارٹر لاہور کے قریب مرید کے میں واقع ہے۔تاہم وہ اپنی فکری رہنمائی سلفی اسلام کی روایت سے حاصل کرتے ہیں۔یہ مرکز دعوۃ والارشاد نامی تنظیم کا مسلح ونگ ہے جس کا قیام ۱۹۸۷ میں عمل میں لایا گیا تھا۔اس کے تنظیمی اور جہادی نظریات کا پرچار تنظیم کی جانب سے شائع ہونے والے اردو ہفتہ وار ''جہاد ٹائمز'' اور انگریزی کے ہفتہ وار اخبار ''وائس آف اسلام'' کے ذریعے بھرپور انداز میں کیا جاتا ہے۔لشکر طیبہ نے ۲۰۰۵ میں جموں و کشمیر کو بھارت کے خلاف اپنی مسلح کارروائیوں کا مرکز بنالیا اور وہاں اس نے فدائین (خودکش حملہ آور) کا ایک گروپ تیار کرلیا جو جموں و کشمیر کے علاوہ بھارت کے اندر جاکر بھی اپنی کارروائیاں کرتا تھا۔ان کارروائیوں کی انتہا ۲۶ نومبر ۲۰۰۸ کو ممبئی میں ہونے والے حملے تھے۔لشکر طیبہ کا تعلق ہیتھرو ائر پورٹ پر حملے کرکے طیاروں کو مارگرانے کی منصوبہ بندی کے ساتھ بھی جوڑا جاتا ہے۔لشکر طیبہ کی بھارت میں جاکر حملے کرنے کی صلاحیت نے پاکستان اور بھارت کے درمیان امن کی کوششوں کو شدید نقصان پہنچایا ہے۔اس حوالے سے بھارت کا موقف یہ ہے کہ اس تنظیم کو پاکستانی فوج کی پشت پناہی حاصل ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ اسے مستقبل میں ہونے والی پراکسی کارروائیوں میں استعمال کیا جاسکے۔پاکستان میں کچھ تجزیہ نگاروں کا خیال ہے کہ اب یہ تنظیم اپنے سابق سرپرستوں کے اثر سے آزاد ہوکر کارروائیاں کرنے کی صلاحیت حاصل کرچکی ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ کشمیر کی آزادی کے حوالے سے اس کے موقف اور اس کی جانب سے کی جانے والی فلاحی سرگرمیوں کے نتیجے میں اسے عوام کے مختلف طبقات میں بہت زیادہ پذیرائی حاصل ہوچکی ہے۔

پاکستان میں زیادہ تر عسکریت پسند اور پنجاب طالبان سے وابستہ لوگوں نے دیوبندی مدرسوں سے تعلیم حاصل کی اور اپنے کیریر کا آغاز مین سٹریم دینی سیاسی پارٹیوں مثلاً جماعت اسلامی اور جمعیت العلماء اسلام سے کیا۔پنجاب طالبان پاکستانی ریاست کے خلاف مسلح کارروائیوں میں سرگرم ہے جبکہ لشکر جھنگوی اور سپاہ صحابہ کو سرکاری طور پر

بین کر دیا گیا ہے۔یہ سمجھنا بہت ضروری ہے کہ عسکری تحریکوں نے سرکاری سرپرستی اور امداد کی فضا میں آنکھ کھولی اور اسی ماحول میں وہ پروان چڑھیں۔ان تنظیموں میں تو کئی ایسی ہیں جن کی پرورش ریاست نے براہ راست اپنے عسکری اداروں کی زیر نگرانی کی۔جب یہ تنظیمیں کشمیر میں "جہاد" میں مصروف تھیں تو انہیں ناصرف ریاست کی جانب سے امداد و تعاون حاصل تھا بلکہ سماجی حوالے سے بھی ان کی خاصی حمایت پائی جاتی تھی۔اس بات کی مدد سے ہم سمجھ سکتے ہیں کہ نائن الیون کے بعد جہادی کلچر کو چیلنج کرنا کیوں مشکل ثابت ہوا اور کیوں آج بھی کھلے عام ان تنظیموں کی فنڈ ریزنگ کا عمل جاری ہے اور ان کا لٹریچر سرعام دستیاب ہے۔اس بات سے ملک کی دینی سیاسی جماعتوں کے مبہم موقف کی بھی وضاحت ہو جاتی ہے جو وہ جنگجو تنظیموں کی دہشت گردانہ کارروائیوں کے جواب میں اپنائے ہوئے ہیں۔جمعیت العلماء اسلام نے خود کو تحریک طالبان پاکستان سے دور کر رکھا ہے لیکن اس کے افغان طالبان کے ساتھ بدستور سرگرم تعلقات موجود ہیں۔

حرف آخر

اس باب میں ہم نے ان معاملات پر تفصیل سے روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے جن کے تحت پاکستان کے جغرافیے، ثقافت، مذہب اور معاشرے نے مل جل کر آزادی کے بعد پاکستان کی ترقی کی صورت گری کی ہے۔سیکورٹی کے خطرات نے اس کے ارتقائی عمل کی تشکیل کی ہے کیونکہ بہت سے حوالوں سے یہ ایک بارڈر لینڈ ریاست ہے جو متحارب سرحدوں کے نوآبادیاتی ترکے کی حامل ہے۔یہ بات بھی احاطہ تصور میں لایا جاسکتا ہے کہ ایک ریاست کی حیثیت سے اس کے مہاجر گروہوں اور اس کی بین الصوبائی آبادی کے درمیان رابطوں اور تعلقات نے اس پر گہرے اثرات مرتب کیے ہیں۔گو کہ پاکستان بھارت کی طرح بہت زیادہ کثیر السانی اور مذہبی تنوع کا حامل ملک نہیں ہے تاہم اس کے باوجود یہ یک رنگ ملک بھی نہیں ہے جیسا کہ بہت سی مغربی تحریروں میں اسے پیش کیا جاتا ہے یا جیسا کہ اسلامی ایکٹوسٹ اسے دیکھنے کے

خواہشمند ہیں۔اس حقیقت کا ادراک کرنے میں ناکامی اور اس ناکامی کے نتیجے میں سامنے آنے والے نتائج اس تاریخی بیانیہ کے ایک حصے کی تشکیل کرتے ہیں جسے ہم ان سطور میں دریافت کرنے کی کوشش کریں گے۔

اس باب سے ایک اور چیز جو نکھر کر سامنے آتی ہے وہ ہے ملک کی شدید ناہمواری کی شکار سماجی و معاشی ترقی۔آج جو علاقے پاکستان کا حصہ ہیں وہ ریاست کی تشکیل کے وقت ترقی کے مختلف مدارج پر موجود تھے۔زرائع پیداوار، مواصلات، تعلیم اور انفرادی حقوق کے حوالے سے ترکے میں ملنے والے فوائد اور زیادہ اہم یہ کہ نقصانات نے بعد از آزادی قومی تعمیر کے عمل کو بہت پیچیدہ بنا دیا تھا۔اسی طرح علاقائی سیکورٹی کے ناسازگار ماحول نے بھی سیاسی ترقی پر اپنے اثرات مرتب کیے ہیں۔حاصل شدہ ترکے سے عہدہ براہونے کی ریاستی کوششوں نے بھی اس کی چھ دہائیوں پر مشتمل تاریخ کی صورت گری کی ہے۔اس پر ہم آنے والے ابواب میں تفصیل سے بات کریں گے۔تاہم اس حقیقت کو سمجھنا ضروری ہے کہ سیاسی عدم استحکام بہرحال پاکستان کو منتقل ہونے والے نوآبادیاتی ترکے کا لازمی نتیجہ نہیں ہے۔اسی طرح ملک کے دونوں حصوں کے درمیان علیحدگی جو ایک دوسرے سے ایک ہزار میل کی دوری پر بھارتی سرحدوں کے آر پار واقع تھے بھی کوئی ایسی بات نہیں تھی جسے تقدیر کا لکھا سمجھا جائے۔سیاسی چوائسوں، سیکورٹی چیلنجوں کے جواب اور وراثت میں حاصل ہونیوالے تنوع نے قومی ترقی پر بہت شدید اثرات مرتب کیے ہیں۔

☆☆☆

حوالہ جات

۱۔ ملاحظہ کیجئے کے ایک کمال کی کتاب۔ "Pakistan: the Garrison State (New Delhi: Intelectual Publishing House, 1982). A. Waites, " The State and Civil Society in Pakistan:, Contemporary South Asia, 4, 3 (1995). Altaf Gauhar, " Ayub Khan: Pakistan's First Military Ruler (Karachi: Oxford Unviversity Press, 1996)

۲۔ Ian Talbot and Durharpal Singh, The Partition of India (Cambridge: Cambridge University Press, 2009), p. 38

۳۔ I.H Malik, "State and Civil Society in Pakistan: Politics of Authority, Ideology and Ethnicity (Basingstoke: Mcmillan, 1997)

۴۔ جماعت اسلامی کے سرگرمی کارکنوں نے مشرقی پاکستان میں دو مسلح جنگجو تنظیمیں البدر اور الشمس بنائی تھیں اور انہیں پاکستان آرمی نے فوجی تربیت فراہم کی تھی۔

۵۔ Sana Haroon, " Frontier of Faith: Islam in the Indo-Afghan Borderland (London: Hurst, 2007)

۶۔ روزنامہ ڈان، انٹرنیٹ ایڈیشن، ۲۴ اکتوبر ۲۰۱۰۔

۷۔ گیس کی فروخت کے موجودہ معاہدے کے تحت ۸۰۰ کلومیٹر طویل گیس پائپ لائن کے ذریعے روزانہ ایک ارب کیوبک فٹ گیس فراہم کی جائے گی جسے ۴،۵۰۰ میگاواٹ بجلی پیدا کرنے کیلئے استعمال کیا جائے گا۔

۸۔ پاکستان کو اس وقت اپنے ایندھن کے سب سے بڑے ذریعے قدرتی گیس میں ۲۰۳ ملین کیوبک فٹ روزانہ کے حساب سے کمی کا سامنا ہے۔دوسری جانب بجلی کا شارٹ فال اپنے ہمراہ آنے والی لوڈ شیڈنگ کے ساتھ چار سے چھ ہزار میگاواٹ ہے۔پاکستان کے کوئلے کے ذخائر جن سے ابھی تک استفادہ نہیں کیا جاسکا کے بارے

میں خیال ہے کہ وہ دنیا کے چند بڑے ذخائر میں شامل ہیں۔تھر فیلڈ جو سندھ میں ۹،۱۰۰ مربع میل کے رقبے میں پھیلی ہوئی ہے کوئلے کی ۱۷۵ ارب ٹن مقدار کی حامل ہے۔پاکستان کی توانائی کی ضروریات کو پورا کرنے کیلئے اگر اسے استعمال میں لایا جائے تو اس سے پاکستان میں ماحولیات کے شدید مسائل بھی پیدا ہو سکتے ہیں۔

۹۔ K.M. Badrakumar, "Pipeline Project a New Silk Road", Asia Times, 16 Dec. 2010

۱۰۔ Ishtiaq Ahmed, " Beyond Geopolitics of Resolving Conflict in Afghanistan" unpublished paper, BASAS conference, University of Southampton, 12 April 2011.

۱۱۔ روزنامہ ڈان، انٹرنیٹ ایڈیشن، یکم نومبر، ۲۰۱۰۔

۱۲۔ John Briscoe and Usman Qamar, "Pakistan's Water Economy: Running Dry (Washington, DC: Oxford University Press and the World Bank, 2006)

۱۳۔ مزید تفصیلات کیلئے ملاحظہ کیجئے روزنامہ ڈان، انٹرنیٹ ایڈیشن، ۵ جون، ۲۰۱۰۔

۱۴۔ روزنامہ ڈان، انٹرنیٹ ایڈیشن، ۵ جون، ۲۰۱۰۔

۱۵۔ روزنامہ ڈان، انٹرنیٹ ایڈیشن، ۱۵ اکتوبر، ۲۰۱۰۔

۱۶۔ یہ سی آئی اے کی ورلڈ فیکٹ بک میں درج اندازے ہیں۔

۱۷۔ پاکستان انسٹی ٹیوٹ آف پیس سٹڈیز کی جانب سے شائع کردہ پاکستان سیکورٹی کے بارے میں سالانہ رپورٹ برائے ۲۰۰۹ میں سیاسی، نسلی اور فرقہ وارانہ تشدد، دہشت گردی کی کارروائیوں اور دہشت گردی کے خلاف سرکاری آپریشنوں میں ہلاکتوں کی تعداد ۱۲،۰۰۰ بتائی گئی ہے۔

۱۸۔ اس حوالے سے تفصیلی مطالعے کیلئے ملاحظہ کیجئے: Michael Kugelman and Robert M. Hathaway (ed.), "Reaping th Dividend: Overcoming Pakistan's Demographic Challenges (Washington DC: Woodrow

Willson International Centre for Scholars, 2011)

۱۹۔ ۲۰۰۵ میں جاری کردہ ورلڈ بنک کے ڈیٹا میں وفاقی اخراجات کو جی ڈی پی کے ۴۔۳ فیصد تک بتایا گیا ہے جبکہ اس کی نسبت تعلیم پر ۶۔۱ فیصد اور صحت پر ۵۔۰ فیصد اخراجات کیے جارہے ہیں۔

۲۰۔ Statistics Division, Population Census Organisation, Government of Pakistan 1998, accessable at:

http://www.statpak.gov.pk/depts/pco/statistics/demographic_indicators.html

۲۱۔ Finace Division, Government of Pakistan, Population, Labour Force and Employment, Pakistan's Economic Survey, 2008-9

۲۲۔ UNDP, Gender Related Index (2000 - 08)

۲۳۔ Zahid Hussain, "Paradise Lost", Newsline (Feb. 2009), online edition

۲۴۔ Population Reference Bureau and National Committee for Maternal and Neo-natal Health (Pakistan), Pakistan on the Move: Family Planning, Reproductive Health and Development in Pakistan" , Michael Kugelman and Robert m. Hathaway (ed.) "Reaping th Dividend: Overcoming Pakistan's Demographic Challenges (Washington DC: Woodrow Willson International Centre for Scholars, 2011)

۲۵۔ ایضاً۔

۲۶۔ Zeba A. Sethar, " Domographic Doom or Demographic Dreams: Pakistan at the Crossroads" in "Reaping th Dividend: Overcoming Pakistan's Demographic Challenges (Washington DC:

Woodrow Willson International Centre for Scholars, 2011)

۲۷۔ یو این پاپولیشن ڈویژن کے اعداد وشمار مندرجہ ڈان انٹرنیٹ ایڈیشن، ۲۸ جولائی، ۲۰۰۹۔

۲۸۔ The Next Generation

http://www.britishcouncil.pk/pakistan-next-generation-report.pdf

British Counsil, Pakistan:

۲۹۔ Yaqoob Khan Bangash, The Integration of Princely States of Pakistan 1947 - 55, unpublished Oxford Dphil 2011

۳۰۔ ایضاً

۳۱۔ مزید تفصیلات کیلئے دیکھیے ایضاً۔

۳۲۔ ایضاً

۳۳۔ مزید تفصیلات کیلئے ملاحظہ کیجئے: Ian Talbot and Durharpal Singh, The Partition of India (Cambridge: Cambridge University Press, 2009), p. 38

۳۴۔ Population Division of the Department of Economic and Social Affairs of the United Nations Secretariat, World Population Project: The 2007 Revision and World Urbanization Prospects http://www.esa.un.org/unup

۳۵۔ پاکستان میں اسلامی نظریہ کو پختون رنگ میں ڈھالنے کے حوالے سے دیکھیے محمد عبدالقدیر کی کتاب، "Pakistan: Social and Cultural Transformation (New York: Routledge, 2007)

۳۶۔ Mohsin Ali, "Violence Drives Settlers Out of Province:, Gulf News, 28 July 2010)

۳۷۔ Roger Ballard, " The Context and Consequences of Migration:

Jullundur and Mirpur Compared", New Community 11, 1/2 (Autumn/Winter 1983)

۳۸۔ Akbar S. Ahmed, "Dubai Chalo: Problem in the Ethnic Encounter between Midle Eastern and South Asian Muslim Societies", Asian Affairs 15, pp. 262-76

۳۹۔ ڈان انٹرنیٹ ایڈیشن، ۱۱ فروری ۲۰۱۱ء۔

۴۰۔ Arshi Saleem Hashmi, "The Arabist Shift from Indo-Persian Civilisation and Genesis of Radicalization in Pakistan" Pakistan Institure for Peace Studies, 2009

۴۱۔ Judith M. Brown, "Global South Asians: Introducing the Modern Diaspora (Cambridge: Cambridge University Press, 2006)

۴۲۔ امریکہ میں مقیم پاکستانی برادری کے سائز اور پاکستان کے ساتھ اس کے معاشی روابط کی تفصیلات جاننے کیلئے ملاحظہ کیجئے عادل نجم کی کتاب، A Giving Community: Philanthropy by the Pakistan-American Diaspora (Harvard: Harvard University Press, 2006)

۴۳۔ Safya Aftab, "Poverty and Militancy" PIPS Journal of Conflict and Peace Studies (Oct-Dec. 2008), pp. 66-86

۴۴۔ اس نے حکومت پاکستان کو فاٹا 15- 2007 تک کیلئے ایک پائیدار ترقی کا منصوبہ بنانے میں مدد فراہم کی۔

۴۵۔ Safya Aftab, "Poverty and Militancy"

۴۶۔ Shahid Javed Burki, "The Middle-Class Millions" Dawn, Internet Edition, 2 Nov. 2010

۴۷۔ Sadaf Ahmed, "Identity Matters, Culture Wars: An Account of Ah-Huda (re) Defining Identity and Reconfiguring Culture in

Pakistan", Culture and Religion 9, 1 (2008)

۴۸۔ David Hensen, "Radical Rhetoric - Moderate Behaviour: Perceptions of Islam, Sharia and the Radical Dimensions Among Inhabitants of Islamabad and Rawalpindi in the post 9/11 Pakistan Reality" unpublished PhD. Thesis, University of Oslo, 2010

۴۹۔ Pervez Hoodbhoy, "Pakistan after Osama June 2011" Himal http://www.himal-mag.com/component/content/article/4466.html

۵۰۔ روزنامہ ڈان، انٹرنیٹ ایڈیشن، ۳۰ مئی ۲۰۱۱ء۔

۵۱۔ I.H Malik, "State and Civil Society in Pakistan: Politics of Authority, Ideology and Ethnicity (Basingstoke: Mcmillan, 1997)

۵۲۔ Ian Talbot, "Pakistan: A Modern History", p. 361

۵۴۔ David Hensen, "Radical Rhetoric - Moderate Behaviour:

۵۵۔ وسیم نے ''فیوڈلز'' کی اصطلاح کو درمیانے طبقات کے مقابلے میں ان کے اپنے الفاظ میں سیاسی طبقات کے اندر یکجا کردیا ہے۔ ملاحظہ کیجئے محمد وسیم کی تحریر ''اے ٹیل آف ٹو کلاسز'' ڈان (کراچی)، ۱۵ دسمبر ۲۰۰۹ء۔

۵۶۔ مسلمان معاشروں میں جمہوریت کی تشکیل کے عمل میں مڈل کلاس کے ابھار کے حوالے سے ایک وسیع تر منظر کے مطالعے کیلئے ملاحظہ کیجئے ولی نصر کی تصنیف، "Forces of Fortune: The Rise of the New Muslim Middle Class and What It Will Mean for our World (New York: Free Press, 2009)

۵۷۔ Mathew J. Nelson, "In the Shadow of Shari'ah: Islam, Islamic Law and Democracy in Pakistan (London: Hurst 2011)

۵۸۔ Mathew J. Nelson, "In the Shadow of Shari'ah, and Anatol Lieven, Pakistan: A Hard Country (London: Allen Lane, 2011)

۵۹۔ Tariq Rehman, Language, Ideology and Power:

Language-Learning Among the Muslims of Pakistan and North India (Karachi: Oxford University Press, 2002) p. 217

۶۰۔ Farina Mir, "The Social Space of Language: Vernacular, Culture in British Colonial Punjab (Burkeley, CA: University of California Press, 2010)

۶۱۔ سندھی زبان کی تحریک کے حوالے سے مزید تفصیلات کیلئے ملاحظہ فرمایئے طارق رحمٰن کی تصنیف، Language and Politics in Pakistan (Karachi: Oxford University Press, 1998)

۶۲۔ G.M. Sayed, A Case for Sindhu Desh (London: Sindh International Council, 2000)

۶۳۔ Tariq Rehman, Language and Politics in Pakistan (Karachi: Oxford University Press, 1998)

۶۴۔ Christophe Jaffrelot, " India and Pakistan: Interpreting the Divergence of Two Political Trajectories", Cambridge Review of International Affairs.

۶۵۔ Qadeer, "Pakistan: Social and Cultural Transformation in a Muslim Nation"

۶۶۔ David Hensen, "Radical Rhetoric - Moderate Behaviour:

۶۷۔ Praveen Swami, India, Pakistan and the Secret Jihad (London: Routledge, 2007), Rizwan Hussain, Pakistan and the Emergence of Islamic Militancy in Afghanistan (Burlington: -Ashgate, 2005)

۶۸۔ Zahid Hussain, "Frontline Pakistan: The Struggle with Militant Islam (New york: Columbia University Press, 2007)

۶۹۔ Willian Millam, "Factors Shaping the Future", in S.Cohen (ed.), Pakistan's Future: The Bellagio Paps http://www.brookings.edu/-media/files/rc/papers/2010/09_bellagio_conference_papers/09_bellagio_papers.pdf

۷۰۔ اس منظر نامے کے ایک سرے پر عدم برداشت کا رویہ اقلیتوں پر حملوں یا ان افراد پر حملوں کی صورت میں اپنا اظہار کرتا ہے جو اسلام کی تنگ نظر تعبیر پر سوالات اٹھاتے ہیں جبکہ دوسرے سرے پر آبادی کے بہت سے طبقات کا وہ رویہ ہے جو ایسے اقدامات کی مذمت کرنے سے انکاری ہے یا وہ ایسے عناصر کی موجودگی کو جواز فراہم کرنے کیلئے سازشی تھیوریوں میں پناہ تلاش کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

۷۱۔ مثال کے طور پر ملاحظہ کیجئے سی فیئر کی کتاب، "Militant Recrutment in Pakistan: Implication for Al Qaeda and Other Organizations, Endowment for Studies in Conflict and Terrorism (Nov. Dec. 2004) Peace, 2005)

۷۲۔ Tariq Rehman, "Education in Pakistan: A Survey, in Craig Baxter (ed.) Pakistan on the Brink: Politics, Economics and Society (Karachi: Oxford University Press, 2004)

۷۳۔ David Hensen, "Radical Rhetoric - Moderate Behaviour

۷۴۔ ایضاً۔ اکثر دیوبندی بھی مزارات پر حاضری دینے میں حرج نہیں سمجھتے اگر وہاں جا کر صرف فاتحہ پڑھنی مقصود ہو۔

۷۵۔ Dilawar Jaan, "Why Did Swat Millitant Exume Pir Samiullah's Body?" The News (Karachi), 19 Dec. 2008

۷۶۔ David Hensen, "Radical Rhetoric - Moderate Behaviour

۷۷۔ ایک عمومی جائزے کیلئے دیکھیے آئین ٹالبوٹ کی کتاب ''انڈیا اینڈ پاکستان'' (لندن: آرنلڈ، ۲۰۰۰)۔

۷۸۔ Francis Robinson, "Islam and the Impact of Print in South Asia" in Nigel Crook (ed), The Transmission of Knowledge in South Asia (Delhi: Oxford University Press, 1996)

۷۹۔ Barbara D. Metcalf, "Islamic Revival in British India: Deoband 1860 - 1900" (Delhi: Oxford University Press, 1982)

۸۰۔ M. Anwarul Haq, "The Faith Movement of Mawlana Muhammad Ilyas (London: George Allen& Unwin, 1972)

۸۱۔ علی گڑھ اور مسلم علیحدگی کی تحریک یعنی تحریک پاکستان کے ابھرتے ہوئے کردار کے مزید مطالعے کیلئے ملاحظہ کیجئے، ڈیوڈ لیلی ویلڈ کی تصنیف، ''علی گڑھز فرسٹ جنریشن (پرنسٹن: پرنسٹن یونیورسٹی پریس، ۱۹۷۸)۔

☆☆☆

۲

پاکستان کے پہلے جمہوری تجربے کی ناکامی

۱۹۴۷ـ۵۸

پاکستان تقسیم کی آگ کے بطن سے طلوع ہوا لیکن اس کے ساتھ ہی یہ نوزائیدہ مملکت انفرادی اور اجتماعی سطحوں پر بے شمار آرزوؤں اور امیدوں کا محور بھی تھی۔ ہندوستانی مسلمانوں کی ثقافتی اور مادی زندگی صرف ایک جمہوری اقدار کے حامل وطن میں ہی آسودگی پا سکتی تھی لیکن آزادی کے بعد معاملات نے جو رخ اختیار کیا اس نے ایک دہائی سے بھی کم عرصے میں امیدوں کو ناامیدی اور خوش فہمیوں کو مایوسیوں میں بدل دیا۔ آبادی کی خاموش اکثریت اس صورتحال میں ایک فوجی حکمران سے ریاست اور معاشرے کو نئے خطوط پر استوار کرنے کی امید لگانے پر مجبور ہوگئی۔

پاکستان کے پہلے جمہوری تجربہ نے کہاں پر ٹھوکر کھائی؟ پاکستان کی سیاسی ٹریجیکٹری اپنے ہمسائے بھارت کے مقابلے میں اس قدر واضح طور پر کہاں سے مختلف ہونا شروع ہوئی جبکہ دونوں ہمسائیہ ملکوں نے برطانوی راج سے ایک جیسی روایات اور ادارے وراثت میں حاصل کیے تھے؟

اس باب میں اس حوالے سے بات کی گئی ہے کہ پاکستان کی سیاسی وراثت نے کشمیر کے تنازعے کے ساتھ مل کر اس کے جمہوری ارتقاء میں رکاوٹیں ڈال دیں۔ اس کے نتیجے کے طور پر ایک ایسی ریاست ابھر کر سامنے آئی جس نے جمہوری استحکام کو نیشنل سیکورٹی کی قربان گاہ پر قربان چڑھا دیا اور جس میں ۱۹۴۰ میں منظور کیے جانے والی

قرارداد میں کثیریت پر مبنی وژن (Pluralist Vision) پر سخت گیر مرکزیت کو ترجیح دینا شروع کردی۔اس تجزیئے کی جانب آنے سے پہلے ہم ان بے شمار وضاحتوں اور تشریحات کا جائزہ لیں گے جو اس کی تشکیل کے ابتدائی برسوں میں ریاست کی سیاسی ٹرَیجکٹری کی شکل وصورت کو بیان کرنے کیلئے دی جاتی ہیں۔

جمہوری ناکامی کیلئے وضاحتیں

پاکستان کے پہلے جمہوری تجربے کی ناکامی کے حوالے سے بہت سی تشریحات وتعبیرات پائی جاتی ہیں۔ان میں سے سب سے سادہ وہ وضاحت ہے جو کھلے عام ۱۹۵۸ کے پہلے فوجی انقلاب کے جواز میں پیش کی جاتی ہے جس نے ریاست کے جمہوری سفر میں پہلی بڑی رکاوٹ کھڑی کردی تھی۔یہ سیاست دانوں کے اختیارات کے ناجائز استعمال، کرپشن اور دھڑے بندی پر مبنی سازشوں کے ذریعے ملک کو گھٹنوں پر جھکادینے کے حوالے سے ان کے کردار پر روشنی ڈالتی ہے۔اس میں اس حقیقت کو بہت آسانی کے ساتھ نظر انداز کردیا جاتا ہے کہ سیاسی عمل میں مداخلت فوج کے ادارہ جاتی مفادات ومحرکات کا نتیجہ بھی ہوسکتی تھی۔بعد میں ہونے والے فوجی انقلابات میں بھی اسی طرح سے اس حقیقت کو نظر انداز کردیا گیا۔اس کے برعکس فوج کی جانب سے سامنے آنے والی وضاحتوں کے استرداد میں یہ بھی کہا جاتا رہا ہے کہ سکندر مرزا (۱۹۵۶ـ۸ تک صدر مملکت) اور غلام محمد (۱۹۵۱ـ۵ تک گورنر جنرل) جیسے بیوروکریٹوں کے شدید جمہوریت دشمن رویوں نے سیاستدانوں پر عدم اعتماد اور منتخب حکومتوں کو برطرف کرنے کی بے قراریوں نے فوجی انقلاب کا راستہ ہموار کیا تھا۔اس حوالے سے یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ ان بیوروکریٹوں کے نوآبادیاتی دور میں تشکیل پانے والے کیریئر نے ان کے اندر غیر جمہوری جذبات کی پرورش کردی تھی (۱)۔ بہت سے حوالوں سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ غلام محمد کی جانب سے ۱۹۵۴ میں پاکستان کی پہلی دستور ساز اسمبلی کو برطرف کیا جانا آزادی کے بعد ہونے والی ڈویلپمنٹ کے دوران ایک بہت اہم سنگ میل ثابت ہوا۔ایلن میگراتھ اس دور میں پیش آنے والے واقعات

کے حوالے سے اپنے کام میں ناصرف غلام محمد بلکہ اس کے اس اقدام کو قانونی چھتری فراہم کرنے کے سلسلے میں اس وقت کے چیف جسٹس محمد منیر پر بھی شدید تنقید کرتا ہے (۲)۔ایم ایم سید بھی میگراتھ کی ہمنوائی کرتے ہوئے پاکستان کی جمہوری ناکامی کو اس قسم کے آزمودہ کار بیوروکریٹوں کے اتنی اہم عہدوں پر فائز ہونے کی بدنصیبی کا شاخسانہ قرار دیتا ہے (۳)۔اس کے ساتھ ہی پاکستان کی پارلیمانی جمہوریت کی ناکامی کو مسلم لیگ کے زوال کے ساتھ بھی منسوب کیا جاسکتا ہے۔(۴)۔ یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ بھارت میں اپنی کاؤنٹر پارٹ کانگریس کے برعکس اس نے آزادی کے حصول کے بعد نوآزاد ملک میں جمہوریت کے استحکام کیلئے ستون کا کردار ادا کرنے میں کوئی دلچسپی نہیں دکھائی۔یہ بات اس حقیقت سے بھی واضح ہوتی ہے کہ درحقیقت مسلم لیگ پاکستان میں شامل علاقوں کے سیاسی منظر نامے میں بہت بعد میں داخل ہوئی تھی۔حکمرانی کی روایات اور مضبوط اداروں سے محرومی نے مسلم لیگ کو پنجاب جیسے اہم ترین علاقوں میں اپنے وجود کو قائم کرنے کیلئے جاگیردار اشرافیہ کا سہارا لینے پر مجبور کردیا تھا۔اس طریقے سے آزادی حاصل کرنے کی قیمت ''آقائیت اور غلامی'' پر مبنی سیاسی رشتوں کی مضبوطی کی شکل میں ادا کرنا ناگزیر تھا اور یہی بعد میں ہونے والے سیاسی و جمہوری عمل میں بھی سرایت کرگیا تھا۔

عائشہ جلال نے پاکستان کی بعد از آزادی کی دہائی کے بارے میں نہایت مستند کام کیا ہے۔اس کے تمام کام میں موجود واحد تھیم وہ تضادات ہیں جو ریاست کے استحکام اور سیاسی شراکت داری کے درمیان پائے جاتے تھے۔پاکستان کے شدید مالیاتی مسائل اور سٹریٹجک حوالے سے عدم تحفظ کے احساس نے ہمیشہ ۱۹۴۰ میں منظور ہونے والی لاہور قرارداد میں پیش کیے جانے والے جمہوری بندوبست کی روح کے برخلاف عمل کیا ہے۔اس کا ایک مطلب یہ بھی ہے کہ مسلم لیگ بھی بجائے خودنظر انداز کی جارہی تھی۔چونکہ بیوروکریسی اور فوج مہاجرین کی آمد سے پیدا ہونے والے مسائل اور کشمیر کے معاملے میں بھارت کے ساتھ مخاصمانہ صورت حال سے نمٹ رہی تھیں لہٰذا انہوں نے ازخود ریاست کے اہم ترین ستونوں کا درجہ حاصل کرلیا تھا۔ان دونوں قوتوں

نے مل کر ریاست کے وسائل کو ترقی کی سیاسی معیشت(Political Economy) کی بجائے دفاع کی سیاسی معیشت کی جانب موڑ دیا۔اس سارے عمل میں امریکہ کے ساتھ بڑھتے ہوئے سٹریٹجک تعلقات سے معاونت حاصل کی گئی۔عائشہ جلال ۱۹۵۸ کے فوجی انقلاب کا پس منظر بیان کرتے ہوئے اپنے تجزیئے کو یہ قرار دیتے ہوئے سمیٹتی ہیں کہ صوبوں میں سیاسی عمل کو روک دیا گیا تاہم ریاست کے استحکام کو اس کے غیر منتخب اداروں کے گرد لپیٹنے کے دوران مکمل طور پر کچلا نہیں گیا۔فوج کے بارے میں یہ تصور کیا جاتا ہے کہ اس نے قومی انتخابات کے بعد بنگالی سیاست دانوں کو ریاست کے اقتدار پر فائز ہونے سے روکنے کیلئے حفظ ماتقدم کے طور پر اقتدار پر قبضہ کرلیا کیونکہ بنگال سے تعلق رکھنے سیاست دانوں کا وژن ان لوگوں سے یکسر مختلف تھا جن کا مغربی پاکستان کی اسٹیبلشمنٹ پر قبضہ تھا(۵)۔

پاکستان میں شامل سابق ریاستوں جو خاصے بڑے رقبے پر مشتمل تھیں کے بارے میں حال ہی میں ہونے والی تحقیق بھی عائشہ جلال کے موقف کی تائید کرتی ہے۔ بھارت میں تو ایک سیاست دان سردار ولبھ بھائی پٹیل نے سابق ریاستوں کو بھارت میں ضم کرنے کے سلسلے میں کردار ادا کیا تھا جبکہ پاکستان میں یہی کام بیوروکریسی نے سر انجام دیا۔یہاں ایک بیوروکریٹ کرنل اے ایس بی شاہ جو وزارت خارجہ کا پہلا جوائنٹ سیکرٹری تھا اور جو بعد میں ریاستوں اور سرحدی علاقوں کے امور کی وزارت کا سیکرٹری مقرر ہوا اس سارے معاملے کی نگرانی پر مامور تھا۔ملک بھر میں ہونے والی سیاسی تبدیلیوں کے عمل میں سیکورٹی امور پر حد سے زیادہ زور دینے کے رجحان نے ان سابق ریاستوں کے معاملے میں شدت اختیار کرلی تھی جہاں دیر اور سوات جیسی ریاستوں میں مطلق العنانی کا کئی سال تک راج رہا یا سندھ میں ریاست خیر پور، بہت تھوڑی مدت کیلئے برقرار رہنے والی بلوچستان سٹیٹ یونین حتیٰ کہ ریاست بہاولپور کی صورت میں سابق حکمرانوں کو فوری طور پر تبدیل کرکے ان ریاستوں کو مرکزیت پسند حکومت کے کنٹرول میں دیدیا گیا(۶)۔

آزادی کے بعد پاکستان کی ناکامیوں کو اس سیاسی یکجہتی کے آزادی کے

تھوڑی ہی دیر بعد اپنی موت آپ مرجانے کے حوالے سے بھی دیکھا جاسکتا ہے جس نے قیام پاکستان سے قبل مسلمانوں کے ہر طبقے میں اپنا بھرپور اظہار کیا تھا۔یونس صمد کے مطابق بھاری بھرکم مرکزیت کے آہنی ہاتھوں نے ملک میں ''مرکز گریز'' قوتوں کو ابھرنے اور پنپنے کا موقع فراہم کیا۔عائشہ جلال کی طرح وہ امریکہ کی مالی اور فوجی امداد کی وجہ سے بیوروکریسی اور فوج کے درمیان پروان چڑھتے ہوئے گٹھ جوڑ پیدا ہونے والی شدت پر اپنی توجہ مرکوز کرتے ہیں۔ان کے خیال میں غلام محمد کے دستور ساز اسمبلی کو تحلیل کرنے کے عمل میں یہ گٹھ جوڑ اس کا بہت زیادہ معاون ثابت ہوا تھا(۷)۔

پاکستان مسلم لیگ کی مرگِ ناگہانی کے بارے میں جو کوئی بھی تعبیر کی جائے لیکن مصنفین اس حوالے سے اہم سنگ میل پر اتفاق کرتے ہیں۔پہلا سنگ میل یہ ہے کہ ۱۹۴۸ میں پاکستان مسلم لیگ کی کونسل نے پارٹی عہدوں اور سرکاری عہدوں کو ایک دوسرے سے الگ کرنے کا فیصلہ کیا۔اس فیصلے کے بعد وزراء پر پارٹی عہدے رکھنے پر پابندی عائد کردی گئی۔دوسرا سنگ میل اکتوبر ۱۹۵۱ میں ملک کے پہلے وزیراعظم لیاقت علی خان کا راولپنڈی کے کمپنی باغ میں ہونے والے جلسہ عام میں قتل کیا جانا تھا۔وہ اس وقت کونسل کے مذکورہ فیصلے کو عملی جامہ پہنانے میں مصروف تھے۔تیسرا سنگ میل ۱۹۵۴ کے موسم بہار میں ہونے والے انتخابات میں مشرقی پاکستان میں مسلم لیگ کی بہت بری شکست تھی۔ایک اور سنگ میل اس وقت سامنے آیا جب مئی ۱۹۵۶ میں مغربی پاکستان کے زمینداروں نے بیوروکریسی کے آلہ کار کے طور پر وجود میں آنے والی ری پبلکن پارٹی میں گروہ در گروہ شمولیت اختیار کرلی اور آخری یہ کہ ستمبر ۱۹۵۶ میں بیوروکریسی سے وزارت عظمٰی کے عہدے پر فائز ہونے والے چودھری محمد علی کا استعفیٰ دینا جو اس بات کا اشارہ تھا کہ پاکستان مسلم لیگ کی مرکز اور صوبوں میں موجودگی اپنے انجام کو پہنچ چکی ہے۔

ان کلیدی واقعات کو تاریخی تناظر میں سمجھنا ضروری ہے جو ظاہر کرتے ہیں کہ نوآبادیاتی دور سے ترکے میں ملنے والے انتظامی کلچر کی صورت میں، مسلم لیگ کے مستقبل کے پاکستان میں کمزور ادارہ جاتی صلاحیتوں اور اس کے نتیجے میں ریاست کی مالیاتی حدود اور سٹریٹجک عدم تحفظ کے احساس کے تناظر میں ریاست کی تعمیر کے عمل میں

حال دشواریوں کے مرکزیت پسند حل تھوپنے کی صورت میں سیاسی زوال کا آغاز ہو چکا
تھا۔اس باب میں ان مسائل پر خاص طور پر توجہ مرکوز کی جائے گی۔

تاریخی وراثت

ا۔ شمال مغربی ہندوستان میں برطانوی سیکورٹی سٹیٹ:

بعض تجزیہ نگاروں کے نزدیک پاکستان میں آزادی کے بعد فوج کے بتدریج
بڑھتے ہوئے غلبے کی جڑیں نوآبادیاتی دور میں انیسویں صدی کے آخر میں فوج کی بھرتی
کیلئے اپنائی جانے والی پالیسیاں تھیں۔ان پالیسیوں کے نتیجے میں پنجاب فوج کا بڑا مرکز
بن گیا تھا۔بظاہر تو اس پالیسی کا تعلق انگریز حکمرانوں کی جانب سے ہندوستان میں
مارشل ریس کو پیدا کرنا تھا یعنی ایسی نسلیں اور گروہ پیدا کرنا جہاں انگریز فوج بہترین
فوجیوں کو بھرتی کر سکے لیکن اس کے ساتھ ہی یہ یقینی بنانا تھا کہ فوجی بھرتیاں ایسے علاقے
سے کی جائیں جو ہندوستانی قوم پرستی کے ابھار سے پاک ہو(۸)۔۱۸۵۷ کی جنگ
آزادی میں پنجاب کی ''وفاداری'' نے برطانوی راج اور کوہستان نمک کے علاقے کے
ٹوانہ خاندان جیسے دیگر جاگیر دار فوجی کنٹریکٹروں کے درمیان ایک سٹریٹیجک الائنس کے
قیام کی حوصلہ افزائی کی(۹)۔اس شاہی کنکشن کے نتیجے میں پنجاب نے مالی طور پر بہت
فائدہ اٹھایا اور اس کے ساتھ ہی برطانوی بلوچستان اور شمال مغربی سرحدی صوبے میں
بھی پدری مطلق العنانیت کی روایت نے تقویت حاصل کی۔یہ استدلال بھی کیا جاتا ہے
کہ بجائے اس کے کہ پاکستان اور بھارت دونوں برطانوی راج کے مشترکہ گورننس کے
ڈھانچے سے استفادہ حاصل کرتے، انگریز حکومت نے مغربی پاکستان پر مشتمل علاقوں
میں اپنے مفادات کیلئے برطانوی سیکورٹی سٹیٹ کے قیام کو ترجیح دی(۱۰)۔اس حوالے
سے سیاسی نظم و ضبط برقرار رکھنے کے تقاضوں کو یہاں نمائندہ جمہوری اداروں کے پروان
چڑھنے پر ترجیح دی گئی۔

خالد بن سعید وہ پہلے مصنف ہیں جنہوں نے مستقبل کے پاکستانی علاقوں میں
برطانوی راج کے استبدادی طرز حکومت کیلئے ''وائس ریگل ازم'' کی اصطلاح استعمال

کی۔اس طرز حکومت کی نمایاں خصوصیات میں استبدادیت، بیوروکریسی کو حد سے زیادہ
صوابدیدی اختیارات تفویض کرنا اور اتھارٹی کو فرد کے تابع کرنا شامل تھا۔ان خصوصیات
کی مثالی صورت فرنٹیر کرائمز ریگولیشن (ایف سی آر) میں دیکھی جا سکتی ہے۔انگریزوں
نے دریائے سندھ اور دریائے گنگا کے درمیانی علاقے میں قائم اپنی سلطنت کو روس میں
زار کی سلطنت سے محفوظ بنانے کیلئے برصغیر کے اس حصے کو ایک الگ حیثیت دے رکھی
تھی۔اس دور میں بھی جب شمال مغربی سرحدی صوبے کو پنجاب سے انتظامی لحاظ سے
الگ کر دیا گیا تھا انگریزوں نے موخر الذکر کی سٹریٹیجک اہمیت کو برقرار رکھا گیا کیونکہ یہ
انڈین آرمی کی بھرتی کا سب سے اہم مرکز تھا۔ نا صرف پنجاب بلکہ مستقبل کے مغربی
پاکستان کے دیگر علاقوں میں بھی امن و امان کو یقینی بنانا اس کی ایک پیشگی شرط تھی۔اس
انتظامی سوچ نے انگریز حکومت کو ہندوستان کے دوسرے علاقوں میں پھیلتی ہوئی پاپولر
نمائندگی کے اثرات سے بھی بچا رکھا تھا۔

انگریزوں نے صوبہ سرحد اور بلوچستان میں سیاسی شراکت کے عمل کو تاخیر کا
شکار بنا دیا تھا۔۱۹۲۷ میں کہیں جا کر سائمن کمیشن نے یہ قرار دیا کہ شمال مغربی سرحدی
صوبہ اپنی سٹریٹیجک لوکیشن کے حوالے سے سیلف گورنمنٹ کیلئے ناموزوں ہے۔بعد میں
جب صوبہ سرحد میں خود مختار حکومت کے قیام کیلئے مظاہرے شروع ہو گئے تو انگریزوں
نے با امر مجبوری ۳۲-۱۹۳۰ میں یہاں مخلوط حکومت کے قیام کی منظوری دے دی جبکہ
ہندوستان کے دیگر علاقوں میں یہ طرز حکومت ۱۹۱۹ سے رائج کیا جا چکا تھا۔این ڈبلیو
ایف پی میں لوگوں کو ان کے سیاسی حقوق دینے سے انکار کا عمل اس بات کی بھی
وضاحت کرتا ہے کہ کیوں یہاں آبادی کے ایک حصے نے کانگریس کے ساتھ اپنے
تعلقات استوار کر لیے تھے۔دوسری جانب بلوچستان میں آزادی کے وقت تک انتخابی
سیاست کو پورے صوبے میں عام کرنے کی بجائے اسے صرف کوئٹہ میونسپلٹی کی حدود تک
روا رکھا گیا۔اس حوالے سے معروف تجزیہ نگار محمد وسیم استدلال پیش کرتے ہوئے کہتے
ہیں کہ ''پاکستان پر مشتمل نہایت اہمیت کے حامل علاقوں میں انتخابی سیاست کی سست
رفتار پیش قدمی کو انتخابی جمہوریت کے حوالے سے کیے جانے والے کسی بھی جائزے میں

پیش نظر رکھنا ضروری ہے ۔۔۔۔خاص طور پر اگر اس کا موازنہ بھارت کے ساتھ کیا جائے"(۱۱)۔

وہ بیوروکریٹک رویے جو برطانوی سیکورٹی سٹیٹ کی جانب سے شمال مغربی ہندوستان میں نوآبادیاتی حکومت کے آخری روز تک اختیار کیے گئے انہیں پاکستانی نوکر شاہی نے ۱۹۵۰ کی دہائی میں بھی اپنے سینے سے لگائے رکھا۔نوکر شاہی کے کارندوں کو خاص طور پر سابق ریاستوں میں بے لگام چھوڑ دیا گیا جہاں انہوں نے طاقت پر بیوروکریسی اور فوج کی گرفت کو جواز فراہم کرنے اور اسے مضبوط کرنے کیلئے سیکورٹی تحفظات کا بہانہ تراشا اور یہی چیز آگے چل کر قومی ترقی کیلئے بدشگونی کا باعث بنی۔ایک اور تجزیہ نگار یعقوب خان بنگش نے انکشاف کیا ہے کہ "رینگتی ہوئی مطلق العنانیت" جو ۱۹۵۴ سے مسلسل روا رکھی جارہی ہے سابق ریاستوں میں بہت پہلے سے اپنا وجود رکھتی تھی (۱۲)۔ان علاقوں میں ریاستی اور سرحدی علاقوں کے معاملات کی انچارج وزارت کنٹرول کیا کرتی تھی۔ بھارت اور افغانستان کے ساتھ کشیدگی کی صورت حال سے پیدا ہونے والے سیکورٹی خدشات نے سابق ریاستوں میں جمہوری عمل کے عنقاء ہونے کے معاملات پر غلبہ حاصل کرلیا تھا۔حکومت نے جمہوریت کی "راشن بندی" کردی اور اسے قومی یکجہتی کے پورے عمل کے ایک جزو کے طور پر نافذ کرنے کی بجائے سابق ریاستوں کے ان والیوں اور شہزادوں کو نیچا دکھانے کیلئے استعمال کیا گیا جو ریاست پر قابض قوتوں کی مکمل اطاعت کرنے سے گریزاں تھے۔بنگش کا کہنا ہے کہ "۱۹۵۴ تک محدود دستوری و سیاسی یکجائی کے ساتھ سابق ریاستیں مکمل طور پر ریاست پاکستان دستوری حصہ نہیں تھیں اور وہاں کی رعایا ایک آزاد ملک کی مکمل شہریت سے بہرہ ور نہ ہوسکی تھی" (۱۳)۔ یہاں تک کہ خیرپور اور بہاولپور جیسی ترقی پسند ریاستوں میں جہاں ان کی اپنی منتخب اسمبلیاں وجود رکھتی تھیں وہاں بھی مرکز کی جانب سے مقرر کیے جانے والے مشیران اور وزرائے اعلیٰ منتخب نمائندوں پر حاوی ہوا کرتے تھے (۱۴)۔جہاں فرنٹیر اور بلوچستان میں میں انتخابی سیاست نے سیکورٹی مفادات کو معرض خطر میں ڈالا بیوروکریسی اور پاکستان مسلم لیگ اسے کچل دینے مشترکہ طور پر حرکت میں آگئیں۔

جمہوریت کے حوالے سے ان عمومی رویوں کی صورت گری کچھ یوں تھی کہ نا صرف سابق ریاست قلات کی نیشنل پارٹی پر ۱۹۴۸ میں پابندی عائد کردی گئی بلکہ جب آل پاکستان سٹیٹس مسلم لیگ نے بھی پر پرزے نکالنا اور خودمختاری حاصل کرنا شروع کی تو اس سے بھی لاتعلقی اختیار کرلی گئی۔سابق ریاستوں میں جمہوری عمل سوات، چترال اور امبھ میں بادل نخواستہ کے طور پر صرف نیم منتخبہ ایڈوائزی کونسل کی تشکیل کی حد تک ہی جاسکا۔قومی سطح پر ان ریاستوں کے والیوں کو ملک کی دستور ساز اسمبلی میں ریاست کی شراکت کی غرض سے والیان کو نامزدگی کے مکمل اختیارات تفویض کردیے گئے۔دوسرے الفاظ میں ان ریاستوں کے عوام کو اپنے نمائندے منتخب کرکے قومی دستور ساز اسمبلی میں بھیجنے کے اختیار کو تسلیم کرنے سے انکار کردیا گیا۔پرنسلی سٹیٹس یعنی سابق ریاستوں کے انضمام اور وہاں جمہوریت کے فروغ کے سلسلے میں حکومت پاکستان کا رویہ اپنی حریف بھارتی حکومت سے یکسر الٹ تھا (۱۵)۔"سیکورٹی" کی محدود تعریف جو مرکز کے کنٹرول میں اضافے کیلئے اختراع کی گئی تھی خودشکستگی کا مظہر ثابت ہوئی کیونکہ ۱۹۵۰ کی دہائی کے وسط میں جمہوری عمل کو روک دینے کے عمل نے نا صرف مرکز کے خلاف معاندانہ جذبات کو ہوا دی بلکہ بہاولپور اور قلات کی ریاستوں کے کچھ حصوں میں نسلی اور لسانی قوم پرستی کو پروان چڑھانے کیلئے جگہ بھی فراہم کی۔

سیکورٹی سٹیٹ کی "گائیڈڈ جمہوریت" کی روایت کے حوالے سے بنگال کو استثنیٰ حاصل تھا اور اگرچہ کہ بنگال کا سب سے زیادہ ترقی یافتہ شہر کلکتہ تقسیم کے وقت بھارت میں شامل ہوگیا تھا تاہم اس کے باوجود کسی بھی دوسرے مسلم اکثریتی علاقے سے کہیں زیادہ یہاں گورننس کا کلچر جمہوریت اور سول سوسائٹی کے فروغ کیلئے زیادہ سازگار تھا۔پاکستان کو اپنے قیام کے وقت سے ہی ان مختلف نوعیت کی نوآبادیاتی وراثتوں کو اکاموڈیٹ کرنے کا معاملہ درپیش تھا۔ایک طریقہ جس کے تحت اس کام کو کیا جاسکتا تھا یہ تھا کہ مغربی پاکستان کے علاقوں میں "وائس ریگل ازم" کو اپنانے سے گریز کیا جاتا لیکن جدوجہد آزادی کی خصوصیات اور ۱۹۴۷ کے وقت پیدا ہونے والی عظیم انتشار اور افراتفری نے پاکستان کیلئے اس راستے کو اپنانا دشوار کردیا تھا۔

۲۔ جدوجہد آزادی کی وراثت:

شمال مغربی ہندوستان میں زمین کی ذاتی ملکیت کے معاملے نے روایتی طور پر سیاسی طاقت کے ساتھ گٹھ جوڑ کر رکھا تھا۔اس خطے کے کئی حصوں میں نوآبادیاتی دور سے قبل کے آخری سالوں میں زمین کی ملکیت تیزی سے ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں منتقل ہوتی رہی تھی۔برطانوی راج کی جانب سے ہندوستانی معاشرے کی ''ڈی ملٹرائزیشن'' نے اس نوعیت کے سماجی تحرک کا خاتمہ کردیا اور اس کی جگہ ایک جامد دیہی معاشرہ وجود میں آگیا۔اسی عرصے کے دوران نوآبادی ریاست نے مقامی طاقت کے مراکز کے اثر ورسوخ کو بہت زیادہ بڑھاوا دے دیا خاص طور پر اس نام نہاد ''رجعت پسندانہ ردعمل'' کی صورت میں جس نے ۱۸۵۷ کی جنگ آزادی کے بعد فروغ پایا تھا۔جامد وساکت دیہی ہندوستان کے نوآبادیاتی سٹیریو ٹائپس کے باوجود برطانوی راج کے ساتھ گٹھ جوڑ کرنے والی اشرافیہ کے ایسے حصے بھی تھے جن کی جڑیں قدامت میں پیوست نہیں تھیں اس کے برعکس وہ جدیدیت کے پیروکار تھے۔

نوآبادیاتی حکمران جاگیرداروں کو اپنے دست و بازو سمجھتے تھے۔ان کو عزت و تکریم دینے اور ان کی قوت کو بڑھانے کیلئے کچھ اس طرح کے طریقے اختیار کیے جاتے تھے:انہیں زمینوں کے وراثتی حقوق عطا کیے گئے اور ان کی عیاشیوں اور اللے تللوں کے نتیجے میں ان پر چڑھنے والے بھاری قرضوں کو کنٹرول کرنے کیلئے زمین کی وراثت کے سلسلے میں اولاد نرینہ کو وراثتی حقوق منتقل کرنے کا طریقہ اپنایا گیا۔اس سلسلے میں قانون سازی کی گئی جس کے تحت غیر کاشتکار افراد کیلئے زمین پر مستقل قبضہ کر لینے کے مواقع کو محدود اور مسدود کردیا گیا۔زمینوں کو ریاستی خدمات کے عوض اپنے وفادار زمینداروں کو نہری علاقوں میں اراضی کے حقوق دیئے گئے یوں ان کی زیر ملکیت اراضی میں اضافہ کردیا گیا۔جن خدمات کے عوض انہیں نئے ڈویلپ شدہ نہری علاقوں میں اراضی دی گئی ان میں فوج کیلئے نئی بھرتیوں میں مدد دینا اور فوج کیلئے گھوڑے اور مال مویشی فراہم کرنا شامل ہیں۔ان جاگیرداروں کو ان کے زیر تسلط علاقوں میں پولیس اور مجسٹریسی کے اختیارات بھی تفویض کردیئے گئے جس کے نتیجے میں وہ اپنی رعایا کے باقاعدہ مالک

بن گئے۔اس کے علاوہ ان کی سہولت کیلئے انتخابی حد بندیوں میں ان کے زیر تسلط دیہات کو شامل کیا گیا۔۔ان کے زیر نگین رعایا پر ان کے تسلط میں اضافے کیلئے انہیں عوام اور انگریز حکمرانوں کے درمیان گیٹ کیپر کی حیثیت دے دی گئی۔یوں عوام میں سے کوئی بھی شخص ان کی مرضی اور منشاء کے بغیر کسی انگریز حاکم سے براہ راست رابطہ نہیں کرسکتا تھا۔مزید یہ کہ معاشرے میں ان کی عزت اور وقار میں اضافے کیلئے انگریز حکمرانوں نے انہیں سرکاری خطابات اور القابات سے نوازنے کا سلسلہ شروع کیا(۱۶)۔

نوآبادیاتی حکمرانوں نے قبائلی اور جاگیرداری اشرافیہ کو نوازنے کا سلسلہ کسی ایک علاقے تک محدود رکھنے کی بجائے مستقبل کے مغربی پاکستان میں شامل تمام علاقوں کیلئے شروع کیا۔شمال مغربی سرحدی صوبے میں بڑے خان برطانوی سرپرستی کے حقدار ٹھہرے۔پنجاب میں بڑے زمینداروں اور برادریوں کے سربراہوں کے علاوہ ان گدی نشینوں پر دست شفقت دراز کیا گیا جن کی گدی کے ساتھ اراضی بھی وابستہ تھی۔سندھ میں یہ کرم نوازی وڈیروں اور پیروں پر روا رکھی گئی جبکہ بلوچستان میں قبائلی سرداروں کو سرپرستی کے قابل سمجھا گیا۔

قیام پاکستان کی جدوجہد کے دوران مسلم لیگ نے مقامی حکمران اشرافیہ کی سیاسی قوت کا تسلیم کرتے ہوئے ان کے ذریعے اپنی طاقت میں اضافہ کرنے کا فیصلہ کیا۔مسلم لیگ نے انہیں بائی پاس کرنے کی بجائے سیاسی موبلائزیشن کیلئے ان کی طاقت کو استعمال کرنے کی حکمت عملی بنائی اور انہیں ایک ایک کرکے اپنی صفوں میں شامل کرنے کا عمل شروع کردیا۔۱۹۴۴ کے بعد سے قیام پاکستان اور اس کے بعد بھی مسلم لیگ نے پنجاب میں خاص طور پر جس طرح ان زمینداروں اور ریاست کے وفاداروں کے ساتھ گٹھ جوڑ کیا اس پر بہت کچھ لکھا جاچکا ہے(۱۷)۔۱۹۴۴ میں جب مسلم لیگ نے جاگیردار اشرافیہ کے ساتھ اپنے سٹریٹیجک الائنس تشکیل دیئے تو ساتھ یہ بھی یقینی بنایا گیا کہ ۴۶۔۱۹۴۵ کے انتخابات میں ان کی رعایا کے تمام تر ووٹ مسلم لیگ کے کھاتے میں جائیں گے۔یہ وہ انتخابات تھے جنہیں آل انڈیا مسلم لیگ نے مطالبہ

پاکستان کے حوالے سے ریفرنڈم قرار دیا تھا۔ جاگیرداروں کی حمایت کے بغیر تحریک پاکستان کی کریڈیبلٹی شدید طور پر مشکوک ہو جاتی۔ اس کے باوجود مسلم لیگ کو اس حکمت عملی کی قیمت بھی ادا کرنا پڑی۔ جاگیرداروں نے اپنے علاقوں میں مسلم لیگ کی شاخیں قائم کرنے سے گریز کیا اور باہر سے آنے والوں کو بھی ایسا کرنے کی اجازت دینے میں متامل رہے۔ پورے پنجاب میں مسلم لیگ کے کل رجسٹرڈ ارکان کی تعداد ڈیڑھ لاکھ تھی جبکہ سندھ میں یہ تعداد کہیں کم تھی۔ وہاں رجسٹرڈ باقاعدہ ارکان کی تعداد بمشکل ۴۸،۵۰۰ تک پہنچ سکی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ مقامی سطح پر مسلم لیگ کی اپنی حریف کانگریس کے برعکس بہت کم جڑیں عوام میں پھیل سکیں۔ اس چیز کی وجہ سے پارٹی وفاداری اور ڈسپلن کو سخت نقصان پہنچا۔ موقع پرست جاگیردار مسلم لیگ میں آئے تو ساتھ اپنی مقامی دشمنیاں اور دھڑے بندی بھی لے کر آئے۔ صوبہ سرحد کی مسلم لیگ میں دھڑے بندی کے نتیجے میں ہونے والی لڑائیوں نے اتنی شدت پکڑی کی جون ۱۹۴۴ میں مسلم لیگ کو ایک آل انڈیا کمیٹی بنانی پڑی جس نے اعتراف کیا کہ صوبے میں پارٹی کے اندر تنظیم نام کی کوئی چیز نہیں ہے (۱۸)۔ مستقبل کے مغربی پاکستان کے علاقوں میں قائم صوبائی مسلم لیگیں درحقیقت لڑکھڑاتی ہوئی تنظیمیں تھیں جن میں داخلی لڑائیوں اور سرپرستیوں کا طرز عمل کارفرما تھا۔ اس طرز عمل کے ہوتے ہوئے ان تنظیموں کا محمد علی جناح کی مطالبہ پاکستان کے حوالے سے آل انڈیا انڈرسٹینڈنگ کے ساتھ ہم آہنگ ہونا ممکن ہی نہ تھا۔

۱۹۴۶ کے انتخابات کے دوران سندھ میں مسلم لیگ کی صورتحال بھی دوسروں سے چنداں مختلف نہ تھی اور مسلم لیگ کی بحرانی کیفیت کی غمازی کر رہی تھی۔ سندھی وڈیرے پارٹی پالیسی کو آگے بڑھانے کی بجائے اپنے انتخابی حلقوں میں صرف اپنی کامیابی کیلئے پیسہ اور اثر و رسوخ استعمال کر رہے تھے۔ انہیں مطالبہ پاکستان کو عوام میں لے جانے کی فکر نہیں تھی۔ فکر تھی تو بس یہ کہ وہ کسی طرح سے اپنے حلقوں سے جیت جائیں۔ ۱۹۴۵ تک سندھ مسلم لیگ میں پارٹی ٹکٹوں کے حصول کیلئے تین دھڑوں کے درمیان کھینچا تانی شروع ہو چکی تھی۔ ایک مرتبہ محمد علی جناح نے ایک انتخابی امیدوار کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا "میری خواہش ہے کہ لوگ وزیر اور وزیر اعلیٰ بننے کے

بارے میں کم سوچیں اور ان عظیم اور اہم مسائل کی جانب زیادہ توجہ دیں جو انہیں درپیش ہیں"۔ انہوں نے مزید کہا کہ "مجھے امید ہے کہ صورتحال کی سنگینی کا ادراک کر لیا جائے گا۔۔۔ ہمارے سامنے واحد درپیش مسئلہ پاکستان بمقابلہ اکھنڈ بھارت ہے اور اگر سندھ اس کا احساس نہیں کر پاتا تو پھر خدا ہمارے حال پر رحم کرے" (۱۹)۔ برطانوی گورنر سر ہی ڈو نے اظہار ہمدردی کرتے ہوئے کہا تھا "جناح ان سب وڈیروں کو ناپسند کرتے ہیں"۔ اس نے وائسرائے لارڈ ویول کے نام ایک خط میں لکھا "اس نے (قائد اعظم محمد علی جناح نے) ایک مرتبہ مجھے کہا تھا کہ میں ان تمام وڈیروں کو پانچ لاکھ روپے کے عوض خرید سکتا ہوں۔ اس پر میرا جواب تھا کہ میں انہیں اس سے بھی کم پیسوں میں خرید سکتا ہوں (۲۰)۔ یہ افسوسناک حقیقت یقیناً مسلم لیگ کی اس تصویر کشی کی توثیق نہیں کرتی جس میں اس نے اس دور کو مثالیت پسندی کا زریں دور قرار دیا تھا۔ یہ صورتحال اس امر کی اچھی طرح سے وضاحت کر دیتی ہے کہ کیوں قیام پاکستان کے بعد کانگریس کے برعکس مسلم لیگ قومی تعمیر پر کما حقہ توجہ دینے میں کامیاب نہ ہو پائی تھی۔ آل انڈیا مسلم لیگ کی بہت سی شاخیں ایسی تھیں جو یا تو محض کاغذی تھیں یا دھڑے بندی کی وجہ سے بہت کمزور تھیں۔ نیچے سے اوپر تک شاخوں کا بنا ہوا مضبوط اہرام جو کانگریس کا خاصا تھا یہاں بہت حد تک ندارد تھا۔ خوش قسمتی سے ۱۹۴۶ کے انتخابات میں مسلم لیگ کی فقید المثال کامیابی نے عارضی طور پر مستقبل کے پاکستان میں شامل علاقوں میں پارٹی کے کمزور تنظیمی ڈھانچے کو چھپا لیا۔

آل انڈیا مسلم لیگ کا مضبوط گڑھ ہمیشہ سے یو پی اور بمبئی میں رہا تھا جہاں مسلمان کل آبادی کا اقلیتی حصہ تھے۔ یہ یو پی کی مسلم اشرافیہ تھی جس نے انگریز حکومت کی جانب سے سیاسی نمائندگی کو متعارف کرائے جانے کے بعد سے گہرائی میں جا کر مسلم اقلیت کو ہندو اکثریت پسندی کے ہاتھوں درپیش ثقافتی اور معاشی خطرات کے بارے میں سوچا تھا۔ مسلم اکثریتی آبادی میں موجود مسلمان اس فکرمندی میں حصہ دار نہیں تھے۔ بلاشبہ یہ ضرور ہوا تھا کہ جمہوریت کے کچھ عناصر کو متعارف کرائے جانے کی وجہ سے مسلم اکثریتی علاقوں میں ہندو اقلیت کے تجارت اور سرکاری ملازمتوں پر اجارہ داری

کو دیکھتے ہوئے مسلمانوں کی تعلیمی اور معاشی پسماندگی کے مسائل کو کسی نہ کسی حد تک حل کرنے کی کوششیں کی جانے لگی تھیں۔مثال کے طور پر پنجاب میں یونیلسٹ پارٹی کے بانی میاں فضل حسین نے تعلیم کے میدان میں برطانوی حکومت کی جانب سے ذمہ داری کی نچلی سطح پر منتقلی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مسلمانوں کی تعلیمی حالت میں بہتری لانے کی کوششیں کیں۔اس سلسلے میں انہوں نے گورنمنٹ کالج لاہور اور لاہور میڈیکل کالج جیسے باوقار تعلیمی اداروں میں جہاں ہندو طلباء کا مکمل غلبہ ہوا کرتا تھا، وہاں مسلمان طلباء کیلئے ۴۰ فیصد کوٹہ مختص کرانے میں کامیابی حاصل کرلی۔

مسلم لیگ نے پورے نوآبادیاتی دور میں اپنی قیادت یوپی کی مسلم اشرافیہ سے حاصل کی تھی۔خاص طور پر اس کی قیادت علی گڑھ جیسے شمالی ہند کے تعلیمی اداروں کی مرہون منت رہی ہے۔یہی وجہ ہے کہ بعد میں ایک موقع پر محمد علی جناح نے علی گڑھ یونیورسٹی کو تحریک پاکستان کا اسلحہ خانہ قرار دیا تھا۔یہ اس حقیقت کے باوجود ہے کہ مذہب کی بنیاد پر ہندوستان کی کسی بھی طرح تقسیم کی جاتی، یوپی نے بھارت ہی کا حصہ رہنا تھا۔دوسری طرف مستقبل کے پاکستان میں شامل علاقوں میں مسلم لیگ کی قیادت میں بہت کم ایسے لوگ تھے جنہیں قیادت یا حکومت کا تجربہ تھا۔نوآبادیاتی دور میں پنجاب مسلم لیگ کبھی حکومت کا حصہ نہیں رہی تھی۔صوبہ سرحد کی مسلم لیگ کو بہت تھوڑے عرصے کیلئے (۱۹۴۳-۴۵) حکومت میں آنے کا موقع ملا تھا جبکہ قیام پاکستان کے وقت وہ حکومت میں شامل نہیں تھی۔دوسری جانب کانگریس یہاں ۱۹۴۶ کے انتخابات میں نا صرف اکثریتی پارٹی کی حیثیت سے ابھر کر سامنے آئی تھی بلکہ اسے مسلم ریزرو سیٹوں پر بھی اکثریت ملی تھی (۱۹/۳۶)(۲۱)۔بلوچستان میں قاضی محمد عیسیٰ کی زیر قیادت مسلم لیگ اس سے بھی کم اثر و رسوخ کی حامل تھی۔صوبے میں اس کی سرگرمیاں کوئٹہ کے پختون علاقوں اور اس کے قرب و جوار تک محدود تھیں۔بلوچ اور براہوی علاقے جہاں کسی نہ کسی حد تک جدید طرز سیاست رائج تھا وہاں سیاسی حلقوں میں عظیم تر بلوچستان کے نعرے کو مقبولیت حاصل تھی۔یہاں اس نعرے کی پاسبان عبدالعزیز کرد کی ینگ بلوچ موومنٹ تھی جو ریاست قلات میں نیشنل پارٹی کے پلیٹ فارم پر سرگرم عمل

تھی۔ابتدا میں خان آف قلات احمد یار خان قلات سٹیٹ نیشنل پارٹی (کے ایس این پی) کا حمایتی تھا کیونکہ پارٹی نے اسے عظیم تر بلوچستان تحریک کی سربراہی سونپ رکھی تھی۔تاہم جب نیشنل پارٹی نے ۱۹۳۹ میں زور و شور سے سیاسی اصلاحات کی بات کرنا شروع کی تو اس نے پارٹی پر پابندی عائد کردی۔تاہم اس کے باوجود نیشنل پارٹی نے اپنی سرگرمیاں ترک نہ کیں نا اس نے کانگریس کے ساتھ اپنے تعلقات منقطع کیے۔سب سے اہم بات یہ ہے کہ بلوچستان کے علاقوں میں مسلم لیگ کی عدم مقبولیت کا سلسلہ ۱۹۴۷ تک اسی طور برقرار رہا تھا۔برطانوی بالادستی کے خاتمے اور قلات کے پاکستان کے ساتھ الحاق کے معاملے نے خان آف قلات اور نیشنل پارٹی کے بلوچ قوم پرستوں کے درمیان ٹوٹے ہوئے رشتوں کو پھر سے بحال کردیا۔

ایک تجزیہ نگار اشوک کپور کا استدلال ہے کہ پاکستان کے آمریت کی گود میں گرنے کا باعث نا صرف مسلم لیگ کے اپنے انتخابی اکثریت کے علاقوں میں سطحی بنیادیں تھیں بلکہ اس کی ایک اور وجہ تحریک آزادی کا مخصوص مزاج بھی تھا۔اس کا کہنا ہے کہ پاکستان کا قیام برطانیہ کی لڑاؤ اور حکومت کرو کی وراثت کا مرہون منت تھا نا کہ کسی طرح کی اصولوں پر مبنی عوامی جدوجہد کا پھل تھا جیسا کہ کانگریس نے ہندوستان کی آزادی کیلئے اختیار کی تھی۔اس کا دعویٰ ہے کہ پاکستان نے اپنا جداگانہ تشخص تحفے میں حاصل کیا۔یہ کسی قسم کی قوم پرستی یا عوامی جدوجہد یا کسی تصورِ آزادی، نمائندہ حکومت یا اکثریتی حکومت کا شاخسانہ نہ تھا۲۲۔اس کے اثرات یہ تھے کہ پاکستان نے اپنی ابتداء بہت کم مثالیت پسندی، عوامی خدمت یا ذاتی قربانی کے جذبات سے کی تھی۔دوسری جانب بنگال میں مسلم لیگ کی جدوجہد ان اثرات سے بہت حد تک پاک تھی۔وہاں نومبر۱۹۴۳ میں بنگال مسلم لیگ کے سیکرٹری جنرل منتخب ہونے والے ابوالہاشم کی سرتوڑ کوششوں کے طفیل مسلم لیگ ایک واضح مقاصد کے ساتھ ایک وسیع تر جمہوری ادارہ بن گئی جو جبر کی تمام تر شکلوں سے رہائی پانے کی جدوجہد کرنے کے قابل تھی (۲۳)۔کانگریس کی طرح بنگال مسلم لیگ کے پاس ہمہ وقتی کارکن تھے جنہیں باقاعدہ معاوضہ دیا جاتا تھا اور ان کے رہنے سہنے کا انتظام کیا جاتا تھا۔وہاں پر تنظیم کاری

کا یہ عالم تھا کہ پرائمری مسلم لیگ کے دفاتر دور دراز دیہات تک بھی پھیلا دیئے گئے تھے۔لیکن ستم ظریفی یہ ہوئی کہ آزادی کے بعد اس پلیٹ کو مضبوط کرنے کی بجائے تباہ کر دیا گیا۔تحریک آزادی کے دوران اسے مسلم لیگ کے قدامت پسند رہنماؤں اور ارکان کی جانب سے دھمکیوں کا سامنا بھی کرنا پڑا تھا۔ان قدامت پسندوں کو روزنامہ ''آزاد'' کی صورت میں آواز ملتی تھی جس نے ابوالہاشم اور اس کے پیروکاروں کو کمیونسٹ قرار دے کر ان کی مذمت کا سلسلہ شروع کر رکھا تھا۔جیسا کہ ہم آنے والے ابواب میں دیکھیں گے کہ بنگال میں آزادی کے بعد مسلم لیگ کی تباہی کی جڑیں تبدیلی کی امنگ کو پورا کرنے کی اہلیت کے فقدان اور اس پر خواجہ دھڑے کے دوبارہ قبضے میں موجود ہیں۔

دیگر مسلم اکثریتی علاقوں میں جدوجہد آزادی نا صرف اندرونی دھڑوں کی لڑائیوں کی وجہ سے جو سندھ میں اپنے عروج پر تھیں بلکہ مطالبہ پاکستان کے تقاضوں پر پورا اترنے کی اہلیت کے فقدان کی وجہ سے بھی اپنی حقیقی روح سے محروم تھی۔زمینداروں کیلئے اس کا مطلب محض کانگریس کے متوقع اقتدار سے رہائی تھا جو زرعی اصلاحات کے وعدے پر کاربند تھی۔مسلمان افسر شاہی اور فوج کیلئے اس کی اہمیت محض یہ تھی کہ اس کے ذریعے ان پر اچانک ترقیوں کے دروازے کھل جائیں گے۔مسلمان کاروباری حضرات کیلئے جدوجہد آزادی کے ذریعے آزاد وطن کے قیام کی اتنی سی اہمیت تھی کہ اس طرح انہیں پورے شمالی ہندوستان میں تجارت اور صنعت پر چھائے ہوئے ہندوؤں سے اگر مکمل طور پر نہیں تو بہت حد تک نجات ملنے کی امید تھی جن کے ہوتے ہوئے وہ آزادی کے ساتھ ترقی کرنے کا محض خواب ہی دیکھ سکتے تھے۔مذہبی طبقے کے نزدیک نئے وطن کی یہ اہمیت تھی کہ یہاں انہیں اپنی اپنی تعبیر کے مطابق مذہب کے نفاذ کا موقع مل سکتا تھا۔بنگال میں ہاشم کے سپورٹر یہ سمجھ رہے تھے کہ وہ ایک آزاد اور خودمختار مشرقی پاکستان کیلئے جدوجہد میں مشغول ہیں جہاں انہیں جاگیرداروں سے نجات حاصل کرنے کیلئے زرعی اصلاحات کرنے کا موقع میسر آئے گا۔ان متضاد تصورات کا مطلب یہ تھا کہ صرف محمد علی جناح جیسی کرشماتی اور مرکزی اہمیت کی حامل شخصیت اور منفی تصورات سے

چھٹکارہ پانے کے ذریعے ہی اتحاد و یکجہتی کا حصول ممکن ہے۔پاکستانی قوم پرستی نے شروع میں ہی ناگزیر طور پر منفی کرداریت حاصل کر لی اور کانگریس اور اس کی قیادت کی جانب مخالفانہ جذبات کا رخ موڑ دیا گیا۔نا صرف ہندوؤں بلکہ مسلم لیگ کے مخالف مسلمانوں کو بھی برائی کی علامتیں بنا کر پیش کیا جانے لگا۔فروری ۱۹۴۷ میں یونینسٹ لیڈر خضر حیات ٹوانہ کے خلاف مسلم لیگ نے راست اقدام کیا جس کے دوران اس کا نقلی جنازہ نکالا گیا۔اس سے پچھلے سال ہونے والے انتخابات میں ایک مہم چلائی گئی جس میں اعلان کیا گیا کہ جو کوئی بھی مسلم لیگ کے خلاف ووٹ ڈالے گا وہ کافر ہو جائے گا اور اسے مسلمانوں کے قبرستان میں دفن نہیں ہونے دیا جائے گا۔

یوں جدوجہد آزادی کے دوران نئی پاکستانی ریاست کو عدم برداشت پر مبنی رویئے کا پہلا تحفہ دیا گیا۔اس تحفے نے فوری طور پر اپنا کام کر دکھایا۔آزادی کے صرف دو ہفتوں کے بعد ہی صوبہ سرحد میں کانگریس کی وزارت کو برطرف کر دیا گیا۔ساتھ ہی مسلم لیگ کے مخالفین پر بے دریغ انداز میں غیر محب وطن ہونے کا لیبل چسپاں کیا جانے لگا۔اس عدم برداشت کے رویئے کی ایک اور مثال اس وقت سامنے آئی جب لیاقت علی خان نے اکتوبر ۱۹۵۰ میں اعلان کیا کہ ''مسلم لیگ کے مقابلے میں نئی سیاسی جماعتوں کی تشکیل پاکستان کے مفادات کے خلاف ہے'' (۴۴)۔

قیام پاکستان کے بعد اردو اور اسلام کو اتحاد کی علامتیں قرار دیتے ہوئے مسلم لیگ کے غلبے کی حامل ایک مرکزیت پسند ریاست کو تشکیل دیا گیا۔جس نے جوابی طور پر علاقائی نسلی و لسانی گروہوں میں مخالفانہ جذبات کو پیدا کر دیا۔جیسا کہ ہم آگے چل کر دیکھیں گے کہ اس رجحان نے نا صرف مطلق العنانیت کی حوصلہ افزائی کی بلکہ حتمی طور پر پاکستان کو بریکنگ پوائنٹ تک پہنچا دیا۔آزادی کے بعد پاکستان میں مرکزیت پسندی کا جواز یہ کہہ کر پیش کیا گیا کہ بھارت اور افغانستان سے درپیش خطرات کے سدباب کیلئے قومی اتحاد کی ضرورت ہے۔مرکزیت پسندی کی طرف رجوع نا صرف پاکستان کے شدید داخلی مسائل کا جواب تھا بلکہ اسے جدوجہد آزادی کی خصوصیات کے ساتھ بھی منسلک کیا جا سکتا ہے۔

آل انڈیا مسلم لیگ نے باوصف اس کے کہ ہندو اکثریت پسندی کے ہاتھوں مسلمان اقلیت کے حقوق کو تحفظ فراہم کرنے کیلئے تحریک پاکستان کی قیادت کی تھی، ایک شدید طور پر مرکزیت پسند ادارہ تھی۔اس کے نسبتاً زیادہ ''نمائندہ'' ادارے مسلم لیگ کونسل اور صوبائی شاخیں بتدریج ان تنظیموں کے زیر تسلط آتی چلی گئیں جنہیں صدر نے نامزد کیا تھا جیسا کہ ورکنگ کمیٹی اور دسمبر ۱۹۴۳ کے بعد سے ایکشن کمیٹی۔مزید براں یہ کہ آل انڈیا مسلم لیگ ناصرف بہت زیادہ سنٹرلائزڈ تھی بلکہ وہ مستقبل میں پاکستان میں شامل ہونے والے علاقوں کے ارکان کی بجائے مسلم اقلیتی علاقوں کے ارکان کے زیر غلبہ بھی رہی۔بنگال کی آبادی ۳۳ ملین نفوس پر مشتمل تھی لیکن کونسل میں اس کے ارکان کی تعداد یوپی کی سات ملین کی آبادی والے ارکان سے محض دس ارکان زیادہ تھی۔فروری ۱۹۳۸ میں مسلم لیگ کے نئے دستور کی منظوری کے بعد بھی یوپی اور بمبئی سے تعلق رکھنے والے سیاستدانوں کی بالادستی برقرار رہی جس کے بعد از آزادی اثرات مرتب ہوئے۔آزادی کے بعد پاکستان آنے والے کونسل کے ان مہاجر ارکان کا کوئی مقامی حلقہ انتخاب نہیں تھا تاہم وہ مسلم لیگ کی تنظیم اور بیوروکریسی میں اپنے رابطوں کے ذریعے اپنی طاقت کو برقرار رکھنے میں کامیاب رہے تھے۔محمد وسیم نے اس حوالے سے واضح طور پر بیان کیا ہے: ''کراچی میں مہاجروں کے غلبے کی حامل حکومت کیلئے انتخابات کا راستہ اپنانا خودکشی کے مترادف تھا کیونکہ اس بات کا کوئی امکان نہیں تھا کہ وہ کسی حلقہ انتخاب سے جیت کر مرکز میں برسر اقتدار آسکتے۔یہی وجہ ہے کہ آزادی کے فوری بعد کے دور میں پاکستان کے سیاسی نظام کیلئے انتخابات کو بے فائدہ تصور کیا جانے لگا'' (۲۵)۔یوں کہا جاسکتا ہے کہ مطلق العنانیت کی جانب مائل رویوں کی تشکیل جدوجہد آزادی کی نوعیت نے کی تھی۔انہیں تقسیم کے بعد شدید انتشار اور بحران کی حالت کے باعث مزید تقویت ملی۔

۳۔ تقسیم کی وراثت:

پاکستان کی تخلیق اپنے جلو میں بہت بڑی ہجرت اور کمیونل قتل عام لے کر آئی۔اس قتل عام کے نتیجے میں ہونے والی ہلاکتوں کی درست تعداد کبھی معلوم نہیں ہو سکی لیکن

عام اندازے کے مطابق یہ دو لاکھ سے دس لاکھ کے درمیان تھیں۔صرف پنجاب کے علاقے میں ۹۰ لاکھ مہاجرین تھے جو تقسیم کے بعد دو آزاد مملکتوں کے درمیان تقسیم ہوگیا تھا۔پاکستان کو مہاجروں کی ریاست ہونے کا اعزاز بھی حاصل ہوا۔۱۹۵۱ میں ہونے والی مردم شماری کے مطابق پاکستان میں آباد نفوس میں ہر دسواں شخص مہاجر تھا۔

عائشہ جلال وہ پہلی مصنفہ ہیں جنہوں نے وائسریگل روایت کی ہیشگی کو تقسیم کی بحرانی صورت حال کے ساتھ جوڑ کر دیکھا ہے (۲۶)۔ان کا استدلال ہے کہ حکومت کے قلیل وسائل کا رخ نمائندہ اداروں کی تشکیل کی بجائے کشمیر کے مسئلے پر بھارت کے ساتھ ہونے والے تصادم اور مہاجروں کی آبادکاری کیلئے انتظامی اور فوجی حل تلاش کرنے کی جانب موڑ دیا گیا۔مسلح افواج کو مضبوط کرنے کی ترجیح کا ذکر لیاقت علی خان نے ۸ اکتوبر ۱۹۴۷ کو قوم کے نام اپنے خطاب میں کیا تھا۔ان کا کہنا تھا ''ریاست کا دفاع ہماری اولین ترجیح ہے۔۔۔اور یہ بات تمام سرکاری سرگرمیوں پر غالب ہے۔ہم اپنے ملک کے دفاع پر کسی قیمت پر کوئی سمجھوتہ نہیں کریں گے'' (۲۷)۔درحقیقت ۵۰۔۱۹۴۷ کے درمیانی عرصے میں قومی بجٹ کا ۷۰ فیصد حصہ دفاعی ضروریات کیلئے مختص کر دیا گیا تھا (۲۸)۔قیام پاکستان کے وقت پاکستان آرمی کی کمزوری کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ فوج میں کوالیفائیڈ پاکستانیوں کی کمی کو پورا کرنے کیلئے ابتدا میں ۵۰۰ برطانوی افسروں کو بھرتی کیا گیا۔پاکستان میں بہت سے افراد ہیں جو انگریز کمانڈر انچیف کو اس بات کا ذمہ دار سمجھتے ہیں کہ اس نے سرینگر میں قبائلیوں کی مدد کیلئے پاکستانی فوج کو بھیجنے میں جھجک کا مظاہرہ کر کے مسئلہ کشمیر کے فوجی حل کا سنہری موقع ہاتھ سے گنوا دیا۔

تقسیم کے بعد کی صورتحال نے مہاجرین کی آبادکاری کے مسئلے پر صوبوں اور مرکز کے درمیان کشیدگی نے بھی مطلق العنانیت کی حوصلہ افزائی کی۔اس معاملے کا اگلے باب میں تفصیل سے جائزہ لیا جائے گا۔یہاں پر اتنا کہنا ہی کافی ہے کہ اس مسئلے پر سندھ کے وزیر اعظم ایوب کھوڑو کی اقتدار سے برطرفی نے بھی ناصرف مرکز کے خلاف سندھی جذبات کو بہت زیادہ ہوا دی بلکہ مستقبل میں بھی مرکز کی جانب سے صوبوں میں

منتخب حکومتوں کو برطرف کرنے کے سلسلے میں اس کی ہمت بندھائی۔

آخری بات یہ کہ تقسیم کے کربناک حالات نے بھارتی اور پاکستانی دونوں ریاستوں کی قومیتوں کی تحریکوں کے خلاف طویل مدتی ریسپانس کی بھی تشکیل کی۔نہ نئی دہلی نہ اسلام آباد کسی مزید تقسیم کا متحمل ہوسکتا ہے۔اس کا نتیجہ دونوں ریاستوں کی جانب سے لسانی وقومی تحریکوں کو پرتشدد انداز میں کچلنے کی صورت میں نکلا ہے۔بھارت ان چیلنجوں سے پاکستان کی نسبت بہتر طور پر عہدہ برا ہورہا ہے تاہم کشمیر، شمال مشرق اور پنجاب کے علاقوں میں اس نے فوجی طاقت کا ننگا استعمال کیا ہے۔پاکستان نے کم مہارت اور کامیابی سے مشرقی بنگال، بلوچستان اور سندھ میں قوم پرست تحریکوں کا سامنا کیا ہے۔اس کیفیت کا اظہار جس کیلئے جنوبی ایشیا میں ''خوفزدہ ریاست'' کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے مزید تفصیل کا متقاضی ہے لہٰذا ہم آگے چل کر اس پر مزید بات کریں گے۔

۱۹۴۷ ـ ۴۸میں کشمیر کے مسئلے پر دونوں ملکوں کے درمیان ہونے والے تنازعے کو تقسیم کے نامکمل کام کی تکمیلی کوششوں کے ایک حصے کے طور پر بھی دیکھا جاسکتا ہے۔نوآبادیاتی دور کا اختتام برصغیر کی پرنسلی سٹیٹس کے پیچ ورک کیلئے بہت زیادہ اثرات کا حامل ثابت ہوا۔گوکہ نام کی آزادی کی حامل آزاد ریاستوں کے حکمرانوں کے تاج برطانیہ کے ساتھ براہ راست رابطے تھے تاہم ۱۹۳۰میں ان کے مستقبل کے آزاد ہندوستان کے ساتھ آئندہ کے تعلقات کے حوالے سے شدید تحفظات تھے کیونکہ کانگریس سٹیٹس پیپلز کانفرنس موومنٹ میں سیاسی اصلاحات کی حوصلہ افزائی کرچکی تھی۔جوں جوں انگریزوں کی رخصتی قریب آرہی تھی ان ریاستوں کے والیوں کی پریشانی میں اضافہ ہوتا جارہا تھا۔سب سے زیادہ پریشانی کی حالت میں ریاست جموں و کشمیر اور حیدرآباد کے حکمران تھے کیونکہ مذہبی اعتبار سے یہ اپنی رعایا کی اکثریت کے برعکس تھے۔جموں و کشمیر کا راجہ ہری سنگھ ڈوگرا ہندو تھا جبکہ رعایا کی غالب اکثریت مسلمان تھی۔دوسری طرف ریاست حیدرآباد کا نظام مسلمان تھا جبکہ رعایا کی غالب اکثریت ہندوؤں پر مشتمل تھی۔آگے چل کر ریاست جموں و کشمیر نے پاکستان اور

بھارت دونوں کی دشمنی کے حوالے سے خاص اہمیت حاصل کرنا تھی کیونکہ یہ ریاست دونوں ملکوں کی قومی شناخت کی علامت بن کر ابھر رہی تھی۔ریاست کے راجہ ہری سنگھ کا پاکستان کے قبائلیوں کے حملے کو ناکام بنانے کیلئے وادی کشمیر میں بھارتی فوجیں اتارنے کے بدلے بھارت کے ساتھ الحاق کا فیصلہ دونوں ملکوں کے درمیان طویل محاذ آرائی کا باعث ثابت ہوا۔اس فیصلے کے نتیجے میں اقوام متحدہ کو مداخلت کرنا پڑی اور ۱۹۴۹ میں سیز فائر لائن کے دونوں اطراف ریاست کی ڈی فیکٹو تقسیم عمل میں آئی۔

بھارت اور پاکستان میں علمی سطح پر واقعات کی متضاد تشریح ابھی تک غالب عنصر کی حیثیت سے موجود ہے۔یہاں پر الحاق کے فیصلے کی قانونی حیثیت یا اس دور میں ہونے والے واقعات میں ماؤنٹ بیٹن اور نہرو کے کردار خاص طور پر اپریل ۱۹۴۸میں سلامتی کونسل کی قرارداد کے حوالے سے نہرو کی کمٹمنٹ کہ اس تنازعے کا فیصلہ آزادانہ اور منصفانہ استصواب رائے کے ذریعے کرایا جائے گا، کے حوالے سے دلائل کو دہرانا مقصود نہیں ہے بلکہ ان طریقوں اور راستوں پر روشنی ڈالنی مقصود ہے جن کی وجہ سے جموں و کشمیر کے تنازعے نے پاکستان میں عسکریت پسند اور مطلق العنانیت کیلئے راستہ ہموار کیا۔

نقطہ آغاز یہ تسلیم کرنا ہے کہ کشمیر برصغیر کی تقسیم کے بعد پاکستان اور بھارت دونوں ملکوں کے درمیان دشمنی اور عدم اعتماد کی علامت بن کر ابھرا ہے۔بہت بڑے پیانے پر ہجرت اور اثاثوں کی تقسیم نے ان تعلقات کی تلخی میں مزید نفرت کا رنگ گھول دیا جو پہلے ہی نوآبادیاتی دور کے ہندوستان میں کانگریس اور مسلم لیگ کے درمیان تاریخی طور پر موجود تھی۔تاہم یہ تنازعہ کشمیر ہے جو دونوں ریاستوں کی نظریاتی بنیادوں کے قلب کی گہرائیوں میں اتر گیا اور پاک بھارت تعلقات کو بین الریاستی دشمنی کی صورت میں استوار کردیا۔بھارتی خطرے نے پاکستان ملٹری اور بیوروکریسی کے اتحاد کو ہنگامی بنیادوں پر قائم کردیا۔اس اتحاد کو ایوب دور میں بہت زیادہ مضبوطی حاصل ہوئی اور ضیاء اور مشرف کے ادوار میں اسے مزید ادارہ جاتی بنیادوں پر استوار کردیا گیا۔تاہم اس کی جڑیں آزادی کی پہلی دہائی کے اندر پیوست ہیں۔

اگر ۴۸-۱۹۴۷ میں بھارت کے مفروضہ خطرے کو بڑھا چڑھا کر پیش نہ کیا جاتا تو امکانی طور پر پاکستان خود کو عسکری طور پر امریکہ کا اتحادی نہ بناتا کیونکہ یہ پاکستان کی نہیں امریکہ کی ضرورت تھی کہ اسے سرد جنگ کے تناظر میں مشرقِ وسطیٰ اور سوویت یونین کے حوالے سے پالیسی سازی کے عمل کیلئے تعاون کی تلاش تھی۔ تاہم ۱۹۵۰ کی دہائی میں پاکستان نے خود کو امریکہ کے ساتھ ایسے تعلقات میں باندھ لیا جو آگے چل کر بہت زیادہ پیچیدگی کے حامل ثابت ہوئے۔ ان تعلقات کی ایک پہچان دونوں ملکوں کے مختلف سٹریٹجک نکتہ ہائے نظر ہیں۔ پاکستان سختی کے ساتھ Indo-centric رہا جبکہ امریکہ کے علاقائی اور بین الاقوامی سطح پر وسیع تر مفادات تھے۔ پاکستان کا امریکہ کے "مشرقی اینکر" ہونے کے کردار نے اس وقت رسمی صورت اختیار کرلی جب یہ ستمبر ۱۹۵۴ میں ساؤتھ ایسٹ ایشیا ٹریٹی آرگنائزیشن (سیٹو) اور دو سال کے بعد سینٹرل ٹریٹی آرگنائزیشن (سنٹو) کا حصہ بن گیا۔ ان معاہدات کے ساتھ امریکہ کی مالی اور فوجی امداد وابستہ تھی جس نے ریاست کے دیگر اداروں کے مقابلے میں فوج کی طاقت میں بہت اضافہ کردیا۔ اس دور میں پاکستان کے طرزِ حکمرانی کا ایک نمونہ طے کردیا گیا جو اس کے سیکورٹی خدشات سے تشکیل پایا تھا۔ اس کے تحت جمہوری طرزِ حکومت کو ہمیشہ فوجی اور مرکزیت پسند افسر شاہی کے معاون کی حیثیت سے اپنا کردار ادا کرنا تھا۔

جموں و کشمیر کا تنازعہ پاکستان کی تاریخ میں ایک اور دیرپا اثرات کے حامل مسئلے کی ابتداء ثابت ہوا۔ یہ مسئلہ تھا ریاست کی جانب سے جہادی قوتوں کو بھارت کے خالف مخاصمت کے سلسلے میں سٹریٹیجک مقاصد کے حصول کیلئے استعمال کرنے کا۔ ۱۹۴۸ میں کشمیر پر حملے کیلئے پاکستان کے بے قاعدہ فوجی دستوں کی معاونت کیلئے پیر آف مانکی شریف کے پیروکار قبائلی لشکروں کو استعمال کیا گیا۔ اس عمل نے پاکستانی ریاست کی جانب سے جہادی گروپوں کو خفیہ طور پر استعمال کرنے کی روایت قائم کردی۔ معاصر تحریریں ان ریاستی قوتوں کی سرپرستی کو فوجی حکمرانوں خاص طور پر جنرل ضیاء الحق کی فوجی حکومت (۸۸-۱۹۷۷) کے ساتھ منسوب کرتی ہیں۔ تاہم یہ معاملہ

اس سے کہیں زیادہ گہری جڑیں رکھتا ہے۔

پاکستان کے مصیبت اور ابتلا کے حامل ابتدائی مہینوں کے دوران بیمار محمد علی جناح نئی ریاست کے مختار کار تھے۔ مرکزی کابینہ اس سے کہیں زیادہ اطاعت گذار تھی جتنی کہ قبل ازیں آل انڈیا مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی ہوا کرتی تھی۔ اس کے ارکان ناصرف قائد کے نامزد کردہ تھے بلکہ وہ ان کے اجلاسوں کی صدارت کرتے اور انہیں اختیار حاصل تھا کہ وہ کابینہ کے کسی بھی فیصلے پر خطِ تنسیخ پھیر دیں۔ جناح کے پاس براہ راست متروکہ املاک اور مہاجرین کی بحالی اور ریاستی و سرحدی امور کی وزارتیں تھیں جس سے اس روایت کی ابتدا ہوئی کہ مملکت کے اعلیٰ ترین منصب پر فائز شخصیت محض دستوری اور علامتی سربراہ نہیں ہوتا۔ تاہم اس کے باوجود قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ ملک کے بابائے قوم ہونے کے حوالے سے شدید احترام کے حامل محمد علی جناح نے گورنر جنرل کی حیثیت سے کبھی اپنے اختیارات سے تجاوز نہیں کیا جو انہیں انڈین انڈی پینڈنس ایکٹ کے تحت حاصل تھے جبکہ بعد میں آنے والے گورنر جنرل غلام محمد (۵۵-۱۹۵۱) اور صدر سکندر مرزا (۵۸-۱۹۵۶) نے اس کے برعکس عمل کرتے ہوئے اپنے اختیارات سے بے پناہ تجاوز کیا۔ محمد علی جناح کی ۱۲ ستمبر ۱۹۴۸ کو ۷۲ سال کی عمر میں وفات نے پوری قوم کو صدمے کی کیفیت سے دوچار کردیا۔ ان کی وفات ہندوستانی مسلمانوں کی تاریخ میں ایک اندوہناک واقعہ کے طور پر یاد رکھی جائے گی۔

جمہوریت کا انہدام:

۱۹۵۰ کی دہائی کے شروع میں دستور سازی کے عمل کو شدید دھچکا لگا اور چونکہ طاقت بتدریج سیاستدانوں کے ہاتھوں سے نکل کر بیوروکریسی اور فوج کے ہاتھوں میں چلی گئی تھی لہٰذا اداروں پر انحصار کا ایک ایسا مرحلہ ابھر کر سامنے آیا جس نے قومی اور صوبائی سطح پر ایسے انتظامی بندوبست کی تشکیل کا عمل روک دیا جو جواب دہ اور جمہوری مزاج کا حامل ہوتا (۴۹)۔ اس دوران ہونے والی تبدیلیوں کا سب سے اہم واٹر مارک اکتوبر ۱۹۵۴ میں گورنر جنرل غلام محمد کی جانب سے دستور ساز اسمبلی کو تحلیل کیا جانا

تھا اور اس سے اگلے ہی سال ون یونٹ سکیم کی منظوری تھی جس کے تحت تاریخی نوعیت کے حامل صوبوں کو منسوخ کرتے ہوئے مغربی پاکستان کو واحد صوبہ قرار دے دیا گیا تا کہ "بنگالی کنٹرولڈ سنٹر" کو روکنے کی پیش بندی کی جا سکے (۳۰)۔ اس کے بعد مطلق العنان فوجی اور بیوروکریٹک طرز حکومت کا ڈول ڈال دیا گیا جس میں قومی تعمیر کے عمل کو از خود پروان چڑھنے کا موقع فراہم کرنے کی بجائے اوپر سے مسلط کر دیا گیا اور جس کے تحت اسلام کو محض سیاسی طور پر قانونی جواز فراہم کرنے کیلئے استعمال کیا جانے لگا۔ مختصر یہ کہ ریاست کے استحکام و تعمیر اور سیاسی عمل کی زیریں لہر کے طور پر موجود سماجی حرکیات کے درمیان ٹکراؤ کو پاکستان کا مقدر ٹھہرا دیا گیا (۳۱)۔

ون یونٹ کو مغربی پاکستان کی وحدت اور ناقابل تقسیم ہونے کا ناگزیر نتائج کا پیش خیمہ تصور کیا گیا تھا (۳۲)۔ لیکن درحقیقت اس کی وجہ سے مغربی بازو میں صوبائی سطح کا سیاسی عمل ماضی کی نسبت زیادہ غیر مستحکم اور دھڑے بندی کا شکار بن کر رہ گیا کیونکہ چھوٹے صوبوں سے تعلق رکھنے والے سیاستدان جنہیں خریدا نہیں جا سکا تھا وہ پنجابی غلبے کے خلاف صف آرا ہو گئے۔ مشرقی بنگال میں ون یونٹ کے قیام کو بین الصوبائی مساوات کو ختم کرنے کے مقصد کو حاصل کرنے کے ایک حربے کے طور پر دیکھا گیا اور یہ کہ اس کا مقصد قومی سیاست میں بنگالی اکثریت کو ختم کرنا تھا۔ اس اقدام کے بعد صوبائی سطح کی سیاست قومی سطح کی سیاست میں تبدیل ہو گئی جس کے نتیجے میں موقع پرستی کے رجحان اور غیر مستحکم سیاسی اتحادوں میں اضافے کی صورت میں سامنے آیا۔ مثال کے طور پر اس کا ایک اہم نتیجہ اس وقت سامنے آیا جب حسین شہید سہروردی نے ۱۹۵۶ میں وزیراعظم بننے کے بعد ون یونٹ کی مخالفت ترک کر دی۔ یہ ون یونٹ کا ہی نتیجہ تھا کہ سیاستدانوں کو بے توقیر کر دیا گیا اور بیوروکریسی اور فوج نے جمہوریت کے لبادے میں زیادہ سے زیادہ اختیارات اپنے پاس رکھ لیے۔

مرکزیت کی صوبائی خودمختاری سے جڑے مفادات پر غلبہ پانے کی ایک بڑی وجہ پنجاب کا ریاست کے مرکزی ستون کے طور پر اہمیت حاصل کرنا تھا۔ ۱۹۴۷ سے پہلے پنجابی قیادت کی خصوصیت اس کا صوبائی معاملات کی حد تک محدود رہنا تھا۔ یہاں تک کہ

آزادی کے بعد ابتدائی برسوں میں نواب ممدوٹ نے مہاجرین کے مسئلے پر مرکز کے خلاف صوبائی کارڈ استعمال کیا تھا۔ اس کے بڑے حریف اور بعد ازاں صوبے کے وزیر اعلیٰ بننے والے میاں ممتاز دولتانہ ہمیشہ مرکز کے حامی ہونے اور صوبائی مفادات کے چیمپئن ہونے کے درمیان جھولتے رہے۔ مارچ ۱۹۵۳ میں اس کا قادیانیوں کے خلاف تحریک اور بعد ازاں پنجاب میں دو مہینے طویل مارشل لاء کے نفاذ میں کردار متنازعہ رہا تھا۔ اس مارشل لاء کو انتخابی سیاست اور ایگزیکٹو پاور کو کچلنے کے حوالے سے ایک سنگ میل کے طور پر دیکھا جاتا ہے۔ اس سے پہلے بھی کئی مواقع پر فوج کو امن و امان کی صورتحال پر قابو پانے کیلئے فوج کو بلانا معمول بن چکا تھا۔ مثال کے طور پر ۱۹۵۲ میں مشرقی پاکستان میں لسانی فسادات پر قابو پانے کیلئے ڈھاکہ اور دیگر متاثرہ شہروں میں فوج طلب کی گئی تھی لیکن یہ پہلی بار تھی جب فوج کو ایک بڑے صوبے کے انتظامی امور چلانے کا موقع میسر آیا تھا۔ یوں لاہور میں لگنے والے پاکستان کے پہلا مارشل لاء سیاستدانوں سے فوج اور بیوروکریسی کو اقتدار کی منتقلی کی راہ میں آنے والا پہلا بڑا سنگ میل ثابت ہوا تھا۔ یہ واقعاتی ترتیب صاف ظاہر کرتی ہے کہ اس وقت تک پنجاب اور مرکز کے مفادات یکساں ہو چکے تھے۔ یونس صمد کے الفاظ میں "مرکز گریز قوتیں" لاہور میں بھی اتنا ہی وجود رکھتی تھیں جتنا کہ دوسرے صوبائی دارالحکومتوں میں (۳۳)۔ پنجاب میں قومیتی سوال نے حتمی طور پر اپنی قوت زائل کر دی کیونکہ پنجاب کو مرکز میں توانا آواز حاصل ہو چکی تھی۔

لاہور میں فوج کا فوری طور پر امن و امان کو بحال کرنا صوبے میں دولتانہ اور مرکز میں خواجہ ناظم الدین کی حکومتوں کو نہ بچا سکا۔ دولتانہ کو ۲۳ مارچ کو برطرف کر کے پنجاب کی وزارت اعلیٰ کا تاج ان کے دیرینہ حریف فیروز خان نون کے سر پر رکھ دیا گیا جو اس وقت مشرقی بنگال میں گورنر کی حیثیت سے خدمات سرانجام دے رہے تھے۔ اس کے بعد ایک ماہ سے بھی کم مدت میں جب کہ احمدیت کے خلاف تحریک کو دوسرا "شہید" نصیب ہوا پاکستان کی تاریخ کے ایک فیصلہ کن موڑ پر گورنر جنرل غلام محمد نے خواجہ ناظم الدین کی مرکز میں حکومت کو برطرف کر دیا۔

تاہم پاکستان اور پنجاب کی نشیب و فراز سے بھری دنیا میں ابھی ممتاز دولتانہ کا کردار ختم نہیں ہوا تھا۔ستم ظریفی یہ ہوئی کہ بعد میں وہ پنجاب میں مرکز کے ایک مضبوط اتحادی کے طور پر ابھرے۔یہ وہ وقت تھا جب مسلم لیگ نے فیروز خان نون کو پارٹی سے نکال دیا۔ممتاز دولتانہ نے اس بار ریپبلکن کی حیثیت سے ظہور کیا۔قسمتوں کے اس الٹ پلٹ کا کھیل پہلی دستور ساز اسمبلی کی برطرفی کے بعد شروع ہوا تھا جب اصل اقتدار کی مالک بیوروکریسی کو پنجاب میں ''قابل اعتماد'' ساتھیوں کی ضرورت محسوس ہوئی۔قبل ازیں فیروز خان نون نے مئی ۱۹۵۵ میں پاکستان مسلم لیگ کے پارلیمانی بورڈ کی جانب سے دستور ساز اسمبلی میں پنجابی نمائندگان کی اکثریت کو خود منتخب کرنے کی کوششوں کی مزاحمت کی تھی۔اس نے پنجاب کے حقوق کے نام پر اپنے موقف پر سٹینڈ لیا تھا۔اس کے موقف کو پنجاب سے تعلق رکھنے والے سیاستدانوں میں خاصی پذیرائی ملی کیونکہ وہ پنجاب کو اکتوبر ۱۹۵۵ میں قائم ہونے والے ون یونٹ میں شامل کرنے پر خوش نہیں تھے۔ون یونٹ سے متوقع طور پر مستفید ہونے والے سیاستدان وہ تھے جو مرکز کے چہیتے اور اتحادی تھے۔فیروز خان نون کے موقف نے ان کی برطرفی کی راہ ہموار کردی۔پنجاب مسلم لیگ دو دھڑوں میں بٹ گئی۔ایک دھڑا نون کے حامیوں کا تھا جبکہ دوسرا دولتانہ کو سپورٹ کر رہا تھا جو اس وقت مرکز کے ساتھ پینگیں بڑھانے میں لگے ہوئے تھے اور انہیں مرکز کی مکمل پشت پناہی حاصل تھی۔موخر الذکر گروپ کو نوازنے کیلئے مرکز نے اس گروپ کے ایک اہم لیڈر عبدالحمید دستی کو پنجاب کا وزیر اعلیٰ بنا دیا(۳۴)۔مسلم لیگ کے بطن سے جنم لینے والی ریپبلکن پارٹی کو اقتدار میں لانے کیلئے زمین نم کی جا چکی تھی۔اسے مستقبل قریب میں نئے مغربی پاکستان صوبے میں مسلم لیگ کو کہنی مار کر پرے ہٹانا اور مرکز میں بڑھتے ہوئے عدم استحکام میں اپنا حصہ ڈالنا تھا۔

مئی ۱۹۵۶ میں پنجاب میں ابھرنے والی ریپبلکن مسلم لیگ اپنے بعد وجود میں آنے والی اسٹیبلشمنٹ کی اتحادی پارٹیوں کنونشن مسلم لیگ اور حالیہ برسوں میں بننے والی مسلم لیگ (ق) کی پیشرو تھی۔اب نو آزاد ریاست اپنے مزاج اور انداز و اطوار میں

زیادہ سے زیادہ ''پنجابستان'' کا روپ دھارنا شروع کر رہی تھی۔ادھر اس کی قیادت کا ایک بڑا حصہ جو جاگیرداروں اور برادریوں کے سربراہوں پر مشتمل تھا پنجابی اجارہ داری کے بدلے اپنی خوشی سے مرکز میں بیوروکریسی اور فوج کو طاقت دلانے میں ان کا ہمنوا ہو چکا تھا۔اس کے نتیجے میں مہاجروں کے اثر ورسوخ کو خاصا دھچکا لگا۔ایوب خان کے فوجی انقلاب کے بعد اس عمل کی رفتار میں اضافہ ہو گیا۔پنجاب کے بڑھتے ہوئے اثر و رسوخ کی ایک مثال اس وقت سامنے آئی جب ملک کے دارالحکومت کو مہاجروں کے گڑھ کراچی سے منتقل کر کے پنجاب کے قریب ایک نئے بسائے جانے والے شہر اسلام آباد میں شفٹ کر دیا گیا۔ملکی تاریخ کے اس نئے موڑ کا باعث نہ صرف یہ امر تھا کہ آبادی، فوج اور سٹریٹیجک اہمیت کے حوالوں سے پنجاب کو اہمیت حاصل ہو گئی تھی اور اس کے ساتھ ہی اسٹیبلشمنٹ کا جھکاؤ روایتی جاگیردار اشرافیہ کی جانب زیادہ سے زیادہ ہوتا جا رہا تھا بلکہ یہ صوبے کی تقسیم کا براہ راست نتیجہ بھی تھا جس نے مخصوص حرکیات کو جنم دیا تھا اور جس کے باعث اس کی تقدیر ریاست کی نظریاتی بقاء کے ساتھ وابستہ ہو چکی تھی۔

اس بات کو سمجھنے کیلئے یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ تقسیم کے بعد ملک میں آنے والے ایک تہائی مہاجرین پنجابی تھے گو کہ انہوں نے مہاجر کا لیبل اپنے اوپر چسپاں کرنے سے گریز کیا۔دوسرے مہاجروں کے برعکس ان پناہ گزینوں کی مہاجرت میں زیادہ شدت تھی کیونکہ مشرقی پنجاب سے جان بچا کر مغربی پنجاب میں آنے والے ان لوگوں نے تشدد اور قتل و غارت کے وہ رنگ دیکھے تھے جنہوں نے آنے والے وقتوں میں ان کے تخیل پر غلبہ حاصل کر لینا تھا۔یہ تشدد اور قتل و غارت گری خاص طور پر انہیں مشرقی پنجاب کے ان مسلم اکثریتی علاقوں (مثلاً گورداسپور اور فیروز پور) میں برداشت کرنا پڑی تھی جن کے بارے میں انہیں یقین تھا کہ وہ پاکستان کا حصہ بنیں گے۔ریاست جموں و کشمیر تک رسائی کے حامل ان علاقوں کو پاکستان میں شامل نہ کیے جانے کی وجہ سے برطانوی حکومت کی نو آزاد مملکتوں کی حدود کے تعین کے سلسلے میں شدید ناانصافی کے احساسات پیدا ہوئے۔''مہاجروں'' کے برعکس مشرقی پنجاب کے

پناہ گزینوں کا مقامی آبادی میں گھل مل جانا نہایت آسان عمل ثابت ہوا کیونکہ ثقافتی اور لسانی طور پر وہ مشترکہ ورثہ کے حامل تھے۔ یہاں انہوں نے معاش کے ایسے ذرائع اپنا لیے جن میں ان کا مقامی آبادی کے ساتھ مفادات کا براہ راست ٹکراؤ پیدا نہیں ہوا(۳۶)۔ مشرقی اور مغربی پنجاب کے حکام کا دونوں اطراف کے مہاجرین کی آبادکاری کے سلسلے میں تعاون پر مبنی رویئے نے تمام کمیونٹیوں کو جانی پہچانی برادریوں کے جانے پہچانے رشتوں کے ساتھ نئی جگہوں پر آسانی سے آباد ہونے کے قابل کردیا۔ تاہم جہاں ان مہاجرین کیلئے مغربی پنجاب کے کشادہ دل لوگوں کے اندر گھل مل جانا نسبتاً بہت آسان تھا، ان کی انتقام میں ڈوبی ذہنیت نے انہیں مارشل لائی حکومتوں کیلئے محفوظ ترین ''کانسٹی چیونسی'' بنادیا یا انہیں دائیں بازو کی سیاسی جماعتوں کیلئے انڈیا دشمنی کے ایجنڈے پر چلنے یا سیاسی و مذہبی جماعتوں کے پان اسلام ازم کے فروغ کیلئے بہترین لابی بنادیا(۳۷)۔ خاص طور پر لاہور، گوجرانوالہ اور سیالکوٹ میں آباد کشمیری مہاجرین پاکستانی ریاست کے بھارت کے ساتھ تنازعے کے ساتھ کومیٹڈ تھے۔ مشرقی پنجاب کے مہاجرین بھی تقسیم کے آگ اور خون کے تجربے میں سے گذرنے کی وجہ سے کشمیر کاز کیلئے دلوں میں نرم گوشہ رکھتے تھے۔

پاکستان اور پنجاب کی شناختوں کے آہستہ آہستہ ایک دوسرے میں ضم ہوجانے کے عمل کی جڑیں تاریخ میں نوآبادیاتی حکومت کے اس فیصلے کے اندر پیوست ہیں جس کے تحت انگریزوں نے پنجابی کی بجائے اردو کو پنجاب کی سرکاری زبان قرار دیا تھا(۳۸)۔ زبان کا علم لہرانے والوں کو اگر ایک جانب رکھیں تو یہ واضح ہوتا ہے کہ معاصر پاکستان میں کچھ اس طرح کے رویئے اپنائے گئے ہیں جن کے مطابق پنجابی ایک ''فرسودہ'' زبان ہے جس کیلئے مناسب یہی ہے کہ اسے صرف گھر کے اندر بولا جائے (اہل پنجاب مرکزیت پسندی کے جوش میں اس قدر آگے بڑھ گئے ہیں کہ انہوں نے اپنی ماں بولی کو گھروں میں بولنے کے قابل بھی نہیں جانا اور پنجاب کے شہروں میں تقریباً ہر گھر میں بچوں کے ساتھ پنجابی کی بجائے اردو یا اپر اور اپر مڈل کلاس سے تعلق رکھنے کی صورت میں انگریزی بولی جاتی ہے۔ یوں پنجابیوں کی موجودہ نوجوان نسل اپنی

زبان سے بہت حد تک نابلد ہے۔ مترجم)۔ پنجاب میں مہاجرین کی آمد سے پہلے ہی پاکستان میں پنجاب کے ممکنہ قومیتی سوال کو بے معنی بنادینے کیلئے اس عمل کی ابتدا کردی گئی تھی۔ پنجابی۔ ملٹری۔ بیوروکریسی گٹھ جوڑ علاقے کی زمیندار اشرافیہ کی روایتی موقع پرستی کی وجہ سے مزید سے مزید مضبوط ہوتا رہا ہے۔ جیسا کہ ہم پہلے بیان کرچکے ہیں پنجاب سے تعلق رکھنے والے سیاست دانوں کا ایک مخصوص گروہ جو دیہی اشرافیہ کا نمائندہ ہے ہمیشہ سے فوجی حکومتوں کیلئے ''کنگز پارٹی'' کی تشکیل کے سلسلے میں دل و جان سے آمادہ ہوتا ہے۔ مزید یہ کہ نوآبادیاتی تعلیمی ڈویلپمنٹ اور مارشل ریس کے خیال خام کے تحت تشکیل دی جانے والی فوجی بھرتی کی پالیسیوں نے فوج اور بیوروکریسی میں پنجاب کی نمائندگی (۸۰ فیصد) کو ہمیشہ غالب حیثیت دی ہے۔ جس نے ۱۹۵۰ کی دہائی سے ریاست پر اپنی گرفت کو مضبوط کررکھا ہے۔ یوں پنجاب مسلمہ طور پر پاکستان کی ریڑھ کی ہڈی کا کردار ادا کررہا ہے۔

اس میں حیرت کا کوئی پہلو نہیں اگر اس طرز حکومت کے خلاف شدید مزاحمانہ جذبات ان صوبوں میں پیدا ہوئے جنہیں نئے پاور سٹرکچر سے باہر رکھا گیا تھا۔ ابتدا میں ہی یہ جذبات شمالی مغربی سرحدی صوبے، بلوچستان اور سندھ میں پیدا ہوچکے تھے۔ پاکستان کی سیاسی تبدیلیوں کیلئے اس سے بھی زیادہ پریشان کن وہ ریسپانس تھا جو قومی سیاسی زندگی میں اکثریتی جمہوری قوت کی حیثیت دینے سے انکار کے ردعمل میں مشرقی بنگال کی طرف سے آیا۔

شمال مغربی سرحدی صوبہ:

شمال مغربی سرحدی صوبے کی سیاسی تاریخ میں مسلم لیگ کو زیادہ اہمیت نہ دینے اور افغان خطرے کی وجہ سے مرکز میں پختون قوم پرستی سے ہمیشہ خطرہ محسوس کیا جاتا تھا۔ کابل نے کبھی ڈیورنڈ لائن کو بین الاقوامی سرحد تسلیم نہیں کیا اور اس کا ہمیشہ سے بلوچستان اور صوبہ سرحد (موجودہ خیبر پختونخوا) کے بعض علاقوں پر دعوئ رہا ہے۔ اس کے علاوہ اس بات کا بھی خطرہ تھا کہ ریاست دیر پاکستان کے ساتھ الحاق کرنے کی

بجائے افغانستان کے ساتھ جاملے گی۔اس خطرے کا تو سد باب کرلیا گیا لیکن اس کے باوجود آزادی کی پہلی دہائی میں پاکستانی حکام نواب آف دیر پر اپنی ریاست میں عوام کو جمہوری حقوق دینے کیلئے زور ڈالتے رہے۔ریاست دیر کو علاقے کی دیگر ریاستوں سوات، چترال اور امب سمیت کبھی ون یونٹ سکیم میں شامل نہ کیا گیا۔پاکستان نے آزادی کی پہلی دہائی میں افغان چیلنج کو کاؤنٹر کرنے میں تو کامیابی حاصل کر لی لیکن کانگریس کی منتخب حکومت کو برطرف کر کے صوبائی حکومتوں کی برطرفی کی مثال قائم کرنے سے پہلے تک کامیابی نصیب ہونے کی صورت دکھائی نہیں دیتی تھی۔آخر مختلف حکمت عملیوں کو استعمال کرتے اور صوبے میں ایک مضبوط مقامی حلیف کے ساتھ اتحاد بنانے کے نتیجے میں مرکز نے اپنے مفادات کو تحفظ دینے کی صورت پیدا کرلی۔صوبہ سرحد میں کشمیری مسلم لیگی لیڈر خان عبدالقیوم خان کی جانب مرکز نے ہاتھ بڑھایا تو وہ ایک قابل اعتبار اتحادی ثابت ہوا۔صوبائی سیاست میں اس کی کامیابیاں انتظامی مشینری کی مضبوط پشت پناہی اور دیہی ترقی کے پروگراموں کو متعارف کرانے کی مرہون منت تھیں۔قیوم کی جانب سے ۱۹۴۹ میں جاگیرداری نظام کے خاتمے کیلئے کوششوں کو ابتدائی دنوں میں اس کی کانگریس کے ساتھ وابستگی کی روشنی میں دیکھا جاسکتا ہے۔ہزارہ علاقے کے مسئلے (۳۹) پر سرخ پوشوں کو دبانے کے ساتھ ساتھ اس بات کو بھی یقینی بنایا گیا کہ سرخ پوش لیڈر خان عبدالغفار خان محمد علی جناح کی جانب سے آزادی کے صرف آٹھ دن بعد ہی چھوٹے بھائی کی وزارت کی برطرفی کے صدمے کے اثرات سے باہر نہ آسکے۔قیوم خان نے اپنے ارادوں کی راہ میں مزاحم ہونے والے سابق مسلم لیگی لیڈروں کے ساتھ بھی سختی سے پیش آنے کی حکمت عملی بنائی۔پیر آف مانکی شریف جس نے صوبے میں عوامی مسلم لیگ کی داغ بیل ڈالی تھی اسے بھی جون ۱۹۴۹ کو ہمیشہ کیلئے صوبہ بدر کردیا گیا۔

اقتدار پر قیوم کی مضبوط گرفت نے پختونستان کے نعرے کی آڑ میں صوبہ سرحد کے علاقوں پر افغانستان کے دعوے کے خطرے کو بھی ہوا میں تحلیل کردیا۔تاہم زرعی اصلاحات کے حوالے سے اس کے اقدامات نے مسلم لیگ سے تعلق رکھنے والے

بڑے خانوں کو جو وہاں مسلم لیگ کے روایتی سپورٹر تھے سخت ناراض کردیا۔مسلم لیگ کے پرانے سرپرستوں میں بغاوت پھوٹ پڑی جس کی قیادت جھگڑا کے خان ابراہیم خان اور محمد یوسف خٹک نے اپنے ہاتھ میں لے لی۔تاہم پنجاب اور سندھ میں اپنے جاگیردار بھائیوں کے برعکس وہ اپنے گروہی مفادات کیلئے مرکز سے کمک حاصل نہ کرسکے۔قیوم خان کا مستحکم اثر ورسوخ کشمیر اور افغانستان کی سرحدوں کے ساتھ واقع اس جغرافیائی اہمیت کے حامل اہم علاقے میں مرکز کے مفادات کیلئے اس قدر کارآمد ثابت ہورہا تھا کہ اس کا توڑ کرنا ان کے بس کا روگ نہیں تھا۔

ون یونٹ سکیم نے حتمی طور پر مرکز اور صوبے کے درمیان کشیدگی کی فضا پیدا کردی تھی۔تاہم یہ حیران کن طور پر سندھ کے مقابلے میں بہت کم شدت کی حامل تھی اس امر کے باوجود کہ ایک ترقی یافتہ پختون سیاسی شعور کا نوآبادیاتی ورثہ وہاں موجود تھا۔اس کی ایک اہم وجہ مرکز میں ڈاکٹر خان صاحب کی حکمت عملی تھی جس نے بڑے بھائی غفار خان اور ان کے پیروکاروں کی مخالفت کو بے آواز کردیا۔آخر کار مرکز نے ون یونٹ کی ٹرانزیشن کی نگرانی کیلئے ایوب خان کے بھائی سردار بہادر خان کی طرف رجوع کیا جو اس سے پہلے مرکز میں وزیر مواصلات رہ چکے تھے۔فرنٹیئر میں ونٹ یونٹ سکیم کے خلاف آواز بلند ہونا شروع ہورہی تھی جو افغانستان سے آنے والے اشاروں کے ساتھ میچ کرتی تھی۔یوں اس مرحلے پر دوستی کیلئے بڑھنے والے مضبوط اور بااعتماد ہاتھوں کو مرکز نے تھامنے میں دیر نہیں لگائی۔

بلوچستان:

اگر آزادی کے ابتدائی برسوں میں مرکز کیلئے صوبہ سرحد میں کامیابی کی داستان رقم ہورہی تھی تو بلوچستان میں اس سے برعکس معاملہ چل رہا تھا۔آزادی کے بعد وہاں ہونے والی قبائلی بغاوت اور فوجی مداخلتوں کی روایت کے ڈانڈے ریاست قلات میں برطانوی غلبے کے خاتمے سے جاملتے ہیں۔تقسیم کے بعد خان آف قلات نے فوری طور پر پارلیمنٹ کے دو ایوان بنادیئے تھے جنہیں محدود نمائندگی کی بنیاد پر منتخب کیا گیا

تھا۔اس کا مقصد پاکستان کے ساتھ الحاق کے معاملے پر اپنے خیالات کو تقویت پہنچانا تھی۔قلات سٹیٹ نیشنل پارٹی نے جو ایوان زیریں میں اکثریتی پارٹی کی حیثیت سے پہنچی، الحاق کی مخالفت کرنے والوں کی قیادت سنبھال لی۔پاکستان کی حکومت نے دو اور ریاستوں لس بیلہ اور خاران کی پاکستان کے ساتھ الحاق کی حوصلہ افزائی کے ذریعے قلات پر اپنے دباؤ میں اضافہ کردیا۔ان دونوں ریاستوں کا خان آف قلات کے اس دعویٰ پر قلات کے ساتھ تنازعہ چل رہا تھا کہ دونوں ریاستیں قلات کی ماتحت ریاستیں ہیں۔خان آف قلات کا الحاق کرلینے کا فیصلہ ممکنہ طور پر ''پولیس ایکشن'' سے بچنے کیلئے تھا کیونکہ اس سے پہلے پاکستانی فوجی دستے خاران، لس بیلہ اور مکران کی ریاستوں سے دور ہٹادیے گئے تھے۔بلوچ قوم پرست ہمیشہ یہ الزام لگاتے آئے ہیں کہ مارچ ۱۹۴۸ میں ریاست قلات کے پاکستان کے ساتھ الحاق کا یہ فیصلہ دباؤ کا نتیجہ تھا۔اس فیصلے کے بعد خان آف قلات اللہ یار کے چھوٹے بھائی پرنس عبدالکریم نے فیصلے سے بغاوت کردی اور ایک علیحدگی پسند تنظیم بلوچ نیشنل لبریشن کمیٹی بنا کر فوراً ہی پاکستان آرمی کے خلاف اپنی کارروائیوں کا آغاز کردیا۔

پاکستانی حکومت الحاق کے عمل اور اس کے بعد کی صورتحال کو بہت قریب سے دیکھ رہی تھی۔الحاق کا عمل ہونے کے بعد خان آف قلات کو مجبور کیا گیا کہ وہ جولائی ۱۹۴۸ میں حکومت کے نامزد کردہ شخص کو اپنے وزیراعظم کی حیثیت سے قبول کرلے۔خان بہادر محمد ظریف خان ایک آزمودہ کار بیوروکریٹ تھا جس نے نوآبادیاتی دور میں اپنے کیریئر کا آغاز کیا تھا اور اس کی تمام تر وفاداریوں کا محور حکومت پاکستان تھی نہ کہ خان آف قلات۔اس نے ۱۹۵۲ میں قلات، خاران، لس بیلہ اور مکران کی بلوچستان سٹیٹ یونین کے نام پر ایک دوسرے میں انضمام کے عمل کی نگرانی کی۔خان کے ساتھ معاہدے کو اس کی مراعات میں اضافہ کرکے محفوظ بنالیا گیا تھا۔اس نئے بندوبست میں منتخب کونسل کا کوئی کردار نہیں تھا تھا اس کی بجائے یہ مرکز کے نامزد کردہ وزیراعظم کے ہاتھوں انجام پذیر ہوا تھا۔پاکستانی ریاست کی مرکزیت پسند پالیسیوں کو ریاست قلات اور صوبہ بلوچستان میں موجود بلوچ قوم پرست گروپوں نے تشویش کی نگاہوں سے دیکھنا شروع کیا تھا۔خان آف قلات بذات خود حرکت میں آنے پر مجبور ہوگیا جب ۱۹۵۴ میں یہ خبریں گردش کرنے لگیں کہ بلوچ سٹیٹ یونین کو بلوچستان میں ضم کردیا جائے گا۔یہ سارا عمل مغربی پاکستان کو واحد صوبہ قرار دینے کیلئے ون یونٹ سکیم کی تیاریوں کا حصہ تھا۔جب اکتوبر ۱۹۵۵ میں ون یونٹ سکیم کا عمل اپنی تکمیل کو پہنچا تو ریاست قلات کا درجہ کم کرکے محض ایک انتظامی ضلع تک محدود کردیا گیا۔تاریخی ریاست قلات کی ''موت'' نے بلوچ اور قلات قوم پرستی کا یکجا کردیا۔

بلوچستان میں قوم پرستی تحریکوں کی ابتدا ۱۹۲۰ میں ہوچکی تھی لیکن ریاست قلات کے پاکستان میں الحاق کے بعد اس کے پھیلنے کی رفتار میں بہت تیزی آگئی۔مستقبل میں بلوچ قوم پرستی کی مسلح مزاحمتی تحریک میں بدلنے اور مسلح بغاوتوں کے سلسلے کی اس وقت داغ بیل پڑی جب پرنس عبدالکریم نے ۱۹۵۸ میں دوسری قبائلی بغاوت کی ابتدا کردی۔اس کے جواب میں خان آف قلات کو گرفتار کرکے اس کی پنشن سے محروم کردیا گیا۔یہ بغاوت نچلی سطح پر شیر محمد مری (مری قبیلے سے تعلق رکھنے والے شیر محمد کو عام طور پر جنرل شیروف کے نام سے جانا جاتا ہے۔مترجم) نے جاری رکھی۔اس نے جھلاوان اور بگٹی کے علاقوں میں گوریلا کیمپ قائم کردیے۔جب جنرل ایوب خان نے ملک میں مارشل لاء لگایا تو اس کی وجوہات میں بلوچستان میں جاری صورتحال کو بھی بہانے کے طور پر شامل کیا گیا۔

سندھ:

سارہ انصاری انکشاف کرتی ہیں کہ کیسے سندھ میں مستقبل کے پنجابی غلبے کے حامل پاکستان کے خلاف معاندانہ جذبات کی ابتدا نوآبادیاتی دور میں ہی ہوچکی تھی جب انگریزوں نے سکھر بیراج کی تعمیر کے بعد پنجابی آبادکاروں کی سندھ کی زرخیز زرعی زمینوں پر آبادکاری شروع کی تھی۔مطالبہ پاکستان کی حمایت کی زیریں تہہ میں سندھی مسلم شناخت کے تحفظ کے حوالے سے سوچ بھی موجود تھی۔قیام پاکستان کے بعد سندھ میں یوپی سے تعلق رکھنے والے مہاجرین کی آمد اور جولائی ۱۹۴۸ میں کراچی کو وفاقی

دارالحکومت قرار دے کر باقی سندھ سے انتظامی حوالے سے علیحدہ کر دینے کے عمل نے سندھ میں مرکز کے خلاف جذبات کو بہت ہوا دی۔ان جذبات کا اولین اظہار کرنے والوں میں نا صرف جی ایم سید بلکہ آزادی کے بعد سندھ کے پہلے وزیر اعلیٰ ایوب کھوڑو بھی پیش پیش تھے۔ایوب کھوڑو کا مرکز سے تصادم نا صرف پنجاب سے مہاجرین کی سندھ منتقلی کے فیصلے کے نتیجے میں ہوا تھا بلکہ اس کی ایک وجہ سندھ سے غیر مسلموں کے انخلاء کو روکنے میں مرکز کی ناکامی بھی تھی (۴۰)۔اس کے اسمبلی میں موجود حامی اس بات پر تلخی کا اظہار کرتے تھے کہ "جب وہ سندھ کے مفادات کی بات کرتے ہیں تو انہیں صوبائی پرست قرار دے دیا جاتا ہے جبکہ مغربی پنجاب میں سوائے مشرقی پنجاب سے آنے والوں کے کسی اور مہاجر کو قبول نہیں کیا جا رہا۔ان کا یہ کہنا تھا کہ کیا یہ صوبائیت نہیں ہے؟"(۴۱)۔اپریل ۱۹۴۸ میں محمد علی جناح کی جانب سے "بد انتظامی، اپنے فرائض اور ذمہ داریوں میں بڑے پیمانے پر کوتاہی اور بداعمالی نیز کرپشن" کے الزامات میں ایوب کھوڑو کی حکومت کی برطرفی پر مہاجر لابی نے خوشی کا اظہار کیا۔تاہم یہ مستقبل میں پاکستان کی جمہوری ترقی کیلئے سخت دھچکا ثابت ہوا۔

کھوڑو نے سیاست سے اپنی نااہلیت کے باوجود سندھ مسلم لیگ میں اپنے اثر ورسوخ کو بعد میں آنے والی صوبائی حکومت اور صوبائی حقوق کے پرچار کیلئے بہت زیادہ استعمال کیا۔مارچ ۱۹۵۱ میں وہ مختصر مدت کیلئے اقتدار میں واپس آئے لیکن صرف آٹھ ماہ بعد دوبارہ کرپشن کے الزامات پر اقتدار سے محروم کر دیئے جانے کیلئے۔نئے گورنر جنرل غلام محمد نے دستور ساز اسمبلی کو تحلیل کرنے کی ریہرسل کے طور پر سندھ اسمبلی کو تحلیل کر دیا اور وہاں ڈائریکٹ رول کا نفاذ کر دیا۔مئی ۱۹۵۳ میں انتخابات کے بعد وہاں معمول کی سیاسی زندگی کا دوبارہ آغاز ہو گیا۔تاہم اس وقت تک دھڑے بندی کے نتیجے میں ہونے والی لڑائیوں کے افسوسناک تماشے اور مہاجرین کی بلا روک ٹوک سندھ میں آمد کا سلسلہ جاری رہنے کے نتیجے میں سماجی سطح پر شدید کشیدگی کی فضا بن چکی تھی۔ان حالات نے جی ایم سید کی حوصلہ افزائی کی جنہوں نے ستمبر ۱۹۵۳ میں اسمبلی کے ایک اجلاس میں بحث کرتے ہوئے قرار دیا کہ "سندھی ایک منفرد قومیت ہے اور یہ ملک کی

دیگر قومیتوں کے ساتھ مساوی سلوک کی مستحق ہے"۔انہوں نے دستور ساز اسمبلی میں سندھ کی غیر مساوی نمائندگی، کراچی کو سندھ سے علیحدہ کرنے پر کسی کمپن سیشن کی عدم ادائیگی صوبے کے داخلی امور چلانے کے سلسلے میں سندھ حکومت کے اختیارات اور انتظامات میں مرکز کی بہت زیادہ مداخلت، ملازمتوں میں سندھ کی ناکافی نمائندگی سندھ میں مہاجرین سے مسئلے سے عہدہ برا ہونے کے سلسلے میں مرکز کی عدم دلچسپی کے معاملات پر مرکز کو آڑے ہاتھوں لیا (۴۲)۔

ایک اور سیاسی کروٹ کے نتیجے میں ایوب کھوڑو کی حکومت کو ایک مرتبہ پھر بحال کر دیا گیا کیونکہ اس بار مرکز کو ون یونٹ سکیم کے سلسلے میں ان کی حمایت درکار تھی۔اس وقت صوبے کے اقتدار پر فائض عبدالستار پیرزادہ ون یونٹ سکیم میں سندھ کے انضمام کے خلاف مارچ ۱۹۵۴ میں وجود میں آنے والے "سندھ بچاؤ محاذ" کا زور توڑنے کے عزم اور قوت سے محروی کا اظہار کر چکے تھے (۴۳)۔گورنر جنرل غلام محمد نے ستار پیرزادہ کی حکومت کو معزول کر دیا اور پروڈا (پبلک اینڈ ریپریزنٹیٹو آفسز ڈسکوالیفکیشن ایکٹ) کے تحت نااہلی بھگتنے والے ایوب کھوڑو پر سے نااہلی کی تلوار ہٹا دی۔اس حقیقت کو کہ ایوب کھوڑو اسمبلی کے رکن ہیں نہ مسلم لیگ کے رکن ہیں یکسر نظر انداز کر دیا گیا اور انہیں غیر معمولی مثال قائم کرتے ہوئے محض اس وجہ سے سندھ کا وزیر اعظم (وزیر اعلیٰ) بنا دیا گیا کہ وہ صوبے کی ون یونٹ سکیم میں شمولیت کو ممکن بنانے پر دل و جان سے آمادہ تھے۔سندھ میں ون یونٹ کی طاقتور مخالفت کا مطلب یہ تھا کہ ہمسائیہ پنجاب کی نسبت کہیں زیادہ چالاکی کے ساتھ معاملات چلائے جائیں گے۔ایوب کھوڑو نے آزمودہ ہتھکنڈوں سے کام لیتے ہوئے غلام علی تالپور اور پیر الٰہی بخش جیسے مخالفین کو سازش کے الزامات میں الجھا دیا۔اسمبلی کے ارکان کو پولیس کی بھاری نفری دکھا کر جس نے اسمبلی کی عمارت کا محاصرہ کر رکھا تھا ان کے دلوں میں خوف بٹھا دیا گیا جبکہ اپوزیشن کو خاموش کرنے کیلئے اس کے ارکان پر مختلف مقدمات قائم کر دیئے گئے۔ان اقدامات کے ذریعے اسمبلی میں ون یونٹ کی قرارداد کو بلڈوز کر دیا گیا اور جون ۱۹۵۵ میں کھوڑو گروپ کو نئی دستور ساز اسمبلی کیلئے منتخب کرا لیا گیا۔جبکہ مرکز اپنے

مفادات کے حصول کیلئے سرگرم تھا، سندھ قوم پرستی کو سیاسی رنگ میں رنگنے کا عمل تیز سے تیز تر ہوتا جا رہا تھا۔

مشرقی بنگال:

تحریک آزادی کے مومینٹم کو مشرقی بنگال میں شراکتی پارلیمانی جمہوریت کے ڈھانچے میں رہتے ہوئے موثر حکمران پارٹی کی تشکیل کیلئے استعمال کیا جاسکتا تھا۔اس کی بجائے وہاں مسلم لیگ کے ڈھانچے کو زوال آشنا کیا گیا اور باوجود اس حقیقت کے کہ قیام پاکستان کے ابتدائی برسوں میں بنگال سے تعلق رکھنے والے تین وزرائے اعظم خواجہ ناظم الدین، محمد علی بوگرا اور حسین شہید سہروردی مرکز میں برسر اقتدار ہوئے، بنگال کی آبادی میں مرکز کے حوالے سے لاتعلقی کے جذبات پروان چڑھنا شروع ہوگئے۔

مئی ۱۹۴۸ میں مشرقی بنگال مسلم لیگ کی تنظیم نو نے وہاں کے قدامت پرست خواجہ دھڑے کے اثر و رسوخ میں اضافہ کر دیا۔اس دھڑے کے لوگوں کو ان ترقی پسندوں کے برخلاف مرکز کا زیادہ وفادار سمجھا جاتا تھا جنہوں نے تحریک آزادی کے آخری دنوں میں ان پرانے مہروں کو ڈھاکہ میں بے اثر کر دیا تھا۔ان پرانے جاگیرداروں کی بحالی کو دیہات میں جڑیں رکھنے والے بنگالی سپیکنگ لیڈروں کی بجائے شہری اردو سپیکنگ اشرافیہ کی اقتدار میں واپسی کے مترادف قرار دیا جانے لگا۔اس عمل نے "ایک قوم اور ایک کلچر" پالیسی کو تقویت بخشی لیکن محض سطحی طور پر۔درحقیقت پاکستانیت کے اس پروگرام کے فروغ نے قومی تعمیر کے اس پروگرام کو سخت نقصان پہنچایا جس کا مقصد عوام کی خدمت تھا۔اس کی ایک چھوٹی سی مثال جولائی ۱۹۴۸ میں اس وقت سامنے آئی جب ریڈیو پاکستان ڈھاکہ کے بنگالی نیوز بلیٹن کے دوران بنگالی میں عربی اور فارسی کے الفاظ کی آمیزش کرنے کے انتہائی غیر مقبول عمل کے خلاف مظاہرے شروع ہوگئے اور آخر کار مظاہرین نے ڈائریکٹر براڈکاسٹنگ کو اس متنازعہ عمل کو ختم کرنے پر مجبور کر دیا(۴۴)۔

دستور ساز اسمبلی میں بنگالی کو سرکاری زبان قرار دینے اور ڈھاکہ میں اسمبلی کے سیشن منعقد کرنے سے انکار نے پاکستان کے مشرقی بازو میں بے چینی کے جذبات

پیدا کر دیئے اور وہاں احتجاجی مظاہروں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔بے چینی کی ایک اور لہر اس وقت پیدا ہوئی جب مرکز نے بڑی تعداد میں پنجاب سے تعلق رکھنے والے افسران کو مشرقی پاکستان میں تعینات کرنے کا فیصلہ کیا۔مغربی پاکستان کے ساتھ تجارت پر بندش سے پیدا ہونے والی گلیوں کی سطح پر معاشی ڈس لوکیشن مرکز مخالف جذبات کو بھڑکانے کا ایک اور ذریعہ ثابت ہوئی۔ادھر مغربی پاکستان کے لیڈروں نے مشرقی بنگال کی کسی بھی رنجش یا شکایات پر قانونی کارروائی کرنے سے انکار کر دیا۔انہیں نرمی اختیار کرتے ہوئے گمراہ کن صوبائیت پرستوں کے پروپیگنڈے کا نتیجہ قرار دے کر رد کر دیا گیا جبکہ سختی اختیار کرتے ہوئے ان مطالبات کو ڈھاکہ میں موجود انڈین ففتھ کالمسٹوں کی موجودگی کے شواہد قرار دے کر رد کر دیا گیا۔ان رویوں کا اظہار جنوری ۱۹۴۸ میں ہی شروع ہوگیا تھا جب وفاقی وزیر مواصلات سردار عبدالرب نشتر نے ڈھاکہ کا دورہ کیا تھا۔"علاقائی حب الوطنی صاف طور پر اسلام کے منافی ہے"۔انہوں نے پرباتیپر میں ایک جلسے سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا۔"پاکستان اس بنیاد پر وجود میں آیا تھا کہ مسلمان ایک قوم ہیں لہٰذا بنگالی، پنجابی، بہاری بن کر سوچنا پاکستان کی بنیادوں کو کمزور کرنے کے مترادف ہے۔۔۔یہ گمراہ کن خیالات پاکستان کے دشمن پھیلا رہے ہیں جو مسلمانوں کے درمیان ففتھ کالمسٹ کا کردار ادا کر رہے ہیں"(۴۵)۔اس حقیقت کو کہ بنگالی کو سرکاری زبان قرار دینے کا مطالبہ کرنے والوں میں دستور ساز اسمبلی کے ہندو اراکین بھی شامل ہیں جیسا کہ کلکتہ میں بنگالی اخبار کر رہے تھے، مغربی پاکستان کی اشرافیہ نے اس بات کے ثبوت کے طور پر پیش کیا کہ مشرقی پاکستان سے بنگالی کو قومی زبان قرار دینے کا مطالبہ دراصل بھارت سازش ہے۔

مشرقی بنگال میں لسانی تحریک نے ۱۹۵۲ میں دوبارہ اس وقت سر اٹھایا جب دستور کی عبوری رپورٹ میں اردو کو واحد قومی زبان قرار دینے کی سفارش کی گئی تھی۔خواجہ ناظم الدین نے زبان کے مسئلے سے غلط انداز میں نمٹنے کی کوشش کی جس کی بنا پر احتجاج میں مزید شدت آگئی۔۲۱ فروری کو ڈھاکہ یونیورسٹی کے کیمپس میں زبان کے مسئلے پر ہونے والے احتجاج کو پولیس نے طاقت کے زور پر کچلنے کی کوشش کی جس کے دوران

پولیس کی گولیوں سے چار طلباء جاں بحق ہوگئے۔ یہ واقعہ صوبے میں مسلم لیگ کے تابوت میں آخری کیل ثابت ہوا(۴۶)۔ پولیس کیلئے ان طلبا کی یاد میں تعمیر کیے جانے والے شہید مینار کو گرادینا آسان تھا لیکن کراچی یا ڈھاکہ کی حکومتوں کیلئے بنگالیوں کی ثقافتی وسیاسی بیداری کو کچل دینا آسان کام نہ تھا۔ مشرقی بنگال میں عوام نے ہر سال ۲۱ فروری کو یوم شہداء کے طور پر منانے کا سلسلہ شروع ہوگیا اور ہر سال ۲۱ فروری جذبات میں ابال پیدا کرنے کا سبب بننے لگا(۴۷)۔

لسانی مسئلے کے ساتھ ساتھ وہاں یہ سوچ بھی پروان چڑھنے لگی کہ مغربی پاکستان ایک نوآبادی کی طرح مشرقی پاکستان کا معاشی استحصال کررہا ہے۔ آزادی کے وقت ملک کے دونوں بازوؤں کے درمیان جو اقتصادی عدم برابری کی خلیج موجود تھی (۴۸) آزادی کی پہلی دہائی کے دوران اس میں بہت زیادہ اضافہ ہوگیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مغربی پاکستان میں صنعتی پیداوار اور انفراسٹرکچر تعمیر کرنے کی رفتار مشرقی پاکستان سے کہیں زیادہ تھی۔ بنگالی تنقید کا سب سے شدید ہدف زرمبادلہ کے حصول کیلئے مشرقی پاکستان سے مغربی پاکستان کی طرف وسائل کی منتقلی تھی (۴۹)۔ یہ عمل جسے ''داخلی نوآبادیات ازم'' کا نام دیا گیا پہلے سیاسی خودمختاری اور بعد ازاں حتمی طور پر علیحدگی کے مطالبے پر منتج ہوا۔

مشرقی پاکستان سے پٹ سن کی پیداوار کو برآمد کرنے سے حاصل ہونے والے زرمبادلہ کو مغربی پاکستان میں ترقیاتی منصوبوں پر خرچ کرنے کا بڑھتا ہوا عمل ''داخلی نوآبادیات ازم'' کے الزام کا سب سے بڑا ہدف تھا۔ اس نے پہلے ہی پٹ سن دونوں بازوؤں کے درمیان دراڑیں ڈالنے کا باعث بن چکی تھی۔ پاکستانی حکومت کی جانب سے ستمبر ۱۹۴۹ کو امریکی ڈالر کے مقابلے میں پاکستانی کرنسی کی قیمت کم کرنے سے انکار کے بعد بھارت سے پٹ سن کی تجارت کو دھچکا لگا جو فساد کی پہلی جڑ تھی۔ اس کے نتیجے میں تجارت کے گراف میں آنے والی گراوٹ نے بنگالی بے اطمینانی کو مزید بڑھا دیا۔ قیمتوں کو استحکام دینے کیلئے حکومت پاکستان کی جانب سے جیوٹ بورڈ کا قیام ایک اور بحرانی موڑ ثابت ہوا کیونکہ اس میں فیصلہ سازوں کی اکثریت کا تعلق مغربی

پاکستان سے تھا۔ مشرقی بنگال میں ۱۹۵۴ میں ہونے والے انتخابات میں پٹ سن کا مسئلہ اپوزیشن کے انتخابی پروگرام میں سرفہرست تھا اور صرف اس ایک مسئلے نے انتخابی نتائج کی صورت گری میں نمایاں کردار ادا کیا۔

لسانی اور معاشی مسائل کے ساتھ ساتھ دستور سازی کے عمل نے صوبے اور مرکز کے درمیان تعلقات پر شدید اثرات مرتب کیے۔ اس کے ساتھ ہی ملک کے دونوں بازوؤں کے درمیان مخلوط اور جداگانہ بنیادوں پر انتخابات جیسے مسائل نے بھی سر اٹھا لیا جن کی وجہ سے قومی جمہوری استحکام کے عمل کو بہت نقصان پہنچا۔ جیسا کہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ ونٹ یونٹ سکیم کا اصل مقصد بنگال کی جمہوری اکثریت کو اقلیت میں بدلنا تھا۔ ۱۹۵۰ میں جاری ہونے والی مشہور عبوری رپورٹ میں اس بات سے انکار کیا گیا ہے۔ اس کے جواب میں بنگال کی جوابی تجاویز نے ایسے مسائل اٹھائے جن کا حتمی طور پر نتیجہ علیحدگی کی صورت میں نکلا۔ ان مطالبات کو نومبر ۱۹۵۰ میں تشکیل پانے والی ایک نئی جماعت عوامی لیگ کے تحت ڈھاکہ میں منعقد ہونے والے گرینڈ نیشنل کنونشن میں پیش کیا گیا تھا۔ ان میں پاکستان کو ریاست ہائے متحدہ بنانے کی تجویز بھی شامل تھی جس کے مطابق یہ ملک کے مشرقی اور مغربی بازوؤں پر مشتمل ہو جس کے مشترکہ الیکٹورل سسٹم کے تحت انتخابات منعقد کیے جائیں۔ مرکز کے پاس صرف دفاع اور خارجہ امور کے محکمے ہوں اور اس کے ساتھ ساتھ اس کے مشرقی ونگ میں علیحدہ سے ریجنل ڈیفنس یونٹ اور ریجنل فارن آفس قائم کیا جائے۔ اگر کوئی نیا ٹیکس عائد کرنا ہو تو یہ صرف دونوں ریجنوں کے درمیان اتفاق رائے کے ساتھ ہو۔ عوامی لیگ کا بعد میں سامنے آنے والا چھ نکاتی پروگرام جو ۱۹۷۱ میں ملک کی تقسیم کا باعث بنا تھا وہ ۱۹۵۰ کی دہائی میں اختیار کی جانے والی پوزیشن سے ہی اخذ کیا گیا تھا (۵۰)۔

حتیٰ کہ مشرقی بنگال اسمبلی میں بھی عبوری رپورٹ کو شدید اپوزیشن کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ یہ مخالفت محض عوامی لیگ تک محدود نہیں تھی بلکہ اس میں ایسٹ بنگال مسلم لیگ کے کچھ ارکان بھی شامل تھے۔ اس کے باوجود وہاں مسلم لیگ کے بارے میں یہ تاثر زیادہ سے زیادہ پختہ ہو رہا تھا کہ یہ پارٹی صرف اور صرف مرکز کے مفادات کی

نگہبان ہے۔ مسلم لیگ کے زوال کے نتیجے میں نہ صرف مشرقی پاکستان میں بلکہ مغربی پاکستان میں بھی سیاسی عدم استحکام پیدا ہوگیا۔ فروری ۱۹۵۲ میں زبان کے مسئلے پر پیدا ہونے والی شورش نے اس کے مقدر پر مہر ثبت کردی۔ اپوزیشن کی جماعتیں بشمول اے کے فضل الحق کی سال خوردہ پارٹی کرشک سرامک پارٹی عوامی لیگ کے ساتھ ہم آہنگ ہورہی تھیں۔ فضل الحق کی شخصیت، شہرت اور ناقابل فراموش شعلہ بیانی نے نوتشکیل شدہ اپوزیشن اتحاد یونائیٹڈ فرنٹ میں بھی انہیں اگلی صفوں میں رکھا۔ یہ اتحاد ۱۹۵۴ کے صوبائی انتخابات مل کر لڑنے کے سلسلے میں تشکیل دیا گیا تھا۔ فضل الحق کی اپنی دبنگ شخصیت کے باوجود ان کی پارٹی سہروردی کی عوامی لیگ کے برعکس تنظیمی ڈھانچے کی شدید کمزوری کا شکار تھی۔

یونائیٹڈ فرنٹ نے اپنا اکیس نکاتی منشور پیش کیا جس کا مرکز ومحور علاقائی خود مختاری تھی جس کے تحت صرف دفاع، خارجہ امور اور کرنسی کو مرکز کے سپرد کیا گیا تھا۔ اتحاد سے باہر موجود اپوزیشن جماعتوں کی حمایت حاصل کرنے کیلئے فرنٹ نے اپنے منشور میں زرعی اجناس کی مناسب قیمتیں طے کرنے اور کم تنخواہ دار اور زیادہ تنخواہ والے طبقات کے درمیان آمدنی کی خلیج کو کم کرنے کے مطالبات بھی شامل کیے گئے۔ ان مطالبات کو افراط زر اور کوریائی جنگ کے نتیجے میں پیدا ہونے والے اقتصادی ابھار کی فضا میں بہت زیادہ پذیرائی ملی۔ آخر میں فرنٹ نے اپنے مطالبات میں پٹ سن کی صنعت کو قومی تحویل میں لینے کا مطالبہ شامل کرکے مشرقی بنگال کے نوآبادیاتی سٹیٹس کی سب سے بڑی علامت کو بھی اپنے ہدف کا نشانہ بنالیا۔ فرنٹ نے اپنے اکیس نکاتی مینو فیسٹو کو عوام کے سامنے ''چارٹر آف فریڈم'' کی صورت میں پیش کیا(۵۱)۔ بعد میں اپوزیشن کی جانب سے پیش کیے جانے والے تمام پروگرام محض اس بنیادی دستاویز کی تلخیص سے تھے(۵۲)۔

۱۹۵۴ میں مشرقی بنگال کے انتخابات مسلم لیگ کیلئے جو مرکز کے ساتھ بہت زیادہ اختلاط کی حامل تھی خاتمے کی خبر ثابت ہوئے۔ ان انتخابات کے نتیجے میں مسلم لیگ ۳۰۹ رکنی ایوان میں محض ۱۰ سیٹوں تک محدود ہوگئی جبکہ یونائیٹڈ فرنٹ جس نے ۶۔۶۵

فیصد ووٹ حاصل کیے تھے ۲۲۳ سیٹیں جیت لیں(۵۳)۔ ووٹروں نے مسلم لیگ کے منشور کو توسرے سے مسترد کردیا تاہم اس کی قبل ازآزادی اپنائی جانے والی کئی پالیسیوں کی حمایت کی۔ بنگالی ووٹر کئی اعتبار سے مشرقی بنگال کے مستقبل کو قرارداد لاہور کی اصل روح کے مطابق نکھارنے کا عمل شروع کرچکے تھے۔ بنگال کے منظرنامے میں ہونے والی اس تبدیلی کو مرکز نے قبولیت کا شرف بخشنے سے انکار کردیا یوں بنگالیوں کو مکمل علیحدگی کے راستے پر ڈال دیا۔

فضل الحق کی حکومت کو صرف ایک ماہ کا اقتدار نصیب ہوا جس کے بعد مرکز نے اسے کمیونسٹ نواز اور بھارت نواز ہونے کے الزامات عائد کرکے برطرف کردیا اور حالات پر قابو پانے کیلئے وہاں گورنر راج کا نفاذ کردیا گیا۔ اس برطرفی پر تھوڑا بہت احتجاجی شور شرابا ہوا جس پر جلد قابو پالیا گیا۔ جس کی سب سے اہم وجہ یہ تھی کہ اس ایک ماہ کے اقتدار میں ہی امن وامان کی صورت ہولناک حد تک بگڑ گئی تھی۔ تاہم آدم جی جیوٹ مل میں ہولناک ہنگامے پھوٹ پڑے جن میں ۴۰۰ افراد ہلاک ہوگئے۔ ان ہنگاموں کو فوج کی مدد سے کچل دیا گیا(۵۴)۔ اس سوال پر کہ کیا مزدوروں کے ان ہنگاموں کے پیچھے ''خفیہ ہاتھ کارفرما'' تھے آج تک اسرار کا پردہ پڑا ہوا ہے۔

گورنر راج کو اس وقت اٹھایا گیا جب دستور ساز اسمبلی کے انتخابات منعقد ہونا تھے اور جب فضل الحق کی کرشاسرامک پارٹی کی مرکز میں سہروردی کے مقابلے میں محمد علی بوگرا کیلئے حمایت حاصل کرلی گئی۔ اس وقت مرکز میں وزارت عظمٰی کے حصول کیلئے بوگرا کی سہروردی کے ساتھ کشمکش چل رہی تھی۔ فضل الحق کی اپریل ۱۹۵۵ میں عوامی لیگ سے دوری نے اسے مرکز کی عنایات کا حقدار بنادیا۔ مرکز میں مسلم لیگ اور کرشاسرامک پارٹی کے نئے نویلے اتحاد نے یونائیٹڈ فرنٹ کی حکومت کو (عوامی لیگ کے بغیر) ابو حسین سرکار کی قیادت میں مشرقی بنگال میں دوبارہ برسر اقتدار آنے کا موقع فراہم کردیا۔

اپنی اس بے مثال قلابازی کے بعد تحریک پاکستان کے دنوں میں شیر بنگال کا لقب پانے والے اے کے فضل الحق سیاست کے شاطر کھلاڑی کی حیثیت سے مشرقی

بنگال کے گورنر بنا دیئے گئے۔ انہوں نے ابو حسین سرکار کو اقتدار پر فائز رکھنے کی کوشش کی جو ناکام ثابت ہوئی۔ اگست ۱۹۵۶ کے آخر تک وہ اسمبلی کے اندر اس قدر تنہا ہو چکے تھے کہ ان کے پاس مستعفی ہونے کے سوا کوئی چارہ نہ رہا۔ سرکار کے استعفیٰ نے عطاالرحمٰن خان کی قیادت میں عوامی لیگ کیلئے اقتدار میں آنے کا راستہ ہموار کردیا۔ مشرقی پاکستان میں حکومت کی تبدیلی نے ناگزیر طور پر مرکز میں دستور ساز اسمبلی میں بھی ہلچل پیدا کی۔ اس ہلچل کے نتیجے میں مرکز کے اندر اکھاڑ پچھاڑ کا ایک اور دور چلا اور وزیر اعظم چودھری محمد علی کی مسلم لیگ اور یونائیٹڈ فرنٹ کی مخلوط حکومت کو برطرف کردیا گیا اور ان کی جگہ حسین شہید سہروردی کی حکومت نے لے لی جو عوامی لیگ اور ری پبلکن پارٹی پر مشتمل تھی۔ سہروردی کی حکومت میں شمولیت نے عوامی لیگ کی صفوں میں شدید تناؤ کی کیفیت پیدا کردی۔ خاص طور پر خارجہ امور کے حوالے سے کیونکہ لیگ کی صوبائی قیادت نہر سوئز کے مسئلے پر پیدا ہونے والی گرم بازاری میں مغرب نواز اپروچ کی مخالف تھی اور اس کی کھلے الفاظ میں مذمت کررہی تھی۔ بلاشبہ اصل بات یہ تھی کہ عوامی لیگ کی صوبائی قیادت سہروردی کی قومی سطح پر وزارت عظمیٰ سے ناخوش تھی لہٰذا ردعمل میں مایوس و دلگرفتہ صوبائی عوامی لیگ نے صوبائی خودمختاری کے نعرے کو زیادہ شدت کے ساتھ بلند کرنا شروع کردیا۔ سہروردی اور بھاشانی کے دھڑوں کے درمیان نظریاتی اختلافات نے اس قدر شدت پکڑی کہ موخر الذکر نے جولائی ۱۹۵۷ میں عوامی لیگ سے الگ ہو کر ایک نئی پارٹی بنائی۔ مولانا بھاشانی کو مغربی حصے میں میاں افتخار الدین، غفار خان، جی ایم سید اور عبدالمجید سندھی جیسے مرکز کے باغیوں کی جانب سے حمایت حاصل ہوگئی۔ اس نئے گروپ نے مل کر نیشنل عوامی پارٹی کی داغ بیل ڈالی اور ایک پانچ نکاتی پروگرام تشکیل دے کر اپنی سرگرمیوں کا آغاز کردیا۔ اس کے مطالبات میں سرفہرست مطالبہ ون یونٹ کا خاتمہ تھا جبکہ دیگر مطالبات میں غیر جانبدار خارجہ پالیسی، علاقائی خود مختاری، جوائنٹ الیکٹوریٹ کی بنیاد پر فوری انتخابات اور مشہور و معروف ۲۱ نکاتی مینوفیسٹو کے ۱۴ باقی ماندہ نکات پر عمل درآمد شامل تھے (۵۵)۔

نیشنل عوامی پارٹی کے قیام نے وفاقی دارالحکومت کراچی میں موجود

اسٹیبلشمنٹ کے نزدیک سہروردی کی افادیت ختم کردی۔ اس کے ساتھ ہی مشرقی بنگال میں عطاالرحمٰن خان کی عوامی لیگ کی حکومت بھی ڈانواڈول ہوگئی۔ بنگالی سیاست کے ایک اور ناسمجھ میں آنے والے اباؤٹ ٹرن کے دوران عوامی نیشنل پارٹی نے پہلے تو ۱۸ جون کو غیر جانبدار رہتے ہوئے عطاالرحمٰن کی حکومت کا خاتمہ ہونے دیا اور پھر فوری بعد اس کے پیشرو ابو حسین سرکار کی حکومت لانے میں سرگرم کردار ادا کیا۔ اگست ۱۹۵۸ میں نیشنل عوامی پارٹی کی حمایت سے عوامی لیگ کی حکومت میں واپسی سے پہلے ایک بار پھر مختصر سا صدارتی راج کا وقفہ آیا۔ لیکن نیپ کی یہ حمایت صوبے کی حد تک محدود رہی، مرکز میں انہوں نے دست تعاون دراز کرنے سے انکار کردیا۔ یوں انتشار زدہ اور موقع پرستانہ سیاسی قلابازیوں نے جمہوریت کی ساکھ کو سخت دھچکا پہنچایا۔ ۲۱ ستمبر کو ہونے والے ایک بحث مباحثے کے دوران زبانی کلامی حملوں نے جسمانی حملوں اور تشدد کا روپ اختیار کرلیا۔ مشرقی بنگال کی اسمبلی میدان کارزار بن گئی اس حد تک کہ ڈپٹی سپیکر کو اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑے۔ یہ شرمناک واقعہ اپنے طور پر فوج کو دعوت دینے کیلئے کافی نہ تھا لیکن اس نے ایوب خان کو ۸ اکتوبر ۱۹۵۸ کی صبح مارشل لاء لگانے کا بہانہ ضرور فراہم کردیا۔

حرف آخر:

جمہوریت کی اصطلاح کو ڈھیلے ڈھالے انداز میں استعمال کیا جاتا ہے لیکن اس میں اختلاف کا ایک جہاں آباد ہے کہ کس چیز کو "پروسیجرل جمہوریت" کا نام دیا جائے اور کسے "سماجی جمہوریت" کہا جائے۔ اول الذکر باقاعدہ انتخابات کے انعقاد سے کچھ زیادہ کا تقاضا کرتی ہے جبکہ موخر الذکر اقتدار کے کھیل میں شراکتی عنصر کو شامل کرنے اور سماجی ناانصافیوں کو دور کرنے کا مطالبہ کرتی ہے۔ اس کی غیر موجودگی میں جمہوریت محض زبانی جمع خرچ بن کر رہ جاتی ہے۔ پاکستان ۵۸ ۔ ۱۹۴۷ کی درمیانی مدت میں "پروسیجرل جمہوریت" پر کسی نہ کسی حد تک عمل پیرا رہا۔ اس دوران اگر قومی سطح پر نہیں تو صوبائی سطح پر انتخابات کا انعقاد ہوتا رہا۔ لیکن ملک نے کسی بھی طرح "سماجی

جمہوریت'' کی کسی بھی خصوصیت کو اپنے قریب نہیں پھٹکنے دیا۔ جو کہ درحقیقت نوآبادیاتی دور کے خاتمے پر شروع ہونے والے ٹرانزیشن کے دور میں استحکام کیلئے ضروری عمل تھا۔ اس دوران پنجاب اور سندھ میں بہت محدود پیمانے پر زرعی اصلاحات کی کوشش کی گئی لیکن جاگیردار اشرافیہ نے جس کی طاقت کی انگریز حکمرانوں نے باقاعدہ پاسبانی کی تھی اس قسم کی کسی بھی کوشش کو سختی سے ناکام بنادیا۔ ممدوٹ اور کھوڑو جیسے سیاستدانوں نے اپنے گروہی مفادات کے تحفظ کیلئے صوبائی حقوق کے نام پر مرکز کے خلاف جعلی محاذ آرائی کی۔ یوں سیاسی آزادی کو سماجی ٹرانسفارمیشن کے ساتھ ملانے کے ایک موقع کو ضائع کردیا گیا۔ یہ چیز شراکتی جمہوریت کے حصول کے راستے میں ایک اہم قدم ثابت ہوسکتی تھی۔

آزادی کے بعد کی دہائی الجھی ہوئی، ناسمجھ میں آنے والی سیاسی قلابازیوں سے عبارت ہے۔ خاص طور پر جب قومی سطح سے صوبائی سطح کی جانب نگاہ کی جائے تو اس عمل میں زیادہ شدت دکھائی دیتی ہے۔ اس کے باوجود یہ جاننا ممکن ہے کہ اول کیسے نوآبادیاتی دور سے وراثت میں حاصل ہونے والے سیاسی اور انتظامی پیٹرن انگریزوں کے جانے کے بہت دیر بعد تک بھی اپنے جلوے دکھاتے رہے۔ دوم، کیسے تحریک آزادی اور تقسیم کے تکلیف دہ تجربے سے حاصل ہونے والے ترکے سے کیسے اغماض برتا گیا جو جمہوری استحکام کیلئے ناگزیر تھا۔ یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ پاکستان میں شامل ہونے والے علاقوں میں مسلم لیگ کی نحیف ونزار سیاسی ادارہ جاتی صلاحیت نے اسے استحکام کے سلسلے میں اس سے ملتا جلتا کردار اپنانے سے باز رکھا جیسا کہ آزادی کے بعد بھارت میں کانگریس نے ادا کیا(۵۶)۔ سوم، یہ واضح ہے کہ پاکستان کی خطرناک حد تک نازک سٹریٹجک پوزیشن اور اس کے ریسپانس نے طاقت کے حصول کے ضمن میں ریاست کے سیاستدانوں کی بجائے فوج اور بیوروکریسی پر انحصار کرنے کا جو عمل شروع کیا اس کے طفیل اس کی داخلی سیاسی ترقی پر شدید منفی اثرات مرتب ہوئے۔ ۱۹۵۰ کی دہائی میں پاکستان نے دھیرے دھیرے مرکزیت اور مطلق العنانیت کی جانب کھسکنے کے عمل کا آغاز کیا جو ملک کے پہلے فوجی انقلاب کی صورت میں انجام پذیر ہوا۔ وعدوں

کے ایفاء اور جمہوری استحکام کی دہائی ثابت ہونے کی بجائے پاکستان کا آزادی کے بعد ابتدائی عرصہ انحصار اور دم چھلا پن کے راستے کی تخلیق کا عرصہ ثابت ہوا جس نے آنے والے برسوں میں ملک میں لرزہ براندام جمہوری ادوار، فوجی مداخلتوں اور فوجی حکومتوں کے خاتمے کے بعد والے بحرانوں کی بنیاد رکھ دی(۵۷)۔

☆☆☆

حوالہ جات

۱۔ آئی اے رحمان کا کہنا ہے کہ سکندر مرزا کے رویوں کی تشکیل ان دنوں میں ہوئی تھی جب وہ شمال مغربی سرحدی صوبے کی ایک قبائلی ایجنسی میں برطانوی راج کے دوران پولیٹیکل ایجنٹ ہوا کرتے تھے۔۔مزید تفصیلات کیلئے ملاحظہ کیجئے آئی اے رحمان کا مضمون "Damned by History" مطبوعہ نیوز لائن، مئی ۱۹۹۶۔

۲۔ Allen McGrath, "The Destruction of Pakistan's Democracy" (Karachi: OXford University Press, 1996).

۳۔ M.M. Syed, "Pakistan: Strugle for Power 1947-58", Pakistan Journal of History and Culture 15, 2 (July- December, 1994).

۴۔ Safdar Mehmood, "Decline of the Pakistan Muslim League and Its Implications (1947-54), Pakistan Journal of History and Culture 15, 2 (July- December, 1994).

۵۔ Ayesha Jalal, "The State of Martial Rule: The Origin of Pakistan's Political Economy of Defence (Cambridge: Cambridge University Press, 1990).

۶۔ پاکستان کی پرنسلی سٹیٹس کے الحاق اور انضمام کے بارے میں تفصیلی مطالعے کیجئے ملاحظہ کیجئے یعقوب خان بنگش کا تھیسس "The Integration of the Princely States of Pakistan 1947 - 44", unpublished 2011, Oxford D.phil thesis.

۷۔ Yunus Samad, "A Nation in Turmoil: Nationalism and Ethnicity in Pakistan 1937 - 58 (New Delhi: Sage, 1995).

۸۔ Clive Dewey, ""The Rural Roots of Pakistani Militarism" in D.A

Low (ed.), The Political Inheritence of Pakistan (Basingstoke: McMillan, 1991).

۹۔ I. Talbot, "Khizr Tiwana, The Punjab Unionist Party and the Partition of India (Karachi: Oxford University Press, 2002).

۱۰۔ I. Talbot, "Paksitan: A Modern History, 2n edition (London: Hurst, 2009).

۱۱۔ M. Waseem, "The 1992 Elictions in Pakistan (Lahore: 1994)

۱۲۔ Bangash, "The Integration of the Princely States of Pakistan 1947 - 44", unpublished 2011, Oxford D.phil thesis.

۱۳۔ ایضاً

۱۴۔ ایضاً

۱۵۔ ایضاً

۱۶۔ I. Tibot, " Punjab and the Raj" 1849 - 1947 (New Delhi: Manohar, 1988).

۱۷۔ ایضاً

۱۸۔ کمیٹی آف ایکشن کے صوبہ سرحد کے دورے کی کارروائی، ایف ایم اے جلد ۳۴۲، این ڈبلیو ایف پی، ایم ایل، حصہ سوم، ۱۹۴۴۔

۱۹۔ Jinah to Khuro, 13 October 1945, SHC Sindh V 1:10.

۲۰۔ Dow to Wavell, 20 September, 1945, L/P&J/5/261 IOR.

۲۱۔ نومبر ۱۹۴۵ میں ایک انتخابی دورے کے دوران محمد علی جناح نے کہا "مسلم لیگ کے حق میں ڈالے جانے والے ہر ووٹ کا مطلب ہے کہ یہ ووٹ پاکستان کو ڈالا گیا۔ مسلم لیگ کے خلاف ڈالے جانے والے ہر ووٹ کا مطلب ہے کہ یہ ہندو راج کو ڈالا گیا روزنامہ ڈان (دہلی)، ۲۹ نومبر ۱۹۴۵۔

۲۲۔ Ashok Kapur, "Pakistan in Crisis" (London: Toutledge, 1991)

۲۳۔ Haroon ur Rashid, "The Foreshadowing of Bangladesh: Bengal Muslim League and Muslim League Politics, 1936 - 1947 (Dhaka: Asiatic Society of Bangladesh, 1987).

۲۴۔ Statesman (Calcutta), 28 October 1950.

۲۵۔ M. Waseem, "The 1992 Elictions in Pakistan (Lahore: 1994)

۲۶۔ Ayesha Jalal, "The State of Martial Rule: The Origin of Pakistan's Political Economy of Defence (Cambridge: Cambridge University Press, 1990).

۲۷۔ Ch. Muhammad Ali, "The Emergence of Pakistan" (New York: Columbia University Press, 1967).

۲۸۔ Yunus Samad, "A Nation in Turmoil: Nationalism and Ethnicity in Pakistan 1937 - 58 (New Delhi: Sage, 1995).

۲۹۔ اس حوالے سے مزید تفصیلات کیلئے ملاحظہ کیجئے: Mazhar Aziz, "The Parallel State: Understanding Military Control in Pakistan" unpublished PhD, University of Nottingham, 2006.

۳۰۔ Ayesha Jalal, "The State of Martial Rule

۳۱۔ ایضاً

۳۲۔ Niaz, "The Culture of Power"

۳۳۔ Yunus Samad, "A Nation in Turmoil

۳۴۔ Ayesha Jalal, "The State of Martial Rule

۳۵۔ Yunus Samad, " Pakistan or Punjabistan: Crisis of National Identity" in Gurharpal and Talbot (ed.), Punjabi Identity: Continuity and Change (New Delhi: Manohar, 1996).

۳۶۔ پنجاب میں جہاں مہاجرین کاروباری حریف ہونے کی بجائے معاشی اثاثہ ثابت

ہوئے مقامی آبادی کے مہاجرین کے ساتھ طرز عمل کے بارے میں جاننے کیلئے ملاحظہ کیجئے: I. Talbot, "Divided Cities: Particition and its Aftermath in Lahore and Amratsar" 1847 - 1957 (Karachi: OXford University Press, 2006).

۳۷۔ Waseem, "Partition, Migration, Assimilation"

۳۸۔ Tariq Rehman, " Language and Politics in Pakistan" (Karachi: OXford University Press, 1996).

۳۹۔ Yunus Samad, "A Nation in Turmoil

۴۰۔ Sarah Ansari, "Life After Partition: Migration, Community and Strife in Sindh 1947 - 1962 (Karachi: OXford University Press, 1996)

۴۱۔ ایضاً

۴۲۔ ایضاً۔

۴۳۔ اس میں شامل تھے سندھ عوامی محاذ، سندھی ہاری کمیٹی اور سندھ مسلم لیگ کے ارکان۔

۴۴۔ ڈپٹی ہائی کمشنر کی رپورٹ برائے ایسٹ بنگال ۱۱ جولائی ۱۹۴۸۔

۴۵۔ ڈپٹی ہائی کمشنر کی رپورٹ برائے ایسٹ بنگال ۱۸۔۱۲ جنوری ۱۹۴۸۔

۴۶۔ M. Habib ur Rehman, "Bhasha Andolan (Language Movement) and the Beginning of the Break-up of Pakistan", Indo-British Review

۴۷۔ T.M Murshid, "The Secred and the Secular: Bengal Muslim Discourses 1871 - 1977 (Oxford: Oxford University Press, 1995)

۴۸۔ G.F. Papanek, " Pakistan's Development: Social Goals and Private Incentives (Cambridge Mass: Harvard University Press,

1967).

۴۹۔ Ayesha Jalal, "The State of Martial Rule

۵۰۔ Zaheer, "Seperation of East Pakistan"

۵۱۔ Safdar Mehmood, Pakistan Divided

۵۲۔ Ziring, "Ayub Khan's Era

۵۳۔ Ayesha Jalal, "The State of Martial Rule

۵۴۔ ان ہنگاموں میں بنگالی مزدوروں نے مغربی پاکستانی منیجروں کے خلاف مظاہرے کیے۔

۵۵۔ Yunus Samad, "A Nation in Turmoil

۵۶۔ Safdar Mehmood, "Decline of the Pakistan Muslim League and its Implications (1947-54)

۵۷۔ Mazhar Aziz, "The Parallel State: Understanding Military Control in Pakistan"

☆☆☆

۳

ایوب خان کا پاکستان

آغاز کا انجام

نتھیا گلی کے مقام پر موجود چیئر لفٹ آزاد کشمیر کی خوبصورت وادی نیلم کا دلکش نظارہ پیش کرتی ہے۔ سیکورٹی کی موجودہ ابتر صورتحال کے باوجود یہ مقام سیاحوں کی بہت بڑی تعداد کیلئے بے پناہ کشش کا حامل ہے۔ یہ پاکستان میں جنگلی حیات کے سب سے زیادہ تنوع رکھنے والے مقام ایوبیہ نیشنل پارک کا حصہ ہے۔ اس کی نسبت سے اس جگہ کو جہاں یہ چیئر لفٹ واقع ہے ایوبیہ کہا جاتا ہے۔ یہ نام، ایوبیہ، ہمیں جنرل ایوب خان کی یاد دلاتا ہے جو پاکستان کے پہلے فوجی ڈکٹیٹر کے طور پر پاکستان کی سیاسی تاریخ کے ایک نہایت اہم موڑ کی علامت ہیں۔

ہر سال یہاں لاکھوں کی تعداد میں سیاح کھنچے چلے آتے ہیں ان میں سے بہت کم نوجوان ایسے ہوں گے جنہیں ایوب اور اس کی وراثت سے دلچسپی ہوگی۔ عدم دلچسپی کا یہ اظہار صرف عام لوگوں کی سطح پر نہیں بلکہ علمی سطح پر بھی بہت عام ہے(۱)۔ اس کے باوجود غور سے دیکھا جائے تو ایوب خان کا دور اقتدار (۱۹۵۸-۶۹) آج بھی پاکستان کے منظر نامے پر اپنے سائے ڈال رہا ہے۔

اس باب میں تین جہتی معاملات پر بات کی جائے گی۔ اول گورننس کی مطلق العنانیت کی روایات، سیاسی اداروں کی صورت گری، مرکز اور صوبوں کے درمیان تعلقات اور عوامی زندگی میں اسلام کے کردار کے حوالے سے ایوب خان کے پاکستان

کے بنیادی مسائل پر مرتب ہونے والے اثرات کا بنظر غائر جائزہ لیا جائے گا۔دوم اس امر کی وضاحت کی جائے گی کہ پاکستان آرمی نے کیسے پاکستانی ریاست کے اقتدار اور معاشرے پر اپنے اثر و نفوذ میں اضافہ کیا۔اور سوم یہ انکشاف کیا جائے گا کہ کیسے سفارتکاری اور اسلامی گروپوں کی ریاستی سرپرستی کو دونوں ریاستوں کے درمیان مخاصمانہ تعلقات میں بھارت کے غلبے کا توڑ کرنے کیلئے استعمال کیا گیا۔

ایوب، گورننس اور ڈی پولیٹی سائزیشن

ایوب خان نے برطانوی راج سے وراثت میں ملنے والی وائسریگل روایات کو مستحکم کیا۔اس حوالے سے اس کی یہ بات بہت مشہور ہوئی کہ ''جمہوریت عوام کے شعور سے مطابقت نہیں رکھتی ہے''۔غلام محمد کی برطرفی کے بعد گورنر جنرل غلام محمد کی برطرفی کے بعد اکتوبر ۱۹۵۴ء میں ملک کے وزیر دفاع کی حیثیت سے اپنے تقرر کے وقت سے سیاستدانوں پر اس کا عدم اعتماد اور تحقیر آمیز جذبات سب پر عیاں ہو چکے تھے(۲۔وہ ہمیشہ پاکستان کے مسائل کا ذمہ دار ''ذمہ داری سے عاری'' سیاستدانوں کو ٹھہراتے رہے۔۸ اکتوبر ۱۹۵۸ میں فوجی انقلاب برپا کرنے کے بعد چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کی حیثیت سے قوم کے نام اپنے پہلے خطاب میں ایوب خان اس دعوے کے ساتھ بے رحمی سے سیاستدانوں پر حملہ آور ہوئے تھے کہ ''سیاستدانوں نے ملک پر مرتب ہونے والے اثرات سے یکسر لاپرواہ ہو کر محض ہوس اقتدار اور بے جا خواہشات کی تکمیل کیلئے ایک دوسرے کے ساتھ نہ ختم ہونے اور تلخ جنگ چھیڑ رکھی ہے''۔ایوب خان نے اپنے اس خطاب میں سیاستدانوں پر برستے ہوئے مزید کہا کہ ''سیاستدانوں کی خودغرضی، چالبازیوں، دھوکہ دہی اور پستی کی کوئی حد نہیں ہے''(۳)۔دوسری جانب ایوب خان کی پاکستان کے ''حقیقی عوام'' خاص طور پر دیہی طبقات کیلئے ''مربیانہ فکر مندی'' شمال مغربی ہندوستان کو سیکورٹی سٹیٹ بنانے کے حوالے سے انگریزوں کی طرز فکر سے براہ راست منعکس ہوتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔دیہات میں رہنے والی آبادی کے بارے میں اس کے جذبات جن میں انگریزوں کی مربیانہ کیفیت کی گونج سنائی دیتی

ہے کچھ اس طرح کے تھے کہ ''فطری طور پر وہ محب وطن اور اچھے لوگ ہوتے ہیں جو رواداری اور صبر کے حامل ہوتے ہیں اور اگر انہیں اچھی قیادت میسر آجائے تو وہ آسمان کی بلندیوں کو چھونے کی صلاحیت رکھتے ہیں''(۴)۔

فوجی انقلاب کی پہلی سالگرہ کے موقع پر ایوب خان نے بنیادی جمہوریت کا نظام متعارف کرایا جس کا بہت شور وغوغا مچایا گیا اور اس کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیئے گئے۔یہ نظام دراصل انسویں صدی کے نوآبادیاتی دور کے اس بندوبست کی صدائے بازگشت تھی جس کے تحت انگریزوں نے بالواسطہ انتخابات اور سرکاری حکام کے ذریعے سیاسی نمائندوں کی نامزدگی کے ذریعے ''سیاسی ٹوڈیوں'' کا ایک طبقہ وجود میں لانے کا اہتمام کیا تھا۔

بنیادی جمہوریت کے نظام کے تحت یونین کونسل اور کمیٹی کی سطح پر حکومت کے پاس ایک تہائی نمائندے منتخب کرنے کا اختیار تھا۔بنیادی جمہوریت کے حوالے سے کی جانے والی ایک تحقیق میں انکشاف کیا گیا ہے کہ یونین کونسلوں کے اجلاسوں میں جو معاملات زیر بحث لائے جاتے تھے ان میں سے ۸۵ فیصد خود حکومتی اہلکار طے کرتے تھے(۶)۔بنیادی جمہوریت کے ۸۰ ہزار نمائندے مل کر الیکٹورل کالج تشکیل دیتے تھے اور یہ وہی الیکٹورل کالج تھا جس نے جنوری ۱۹۶۰ میں ایوب خان کی بطور صدر نامزدگی کی توثیق کی تھی۔۱۹۶۲ کا آئین منظور ہونے کے بعد انہی بنیادی جمہوریت کے نمائندوں کو قومی اور صوبائی اسمبلیوں کیلئے الیکٹورل کالج بنانے کا اختیار بھی مل گیا تھا۔

جیسا کہ نوآبادیاتی دور میں دستور تھا، اعلیٰ سول انتظامیہ نظام حکومت میں ریڑھ کی ہڈی کا کام کرتی تھی جو ہمیشہ انتظامیہ کو سیاسی شراکت داری پر ترجیح دیتی تھی۔درحقیقت ایوب خان کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ اس نے سی ایس پی افسروں کے طبقے پر کسی بھی دوسرے فوجی ڈکٹیٹر سے کہیں زیادہ انحصار کیا۔مارشل لاء کے ریگولیشن نمبر ۱۶۱ کے تحت متعارف کرائے جانے والے سکریننگ کے عمل جس کا مقصد ملکی سیاست کو ''بدعنوان'' عناصر سے پاک رکھنا تھا، پر نیم دلی کے ساتھ عمل کیا گیا اور اسے سیاسی بلیک میلنگ کا حربہ بنا دیا گیا۔سی ایس پی افسر شاہی نے ایوب آمریت کے

پورے دور میں مرکزی کردار ادا کیا۔کمشنر اور ڈپٹی کمشنر بنیادی جمہوریت کے نظام کے نگران تھے جن کو انہیں رورل ورکس پروگرام کے تحت حاصل ہونے والے فنڈز پر پورا کنٹرول حاصل تھا۔اس دور میں گوہر ایوب اور اختر حسین جیسے ٹاپ بیورو کریٹس ایوب خان کے مشیر کی حیثیت سے کام کرتے رہے تھے۔

پاکستان کے پہلے سے کمزور سیاسی اداروں کو ایوب حکومت کے دوران مزید دھچکوں کا سامنا کرنا پڑا۔ایوب خان نے اپنے اقتدار کی ابتدا میں تمام سیاسی پارٹیوں پر پابندی عائد کردی اور جب ۱۹۶۳ میں قومی اور صوبائی اسمبلیوں کیلئے عام انتخابات کرانے کا مرحلہ درپیش ہوا تو انہیں غیر جماعتی بنیادوں پر منعقد کرانے کا فیصلہ ہوا۔ان غیر جماعتی انتخابات کے نتیجے میں ملک میں برادری ازم کو فروغ حاصل ہوا اور برادریوں کے نمائندے اور جاگیر دار جو گراس روٹ پر جماعتی تنظیم سازی کی ترقی کے حق میں ضرر رساں ثابت ہوتے چلے آئے تھے، ان انتخابات کے بعد پہلے سے زیادہ طاقتور ہو کر ابھرے۔ایوب خان نے بہت رد و کد کے بعد مجبوری کے عالم میں جولائی ۱۹۶۲ کے پولیٹیکل پارٹیز ایکٹ کے تحت سیاسی جماعتوں پر عائد پابندی اٹھائی اور انہیں کام کرنے کی آزادی دے دی۔ایوب خان نے سیاسی نظام پر اپنی گرفت کو مضبوط رکھنے کیلئے نئی منتخب اسمبلی میں مسلم لیگ کی تراش خراش کرکے ایک نئی مسلم لیگ کنونشن مسلم لیگ کے نام سے تشکیل دی جو اسی طرح حکومت نواز پارٹی تھی جیسے ایک نسل کے بعد مسلم لیگ (ق) وجود میں لائی گئی تھی۔دسمبر ۱۹۶۳ میں ایوب خان بذات خود کنونشن لیگ کے صدر بن گئے۔

ایوب خان کے دور میں اظہار رائے اور انفرادی سطح پر سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لینے پر پابندی عائد تھی۔لیاقت علی خان کی جانب سے ۱۹۴۹ میں متعارف کرائے جانے والے احتساب اور ''کرپٹ'' سیاستدانوں کو حکومتی اور جماعتی عہدوں کیلئے نااہل قرار دینے والے قانون کو ایوب خان نے کھینچ تان کر لمبا کردیا۔ایوب خان نے اپنے دور میں سیاستدانوں پر شکنجہ کسنے کیلئے مارچ ۱۹۵۹ میں پبلک آفسز ڈسکوالیفکیشن آرڈر یعنی پوڈو متعارف کرایا جبکہ چند ہی ماہ بعد اگست ۱۹۵۹ میں ایک اور قانون الیکٹو باڈیز

ڈسکوالیفکیشن آرڈر یعنی ایبڈو متعارف کرایا۔ان دونوں قوانین کی زد میں آنے والے افراد کو آپشن دی گئی کہ وہ ''بدمعاملگی'' کے ٹرائل کیلئے ٹرائبونل کے سامنے پیش ہوں یا رضاکارانہ طور پر عوامی عہدے سے خود کو الگ کرلیں۔ایبڈو کے تحت مجرم ٹھہرائے جانے والے افراد ۳۱ دسمبر ۱۹۶۶ تک کسی بھی منتخب ایوان کی رکنیت سے خود بخود نااہل قرار پاتے تھے۔انتہائی محتاط اندازوں کے مطابق کم از کم ۴۰۰ سیاستدانوں کو ایبڈو کی تلوار کا شکار ہونا پڑا(۷)۔تجزیہ نگار محمد وسیم کا کہنا ہے کہ ایبڈو ایوب حکومت کے ہاتھ میں سب سے مہلک تلوار تھی اور اس کا کسی بھی اہمیت کی حامل اپوزیشن کے گلے کاٹنا ایوب کے سسٹم کی طوالت کا باعث بنا تھا(۸)۔

سنسر شپ نے اپوزیشن کو مزید بے دست و پا کردیا تھا۔ایوب خان نے اخبارات کو کنٹرول کرنے کیلئے نا صرف پہلے سے موجود پبلک سیفٹی ایکٹ کو بے دردی سے استعمال کیا بلکہ اپنے کنٹرول کو مزید موثر بنانے کیلئے ۱۹۶۳ میں ایک نیا قانون پریس اینڈ پبلیکیشن آرڈی نینس نام سے نافذ کیا۔اس قانون کے نفاذ کا جواز بتاتے ہوئے حکومت نے قرار دیا کہ اس کا مقصد ''پریس کو صحافتی اصولوں اور محب وطنی کے تقاضو کے تابع بنانا ہے''(۹)۔اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھتے ہوئے ایوب خان نے ۱۹۶۴ میں صحافت پر بڑی زنجیروں کو مضبوط کرنے کیلئے نیشنل پریس ٹرسٹ کی بنیاد رکھی۔اس ادارے کے تحت پاکستان ٹائمز اور امروز جیسے آزاد اور بے لاگ صحافت کیلئے جانے والے اخبارات کو اپنی تحویل میں لے کر انہیں حکومت کا بھونپو بنادیا۔یوں ایماندار اور ذمہ دارانہ صحافت کے بطن سے پھوٹنے والی حقیقی حب الوطنی کی جگہ چاپلوسی اور تابعداری نے لے لی۔الطاف گوہر بحیثیت مرکزی سیکرٹری اطلاعات کے عملی طور پر ۱۵۰۰ اخبارات و جرائد کے چیف ایڈیٹر کے فرائض سرانجام دینے لگے تھے(۱۰)۔
ایوب خان کے ان اقدامات نے نا صرف اس کی مطلق العنانیت کے مخصوص برانڈ کے خلاف مزاحمت کو زک پہنچائی بلکہ سول سوسائٹی کی طویل مدت سے ہونے والی ترقی کی بنیادیں ہلا کر رکھ دیں۔ایوب خان کے اقدامات ان کے بعد بھی بہت عرصے تک آنے والی حکومتوں کے کام آتے رہے یوں کہ پریس اینڈ پبلیکیشن آرڈی کو ۱۹۸۸ میں تبدیل

کیا گیا جبکہ نیشنل پریس ٹرسٹ کا خاتمہ ۱۹۹۶ میں کہیں جا کر ہوا۔

مرکز اور صوبوں کے درمیان تعلقات:

ایوب خان نے مضبوط مرکز کی حامل ریاست کو پروان چڑھایا۔ دستور کے ساتھ تمام تر کھلواڑ کے باوجود اس نے ون یونٹ سکیم کو ختم کرنے کی کوشش نہیں کی۔ ۱۹۶۲ کا دستور صوبوں کو کچھ اضافی اختیارات سے لیس کرتا تھا جیسے کہ صنعت اور ریلوے پر کنٹرول وغیرہ ان اختیارات کے استعمال کی راہ میں اتنی رکاوٹیں اور پیچیدگیاں حائل کر دی گئیں کہ عملی طور پر صوبوں کیلئے ان اختیارات کا استعمال ناممکن بنا دیا گیا (۱۱)۔ سیاسی مرکزیت اپنے جلو میں ثقافتی یکجہتی بھی لے کر آئی۔ اس سلسلے میں سب سے بڑا چیلنج بنگالی زبان کی امتیازی حیثیت کو ختم کرنے کے حوالے سے درپیش ہوا۔ ۱۹۵۹ میں نیشنل ایجوکیشن کمیشن کی جانب سے پیش کی جانے والی رپورٹ میں کہا گیا تھا:

> اردو اور بنگالی کو ان کے ذخیرہ الفاظ میں شامل مشترکہ عناصر کو بڑھاتے ہوئے ایک دوسرے کے قریب لے کر آنا چاہیے اور ان مشترکہ عناصر کو رائج الوقت کرنا چاہیے (۱۲)۔

ایوب خان نے تجویز پیش کی کہ تمام پاکستانی زبانوں کو رومن رسم الخط میں مروج کر کے اس کام کو زیادہ بہتر انداز میں کیا جاسکتا ہے۔ اس خیال کو عوامی مزاحمت کے خطرے کے پیش نظر ترک کر دیا گیا تاہم اردو اور بنگالی کے فروغ کیلئے قائم مرکزی بورڈز جیسے سرکاری اداروں نے زبانوں کی یکجائی پر کام کا آغاز کر دیا۔ اس ماحول میں حکومت پاکستان نے بنگلہ کے عظیم شاعر رابن ناتھ ٹیگور (۱۹۴۱-۱۸۶۱) کی سو ویں سالگرہ کی تقریبات کو زیادہ نمایاں نہ ہونے دیا اور بعد ازاں اس کی شاعری کو نشر کرنے پر پابندی عائد کر دی۔ اس پر بنگالیوں نے اپنے غم و غصے کا اظہار کرتے ہوئے پورے ڈھاکہ میں گلیوں کے نشانات اور نمبر پلیٹوں کو اردو سے بنگالی زبان میں منتقل کر دیا۔

جب کہ اردو کو قومی تعمیر کیلئے ناگزیر قرار دینے پر اصرار کیا جا رہا تھا وہیں

دوسری جانب حکومت پنجاب کو خوش کرنے کیلئے مہاجروں کو سائیڈ پر لگا رہی تھی۔ پختونوں کو پنجابی غلبے کی حامل ریاست میں، فوج میں زیادہ بھرتیوں کے پیش نظر جونیئر پارٹنر کے طور پر آگے بڑھانے کا عمل شروع ہوا۔ پاکستان میں طاقت کے نئے مراکز کی علامت کے طور پر وفاقی دارالحکومت کو کراچی سے ایک نئے شہر اسلام آباد میں منتقل کرنے کے فیصلے کو دیکھا جاسکتا ہے۔ اسلام آباد پنجاب کے شمال میں مارگلہ کی پہاڑیوں کے دامن میں واقع ہے اور راولپنڈی کے جی ایچ کیو کے ساتھ ملحق ہے۔ مرکزی حکومت کے اہلکاروں کی اسلام آباد میں منتقلی کا عمل ستمبر ۱۹۶۰ میں شروع ہوا۔ ابتدائی طور پر سول سرونٹس اور ان کے خاندانوں کو عارضی طور پر چک لالہ کے کنٹونمنٹ کے علاقے میں ٹھہرایا گیا جبکہ دوسری جانب اسلام آباد کی تعمیر کا کام بھی ساتھ ساتھ جاری تھا۔

مہاجروں کی ناراضی کا اظہار آنے والے برسوں میں دھیرے دھیرے ہونا تھا جو آخر کار ایک نئی نسلی و سیاسی شناخت کی صورت میں متشکل ہوئی۔ اس نے اس ریاست کو چیلنج کرنا شروع کر دیا جس کی تعمیر میں مہاجروں نے بھی حصہ لیا تھا۔ ایوب خان کے دور میں سب سے شدید ناراضی کا اظہار سندھی اور بنگالی لیڈروں کی جانب سے آیا جن کی قومیتوں کا مقتدر ریاستی افسر شاہی اور فوج میں اثر و رسوخ نہ ہونے کے برابر تھا۔ ۱۹۶۰ کی دہائی میں تیز رفتار لیکن ناہموار اقتصادی ترقی نے اس احساس لاتعلقی کو مزید مہمیز دی۔ ۱۹۶۹ میں ایوب خان کے خلاف بہت بڑی عوامی تحریک جس کے نتیجے میں اسے اقتدار سے ہاتھ دھونا پڑا، کے منظم ہونے تک مشرقی پاکستان میں بہت بڑے تصادم کے بیج بوئے جا چکے تھے۔ ایوب خان کے دور میں کاشت کیے جانے والے بیجوں سے بہت جلد انکھوے پھوٹنے لگے اور اس کے جانشین یحیٰی خان کے مختصر دور حکومت میں کانٹوں کی فصل کٹنے کیلئے تیار ہو چکی تھی۔ پاکستان کے بقاء کی کنجی مضبوط مرکز میں نہیں بلکہ پاور شیئرنگ کے بھائی چارے پر مبنی بندوبست میں ہے جو ثقافتی تکثریت (Pluralism) کی بنیاد پر قائم ہو۔ فوجی اقتدار کی وائسریگل ازم اور سیاسی عدم برداشت کی نوآبادیاتی روایات پر چلنے کی روش نے نہایت المناک حالات کے ساتھ اس

راہ عمل کو مسدود کر دیا۔

۱۔ سندھ:

ایوب خان کی حکومت نے سندھ کی سیاسی اشرافیہ کے احساس لاتعلقی کو شدید سے شدید تر کر دیا۔ سندھ کے سرکردہ رہنما جی ایم سید کو ایبڈو اور پوڈو کے تحت احتساب کے عمل سے گذرنا پڑا جس کے نتیجے میں انہیں اکتوبر ۱۹۶۶ کو آٹھ سال قید کی سزا سنادی گئی۔ قید و بند کی اس مدت کے دوران انہوں نے بہت سی کتابیں لکھیں جن میں سندھی شناخت کی علامت شاہ عبدالطیف بھٹائی پر بھی ایک کتاب شامل تھی۔ شاہ عبدالطیف وہ ہستی تھی کہ جن کی شاعری نے جنرل ضیا کے خلاف ۱۹۸۳ کی تحریک کے باغیوں کو جوش و ولولے سے بھر دیا تھا۔ بہت سے سندھی حیدر آباد کے قریب غلام محمد بیراج کے علاقے میں پنجابی جرنیلوں اور افسروں کو زمینوں کی بے دریغ الاٹمنٹ پر سخت غم و غصے کا اظہار کر رہے تھے (۱۳)۔ مستقبل کی پاکستانی ریاست میں سندھیوں کی پنجاب کے ماتحت کی سی حیثیت جس کے بارے میں جی ایم سید ۱۹۴۶ میں اپنے اخبار ''قربانی'' میں لکھے جانے والے مضامین میں پیش بینی کر چکے تھے، عملی صورت اختیار کرتی دکھائی دے رہی تھی (۱۴)۔

سندھیوں کو جو گولی نگلنا پڑ رہی تھی وہ کڑوی تھی اس پر بڑھتی ہوئی خوشحالی کی چینی نہیں چڑھی ہوئی تھی۔ سندھی اشرافیہ جنرل ایوب خان کی خود ساختہ ''دس سالہ ترقی'' کے پھل کھانے سے محروم رہی تھی۔ اس دور میں ترقی کی سالانہ شرح ۵۔۰۰ فیصد رہی تھی تاہم اس کے ساتھ ہی چند مخصوص ہاتھوں میں دولت کا شدید ارتکاز بھی اس کے ہمراہ آیا تھا۔ دولت کا یہ ارتکاز زیادہ تر گجراتی بولنے والے خوجہ سیٹھوں اور چنیوٹ کے پنجابیوں کاروباریوں کے در دولت پر حاضری دے رہا تھا۔ اس زمانے میں دولت کے اس بہاؤ سے فیض یاب ہونے والی بدنام زمانہ بائیس خاندانوں میں سندھ سے تعلق رکھنے والا ایک خاندان بھی نہیں تھا۔ ان بائیس خاندانوں پر ریاست کے وسائل جس طرح نچھاور کیے گئے اس کا اندازہ اس حقیقت سے لگایا جاسکتا ہے کہ انہیں ملک کے تمام صنعتی

اثاثوں میں سے ۶۶ فیصد پر کنٹرول حاصل تھا جبکہ ۷۹ فیصد انشورنس فنڈز اور ۸۰ فیصد بنکوں کے اثاثوں پر ان کی اجارہ داری قائم تھی (۱۵)۔ ایوب خان کی نجی شعبے کو ترقی دینے کی حکمت عملی کے تحت ملکی وسائل کو ایک معمولی سی اقلیت کے ہاتھوں میں سونپنے کے نتیجے میں ہی ان کی حکومت کا زوال کا شکار ہوئی۔ ایوب خان ہی کے ایک سابق سندھی سپیکنگ وزیر ذوالفقار علی بھٹو نے معاشرے میں پائی جانے والی شدید معاشی ناہمواری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے طلباء، مزدوروں اور وکلاء کو منظم کیا اور نومبر ۱۹۶۸ میں ایوب خان کی آمریت کے خلاف ملک بھر میں مظاہروں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ انہی مظاہروں کے نتیجے میں آخر کار ۲۵ مارچ ۱۹۶۹ کو ایوب خان کو اقتدار سے ہاتھ دھونا پڑے اور وہ اپنے پیچھے پہلے سے شکست و ریخت کی شکار ریاست میں طبقاتی اور علاقائی عدم مساوات کی وراثت چھوڑ کر ہزارہ میں اپنے گاؤں ریحانہ میں گمنام زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو گئے۔

صرف معیشت ہی کا معاملہ نہیں تھا بلکہ سندھ میں سندھی زبان کا مسئلہ بھی تھا جو صوبے کی حد تک شدید ناراضی کے دوران مرکزی اہمیت اختیار کر گئی تھی۔ ۱۹۵۹ میں قومی تعلیم کے حوالے سے جاری کی جانے والی ایک رپورٹ میں تجویز پیش کی گئی تھی کہ ملک بھر میں چھٹی جماعت سے اردو کو ذریعہ تعلیم کے طور پر اپنایا جائے۔ یہ تجویز جو بظاہر قومی یکجہتی کیلئے دی گئی تھی عملی طور پر الٹ اثرات کی حامل ثابت ہوئی۔ سندھ میں سندھی زبان کی اہمیت کو کم کرنے کے خلاف غصے کی لہر دوڑ گئی اور صوبے بھر میں مظاہروں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ایوب خان نے ان مظاہروں کے بعد اپنے فیصلے کو معطل کر دیا لیکن اس کے باوجود سندھی میں تعلیم دینے والے پرائمری سکولوں کی تعداد میں مسلسل کمی کا عمل روکا نہ جاسکا۔ مجموعی طور پر ۳۰ پرائمری سکولوں کو بند کرنا پڑ (۱۶)۔ اس صورتحال سے سندھی قوم پرستوں نے بھرپور فائدہ اٹھایا جنہوں نے دوسرے ایشوز کے ساتھ ساتھ ریلوے اسٹیشنوں اور دیگر سرکاری عمارتوں میں ناموں کو سندھی سے اردو میں منتقل کرنے کے خلاف شدید ردعمل کا اظہار کیا اور اسے سندھ اور سندھی زبان کے خلاف ایک سازش قرار دیا۔

سندھی قوم پرستوں کا یہ بھی دعویٰ تھا کہ سندھی زبان کیلئے جاری کیے جانے والے اشتہاری و دیگر فنڈز دینے سے انکار کیا جارہا ہے اور یوں سندھی کتابوں کی نشرو اشاعت متاثر ہورہی ہے۔ان کا یہ بھی کہنا تھا کہ سندھی لکھاریوں کی حوصلہ شکنی کی جارہی ہے اور ریڈیو پاکستان سے سندھی زبان کے پروگراموں کی براڈکاسٹنگ میں بھی کمی کردی گئی ہے۔جولائی ۱۹۶۵ میں حیدرآباد میونسپل کارپوریشن کی جانب سے اردو کو اپنی دفتری زبان قرار دیئے جانے کے خلاف بھی تنازعے کی کیفیت پیدا ہوگئی۔اس کے اگلے برس حیدرآباد میں واقع سندھ یونیورسٹی میں سندھی زبان کے سرگرم کارکنوں نے ردعمل کے طور پر سندھی کو ذریعہ تعلیم اور ذریعہ امتحان قرار دلوانے کیلئے ایک مہم کا آغاز کیا۔حیدرآباد کے اردو سپیکنگ کمشنر کی جانب سے ان طلبا کی گرفتاری کے نتیجے میں وہاں نا صرف سندھی اردو کشیدگی میں اضافہ ہوگیا بلکہ ایوب حکومت سے سندھیوں کو مزید لاتعلق رکھنے کا معاملہ مزید اہمیت اختیار کرگیا(۱۷)۔

۲۔ بنگال

بنگال کی سیاسی اشرافیہ قیام پاکستان کے وقت سے ہی لاتعلقی کا شکار تھی۔ایوب دور نے اس لاتعلقی میں مزید اضافہ کردیا۔ایوب خان کے فوجی انقلاب کو غالباً اس طرح ڈیزائن کیا گیا تھا کہ مغربی پاکستان میں موجود اسٹیبلشمنٹ کے مفادات اور پالیسیوں کو بنگالی چیلنجوں سے نمٹنے کیلئے پیش بندی کی جائے۔لہٰذا یہ بات حیران کن نہیں ہے کہ ایوب حکومت نے مشرقی بنگال کو مارجن لائز کرنے کے احساس کو بڑھاوا دیا۔یہ احساس مشرقی بنگال سے تعلق رکھنے والے بہت سے سیاستدانوں اور اہم شخصیات جیسے مولانا عبدالحمید بھاشانی، شیخ مجیب الرحمٰن اور حمید الحق چودھری وغیرہ میں قدر مشترک تھا۔اسی کے طفیل ان شخصیات کو ایوب خان کے معروف قانون ایبڈو کے تحت پابندیوں کا سامنا بھی کرنا پڑا۔مرکز سے لاتعلق ہونے کے اس احساس میں اس وقت مزید شدت آگئی جب یہ فیصلہ سامنے آیا کہ مشرقی بنگال کے اہل قرار دیئے جانے والے سیاستدانوں کی دو میں سے ایک سے بھی کم تعداد نے بنیادی جمہوریت کے نظام

کے تحت اپنا ووٹ کاسٹ کیا۔جب ۳۰ جنوری ۱۹۶۲ کو حسین شہید سہروردی جیسے سرکردہ سیاستدان کو گرفتار کیا گیا تو اس کے خلاف ڈھاکہ میں طلباء کے بڑے پیمانے پر مظاہرے دیکھنے میں آئے۔ایوب خان جو اس وقت ڈھاکہ کے گورنر ہاؤس میں موجود تھے ان مظاہروں کے نتیجے میں اپنے دورے کے تین روز تک ایوان صدر میں عملی طور پر قیدی بن کر رہ گئے(۱۸)۔آخر ڈھاکہ یونیورسٹی کے کیمپس میں ان مظاہروں پر قابو پانے کیلئے حکومت کو پنجاب رجمنٹ کی یونٹس بھیجنا پڑیں۔ایوب خان کے خلاف ان پرتشدد مظاہروں کے برعکس ڈھاکہ اور چٹاگانگ میں عوام کی کثیر تعداد نے تمتمائے ہوئے جذبات کے ساتھ ۱۹۶۵ کے صدارتی انتخابات میں ایوب خان کی حریف ۷۱ سالہ فاطمہ جناح کو انتہائی والہانہ انداز میں خوش آمدید کہا۔ایوب خان نے ان انتخابات میں دیگر جگہوں کی طرح مشرقی بنگال میں بھی کامیابی حاصل کرلی لیکن اس نے عوام کو ہمیشہ کیلئے کھودیا۔

مئی ۱۹۶۶ میں پیش کیے جانے والے عوامی لیگ کے چھ نکاتی پروگرام میں بنگالی قوم پرستوں کے ریڈیکل مطالبات کو ہی سمویا گیا تھا۔اس کے تحت اسٹیبلشمنٹ سے قرارداد لاہور کی بنیاد پر مشرقی پاکستان کو مکمل صوبائی خودمختاری دینے کا مطالبہ کیا گیا تھا۔چھ نکاتی پروگرام میں وفاق کیلئے صرف دفاع اور خارجہ امور کے محکمے چھوڑ دیئے گئے تھے۔جہاں تک موخر الذکر کا تعلق ہے ۱۹۶۵ میں بھارت کے ساتھ ہونے والی جنگ کے تناظر میں مغربی پاکستان کی اسٹیبلشمنٹ کی طرف سے مشرقی پاکستان کو دفاع سے محروم چھوڑ دیئے جانے کے حوالے بھی عدم تحفظ کا احساس موجود تھا لہٰذا مشرقی پاکستان کیلئے الگ ملیشیا یا پیرا ملٹری فوج بنانے کا مطالبہ بھی کیا گیا تھا۱۹۔

ایوب خان کی جانب سے چھ نکاتی پروگرام کے بادبانوں سے ہوا نکالنے کی غرض سے شیخ مجیب الرحمٰن کو اگرتلہ سازش کیس میں ملوث کیے جانے کی کوشش نے بری طرح سے بیک فائر کیا۔شیخ مجیب اور ان کے ۵۰ ساتھیوں کے خلاف کھلی عدالت میں لگائے جانے والے الزامات کہ انہوں نے مشرقی پاکستان کی علیحدگی کیلئے بھارت کے ساتھ مل کر سازش تیار کی تھی نے بنگالی خودمختاری کے خیالات کے پھیلاؤ کیلئے ایک

پرفیکٹ پلیٹ فارم مہیا کردیا۔گوکہ شیخ مجیب الرحمٰن نے فی الحقیقت بھارتی سرکاری اہلکاروں کے ساتھ ملاقات کی تھی اس کے باوجود استغاثہ کے بھونڈے پن نے ایوب حکومت کو بیک فٹ پر جانے پر مجبور کردیا۔حکومت کو مجبور ہوکر کیس واپس لینا پڑا یوں ایوب خان کو الٹا قلابازی لگانے کے سلسلے میں سخت شرمندگی کا سامنا کرنا پڑا۔حکومت نے شیخ مجیب کو مشرقی پاکستان میں بڑھتی ہوئی کشیدگی، کھنچاؤ اور بحرانی کیفیت کے پس منظر میں شیخ مجیب الرحمٰن کو گول میز کانفرنس میں شرکت کی دعوت دی۔اس عمل نے ایوب خان کی اقتدار سے علیحدگی میں اپنا حصہ ڈالا لیکن اس کے جانشین نے اس صورت حال سے کوئی سبق نہ سیکھا کہ صورتحال کا تقاضا ہے کہ بنگالی قوم کے ساتھ محاذ آرائی میں الجھنے کی بجائے بنگال کے نمائندوں سے تعاون مانگا جائے۔

ایوب خان کے پاکستان میں طاقت کا مرکز بنیادی جمہوریت کا سرکاری اہتمام نہیں تھا نہ ۱۹۶۲ کے بعد کنونشن مسلم لیگ طاقت میں حصہ دار تھی۔ان کی بجائے اس پورے دور میں طاقت کا سرچشمہ فوج اور بیوروکریسی رہی۔ان دونوں ریاست کے غیر منتخب ستونوں میں بنگالیوں کا وجود تاریخی طور پر نہ ہونے کے برابر تھا۔کہا جاسکتا ہے کہ ارادوں اور عزائم سے قطع نظر ایوب خان کی پوری رجیم لازمی طور پر بنگالیوں کے مفادات سے متصادم تھی۔سرکاری اعداد وشمار بھی اس کی تصدیق کرتے ہیں کہ فوج کے افسران میں بنگالیوں کی شمولیت پانچ فیصد سے زیادہ نہ تھی جبکہ سی ایس پی کیڈر میں ان کی تعداد بھی کم وبیش ۳۰ فیصد سے کبھی نہ بڑھی۔اس صورتحال کے نتیجے میں نہ صرف بنگالی مرکزی سیکریٹریٹ میں اقلیت میں تھے بلکہ وہ ایوب خان کے پورے دور میں بے تحاشا بنانے جانے والی تحقیقاتی کمیشنوں سے بھی یکسر غائب رہے (۲۰)۔اس کے نتیجے میں نا صرف یہ ہوا کہ بنگالیوں کے مفادات اور مطالبات شنوائی اور سپورٹ سے محروم رہے بلکہ حکمرانوں کو بھی کبھی مشرقی بازو کے حقیقی مسائل و معاملات سے آگاہی حاصل کرنے کا موقع نہ مل سکا۔ بنگالی سول سرونٹس کی جانب سے حاصل ہونے والی ماہرانہ مشاورت کی کمی کا جو عالم تھا اس کا اندازہ اس حقیقت سے لگایا جاسکتا ہے کہ جنوری ۱۹۶۳ میں ایک اعلیٰ فوجی افسر نے امریکن کونسل جنرل کو بتایا کہ "کابینہ میں شامل مشرقی

پاکستان سے تعلق رکھنے والے وزراء نااہل اور کسی خاص اہمیت کے حامل نہیں ہیں ۔ان کا گزارہ صرف ایوب خان کی خوشامدیں کرنے سے چلتا ہے اور وہ وہی کچھ کہتے ہیں جو ایوب خان سننا چاہتے ہیں" (۲۱)۔

ایوب خان کے دور میں ہونے والی تیز رفتار ترقی ایک مضبوط پاکستانی ریاست کی بنیادیں استوار کرنے اور اسے جدید ریاست میں تبدیل کرنے کی بجائے اپنے جانبدارانہ اثرات کی وجہ سے قومی اتحاد کو زک پہنچانے کا باعث بنتی رہی ۔مشرقی پاکستان میں اقتصادی ترقی کی شرح مغربی پاکستان کی نسبت کہیں کم تھی (۲۲)۔اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ نجی شعبے کی فرمیں جو معاشی ترقی میں تیز رفتاری پیدا کرتی ہیں زیادہ تر مغربی پاکستان میں واقع تھیں۔ان فرموں کے مالکان موسمی و ثقافتی وجوہات اور انفراسٹرکچر کی کمی کی وجہ سے مشرقی پاکستان میں اپنے دفاتر اور کارخانے قائم کرنے سے جھجکتی تھیں۔یہ وہ فرمیں تھیں جو پاکستان انڈسٹریل ڈویلپمنٹ بنک اور پاکستان انڈسٹریل اینڈ کریڈٹ اور انویسٹمنٹ کارپوریشن جیسے مالیاتی اداروں سے صنعتی اور تجارتی قرضوں کا بہت بڑا حصہ وصول کرتی تھیں۔ایوب خان نے صنعتی وتجارتی ترقی میں شدید ناہمواری کے پیش نظر مشرقی پاکستان میں سرکاری سرمایہ کاری کرنے کی کوشش کی لیکن اس شعبے میں بھی ترقی کی رفتار نسبتاً سست رہی۔لاشعوری طور پر ہی سہی لیکن اس کی اقتصادی پالیسیوں کا محور ملک کے دونوں بازوؤں کے درمیان پہلے سے موجود معاشی ناہمواری میں اضافے پر رہا۔

بنگالیوں کی علاقائی خودمختاری اس خیال کے ساتھ جڑ گئی کہ ملک کے دونوں بازو دومختلف قسم کی معیشتوں کے حامل ہیں جن کی ضروریات اور تقاضے ایک دوسرے سے یکسر الگ ہیں۔اس حقیقت کا کسی نہ کسی حد تک ادراک ایوب خان کو بھی تھا جس نے اس تاثر کی نفی کرنے کیلئے مشرقی اور مغربی پاکستان دونوں کیلئے الگ الگ انڈسٹریل ڈویلپمنٹ کارپوریشن اور واپڈا کی منظوری دی۔عوامی لیگ کا چھ نکاتی پروگرام اس قسم کے اقدامات سے کہیں آگے تھا کیونکہ اس میں مشرقی پاکستان کو خود اپنے ٹیکس اکٹھے کرنے، اپنی کرنسی جاری کرنے اور اپنے غیر ملکی زرمبادلہ کے اکاؤنٹس شروع کرنے

کی اجازت دینے کے مطالبات بھی شامل کیے گئے تھے۔زرمبادلہ کے الگ اکاؤنٹ کھولنے کے مطالبے کے پیچھے یہ طویل مدتی احساس محرومی شامل تھا کہ مشرقی پاکستان کے پٹ سن کی فروخت سے حاصل ہونے والے زرمبادلہ سے مغربی پاکستان مستفید ہورہا ہے۔ایک رنجش جو خاص طور پر ایوب خان کے دور سے متعلق تھی، اس حوالے سے تھی کہ مغربی پاکستان کی جانب سے مشرقی پاکستان میں قائم کی جانے والی صنعتوں کا منافع واپس مغربی پاکستان منتقل کردیا جاتا ہے۔چاول، آٹا اور پٹ سن کے شعبوں میں قائم ہونے والی فوجی فاؤنڈیشن کے کارخانے اپنا منافع پنجاب کے فوجی بھرتی کے علاقوں میں فلاحی منصوبوں پر خرچ کردیتے ہیں(۲۳)۔اس کا فطری نتیجہ یہ تھا کہ مشرقی پاکستان میں ان دعوؤں کو تقویت ملتی کہ پاکستان کو "پنجابستان" بنایا جارہا ہے۔

اسلام کا کردار

ایوب خان نے اپنے اقتدار کو جواز فراہم کرنے کیلئے اسلام کو کبھی استعمال نہیں کیا جیسا کہ اس سے پہلے کے سیاستدان اور حکمران کرتے چلے آئے تھے۔جدیدیت اس کے دور کی منفرد خصوصیت اور وجہ جواز تھی۔اس میں ناصرف معاشی ترقی اور نیم دلی کے ساتھ کی جانے والی زرعی اصلاحات کی کوشش شامل تھی بلکہ بجائے خود اسلام کو جدید تقاضوں کے مطابق ڈھالنے کی کوشش بھی شامل تھی۲۴۔۱۹۶۲ کے آئین میں جان بوجھ کر جمہوریہ پاکستان کے ساتھ جڑے لفظ "اسلامی" کو حذف کردیا گیا تھا۔اس سلسلے میں ایک اہم اقدام Repugnancy Clause کے الفاظ میں ترمیم کرنا تھا۔اس کے مطابق اس شق میں اس سے قبل قرآن اور سنت کا براہ راست حوالہ نکال دیا گیا اور صرف یہ کہا گیا کہ کسی ایسے قانون کا نفاذ نہیں کیا جائے گا جو اسلام سے متصادم ہو۔یوں اس شق کے تحت اجتہاد کے جدید تصور کیلئے دروازہ کھول دیا گیا(۲۵۔)ایک اور فیصلہ کن اقدام کے ذریعے مسلم فیملی لاز آرڈی نینس کے تحت شادی اور وراثت کے معاملات میں سیکولر اثرات کو متعارف کرانے کی کوشش کی گئی۔مزید یہ کہ متروکہ وقف املاک جو مساجد اور مزاروں کے ساتھ ملحق تھیں کو مغربی

پاکستان اوقاف پراپرٹیز آرڈی نینس کے ذریعے ریاستی انتظام کے تحت کردیا گیا۔

اس دور میں جدید اپروچ کو تقویت دینے کیلئے پاکستانی ریاست میں اسلام کے مستقبل کے کردار کے گرد موجود ابہام کی دھند کو کم کرنے کی کوششوں کے سلسلے میں کئی اقدامات کیے گئے۔اس میں کوئی شبہ نہیں کہ علی گڑھ میں اپنی تعلیم کی وجہ سے ایوب خان ناصرف پاکستانی قوم پرستی کے انداز فکر بلکہ اسلام کے حوالے سے جدید طرز فکر کا حامل تھا۔اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ ایوب خان پاک فوج میں موجود فوجی افسران کی "برطانوی" نسل کا نمائندہ تھا اور اس کا اسلام کے حوالے سے جنرل ضیاء کے دور کے فوجی افسران کی "پاکستانی" نسل کے برعکس طرز فکر تھا۔ایوب خان کا جدید تصور اسلام حقائق پر مبنی تھا جو کسی تھیالوجیکل تشریح کی بجائے عقل سلیم پر انحصار کرتا تھا۔اس کا اظہار ان جذبات میں کیا گیا ہے: "یہ زندگی کے عمل اور مذہب کے حوالے سے بہت بڑی ناانصافی ہوگی کہ بیسویں صدی کے انسان پر یہ شرط مسلط کردی جائے کہ اسے اپنے اچھے مسلمان ہونے کی سند لانے کیلئے کئی صدیاں پیچھے کی طرف سفر کرنا پڑے گا"(۲۶)۔ایوب خان کے ذاتی مشاہدے نے اس پر یہ بات عیاں کردی کہ مولوی حضرات سیاستدانوں سے جن سے وہ سخت بیزار تھا، کسی بھی حوالے سے بہتر نہیں ہیں۔اس کے خیال میں یہ مذہبی پیشوا دولت اور طاقت کی ہوس میں مبتلا ہیں اور کسی بھی قسم کی دھوکہ دہی سے دریغ نہیں کرتے"(۲۷)۔تاہم اس کے باوجود وہ جدید دور کے کمال اتاترک کی حیثیت سے ابھرنے کی بجائے اسلامی گروپوں کی شدید مزاحمت کے باعث اپنے موقف سے پیچھے ہٹنے پر مجبور ہوگیا۔ستم ظریفی یہ کہ اپنی پسپائی کے بعد اس نے مزارات سے متعلق روایتی صوفی اسلام کی اوٹ میں پناہ لینے میں ہی عافیت جانی۔ایوب خان کو پیر آف دیول شریف سمیت کئی بااثر سجادہ نشینوں کی حمایت حاصل تھی۔اس کے دور حکومت کے اختتام تک پاکستان کی عوامی زندگی میں اسلام کا کردار اتنا ہی پیچیدہ معاملہ بن چکا تھا جتنا وہ ہمیشہ سے تھا۔

علماء نے ۱۹۶۲ میں کی جانے والی آئینی ترامیم کی مخالفت کی۔وہ اسلامی مشاورتی کمیٹی کی ہیئت کے بھی خلاف جو ایوب خان نے اسلامی تصورات پر مبنی قوانین

کی تشکیل کیلئے قومی اسمبلی کی معاونت کے سلسلے میں قائم کی تھی۔اسے ملک کے نام کے حوالے سے بھی پسپائی اختیار کرنے پر مجبور کیا گیا۔اس حوالے سے ۱۹۶۳ کی پہلی آئینی ترمیم کے ذریعے پاکستان کا نام دوبارہ ''اسلامی جمہوریہ پاکستان'' قرار پا گیا۔جب پولیٹیکل پارٹیز ایکٹ کے تحت سیاسی جماعتوں کو کام کرنے کی اجازت دی گئی تو جماعت اسلامی خم ٹھونک کر میدان میں آگئی۔مولانا مودودی نے ایوب حکومت کی غیر اسلامی خصوصیات پر جارحانہ انداز میں تنقید کے تیر برسائے۔سیاسی سرگرمیوں پر رکھی پابندی اٹھنے سے پہلے ہی انہوں نے فیملی لاء آرڈی نینس کی مذمت کیلئے ملک کے دونوں حصوں سے پچاس علماء کو اکٹھا کیا۔قومی اسمبلی میں اس آرڈی نینس کو ختم کرانے کی کوششوں کو ناکام بنانے کیلئے ایوب خان نے اس آرڈی نینس کو آئینی تحفظ فراہم کردیا جس کے بعد کسی عدالت کے ذریعے اسے کالعدم قرار دینے کی کوئی صورت نہ رہی۔۱۹۷۳ کے آئین کی منظوری کے بعد بھی اسی طرح کے اقدامات کیے گئے تاہم اس وقت تک عائلی قوانین کا آرڈی نینس عورتوں کے حقوق کی علامت بن چکا تھا۔تاہم مولانا مودودی نے ایوب حکومت پر اپنے حملوں کا سلسلہ جاری رکھا۔جماعت اسلامی کی مرکزی مجلس شوریٰ جس کا اجلاس اگست ۱۹۶۲ کے پہلے ہفتے میں لاہور میں منعقد کیا گیا، نے بہت سی قراردادیں منظور کیں جن میں دیگر امور کے علاوہ ایڈوائزری کونسل برائے اسلامک آئیڈیالوجی، عائلی قوانین، پاکستان آرٹس کونسل کے قیام، گرلز گائیڈ اور بلیو برڈز کی تشکیل، سینما گھروں کی تعمیر اور اسلام پر تنقیدی نگاہ ڈالنے والی کتابوں کی برآمد کی سخت الفاظ میں مذمت کی گئی تھی(۲۸)۔

ایک نسل سے بھی کم مدت کے بعد فوج کے حکومت پر قبضے کی ناقد ہونے کی بجائے یہی جماعت اسلامی ضیاء کی مارشل لاء حکومت کا نفس ناطقہ بن چکی تھی۔آگے چل کر ہم 'ملا ملٹری کمپلیکس'' کی اصطلاح کا تفصیل سے جائزہ لیں گے۔فرزانہ شیخ نے استدلال کیا ہے کہ ایوب خان کی تمام تر جدیدیت اور معاشی و سماجی اصلاح کے پروگراموں نے اس ڈویلپمنٹ کا راستہ ہموار کیا(۲۹): اول، نسلی اور طبقاتی تقسیم اس کی حکومت کیلئے خطرہ بن چکی تھی لہٰذا اس سے جان چھڑانے کیلئے اسلام کی جانب رجوع

کرنا۔دوم، اس بات پر زور دینا کہ پاکستان ایک مسلم جغرافیائی اکائی ہے اور اسلام کا قلعہ ہے جس میں فوج نظریاتی محافظ کا کردار ادا کر رہی ہے۔سوم، جیسا کہ ہم آنے والے ابواب میں تفصیل سے دیکھیں گے، مذہبی جذبات کی حامل بے قاعدہ مسلح قوتوں کی مدد سے پاکستان کے کشمیر میں سٹریٹیجک مقاصد کو آگے بڑھانا۔فرزانہ شیخ ۱۹۶۵ میں بھارت کے ساتھ ہونے والی جنگ کو ایوب کے اقتدار کی ان وراثتوں کے اعتبار سے ایک اہم ٹرننگ پوائنٹ کے طور پر دیکھتی ہیں۔ان کا کہنا ہے کہ یہ وہ وقت تھا جب ایوب خان نے پہلی مرتبہ ''بھارتی جارحیت'' کے خلاف مشترکہ دفاع میں اسلام، پاکستانی شناخت اور فوج کو یکجا کردیا''(۳۰)۔

ایوب خان کے ورثے کا اک اور زاویئے سے مطالعہ یہ جاننے کیلئے ہوسکتا ہے کہ کیسے ۱۹۵۰ کی دہائی سے اسلامی گروپوں نے اس قدر سٹریٹ پاور حاصل کرلی کہ وہ مطلق العنان حکومتوں کو بھی چیلنج کرنے سے باز نہیں رہتے۔ایوب خان بعد کے حکمرانوں کی طرح ان گروپوں کے ساتھ براہ راست تصادم سے گریزاں تھا لہٰذا انہیں خوش رکھنے کی پالیسی نے، جیسا کہ ذوالفقار علی بھٹو پر آخری دنوں میں کھلا، ان کے حوصلوں کو بڑھادیا۔اس حوالے سے ایک اور بات کا ادراک بھی کیا جاسکتا ہے جس کے آنے والے برسوں پر دیرپا اثرات مرتب ہوئے۔یہ ہے اسلامی گروپوں کی جمہوریت کو آگے بڑھانے کے نام پر اپنے سیاسی حریفوں کے ساتھ اتحاد قائم کرنے پر آمادگی۔اس طور یہ گروپ اپنے اثر و رسوخ کا دائرہ پھیلانے میں کامیاب رہے۔جماعت اسلامی نے ۱۴ اکتوبر ۱۹۶۲ میں سہروردی کے جمہوری محاذ کو جوائن کرلیا گو کہ اس اتحاد میں کونسل مسلم لیگ جیسی پارٹی کے علاوہ سہروردی کی ہم خیال پارٹیاں عوامی لیگ، نیشنل عوامی پارٹی اور کے ایس پی بھی شامل تھیں۔ان میں سے موخر الذکر کو پرانی روش کے حامل مسلم لیگیوں نے بنایا تھا جو ایوب کے مخالف اور کنونشن مسلم لیگ کو اس کے مددگاروں کی کلب قرار دیتے ہوئے اس سے مخاصمت رکھتے تھے۔جماعت اسلامی نے اپنی بہت زیادہ لچک پذیری کا اس وقت مظاہرہ کیا جب اس نے ۱۹۶۵ کے صدارتی انتخابات کے موقع پر فاطمہ جناح کی حمایت کی جبکہ مختلف قسم کے حالات میں کسی عورت کی قیادت اور صدر

مملکت کی حیثیت سے اس کے انتخاب کو مکروہ سمجھا جاتا۔

ایوب دور میں "ملبس" کا عروج

عائشہ صدیقہ نے پاکستان کی کاروباری اور صنعتی زندگی میں فوج کے بڑھتے ہوئے کردار پر نئے زاویوں سے روشنی ڈالی ہے۔انہوں نے اس عمل کیلئے "ملبس (Milbus)" کی اصطلاح تراشی ہے۔ان کی تحقیق کے مطابق پاکستان کے علاوہ انڈونیشیا اور ترکی وہ ریاستیں ہیں جہاں فوج نے ریاست کی معیشت میں اپنے ہاتھ پاؤں پھیلائے ہیں۔ "ملبس" کے عروج نے فوج کو ایک پریشر گروپ کے طور پر دیکھے جانے کا راستہ ہموار کیا ہے جس کا سیاسی عمل میں مداخلت کیلئے اپنا ایجنڈا اور اپنے عزائم ہیں۔ایوب دور میں فوج کی جانب سے پاکستانی معاشرے اور اقتدار کی "نوآبادیت" میں بہت زیادہ توسیع ہوئی۔اس کی جڑیں انگریز حاکموں کی اس پالیسی سے نکلی ہیں جن کے تحت وہ سابق فوجیوں کو مغربی پاکستان اور سندھ کے نئے آبپاشی کے علاقوں میں زمینوں کا عطیہ دیتے تھے۔۱۹۵۴ میں فوجی فاؤنڈیشن کے قیام کے بعد یہ سلسلہ شروع ہوا کہ فوجیوں کی بہبود کیلئے مختص فنڈز کو بڑے پیمانے پر تجارتی سرگرمیوں کیلئے استعمال کیا جانے لگا۔اکیسویں صدی کے آغاز تک فوجی فاؤنڈیشن پاکستان میں چند سب سے بڑے کاروباری اداروں میں شامل ہو چکی تھی۔ایوب خان کے دور کے تمام عرصے میں اس ادارے کو ٹیکسوں سے چھوٹ حاصل رہی تھی۔

فوج کے معیشت میں توسیعی کردار کو مارشل لاؤں کی وجہ سے جنہوں نے سیاسی اشرافیہ اور سول سوسائٹی کو کمزور کیا اور ایوب خان کے دور میں نجی شعبے کی معاشی ترقی کو حاصل ہونے والی اہمیت کی وجہ سے بھی بہت سہولت میسر آئی۔اس حکمت عملی کی امریکہ اور جرمنی جیسے ملکوں نے حوصلہ افزائی کی جو پاکستان کو بھاری مقدار میں ترقیاتی امداد فراہم کرتے تھے(۳۱)۔کاروباری طبقہ بمشکل ہی اس کی مخالفت کرنے کا سوچ سکتا تھا کیونکہ اسے بھی اسی قسم کی ٹیکس کی چھوٹ حاصل تھی جو فوجی فاؤنڈیشن کے تحت چلنے والے کاروباری اداروں کو حاصل تھی۔اسلامی گروپوں نے بھی خود کو ایوب خان کی معاشی

پالیسیوں کی بجائے اس کے ماڈرنائزیشن کے پروگرام پر تنقید کی حد تک محدود رکھا۔دوسری طرف جماعت اسلامی نے بھی فری انٹر پرائز کو اسلام کے بنیادی معاشی اہداف کے طور پر دیکھا(۳۲)۔ان تمام عوامل کا نتیجہ یہ نکلا کہ ملی بس بے لگام ترقی کی راہ پر گامزن ہوگئی۔

فوجی فاؤنڈیشن رفتہ رفتہ تمباکو، چینی اور ٹیکسٹائل انڈسٹری میں بہت زیادہ انوالو ہوگئی۔مثال کے طور پر اس کی ایک ٹیکسٹائل فیکٹری جہلم میں قائم ہے، ایک شوگر مل ٹنڈو محمد خان سندھ میں واقع ہے اور خیبر ٹوبیکو کمپنی کے نام سے ایک فیکٹری مردان میں واقع ہے(۳۳)۔ہم پہلے ہی دیکھ چکے ہیں کہ مشرقی پاکستان میں ڈھاکہ اور چٹاگانگ میں بھی اپنے کاروباری اداروں کے ساتھ سرگرم عمل تھی۔

ان کاروباری سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ فوج نے خود کو انفراسٹرکچر سے متعلق سرگرمیوں میں بھی سرگرم کرلیا۔اس سلسلے میں فرنٹیر ورکس آرگنائزیشن کے نام سے ایک ترقیاتی ادارہ قائم کیا گیا جس نے پاکستان اور چین کو ملانے والی ۸۰۵ کلومیٹر طویل شاہراہ ریشم کی تعمیر میں بھی سرگرمی سے حصہ لیا۔فرنٹیر ورکس آرگنائزیشن جس کا قیام ۱۹۶۶ میں عمل میں آیا تھا اس وقت پاکستان میں سڑکوں کی تعمیرات کے ٹھیکے لینے والے سب سے بڑے کنٹریکٹر کے طور پر اپنا وجود منوا چکی ہے۔یہ ملک کی تمام موٹر ویز پر ٹال ٹیکس وصول کرنے کے سلسلے میں بھی سرگرم عمل ہے۔

ایوب دور میں فلاح و بہبود سے متعلق تعمیرات کی ابتدا بھی ہوئی جو فوج کے کارپوریٹ مفادات کا ہال مارک بن چکی ہے۔فوجی فاؤنڈیشن جو منافع کماتی تھی ان کا ایک بڑا حصہ فوجیوں کیلئے قائم کردہ فلاحی سکولوں اور ہسپتالوں کی تعمیر میں صرف کیا جاتا تھا۔یہ آغاز تھا ایک بہت بڑے انٹر پرائز کے قیام کا جو اکیسویں صدی کی ابتدا تک ۹۰ سکولوں اور کالجوں کا انتظام چلا رہا تھا جن میں طالبعلموں کی تعداد ۴۰،۰۰۰ سے متجاوز تھی۔اس ادارے کے تحت صحت کے شعبے میں اس وقت تک ۱۱ ہسپتال اور ۲۳ میڈیکل سنٹر کام کر رہے تھے(۳۴)۔

جبکہ نئی تبدیلیوں اور ترقیوں کا یہ عمل جاری و ساری تھا، ایوب حکومت نے فوجی

افسروں کو زرعی زمینوں کی الاٹمنٹ کی پرانی پالیسی کو مزید وسعت دے دی۔اس پالیسی کے تحت سندھ کے کوٹری بیراج، گدو بیراج اور غلام محمد بیراج کی تعمیر کے ذریعے زرخیز زمینوں کو پیداوار کیلئے استعمال میں لایا گیا۔اس مقصد کیلئے مختص کی جانے والی زمین کا مجموعی رقبہ اندازوں کے مطابق تین لاکھ سے دس لاکھ ایکٹر کے درمیان تھا(۳۵)۔یہ تمام زمین جن افراد کو الاٹ کی گئی ان میں بڑے فوجی افسران بھی شامل تھے۔سندھ کی ان زرخیز زمینوں کی الاٹ منٹ سے فائدہ اٹھانے والوں میں خود جنرل ایوب خان (۲۴۷ ایکڑ)، جنرل محمد موسیٰ خان (۲۵۰ ایکڑ) اور جنرل امراؤ خان (۲۴۶ ایکڑ) شامل تھے۔اسی پر بس نہیں بلکہ میجر سے لیفٹیننٹ رینک کے فوجیوں کو بھی فی کس ۱۰۰ ایکڑ تک الاٹ کیے جانے کی یقین دہانی کرائی گئی(۳۶)۔اس حکمت عملی کے نتیجے میں فوجی جاگیردار طبقے کی تخلیق ہوئی اور فوجیوں اور جاگیردار طبقے کے اس حصے کے درمیان تعلقات کو مضبوط کرنے میں مدد ملی جو موقع ملنے پر مارشل لاء کی بی ٹیم کا کردار کرنے کیلئے ہر وقت تیار رہتا ہے۔

ایوب خان کا ایک اور اہم کام اس پالیسی کا نفاذ تھا جس کے تحت پہلی بار فوجی افسران کو بیوروکریسی میں شامل کیا گیا۔بعد میں جنرل ضیاء اور جنرل مشرف کے ادوار میں اس پالیسی پر بہت شد و مد سے عمل کیا جانے لگا۔یہ پالیسی محض فوجی افسران کو ریوارڈ دینے کی حد تک محدود نہیں تھی بلکہ اس کی جڑیں فوج کے اس خود ساختہ تصور میں گڑی ہوئی تھیں کہ فوج ریاست کا سب سے زیادہ موثر ادارہ ہے۔اس کے بعد فوجی افسران کو معمول کی سول انتظامیہ میں شامل ہونے کیلئے طلب کرنے کی روایت تسلسل کے ساتھ قائم رہی۔مثال کے طور پر نواز شریف کے دوسرے دور حکومت میں بہت تاخیر سے ہونے والی ۱۹۹۸ کی مردم شماری کیلئے فوج کی خدمات حاصل کی گئیں۔اسی طرح سرکاری امداد سے چلنے والے ۵۶،۰۰۰ ہزار پرائمری سکولوں میں سے گھوسٹ سکولوں کو تلاش کرنے کا کام بھی فوج کے سپرد کیا گیا(۳۷)۔

۱۹۵۹ کے اختتام تک مختلف سول انتظامی عہدوں پر ۵۳ فوجی افسران کام کر رہے تھے(۳۸)جن میں سے جنرل اعظم خان کو سب سے زیادہ بااختیار افسر سمجھا

جاتا تھا۔وزیر بحالیات کی حیثیت سے انہوں نے کراچی میں مہاجرین کی آبادکاری کے نہایت سنگین مسئلے کو حل کرنے کیلئے صرف چھ ماہ کی قلیل مدت میں ۱۵ ہزار مکانات پر مشتمل نئی کورنگی ہاؤسنگ سکیم کی تعمیر مکمل کر کے وہاں مہاجرین کو آباد ہونے کا موقع فراہم کیا۔بعد میں انہوں نے مشرقی پاکستان میں گورنر کی حیثیت سے خدمات بھی سرانجام دیں۔

پاکستان کی شہری زندگی کے بہت سے شعبوں میں فوج کی جانب سے پاؤں پسارنے کے نتیجے میں کرپشن کو فروغ ملا۔اس سے اقربا پروری اور حسن عسکری رضوی کے الفاظ میں ''مطلق العنان کلائنٹل ازم'' کی بھی حوصلہ افزائی ہوئی۔سیاسی عمل کے بہت سے پہلو تھے جن کی شروع میں ایوب خان نے سخت مذمت کی تھی۔جیسا کہ بعد کے ادوار میں ضیاء اور مشرف نے کیا، فوج کو اس ''احتساب'' کے عمل کا حصہ نہیں بننا چاہیے تھا جو اس نے سویلین پر مسلط کیا۔اس حوالے سے بدترین کرپشن میں خود ایوب خان کا خاندان ملوث ہوا۔گو کہ اس کے بیٹوں اختر اور گوہر کی فوج سے قبل از وقت ریٹائرمنٹ کے حوالے سے اس کا داغ دھونے کی کوشش کی گئی(۳۹)۔

مختصر یہ کہ پاکستان کے پہلے مارشل لاء کا دور فوج کے ملکی معیشت میں باقاعدہ دخول سے عبارت ہے۔فوج کے سینئر افسران اس سے زیادہ مستفید ہوئے لیکن نچلے رینک کے افسروں نے بھی فلاح و بہبود اور زمین کی ملکیت کے اعتبار سے حسب توفیق اس سے فائدہ اٹھایا۔فوج نے بحیثیت ادارہ معاشی ایمپائر بننے کی جانب پیش قدمی کی جو اس کی صلاحیت اور مستقبل میں سیاسی میدان میں جلوہ نمائی کے سلسلے میں اس کیلئے بہت فائدہ مند ثابت ہوئی۔عائشہ صدیقہ کا الفاظ میں:

> ایسی افواج جو گہرے معاشی مفادات پیدا کر لیتی ہیں یا معیشت میں اپنی موجودگی کو مضبوط کر لیتی ہیں سیاسی کنٹرول کو ترک کرنے پر آمادہ نہیں ہوتیں۔درحقیقت رجحان یہ ہوتا ہے کہ ریاست اور سوسائٹی میں ادارے کی اجارہ داری قائم کی جائے۔پاکستان، انڈونیشیا اور ترکی کے معاملے میں فوج کا اجارہ دارانہ کنٹرول واضح طور پر دیکھا جاسکتا

ہے(۴۰)۔

جبکہ ایوب خان کے دور کے بہت سے ورثے کو بھلایا جاچکا ہے تاہم اس حوالے سے ایوب حکومت کو ایک سنگ میل کے طور پر ہمیشہ یادرکھا جائے گا۔

بھارت کے ساتھ دیرینہ دشمنی

بہت سے تجزیہ نگار اس بات پر متفق ہیں کہ بھارت کے ساتھ ۱۹۶۵ کی جنگ ایوب حکومت کے زوال کا باعث بنی۔اس کا ۲۲ ستمبر کو جنگ بندی قبول کر لینے کا فیصلہ اس آبادی کیلئے صدمے کا باعث بنا جن کی غذا فتح کی رپورٹیں بن چکی تھیں۔اس جنگ بندی کے فیصلے نے اس کے اور وزیر خارجہ ذوالفقار علی بھٹو کے درمیان خندق بھی کھود دی۔بھٹو نے آخر کار جون ۱۹۶۶ میں وزارت سے استعفیٰ دے دیا اور ایوب مخالفت کی اٹھتی ہوئی لہر کی قیادت پر فائز ہوگئے۔جنوری ۱۹۶۶ میں طے پانے والے تاشقند معاہدہ جس میں بعد از جنگ سیٹلمنٹ کی شرائط اور پاکستان کی جنگ سے پہلے کی پوزیشنوں پر سٹیٹس کو برقرار رکھنے کی رضامندی شامل تھی، کے خلاف لاہور میں طلباء اور کشمیری مہاجرین نے شدید احتجاجی مظاہرے کیے۔اس حوالے سے اس وقت کے برطانوی ہائی کمشنر سر موریس جیمز نے اپنی حکومت کو لکھا: ”ایوب خان نے قوم کو دھوکہ دیا ہے اور بھارت کے خلاف ناقابل معافی طور پر اپنے موقف کو نقصان پہنچایا ہے“(۴۱)۔اس کے فوری بعد مولانا مودودی نے لاہور میں دیگر سیاسی شخصیات کے ساتھ ایک مشترکہ پریس کانفرنس کی جس میں ایوب خان پر قومی وقار کی قیمت پر امن خریدنے اور کشمیر پر اصولی موقف سے غداری کرنے کے حوالوں سے ”ناقابل معافی حد تک کمزوری“ دکھانے کا الزام عائد کیا گیا۔

بھارت کے ساتھ تصادم کے دو اہم پہلو ایسے ہیں جن پر بہت کم بات کی جاتی ہے۔اول، اس جنگ کے نتیجے میں امریکہ کی جانب سے دھوکہ دینے کا احساس پیدا ہوا جو دونوں ملکوں کے درمیان پیچیدہ تعلقات کی ابتدا تھی جن کی پیچیدگی آج تک جاری ہے۔دوم، اس کے نتیجے میں پاکستانی ریاست کی جانب سے بے قاعدہ مذہبی عسکری

قوتوں کو استعمال کرنے کے رجحان میں اضافہ ہوا۔اس کام کا بیڑہ ایوب حکومت نے اٹھایا تاہم نظریاتی بنیادوں پر نہیں بلکہ ایک حربے کے طور پر۔اس حکمت عملی نے فوج اور جہادی عناصر کے درمیان تعلقات کے قیام کیلئے راستہ ہموار کر دیا جس نے ۱۹۸۰ کی دہائی میں بھرپور طریقے سے اپنا رنگ جمایا۔لیکن اکیسویں صدی کے ابتدائی برسوں میں اس کا رخ خود ریاست کے خلاف ہوگیا۔

جیسا کہ ہم پیچھے دیکھ چکے ہیں ایوب خان نے ۱۹۵۰ کی دہائی میں امریکہ کے ساتھ فوجی اور سفارتی سطح پر مضبوط تعلقات قائم کیے۔فوج نے ایک ادارے کے طور پر سفارتی عمل کی قیمت پر اس سے بھرپور فائدہ اٹھایا۔پاکستان نے اس کے بعد بھارت کے ساتھ کسی بھی تنازعے کیلئے ضمانتی کے طور پر امریکہ کی جانب دیکھنا شروع کر دیا جبکہ دوسری جانب امریکہ کی پوزیشن مختلف تھی اس کے سرد جنگ کے حوالے سے وسیع تر علاقائی مفادات تھے۔جب ایوب خان نے ۱۹۶۱ میں امریکہ کا سرکاری دورہ کیا تو اس وقت کے امریکہ صدر جان الیف کینیڈی نے انڈریو ائر فورس بیس پر ایوب خان کا استقبال کرتے ہوئے اپنی تقریر میں پاکستان کو ہر وقتی اور مشکل ضرورت میں اپنا دوست قرار دیا(۴۲)۔پاکستان میں بہت سے ایسے لوگ تھے جو ۱۹۶۵ کی جنگ کے حوالے سے ہونے والے تجربے کے مدنظر انہیں کھو کھلے الفاظ سے تعبیر کر رہے تھے۔

بھارت کے ساتھ دشمنی کے نئے دور کے آغاز سے بھی پہلے ایوب خان کے کرشماتی شخصیت کے حامل وزیر ذوالفقار علی بھٹو اسے چین کی جانب دوستی کا ہاتھ بڑھانے کا مشورہ دے رہے تھے۔بھٹو حالات میں تبدیلی کا کریڈیٹ لے رہے تھے جبکہ ایوب خان امریکہ کے یوٹو طیاروں کی سویت یونین کے خلاف جاسوسی سے پیدا ہونے بحران کے تناظر میں پہلے ہی محسوس کر رہے تھے کہ انہیں امریکہ نے نیچا دکھایا ہے اور وہ اپنی طویل مدتی خارجہ پالیسی کے ڈاکٹرائن کو تبدیل کرنے پر غور و فکر کر رہے تھے۔سب سے اہم ٹرننگ پوائنٹ ۱۹۶۲ میں چین اور بھارت کے درمیان جنگ ثابت ہوا۔اس جنگ کے نتیجے میں اولاً اس کہاوت کی بنیاد پر چین کے ساتھ علاقائی اتحاد کے امکانات پیدا ہوئے کہ دشمن کا دشمن دوست ہوتا ہے۔دوم، اس کے نتیجے میں اسلام آباد

میں اس حوالے سے بے چینی پیدا ہوئی کہ بھارت کی شکست کے بعد امریکہ اور برطانیہ فوری طور پر اس کی مدد کیلئے آگے آگئے اور انہوں نے نئی دہلی کو ہنگامی بنیادوں پر ۱۲۰ ملین ڈالر کی ہنگامی فوجی امداد فراہم کردی۔ اسلام آباد میں اس خیال نے جڑ پکڑلی کی اس فوجی امداد کے نتیجے میں بھارتی فوج میں ہونے والی توسیع کا ہدف چین نہیں بلکہ پاکستان ہوگا۔ اس صورتحال نے ذو الفقارعلی بھٹو جیسے تمام لوگوں کو متحرک کردیا جو کشمیر کے مسئلے کا فوجی حل تلاش کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ سوم، چین کے ساتھ جنگ میں بھارت کی شکست نے پاکستان میں پائے جانے والے ان جذبات نے تقویت پکڑلی کہ فوجی اعتبار سے بھارت کمزور ہے اور اس کی لڑنے کی صلاحیت محدود ہے۔ اس خیال نے اس وقت مزید تقویت پکڑ لی جب اپریل ۱۹۶۵ کے پہلے ہفتے میں بھارت اور پاکستان کی فوجوں کے درمیان رن آف کچھ کی ساحلی پٹی پر باقاعدہ جنگ کی صورتحال پیدا ہوئی (۴۴)۔ پاکستان کا رن آف کچھ کے شمالی علاقے پر دعویٰ تھا جہاں انسانوں کی بجائے صرف فلیمنگو اور جنگلی گدھے پائے جاتے ہیں جبکہ بھارت ۸۴۰۰ مربع میل پر محیط تمام علاقے کا دعوے دار تھا۔

پاکستان کی سفارت کاری کے میدان میں نئے اتحادی تلاش کرنے کی کوشش اور بھارت کے ساتھ نئی جنگ کی منصوبہ بندی کے پیچھے امریکہ کی جانب سے بھارت کو اسلحہ فراہم کرنے کے خلاف پاکستان میں ہونے والے مظاہرے تھے جن کے دوران کراچی میں ہجوم نے یو ایس آئی ایس لائبریری پر حملہ کردیا (۴۵)۔ اس کے فوری بعد راولپنڈی میں ہونے والے مظاہروں کے دوران سرکاری اور فوجی گاڑیوں پر پتھراؤ اور فلیش مین ہوٹل پر حملہ ہوا (۴۶)۔ امریکہ میں بھی ان رپورٹوں کی وجہ سے بے چینی پیدا ہورہی تھی کہ پاک فوج کے جونیئر رینک کے افسروں میں امریکہ کے خلاف جذبات پروان چڑھ رہے ہیں (۴۷)۔

پاکستان میں امریکہ کے خلاف نفرت کے جذبات اس وقت مزید بھڑک اٹھے جب امریکہ نے ۸ ستمبر ۱۹۶۵ کو بھارت کے ساتھ جنگ کے عین دوران پاکستان کو اسلحہ کی فروخت پر پابندی عائد کردی۔ پاکستان کے ٹینکوں اور جنگی طیاروں کو فاضل پرزہ

جات نہ ملنا بھی بلاشبہ ۲۳ ستمبر کو ایوب حکومت کی جانب سے اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل جنگ بندی کی متفقہ قرارداد کی منظوری پر سرتسلیم خم کرنے کی ایک اہم وجہ تھی۔ اس نازک موقع پر امریکہ کا موقف اور اس کا کردار پاکستان میں عوامی سطح پر امریکہ کے خلاف جذبات کو مزید گہرائی بخشنے کا باعث ثابت ہوا۔ امریکہ کی جانب سے پیٹھ دکھانے کے عمل کا توڑ کرنے کیلئے پاکستان نے بیجنگ سے سفارتی مدد طلب کرلی (۴۸) اور اس کے ساتھ ایک دفاعی معاہدہ کرلیا۔ بعد ازاں اپریل ۱۹۶۷ میں امریکہ صرف فاضل پرزے بیچنے پر آمادہ ہوا اور وہ بھی نقد رقم کی ادائیگی کی شرط پر۔

کشمیر میں بڑھتی ہوئی مداخلت جو ۱۷ روزہ پاک بھارت جنگ کا باعث ثابت ہوئی پر بہت بڑی تعداد میں کتابیں لکھی جاچکی ہیں۔ ان تصنیفات میں جن باتوں پر خصوصی توجہ مرکوز کی گئی ہے ان میں یہ معاملات شامل ہیں: اول، ذوالفقار علی بھٹو کی اس حکمت عملی کی تشکیل میں معاونت جسے آپریشن جبرالٹر کا کوڈ نیم دیا گیا تھا (۴۹)، دوم، کشمیر پر بھارتی قبضہ واگزار کرانے کیلئے فوجی کارروائی کے محرکات جو اکثر علاقائی اور ذاتی مفاد کے عوامل میں بدل جاتے ہیں (۵۰)، سوم، کشمیری مسلمانوں کی جانب سے بھارت کے خلاف اٹھ کھڑا ہونے کی امید ہمیشہ کیوں حقیقت کا جامہ نہیں پہن پاتی۔

تاہم یہاں پر ہم زور اس بات پر دیں گے کہ ۱۹۶۳ میں سرینگر میں بالائی جھیل ڈیل کے کنارے پر واقع حضرت بل کے مزار سے موئے مبارک کے غائب ہونے اور اس کی برآمدگی کے حوالے سے پیدا ہونے والے شدید جذبات کو پاکستان نے کیوں غلط طور پر سمجھا (۵۱)۔ حال ہی میں چھپنے والی چند کتابوں میں اس پہلو پر زور دیا گیا ہے کہ آپریشن جبرالٹر کے دوران بے قاعدہ اسلامی عسکریت پسندوں کے دستوں کو استعمال کرنا مستقل میں ریاست کی جانب سے جہادی گروپوں کے ساتھ اتحاد تشکیل دینے کی بنیاد بنا (۵۲)۔ یہی وہ معاملہ ہے جس کی طرف اب ہم توجہ مرکوز کریں گے۔

آپریشن جبرالٹر کا ہیڈکوارٹر پاکستان کے پہاڑی مقام مری میں میجر جنرل اختر حسین ملک کی سرکردگی میں قائم کیا گیا تھا۔ اس آپریشن کے دوران ۵ اگست کو کنٹرول لائن عبور کرنے کیلئے چھ مسلح پارٹیاں بنائی گئی تھیں جن کے نام مشہور اسلامی سپہ سالاروں

کے نام پر رکھے گئے تھے۔ مسلح دخل اندازوں نے کنٹرول لائن کے پار انفراسٹرکچر اور فوجی تنصیبات کو ہدف بنانے کا منصوبہ بنایا تھا۔ ان کی مسلح کارروائیوں کے حوالے سے توقع کی جارہی تھی کہ ان کے نتیجے میں کشمیر کی مسلمان آبادی بھارت کے خلاف اٹھ کھڑی ہوگی۔ ان ٹاسک فورسز یا مسلح دستوں میں بڑی تعداد رضا کار اسلامی جنگجوؤں (مجاہدین) کی تھی جنہیں آزاد کشمیر اور بہت بڑی تعداد میں کشمیری آبادی کے حامل سرحدی ضلع سیالکوٹ سے بھرتی کیا گیا تھا۔ ان دستوں میں شامل دیگر جنگجوؤں میں آزاد کشمیر رائفلو، ناردرن لائٹ انفنٹری اور سپیشل سروسز گروپ کے فوجی کمانڈوز شامل تھے۔ جہادی رضا کاروں کو مئی ۱۹۶۵ میں ۱۹ویں بلوچ رجمنٹ نے اٹک کے مقام پر ابتدائی تربیت فراہم کی تھی۔ آپریشن کے وقت انہیں آزاد کشمیر کے سرحدی علاقوں کوٹلی، تکیال سیکٹر، ترکنڈی سیکٹر اور بھیر سیکٹر کی جانب روانہ کیا گیا۔ سوامی کا کہنا ہے کہ دلچسپ بات یہ ہے کہ ان جہادیوں کو آزاد کشمیر رائفلو کے اہلکاروں نے جن کیمپوں میں اس وقت کے جہادیوں کو تربیت فراہم کی تھی کئی برس بعد ۱۹۸۹ کے جہاد کے دوران بھی جہادیوں کی نئی نسل کو انہیں کیمپوں میں تربیت فراہم کی گئی (۵۳)۔

فوج کی مجاہدین اور جہادیوں کے گروپوں کے ساتھ بعد میں کی جانے والی ''انگیج منٹ'' بہت بڑے پیمانے پر اور ایک مختلف عالمی منظر نامے کے تناظر میں وقوع پذیر ہوئی تھی۔ فوج کی اپنی تبدیلی ہوتی ہوئی ہیئت اور ان گروپوں کے ساتھ طویل مدتی انٹرایکشن سے یہ بھی مطلب اخذ ہوتا ہے کہ فوج کی مجاہدین کے کاز کے ساتھ نظریاتی کمٹمنٹ بھی ہو چکی تھی۔ ۱۹۶۵ میں ان جہادیوں کا استعمال محض جنگی حربے کے طور پر تھا گوکہ پاکستانی نکتہ نظر سے یہ بھارت کے پنجاب کی سرحد پر تباہ کن جوابی کارروائی کو روکنے میں مددگار ثابت نہ ہوسکا۔ تاہم اس ابتدائی مرحلے میں بھی پاکستانی فوج میں ایسے افسروں کی کمی نہ تھی جو مسلم سپاہ گری اور ''قوم پرست ریاست کی آئیڈیالوجی'' کی حفاظت کیلئے کمیٹڈ فوج تشکیل دینے کے سلسلے میں پرعزم تھے، جیسا کہ ۱۹۵۱ میں ''راولپنڈی سازش کیس'' کی مثال سے واضح ہو چکا تھا۔ اس پہلو کو عام طور پر فوج کے کچھ حلقوں اور جہادی گروپوں کے درمیان گٹھ جوڑ کا تجزیہ کرتے وقت نظر انداز کردیا

جاتا ہے۔ نہ آپریشن جبرالٹر کی ناکامی اور نہ اس کے خلاف بھرپور جوابی ''آپریشن گرینڈ سلام'' پاکستانی فوج کے Irredentism کو ختم کرسکے۔ ایوب خان کی اقتدار سے محرومی کے بعد اسلام آباد میں آرام کرنے کے ایام میں بھی کشمیر میں دونوں فریقین کے درمیان خفیہ تصادم کا سلسلہ جاری رہا جو اس کے فوجی جانشینوں جنرل ضیاء الحق اور جنرل مشرف کے ادوار میں آگ کا الاؤ بن کر دھک اٹھا۔

حرف آخر:

بہت سی منفرد خصوصیات کے باوجود ایوب دور کو تقسیم کے عظیم انتشار میں تشکیل پانے والی سیکورٹی سٹیٹ اور بعد کے فوجی حکمرانوں کی جانب سے اسے مستحکم کرنے کی کوششوں کے درمیان میں ایک عبوری عرصے کے طور پر دیکھا جاتا ہے۔ یہ ''ملبس'' کے قیام کی ابتدا بھی تھی اور فوج اور جہادی عناصر کے درمیان طویل گٹھ جوڑ کا آغاز بھی تھا۔ ایوب خان نے مرکزیت کی حامل ریاست اور ثقافتی یکجہتی کو قائم و دائم رکھا جو ریاست کی تعمیر کے ابتدائی برسوں کی اہم خصوصیات رہی تھیں۔ تاہم اس کے ساتھ ہی یہ ایک عبوری دور بھی تھا جس میں ریاست مہاجر انٹرپرائز سے پختون جونیئر پارٹنرز کے ساتھ پنجابی غلبے کی جانب منقلب ہوئی۔ اس دور میں سندھی اور بنگالی اشرافیہ کو ریاستی اقتدار سے باہر رکھنے کا اہتمام بھی کیا گیا تھا۔ نام نہاد ثقافتی یکجہتی نے انہیں ریاست سے مزید لاتعلق کردیا۔ اس دور میں ناہموار معاشی ترقی نے پنجابی غلبے کی حامل ریاست کے تاثر میں گہرائی پیدا کردی تھی۔ ایوب خان کا دور معاشی ترقی کی بلند شرح کے حوالے سے یاد رکھا جائے گا تاہم اس کے ساتھ ہی معاشی عدم مساوات میں بھی بے پناہ اضافہ ہوا۔ اس کے دور کے آغاز کی نسبت اختتام تک قومی وحدت کو شدید درجے نقصان پہنچ چکا تھا۔ مزید براں یہ کہ کرپشن اور سیاسی انتشار جس کے خاتمے کا عزم لے کر ۱۹۵۸ میں یہ حکومت برسر اقتدار آئی تھی بدستور قومی منظر پر جلوہ افروز رہا۔

اگرچہ ایوب خان نے پاکستان کی ریاست اور معاشرے کو جدید خطوط پر استوار کرنے کی کوشش کی تاہم وہ عوامی زندگی میں اسلام کے کردار کا فیصلہ کن تعین کرنے

میں ناکام رہا۔اسے اپنے بہت سے اقدامات کو واپس لینا پڑا جن میں پاکستان کے سرکاری نام سے لفظ ''اسلامی'' کا اخراج بھی شامل تھا۔وہ سخت گیر ملاؤں کی شدید مخالفت کے مقابلے میں دفاعی پوزیشن اختیار کرتے ہوئے خود مزاروں سے منسلک روایتی اسلام کی حمایت حاصل کرنے پر مجبور ہوگیا جو جدید مصلحین کا ہدف تنقید رہا تھا۔اس کی کمزوری نے آنے والے برسوں میں اسلامی جماعتوں کے بڑھتے ہوئے اثر ورسوخ اور اپنی حکومت کے قانونی جواز کے نہ ہونے سے جنم لیا تھا۔اسلام پرستوں نے ۱۹۶۵ کے صدارتی انتخابات کے دوران اس کی حکومت کے خلاف لبرل قوتوں، لسانی گروہوں، نسلی بنیادوں پر سیاست کرنے والے قوم پرستوں اور طلباء کے ساتھ ہاتھ ملالیے اور پھر بعد ازاں چار سال بعد برپا ہونے والے عوامی ابھار نے اسے اقتدار چھوڑنے پر مجبور کردیا۔اس پیٹرن نے ایک دہائی سے بھی کم مدت کے بعد ذوالفقار علی بھٹو کی حکومت کے خلاف پی این اے کی تحریک کی صورت میں خود کو دہرایا۔یہ تحریک بعد میں جنرل ضیاء الحق کے مارشل کی صورت میں انجام پذیر ہوئی۔جیسا کہ ہم اگلے باب میں دیکھیں گے کہ ذوالفقار علی بھٹو کو مشرقی پاکستان کے سقوط اور بنگلہ دیش کے قیام کے نتیجے میں ہونے والی فوجی شکست کے بعد پاکستان کو نئی بنیادوں پر استوار کرنے کا موقع ملا تھا۔تاہم وہ ایسا کرنے میں ناکام رہا۔اس کی ناکامی کی وجوہات کا تنازعہ موجودہ پاکستان میں سیاسی محاذ آرائی کی بڑی وجوہات میں شامل ہے۔

☆☆☆

حوالہ جات

۱۔ L. Ziring, "The Ayub Khan Era: Politics in Pakistan, 1958 - 1969" (Syracuse, NJ: Syracuse University Press, 1971)

۲۔ اس نے بعد ازں اپنی سوانح حیات میں لکھا کہ ''کل کے غدار آج کے وزیر اعظم ہیں''۔ Ayub Khan, "Friends not Masters: a Political Biography (London: Oxford University Press, 1967)

۳۔ Muhammad Ayub Khan, "Speeches and Statesments, vol 1 (Karachi: Pakistan Publications, 1961)

۴۔ Cited in R. Jahan, "Pakistan: Failure in National Integration (New York: Columbia University Press, 1972)

۵۔ مزید تفصیلات کیلئے ملاحظہ کیجئے: I. Talbot, "Pakistan: A Modern History" 2nd edition (London: Hurst, 2009)

۶۔ A. T. Rafiq ur Rehman, "Basic Democracies at the Grass Roots" (Comilla: Pakistan Academy for Village Development, 1962)

۷۔ Hassan Askari, "Military, State and Society in Pakistan (Basingstoke: McMillan, 2000)

۸۔ M. Waseem, "Politics and the State in Pakistan" (Lahore, Progressive, 1989)

۹۔ Z. Niazi, "Towards a Free Press" in V. Schofield (ed), Old Roads, New Highways: Fifty Years of Pakistan" (Karachi: Oxford University Press, 1997)

۱۰۔ Iftikhar H. Malik, "State and Civil Society in Pakistan: Politics of Authority, Ideology and Ethnicity" (Basingstoke: McMillan, 1997)

۱۱۔ اس کے باوجود مرکز کوارڈی نیشن اور پالیسی کی یکسانیت کے نام پر ریلوے اور صنعتوں کے شعبے میں مداخلت کرسکتا تھا۔علاوہ ازیں صوبے کی جانب سے پیش کردہ کوئی بھی منصوبہ جس کی لاگت پانچ ملین ڈالر سے زیادہ ہو مرکز کی منظوری کا محتاج تھا۔

۱۲۔ Tariq Rehman, "Language and Politics in Pakistan (Karachi: Oxford University Press, 1996)

۱۳۔ S. Ansari, "Punjabis in Sind-Identity and Power", International Journal of Punjab Studies 2, 1 (January - June, 1995)

۱۴۔ مثال کے طور پر دیکھیے ۱۱ جون ۱۹۴۶ کے سندھ مسلم لیگ کا شمارہ، حصہ نہم، ۶۔۱۹۴۴، جلد ۳۸۶، فریڈم موومنٹ آرکائیوز۔

۱۵۔ Harun-ur-Rashid, "The Ayub Regime and the Alienation of East Bengal", Indo British Review 17, (Sept. 1989 and Dec. 1989)

۱۶۔ Tariq Rehman, "Language and Politics in Pakistan (Karachi: Oxford University Press, 1996)

۱۷۔ Rehman, "Language and Politics in a Pakistani Province: Sindhi Language Movement", Asian Survey 35, 11 (November 1995)

۱۸۔ کونسل جنرل دکن بنام ڈیپارٹمنٹ آف سٹیٹ، ۸ فروری ۱۹۶۲، کالج پارک میں موجود نیشنل آرکائیوز۔

۱۹۔ ۱۹۶۵ میں سترہ روزہ جنگ کے دوران ملک کے مشرقی بازو کو دفاع اور معیشت کے حوالوں سے مکمل طور پر اس کے حال پر چھوڑ دیا گیا تھا۔

۲۰۔ انکوائری کمیشنوں کے ۲۸۰ میں سے صرف ۷۵ ارکان کا تعلق مشرقی پاکستان سے تھا، ملاحظہ کیجئے: Jahan, "Paksitan: Failure in National Integration"

۲۱۔ کونسل جنرل لاہور بنام ڈیپارٹمنٹ آف سٹیٹ، ۲۲ جنوری ۱۹۶۳، کالج پارک میں موجود نیشنل آرکائیوز۔

۲۲۔ Papanek, "Pakistan's Development: Social Goals and Private Incentives", (Cambridge, MA: Harvard University Press, 1967)

۲۳۔ Ayesha Saddiqa, "Military Inc.: Inside Pakistan's Military Economy" (London: Pluto Press, 2007)

۲۴۔ مزید تفصیلات کیلئے ملاحظہ کیجئے: I. Talbot, "Pakistan: A Modern History" 2nd edition (London: Hurst, 2009)

۲۵۔ یہاں قرآن اور سنت میں موجود ایک ضابطہ قانون کی جانب اشارہ ہے۔

۲۶۔ Muhammad Ayub Khan, "Speeches and Statesments, vol 1 (Karachi: Pakistan Publications, 1961)

۲۷۔ Muhammad Ayub Khan, "Friends not Masters"

۲۸۔ امریکن کونسل لاہور بنام ڈیپارٹمنٹ آف سٹیٹ، ۱۳ اگست ۱۹۶۲، کالج پارک میں موجود نیشنل آرکائیوز۔

۲۹۔ Farzana Sheikh, "Making Sense of Pakistan" (London: Hurst, 2009)

۳۰۔ ایضاً۔

۳۱۔ ۶۵-۱۹۶۰ کے عرصے کے دوران پاکستان نے مجموعی طور پر ۲،۳۶۵ ملین ڈالر غیر ملکی امداد حاصل کی تھی۔جس میں سے تقریباً ۸۰ فیصد حصہ قرضوں کی صورت میں تھا۔ Anita Weiss, "Culture, Class and Development in Pakistan: The Emergence of an Industrial Bourgeoisie in Punjab (Colorado: Westview Press, 1991)

۳۲۔ Farzana Sheikh, "Making Sense of Pakistan" (London: Hurst, 2009)

۳۳۔ Ayesha Saddiqa, "Military Inc.: Inside Pakistan's Military Economy"

۳۴۔ ایضاً۔

۳۵۔ ایضاً۔

۳۶۔ ایضاً۔

۳۷۔ I. Talbot, "Pakistan: A Modern History" 2nd edition

۳۸۔ S. J. Burki, "Twenty Years of the Civil Service of Pakistan: A Re-evaluation", Asian Survey 9, 4 (April 1969)

۳۹۔ H. Feldman, "From Crisis to Crisis: Pakistan 1962 - 1969 (London: Oxford University Press, 1972)

۴۰۔ Ayesha Saddiqa, "Military Inc.: Inside Pakistan's Military Economy"

۴۱۔ Sir Morice James, Pakistan Chronicle (London: Hurst, 1992)

۴۲۔ Muhammad Ayub Khan, "Friends not Masters"

۴۳۔ گیری پاور کے یوٹو جاسوس طیارے نے اپنی بدقسمت پرواز کا آغاز پانچ مئی ۱۹۶۰ کو پشاور کے نزدیک ایک فضائی اڈے بڈابیر سے کیا تھا۔اس پر خروشیف نے خبردار کیا تھا کہ نا صرف اگلی ایسی کسی پرواز کو مار گرایا جائے گا بلکہ ان غیر ملکی اڈوں کو جہاں سے ان طیاروں کو روانہ کیا جائے نا قابل تلافی نقصان پہنچایا جائے گا۔اس کی وجہ سے پاکستان میں مغرب مخالف جذبات کو تقویت ملی تھی۔ایوب خان خاص طور پر پریشانی کا شکار ہوا تھا کیونکہ اس مشن کے سلسلے میں اسے اندھیرے میں رکھا گیا تھا۔

۴۴۔ For details see Brian Cloughley, "A History of the Pakistan Army: Wars and Insurrections (Karachi: Oxford University Press, 1999)

۴۵۔ امریکی سفارتخانہ کراچی بنام ڈیپارٹمنٹ آف سٹیٹ، ۱۶ نومبر ۱۹۶۲، کالج پارک

میں موجود نیشنل آرکائیوز۔

۴۶۔ امریکی سفارتخانہ کراچی بنام ڈیپارٹمنٹ آف سٹیٹ، ۲۱ نومبر ۱۹۶۲، کالج پارک میں موجود نیشنل آرکائیوز۔

۴۷۔ امریکی سفارتخانہ کراچی بنام ڈیپارٹمنٹ آف سٹیٹ، ۸ جنوری ۱۹۶۳، کالج پارک میں موجود نیشنل آرکائیوز۔

۴۸۔ چین کے وزیراعظم چن یی نے پاکستان کے ''منصفانہ اقدام'' کو سراہنے کیلئے چند بیانات دیئے تھے۔۱۶ ستمبر کو چین نے بھارت پر سکم کے بارڈر پر فوجی تنصیبات کی تعمیر کا الزام عائد کیا اور انہیں گرانے کا مطالبہ کیا تھا۔

۴۹۔ Gen. K. M. Arif, "Khaki Shadows: Pakistan 1947 - 1997 (Karachi: Oxford University Press, 2001)

۵۰۔ Stephen M. Saideman, "At the Heart of the Conflict: Irredentism and Kashmir: in T.V. Paul (ed.), "The India-Pakistan Conflict: An Enduring Rivalry (Cambridge: Cambridge University Press, 2005)

۵۱۔ Victoria Schofield, "Kashmir in Conflict: India, Pakistan and the Unfinished War" (London: I.B Taurus, 2000)

۵۲۔ Praveen Swami, "India, Pakistan and the Secret Jehad: The Covert War in Kashmir 1947 - 2004 (London: Routledge, 2007)

۵۳۔ ایضاً۔

۵۴۔ راولپنڈی سازش کیس کے بارے میں مزید جاننے کیلئے ملاحظہ فرمائیے: Hasan Zaheer, "The Times and Trial of the Rawalpindi Conspiracy, 1951: The First Coup Attempt in Pakistan (Karachi: Oxford University Press, 1998)

☆☆☆

۴

بھٹو کا پاکستان
ایک موقع جو ضائع ہو گیا

۲۰ دسمبر ۱۹۷۱ کو بالآخر وہ دن طلوع ہوا جب ذوالفقار علی بھٹو نے صدر پاکستان اور چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر آف پاکستان کی حیثیت سے رسمی طور پر یحییٰ خان کی جگہ لے لی۔ دو سال بعد مارشل لاء کے خاتمے اور قومی اسمبلی سے آئین کی منظوری کے بعد اگست ۱۹۷۳ میں بھٹو نے وزیراعظم پاکستان کی حیثیت سے حلف اٹھالیا۔ اگلے چار برسوں تک وہ ایسی حکومت کے سربراہ رہے جو نا صرف تنازعات بلکہ معاصر پاکستان کی علامت کے طور پر جانی جاتی ہے۔ بھٹو کو موقع ملا تھا کہ وہ پاکستان کو سویلین بالادستی، سیاسی اداروں کی تعمیر، مرکز اور صوبوں کے درمیان تعلقات کی نوعیت اور عوامی زندگی میں اسلام کے کردار کے اعتبار سے ملک کو نئی راہ پر ڈال دیتے۔

ان سب امور کے علاوہ پاکستان بھر میں موجود محروم گروہوں کی ایمپاورمنٹ کے امکانات بھی موجود تھے جنہیں قیام پاکستان کے بعد سے مسلسل نظر انداز کیا جاتا رہا اور انہیں ریاست کی مقتدرہ قوتوں اور ان کے اتحادیوں نے ہمیشہ ریاستی اقتدار سے باہر رکھا۔ ان گروہوں میں ابھرتی ہوئی مڈل کلاس، صنعتی مزدور، چھوٹے کاشتکار اور کھیت مزدور شامل ہیں۔ انہیں ایوب خان کے دور میں صنعت کاری، سبز انقلاب اور بڑے پیمانے پر آبادی کی دیہات سے شہروں کو منتقلی کے نتیجے میں حاصل ہونے والی تیز رفتار معاشی تبدیلیوں کے دور میں سیاسی و معاشی اشرافیہ کو طاقتور بنانے پر توجہ مرکوز رکھنے کی

وجہ سے احساس محرومی کا شکار بنایا گیا۔ بھٹو نے ان تبدیلیوں کے نتیجے میں پیدا ہونے والی صورتحال کو جنم نہیں دیا تھا نہ ہی اس کی وجہ سے عوام کے مختلف طبقات کی وہ تحریک منظم ہوئی تھی جو ایوب خان کو اقتدار سے باہر پھینک دینے پر منتج ہوئی تھی۔ اس کی بجائے بھٹو نے محض جبلی طور پر رونما ہونے والی ان تبدیلیوں کو محسوس کر لیا تھا اور اقتدار میں آنے کیلئے اس عوامی ابھار کی لہر کے اوپر سوار ہو گئے تھے۔ ایک مرتبہ جب بھٹو نے سیاسی بلندیوں کو چھو لیا تو پھر وہ نئی عوامی قوتوں کو لگام ڈالنے میں ناکام ہو گئے۔ سو انہوں نے بہتر سمجھا کہ وہ واپس طاقت کی سیاست اور اشرافیہ کی دنیا میں جانب لوٹ جائیں۔ بھٹو کا سٹیٹس کو کے حوالے سے تذبذب کا رویہ اس بات کا اظہار تھا کہ سیاسی شعور سے بہرہ ور عوام کی جانب سے مایوسی کا سامنا کرنے کے ساتھ ساتھ انہیں مقتدر اشرافیہ کی مخاصمت کا سامنا تھا۔ اسی چیز نے ان کی اقتدار سے محرومی کا راستہ ہموار کیا۔ اپریل ۱۹۷۹ میں ان کی پھانسی کے گرد چھائی ناانصافی کی دبیز تہہ نے عوامی طبقات کے ساتھ ان کے ٹوٹے ہوئے رشتے کو پھر سے جوڑ دیا ہے اور ''بھٹو ازم'' نے بالآخر ان کی بیٹی کو بھی اقتدار کے ایوانوں تک پہنچا دیا۔

بھٹو کی کرشماتی شخصیت میں غریبوں کیلئے کشش ان کی طرف سے فراہم کیے جانے والے سیاسی شعور پر ہی منحصر نہیں تھی جسے ۱۹۷۰ کے انتخابات میں ''مساوات'' اور پھر ''روٹی کپڑا اور مکان'' کے مقبول عام نعروں میں سمو دیا گیا تھا بلکہ اس کی بہت سی جہتیں اور روایت میں موجود جڑیں ہیں۔ اپنی موت سے بہت پہلے بھٹو کبھی کبھار اپنے بارے میں صوفی اصطلاحوں میں بات کرتے تھے۔ وہ جلسوں میں عوام سے خطاب کرتے ہوئے کہتے تھے کہ بھٹو ایک نہیں دو ہیں ایک وہ جو تمہارے سامنے کھڑا ہے اور ایک وہ ہے جو تمہارے دلوں میں بستا ہے(۱)۔

اس باب میں وضاحت کی جائے گی کہ کیوں بھٹو دور پاکستان کے ماضی سے چھٹکارے کی بجائے عوام کیلئے محض ایک عارضی وقفہ ثابت ہوا تھا۔ اس میں یہ جائزہ بھی لیا جائے گا کہ کیسے اس کی حکومت نے ملکی تعمیر کے طویل مدتی مسائل اور شناخت کے بحران کو کیسے حل کرنے کی کوشش کی اور کیوں اس کی مقبول عام اپروچ ان معاملات کو حل

کرنے کیلئے ناموزوں تھی۔اس بات کی بھی ضرورت ہے کہ یہ سمجھا جائے کہ عوامی نفرت کے ہدف یحیٰی خان سے وراثت میں ملی ہوئی صورتحال نے پاکستان کی تعمیر نو کیلئے بھٹو کے سامنے کیا چیلنج اور مواقع رکھے تھے۔ہم سب سے پہلے یحیٰی خان مشرقی پاکستان میں شکست کے حوالے سے منتقل ہونے والے ورثے پر اپنی توجہ مرکوز کریں گے۔

بھٹو کو پاکستان کی تقسیم سے ملنے والی وراثت

حسن عسکری رضوی جیسے دانشوروں نے اس جانب اشارہ کیا ہے کہ کیسے فوجی شکست اور اس کے نتیجے میں ملک ٹوٹنے کے نتیجے میں پیدا ہونے والی صورتحال نے بھٹو کیلئے فوج پر سویلین بالادستی قائم کرنے کا سنہری موقع فراہم کیا تھا (۲)۔گو کہ حکومت کی جانب سے مقرر کیے جانے والے حمود الرحمٰن کمیشن کی رپورٹ مکمل صورت میں کبھی سامنے نہیں آسکی اس کے باوجود پریس فوج اور اس کی اعلیٰ قیادت پر شدید تنقید سے بھرا ہوا ہے۔پاکستان کی جانب سے ۳ دسمبر ۱۹۷۱ کو شمال مغربی بھارت میں کیے جانے والے فضائی حملوں نے بھارت کو یہ قانونی جواز فراہم کردیا کہ وہ مشرقی پاکستان میں آزادی کیلئے لڑنے والی مکتی باہنی کی امداد کیلئے وہاں فوجی کارروائی کرے۔پاکستانی ائر فورس کی مشرقی پاکستان میں کارکردگی پر تنقید کے تازیانے برسائے گئے تھے کیونکہ وہاں عملی طور پر زمینی دستوں کیلئے کوئی فضائی کور نہیں تھا۔مشرقی پاکستان میں فوج کے کمانڈر لیفٹیننٹ جنرل اے کے نیازی کی بھارتی فوج کی پیش قدمی روکنے میں ناکامی اور آخر کار ۱۶ دسمبر ۱۹۷۱ میں ڈھاکہ کے پلٹن میدان میں غیر مشروط ہتھیار ڈالنے پر اسے سخت مذمت کا نشانہ بھی بنایا جاتا ہے۔تاہم سب سے بڑا تنقید کا تازیانہ جنرل یحیٰی خان کیلئے استعمال کیا جاتا ہے نا صرف مارچ ۱۹۶۹ کے بعد سے پاکستان کے صدر کی حیثیت سے اس کی قیادت کی پرفارمنس کے حوالے سے بلکہ اس کے اخلاقی چال چلن کے حوالے سے بھی۔

یحیٰی خان نے اپنے دور اقتدار میں تباہ کن غلطیوں کا ایک طویل سلسلہ شروع کیا تھا جس میں سے چند غلطیاں یہ ہیں: ۱۹۷۰ کے عام انتخابات کے بارے میں غلط

اندازے لگانا (۳)؛ انتخابات کے بعد عوامی لیگ اور پیپلز پارٹی کے درمیان ہونے والے مذاکرات میں جانبدارانہ کردار ادا کرنا جبکہ ان انتخابات میں عوامی لیگ نے مشرقی پاکستان میں کلین سویپ کیا تھا جبکہ مغربی پاکستان میں اسے ایک نشست بھی نہ مل سکی تھی؛ شیخ مجیب الرحمٰن کے ساتھ مشکل اور تکلیف دہ مذاکرات سے گریز اور طاقت کے استعمال کو ترجیح دینا اور آنکھیں بند کرکے بھارت کے ساتھ جنگ میں کود جانا وہ بھی اس نازک وقت کے دوران جبکہ ۲۵ مارچ کو مشرقی پاکستان میں سفاکانہ فوجی آپریشن شروع کیا جا چکا تھا (۴)۔بنگلہ دیش کے قیام کے امکانات آخری دنوں میں بہت زیادہ ہو چکے تھے کیونکہ فوجی آپریشن کے دوران ۷۰ لاکھ بنگالی مشرقی پاکستان سے بھاگ کر بھارت میں پناہ لے چکے تھے جس کی وجہ سے اس مسئلے کو عالمی اہمیت حاصل ہوگئی تھی۔

فوجی شکست ہونے تک مغربی پاکستان میں حکومت لوگوں کو فوجی کامرانیوں کے رسیلے ترانے سنا کر بے وقوف بنانے میں مگن تھی۔اس کی وجہ سے شکست کے بعد جب لوگوں کو اصل صورتحال کا علم ہوا تو ان کیلئے اس پر یقین کرلینا ناممکن تھا اس کا ایک نتیجہ یہ نکلا کہ بہت سے لوگوں نے اسے بنگالیوں کی غداری پر محمول کیا۔ان جذبات کو اس وقت لاہور سے شائع ہونے والے ایک اردو روزنامے کی ایک چیختی ہوئی سرخی میں سمویا گیا تھا جس کے الفاظ تھے: ''ایک آواز، ایک اعلان ۔قوم کا قاتل یحیٰی خان'' (۵)۔پاکستان کے ٹوٹنے کی وجہ بنگالیوں کی غداری نہیں تھی نا بھارت کی جانب سے خفیہ سازش اس کے پیچھے کارفرما تھی۔اس کی بنیادی ذمہ داری اسلام آباد میں موجود مقتدر لوگوں پر عائد ہوتی ہے: بنگالیوں کے جمہوری مطالبات سے خطرناک انکار نتیجہ ہے شاونزم اور حماقت کے اختلاط کا۔

ان حالات میں پاکستان آرمی کی روایتی یکجہتی ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو چکی تھی۔انہی دنوں پاک فوج کے جونیئر افسران کا ایک وفد کرنل علیم آفریدی کی سربراہی میں اس وقت کے چیف آف جنرل سٹاف لیفٹیننٹ جنرل گل حسن سے ملا اور اس سے یحیٰی کی فوج سے برطرفی کا مطالبہ کیا۔یہ پس منظر تھا ذوالفقار علی بھٹو کی نیویارک سے واپسی جہاں وہ اقوام متحدہ میں پاکستان کا کیس لڑ رہے تھے اور اس کے بعد انہیں

صدارت کے عہدے پر فائز کرنے کا۔پاک فوج نہ صرف تقسیم ہوچکی تھی بلکہ شکست خوردہ اور ہزیمت زدہ بھی تھی۔کم از کم ۱۹۵۰ کی دہائی سے کسی بھی سویلین نے فوج کو اس طرح مارے شکست خوردگی کے کندھے جھکائے ہوئے نہیں دیکھا تھا جیسا کہ وہ ۱۹۷۱ کے دوران تھی۔بھارت کے ہاتھوں پاکستان کی فوجی شکست کو ہضم کرنا ایک ناممکن کام تھا۔دو ہفتوں پر مشتمل اس جنگ کے دوران پاکستان اپنی آدھی نیوی، ایک تہائی آرمی اور ایک چوتھائی ائرفورس سے محروم ہوگیا تھا (۶)۔اس پر مستزاد یہ تلخ حقیقت کہ جنرل نیازی کے ہتھیار ڈالنے کے بعد دو سال سے ۹۰ ہزار پاکستانی فوجی بھارت کے جنگی کیمپوں میں قیدی کی زندگی گذار رہے تھے۔نیازی نے اپنی یادداشتوں میں اپنے کردار کا دفاع کرتے ہوئے قرار دیا ہے کہ ''مشرقی گیریزن کو پاور پالیٹکس میں ناکارہ مہروں کی طرح استعمال کیا جاتا تھا جس کے ذمہ دار یحییٰ خان، بھٹو اور مجیب تھے''(۷)۔

بھٹو نے اقتدار سنبھالا تو اپنی حکومت کے پہلے چار ماہ میں فوج سے ۲۹ سینئر افسروں کو فارغ کردیا۔ان میں چیف آف آرمی سٹاف جنرل گل حسن خان بھی شامل تھے۔اگرچہ ان حالات کے نتیجے میں بھٹو کے پاس فوج پر سویلین بالادستی قائم کرنے کا سنہری موقع دستیاب تھا لیکن اس صورتحال نے بھٹو کیلئے ایک ڈائلیما بھی تخلیق کردیا تھا۔ستم ظریفی یہ ہوئی کہ اسے ایک مضبوط فوج کی ضرورت بھی محسوس ہورہی تھی۔اس موقع پر کچھ دیر کیلئے ذوالفقار علی بھٹو کے دماغ میں ''پرائیویٹ آرمی'' بنانے کا خیال بھی آیا تاہم جلد ہی انہیں اپنے اس خیال سے دستکش ہوکر ریگولر فوج کی ساز و سامان اور اسلحہ کی کمی کو پورا کرنے کیلئے ریاست کے وسائل کی بہت بڑی مقدار کو فوج کی تعمیر نو کیلئے مختص کرنا پڑا۔۱۹۷۰ کے عام انتخابات میں مغربی پاکستان کے اندر انہوں نے بھارت دشمنی کی بنیاد پر اپنی انتخابی مہم چلائی تھی اور اس دوران ان کے بھارت مخالفانہ جذبات کو عوامی سطح پر بہت پذیرائی ملی تھی۔انتخابی مہم کے دوران انہوں نے کشمیر کو حاصل کرنے کیلئے بھارت کے ساتھ ہزار سال تک جنگ کرنے کی بات کرکے اپنے ووٹروں کے جذبات میں ہلچل مچادی تھی۔اس سے قبل وہ وزیر کی حیثیت سے آپریشن جبرالٹر کے

سب سے زیادہ متحرک کردار بھی تھے جس کا مقصد کشمیر میں فوجی کارروائی کے ذریعے بھارت کا کشمیر سے فوجی قبضہ چھڑوانا تھا۔اس کے علاوہ ۱۹۶۵ کی جنگ میں پاکستان کی ناکامی کے باوجود جون ۱۹۶۶ میں وزیر دفاع کی حیثیت سے ان کے استعفیٰ نے انہیں پاکستان کے قومی مفادات کے بہت بڑے چیمپئن کی حیثیت بھی عطا کردی تھی۔جب وہ وزارت سے اپنے استعفیٰ کے بعد راولپنڈی سے اپنے آبائی شہر لاڑکانہ گئے تو انہوں نے یہ سارا سفر ریلوے کے ذریعے کیا جس کے دوران راستے میں آنے والے ہر ریلوے اسٹیشن پر ان کے استقبال کیلئے عوام کا جم غفیر امڈ آیا تھا۔ان کی اس عظیم الشانی پذیرائی نے پندرہ ماہ بعد ایک نئی پارٹی پاکستان پیپلز پارٹی کے قیام کی راہ ہموار کردی تھی۔اس کے اساسی اصولوں میں ایک '' آزاد خارجہ پالیسی'' جس کا محور لازمی طور پر بھارت کے خلاف مزاحمت تھی اور ''سوشلزم کی بنیاد پر معاشی پالیسی'' کا قیام شامل تھا۔پاکستان کے مستقبل کے حوالے سے کسی متبادل وژن کی مخالفت ۱۹۷۰ کے انتخابات کے بعد مغربی پاکستان میں پیپلز پارٹی اور مشرقی پاکستان میں شیخ مجیب الرحمٰن کی عوامی لیگ کی حیران کن کامیابی کے بعد دونوں پارٹیوں کے درمیان تعطل کی صورت پیدا کرنے کا باعث بنی تھی۔دونوں سیاسی حریفوں کے درمیان سمجھوتا نہ ہونے کی وجہ بعد ازاں مشرقی پاکستان میں فوجی آپریشن کی صورت میں سامنے آئی جس نے ملک کے مشرقی بازو میں خانہ جنگی کی صورتحال پیدا کردی۔مشرقی پاکستان کے دار الحکومت ڈھاکہ میں پاک فوج کی جانب سے قتل عام ہی تھا جس نے جنرل ضیاء الرحمٰن کی قیادت میں ایسٹ بنگال رجمنٹ کو بغاوت پر اکسایا۔

اگر بھٹو اس قدر سخت گیر نہ ہوتے تب بھی بنگلہ دیش کی آزادی کے پیش نظر بھارت کے ناقابل سمجھوتہ صورتحال کی وجہ سے دونوں ملکوں کے درمیان بہتر تعلقات کے امکانات نہ ہونے کے برابر تھے۔دوسری جانب یہ خدشات بھی ذہنوں میں بہت توانا تھے کہ بھارت جیسا دشمنانہ جذبات رکھنے والا ہمسائیہ ہندوستان کی تقسیم کو نہیں بھولا اور وہ تقسیم کے عمل کو ختم کرنے (Undo) کے درپے ہے۔۱۹۷۱ کے حالات کے دوران ہونے والی خانہ جنگی کے دوران بھارتی فوج کی مکتی باہنی کو امداد کی فراہمی اور بعد ازاں

فوجی مداخلت نے ان خدشات کو یقین میں بدل دیا تھا۔ دونوں ملکوں کے درمیان دیرینہ طور پر ناہموار تعلقات نے مخاصمت میں مزید شدت پیدا کردی تھی۔ پاکستان جبکہ اس جنگ اور اس کے نتیجے میں مشرقی بنگال کی علیحدگی کے بعد اپنے زخم چاٹ رہا تھا کشمیر کے حوالے سے جنگویانہ جذبات کو ایک جانب رکھنا ضروری تھا لیکن ایسا کرنا اور بھی مشکل ہو چکا تھا۔ اس کے باوجود موجودہ پاکستان کی طرح ۱۹۷۰ میں بھی پاکستان کی مجبوری تھی کہ وہ داخلی جمہوری استحکام کیلئے بھارت کے ساتھ تعلقات کو نارمل بنانے کی کوشش کرے۔

پاکستان کی صورتحال میں اس تضاد نے بھٹو کے سامنے ایک اور بڑا چیلنج پیش کردیا تھا۔ نظریاتی طور پر ملک کی تعمیر نو کیسے کی جائے؟ بنگلہ دیش کے قیام نے دوقومی نظریے کی بنیادیں ہلا کر رکھ دی تھیں جس نے مطالبہ پاکستان اور ریاست کی تعمیر کے عمل میں نظریاتی حوالے سے بنیادی کردار ادا کیا تھا۔ بنگالی اشرافیہ نے اپنے عمل سے ثابت کردیا تھا کہ اسلام کی مشترکہ بنیاد انہیں فیڈریشن میں رکھنے کیلئے ناکافی ہے جبکہ "پنجابی سامراجیت" کی جانب سے ان کی زبان اور معاشی مفادات کو خطرات بھی درپیش ہوں۔ بھٹو ایک سندھی پس منظر کے حامل ہونے کی حیثیت سے ماضی میں ملک کی ایک زبان اور ایک مذہب کے حوالے سے مرکزیت پسندی کے باوجود ایک لحاظ سے کثیر القومیت (Pluralism) کی بنیاد پر ملکی شناخت کی تشکیل نو کرنے کے اہل تھے۔ جیسا کہ ہم آگے چل کر دیکھیں گے کہ انہوں نے سندھی شناخت کو مضبوط تو کیا لیکن مہاجر سندھی کشمکش میں اضافے کی قیمت پر۔ وہ لبرل ہونے کے باوجود ۱۹۷۰ میں پیپلز پارٹی کے ریڈیکل جذبات کے دور عروج کے دوران بھی "اسلامی سوشلزم" کی اصطلاح استعمال کرنے پر مجبور تھے۔ جیسے جیسے اس کی حکومت اپنی نظریاتی جڑوں سے دور ہٹتی گئی اور سٹیٹس کو کی حامی قوتوں کے نرغے میں آتی گئی وہ زیادہ سے زیادہ اسلامی گروپوں کو رعایتیں دیتے چلے گئے۔ ۱۹۷۳ کا آئین جس کا نفاذ ۱۴ اگست کے موقع پر ہوا تھا، میں یہ اعلانیہ شامل تھا کہ اسلام ریاست کا سرکاری مذہب ہوگا اور اس میں یہ بھی قرار پایا کہ صرف ایک مسلمان ہی صدر مملکت اور وزیر اعظم کے مناسب پر فائز ہونے کی اہلیت کا

حامل ہوگا۔

بھٹو نے اپنے دور حکومت میں مسلمان ملکوں کے ساتھ تعلقات کو مضبوط بنیادوں پر استوار کیا گو کہ وہ مسلمان دنیا پر مشتمل کسی اتحاد کی قیادت اپنے ہاتھ میں لینے میں کامیاب نہ ہوسکے۔ مسلم دنیا کی قیادت کی خواہش کا ایک اظہار اس وقت سامنے آیا جب فروری ۱۹۷۴ میں لاہور میں اسلامی سربراہی کانفرنس کا کامیاب انعقاد کیا گیا تھا۔ مسلمان ملکوں کے لیڈروں فلسطین کے یاسر عرفات، سعودی عرب کے شاہ فیصل، کرنل قذافی، صدر اسد اور بومدین وغیرہ کو ایک جگہ پر اکٹھا کرنے کے ذریعے بھٹو نے اس بات کو یقینی بنانے کی کوشش کی کہ پاکستان مسلم دنیا کی توجہ کا محور و مرکز ٹھہرے۔ اس حوالے سے لاہور نے اپنی مغل شان و شوکت اور تحریک پاکستان کے دوران مرکزی اہمیت کا حامل ہونے کی بنا پر ایک پرفیکٹ بیک ڈراپ کا کام کیا۔ لاہور کے قذافی سٹیڈیم میں جوش جذبات سے بھرے ہوئے مجمع کے سامنے لیبیا کے لیڈر معمر قذافی کے اس بیان نے کہ پاکستان "ایشیا میں اسلام کا قلعہ ہے" اور "ہمارے وسائل آپ کے وسائل ہیں" (۸)، دسمبر ۱۹۷۱ میں پاکستانیوں کے گرد لپٹی دکھ کی چادر اتار پھینکی تھی۔ اس سربراہی کانفرنس کا مقصد محض قومی تفاخر کی بازیافت نہ تھی بلکہ اس کا مقصد ملک کی معیشت کو تیل اور دولت کی سپورٹ کے ذریعے مضبوط بنیادوں پر استوار کرنا بھی تھا۔ اس کانفرنس سے یہ بھی منعکس ہوا کہ مشرقی بازو سے محرومی نے پاکستان کی آبادی اور اس کے جیو پولیٹیکل آؤٹ لک پر بھی شدید اثرات مرتب کیے تھے۔

بنگلہ دیش کے قیام کے نتیجے میں پاکستان اپنے رقبے کے چھٹے حصے سے محروم ہو چکا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے مشرقی بازو میں موجود ایک بڑی ہندو اقلیت سے بھی ہاتھ دھو لیے تھے۔ اب وہ مسلمان آبادی کے شدید غلبے کا حامل مسلمان ملک بن کر رہ گیا تھا جہاں پر مذہبی اقلیتوں کا آبادی میں حصہ صرف تین فیصد رہ گیا تھا۔ بھٹو نے نا صرف نئے حالات کے ساتھ مطابقت پیدا کرنا تھی بلکہ اس کے اندر سے ملک پر قسمت کے نئے دروازے بھی کھولنے تھے۔ جیسا کہ انہوں نے ایک تقریر کے دوران اعتراف کیا تھا: "مشرقی پاکستان کی علیحدگی نے ہمارے جغرافیائی فوکس کو بہت زیادہ تبدیل

کردیا ہے۔۔حقیقت یہ ہے کہ(مغربی ایشیا) میں ہمارے بنیادی معاملات موجودہ صورتحال میں مزید اہمیت اختیار کر چکے ہیں"(۹)۔بھٹو نے اقتدار سنبھالنے کے بعد پاکستان کو زیادہ سے زیادہ اسلامی تہذیبی دنیا کی جانب موڑا اور آرگنائزیشن اور اسلامک کانفرنس کی ریاستوں کے ساتھ تجارت اور سرمایہ کاری کے زیادہ سے زیادہ حصول کیلئے کوششیں کیں۔نئی صورتحال میں پاکستان کی قوت و استحکام کے مراکز جنوبی ایشیا سے مغربی ایشیاء کی جانب منتقل ہوگئے۔بھٹو کے جانشین ضیاء الحق نے اس تبدیلی کو تیز تر کردیا۔۱۹۸۱ تک پاکستان کی ۳۰ فیصد سے زیادہ پاکستان کی درآمدات اور برآمدات او آئی سی ریاستوں کے ساتھ تھیں۔اس کے ساتھ ہی پاکستان سعودی عرب کی کل امداد کا ایک چوتھائی حصہ (تقریباً ۱۰۰ ملین ڈالر) وصول کررہا تھا(۱۰)۔اس دور میں پاکستان سعودی امداد سے تعمیر ہونے والی مساجد اور کھمبیوں کی طرح اگ آنے والے مدارس کے باعث جنوبی ایشیاء سے زیادہ مشرق وسطیٰ کے کسی ملک کا نقشہ پیش کرنا شروع ہوچکا تھا۔یہ ناممکن تھا کہ یہ تبدیلی جو اپنے جلو میں ضیاء کی ریاستی اسلامائزیشن بھی لے کر آئی تھی کے حامل کثیرالقومیت مشرقی بازو کو الگ کیے بغیر وقوع پذیر ہوسکتی۔

بعد از ۱۹۷۱ پاکستانی ریاست کے خدوخال پنجابی غلبے کی راہ ہموار کررہے تھے۔متحدہ پاکستان میں پنجاب نے دوسرے صوبوں کی نسبت کہیں زیادہ تعلیمی، انفرا اسٹرکچرل اور معاشی فوائد حاصل کیے تھے۔فوج کے ساتھ پنجاب کے گٹھ جوڑ نے ان فوائد میں مزید اضافہ کردیا تھا۔پنجاب کو آبادی کے لحاظ سے متحدہ پاکستان میں غلبہ حاصل نہیں تھا۔جیا کہ ہم پچھلے ابواب میں بات کرچکے ہیں کہ پنجاب کی اس کمی کو ہی پورا کرنے کیلئے ون یونٹ کے ذریعے مغربی پاکستان صوبے نے پنجابی اسٹیبلشمنٹ کو غالب رکھنے کا اہتمام کیا تھا۔مشرقی پاکستان کی علیحدگی نے آبادی میں کمی بیشی کا یہ مسئلہ بھی حل کردیا۔اب پنجاب کی آبادی ملک کی کل آبادی کا ۵۶ فیصد تھی اور غلے کی مقدار کا ۶۵ فیصد پیدا کررہا تھا جبکہ صنعتی پیداوار میں اس کا حصہ ۵۲ فیصد تھا۔نئی صورتحال میں پنجاب پاکستانی ریاست کا بلاخوف مقابلہ پاور سنٹر بن چکا تھا۔تاہم یہ بھی حقیقت ہے کہ بھٹو کی صورت میں پاکستان کی قیادت پر ایک سندھی لیڈر فائز تھا۔اس حقیقت کی وجہ سے ایک مرکزیت سے محروم اور کثرتیت پر مبنی طرز سیاست کے قیام کے امکانات پیدا ہوچکے تھے جس کی وجہ سے پنجابی غلبے کا خدشہ دم توڑ دیتا۔بھٹو مرکز اور صوبوں کے درمیان تعلقات کے معاملے سے کیسے عہدہ برا ہوئے، اگلی سطور میں ہم اسی پر بات کریں گے۔

بھٹو اور مرکز وصوبوں کے درمیان تعلقات کا معاملہ

بھٹو ایک اقلیتی صوبے سے آئے تھے۔اینٹی ایوب مہم کے دوران اور بعد ازاں یحییٰ خان کی سرکردگی میں ہونے والے ۱۹۷۰ کی انتخابی مہم کے دوران بھی بھٹو نے زوروشور کے ساتھ صوبائی ہم آہنگی کی بات کی تھی۔اس کی وجہ سے یہ امید پیدا ہو چلی تھی کہ اب صوبوں کے درمیان مختلف قسم کے اختلافات کا دیرینہ مسئلہ ہمیشہ کیلئے حل ہوجائے گا۔۱۹۷۳ کے آئین نے بھی ماضی کے دساتیر کی نسبت کہیں زیادہ صوبوں کو خود مختاری دی تھی۔اس آئین کے ساتھ مشترکہ مفادات کی کونسل کی تشکیل بھی کی گئی تھی جس کا کام صوبائی اکائیوں کے درمیان اقتصادی اختلافات کے طے کراتا تھا۔اس کے باوجود کنکرنٹ لسٹ میں شامل معاملات اور مرکز کی جانب سے صوبوں کے معاملات میں مداخلت کا عمل اپنی جگہ پر موجود رہا۔اس آئین کی ۱۰ اکتوبر ۱۹۷۳ کو قومی اسمبلی میں تقریباً اتفاق رائے سے منظوری سے یہ بات منعکس ہوتی تھی کہ یہ اس عبوری صدارتی نظام کی نسبت کہیں کم مرکزیت کا حامل ہے جو ایوب خان کی اقتدار سے علیحدگی کے بعد سے ملک کے معاملات چلانے کیلئے رائج تھا اور جسے اس وقت تک کیلئے بہترین سمجھا جاتا تھا۔تاہم بھٹو کی جانب سے صرف دو ماہ قبل بلوچستان میں نیپ کی حکومت کی برطرفی نے یہ سنجیدہ سوال اٹھادیا تھا کہ کیا بھٹو کی حکومت اپنے پیشرو حکمرانوں کے ادوار کی نسبت واقعی اختیارات کو مرکز سے صوبوں کو منتقل کرنے میں سنجیدہ بھی ہے یا نہیں۔بلوچستان کے معاملات پر بات کرنے سے قبل کو عمومی طور پر بھٹو حکومت کیلئے ٹرننگ پوائنٹ ثابت ہوئے، ہم بھٹو کی وزارت عظمیٰ کے دوران سندھ پر مرتب ہونے والے اثرات کا مختصر جائزہ پیش کریں گے۔

سندھی روایتی طور پر پاکستان کی بیوروکریسی اور فوج میں ایک اقلیتی عنصر کے طور پر موجود رہے تھے۔ایوب حکومت نے سندھی زبان کی تعلیمی اہمیت میں مزید کمی کردی تھی۔سندھ کے وزیر اعلیٰ ممتاز بھٹو کو مرکز میں اپنے کزن کی موجودگی کی وجہ سے اس عمل کو الٹ کردینے کا موقع میسر آگیا تھا۔اس نے جولائی ۱۹۷۲ میں صوبائی اسمبلی میں ایک قانون سازی کے ذریعے ناصرف سندھی کو نچلی سطح سے تعلیمی اداروں میں لازمی مضمون کے طور پر پڑھانے لازم قرار دے دیا بلکہ عدالتوں، انتظامیہ اور مقننہ میں بھی سندھی کو لازمی قرار دے دیا۔مہاجر اشرافیہ جو اپنے پنجابی حریفوں کی وجہ سے پہلے ہی سخت دباؤ کا شکار تھے، اس تبدیلی پر سیخ پا ہوگئے۔اس اشرافیہ کے ترجمان ''جنگ'' اخبار نے اسے اردو کی موت قرار دے دیا۔صوبہ سندھ کی حکومت کے اس اقدام کے نتیجے میں کراچی اور حیدرآباد میں پرتشدد مظاہرے پھوٹ پڑے جن پر قابو پانے کیلئے ان شہروں میں فوج کو طلب کرنا اور کرفیو کا نفاذ کرنا پڑا۔ذوالفقار علی بھٹو کی مداخلت کے نتیجے میں تصادم کے شعلے ٹھنڈے پڑے۔بھٹو نے سندھ میں سرکاری اہلکاروں کو سندھی میں کام کرنے کی لازمی شرط کو ۱۲ سال کیلئے موخر کردیا۔اس کے باوجود سندھی اور مہاجر آبادی کے درمیان بڑھتی ہوئی تلخی کی شدت میں کوئی خاص کمی نہ آئی کیونکہ وفاقی حکومت نے سرکاری ملازمتوں پر تعیناتی کیلئے ایک نئی ریزرویشن پالیسی متعارف کرائی جس نے صوبے میں ملازمتوں کے کوٹے کا پلڑا سندھ کی غالب تعداد کی حامل دیہی تعلیم یافتہ کلاس کی جانب جھکادیا(۱۱)۔مزید براں صوبائی کوٹے کا دائرہ کار ملازمتوں سے بڑھا کر ڈومیسائل دستاویزات کی بنیاد پر تعلیمی اداروں میں داخلوں تک پھیلا دیا گیا۔اس کا ایک مطلب یہ تھا کہ دولت مند سندھی طالبعلموں کو پہلے سے ہی محدود مہاجر کوٹے کے اندر مزید نقب لگانے کا موقع مل جائے گا۔یہی وہ ڈومیسائل اور کوٹے کا مسئلہ تھا جس کے نتیجے میں کراچی کے تعلیمی اداروں میں ۱۹۷۸ میں آل پاکستان مہاجر سٹوڈنٹس آرگنائزیشن(APMSO) وجود میں آئی جس نے آگے چل کر ایم کیو ایم کو جنم دیا۔

ذوالفقار علی بھٹو نہ پہلے تھے اور نہ آخری حکمران تھے جنہوں نے بلوچ قوم پرستوں کو دبانے کیلئے ریاست کی طاقت کو استعمال کیا تھا۔تاہم مرکز اور بلوچستان کے

درمیان محاذ آرائی جس کے دوران ۹،۰۰۰ ہزار افراد کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا، ناصرف پاکستان میں غیر مرکزیت کے حامل دور کے آغاز کی امیدوں کیلئے تباہ کن ثابت ہوئی بلکہ اس نے فوج کے سیاست میں ایک اہم کھلاڑی کی حیثیت سے واپسی کا راستہ بھی کھول دیا۔بھٹو نے اپنی تنگ وتاریک موت کی کوٹھڑی میں لکھی جانے والی یادداشتوں میں یہ دعویٰ کیا تھا کہ بلوچستان میں فوج نے واپسی کے منصوبے سے تجاوز کیا تھا کیونکہ جنرل ''پورے بلوچستان میں اپنے پاؤں پھیلانا چاہتے تھے''۱۲۔

بلوچستان کی ناراضگیاں سندھ کے ساتھ کافی حد تک ملتی جلتی تھیں کیونکہ دونوں کا بنیادی طور پر یہ شکایت تھی کہ انہیں ریاستی امور میں ان کے استحکام کے مطابق حصہ نہیں مل رہا اور دوسرے یہ کہ دونوں کا مسئلہ سندھ میں مہاجروں اور بلوچستان میں پختونوں کی صورت میں آبادکاروں کی بڑھتی ہوئی تعداد تھی جن کی وجہ سے انہیں مقامی آبادی کے اقلیت میں تبدیل ہونے کا خدشہ لاحق تھا۔علاوہ ازیں ۱۹۷۱ سے پہلے کے مشرقی پاکستان کی طرح بلوچستان کو بھی یہ شکایت تھی کہ وفاق مقامی مفادات کو ملکی مفادات پر قربان کرتے ہوئے اس کا معاشی استحصال کررہا ہے اور اس کے قدرتی وسائل پر ناجائز تصرف حاصل کررہا ہے۔بلوچوں کی قبائلی بغاوت کا فوری محرک بھٹو کی جانب سے صوبے میں اپنی حریف پارٹی کو اقتدار میں برداشت نہ کرنا تھا کیونکہ وہ زیادہ سے زیادہ اپنے دائرہ اقتدار کو بڑھانے کی خواہش میں مبتلا تھے۔یہی بات صوبہ سرحد میں بھی نیپ کی حکومت کو برطرف کرنے کا باعث بنی تھی۔فروری ۱۹۷۵ میں بھٹو نے اس الزام کی بنیاد پر نیپ پر پابندی عائد کردی تھی کہ وہ ریاست کی یکجہتی کے خلاف سرگرمیوں میں ملوث ہے۔

بلوچستان میں عطاءاللہ مینگل کی حکومت کو برطرف کرنے کا پس منظر ابھی تک متنازعہ چلا آرہا ہے۔اس کا ظاہری بہانہ اسلام آباد میں عراقی سفارتخانے سے مبینہ طور پر ہتھیاروں کی برآمدگی تھی جس کے بارے میں یہ دعویٰ کیا گیا کہ عراقی حکومت ان ہتھیاروں کو بلوچ علیحدگی پسندوں کو فراہم کرکے ریاست کے خلاف ان کی جنگ کو تیز کرنا چاہتی ہے۔بھٹو نے بلوچستان میں بگٹیوں، جاموٹ اور مینگل قبائل کی مخلوط

حکومت میں ان کے درمیان پائی جانے والی روایتی قبائلی دشمنیوں کو ہوا دینے اور ان سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بلوچ قبائل کی باہمی سیاست میں بھی مداخلت شروع کر دی تھی (۱۴)۔ مینگل حکومت کی برطرفی کے بعد پھوٹ پڑنے والی قبائلی بغاوت کو وفاقی حکومت نے بھرپور فوجی آپریشن کے ذریعے دبانے کی کوشش کی۔ اس فوجی کارروائی کے عروج کے دنوں میں پاکستان ائرفورس کو شاہ ایران کی فوج کی جانب سے بھی معاونت حاصل ہوگئی کیونکہ شاہ ایران بھی ایرانی بلوچستان میں بلوچوں کے مسئلے کو طاقت کے ذریعے کچلنے کا خواہشمند تھا (۱۵)۔ مجموعی طور پر ایسے خونریز فوجی آپریشن کے دوران جس کی یادیں بلوچ علیحدگی پسندوں کے حافظے میں ہمیشہ محفوظ رہیں گی ۵۵ ہزار بلوچ قبائلی کم وبیش ۷۰ ہزار پاکستانی فوج کے ساتھ برسرپیکار تھے۔

بھٹو اور سیاسی اداروں کی تشکیل

بلوچستان میں نیپ حکومت کی برطرفی پاکستانی ریاست کی مطلق العنانیت کا مظہر تھی۔ یہ مطلق العنانیت بھٹو کی جانب سے محض حریف پارٹیوں کے ساتھ نمٹنے کے سلسلے میں بھی عیاں نہ تھی اس کا بہت واضح اظہار خود پیپلز پارٹی کے اندر بھی دیکھا جاسکتا تھا۔ جب نومبر ۱۹۶۷ میں لاہور میں اس پارٹی کی بنیاد رکھی گئی تو امید پیدا ہو چلی تھی کہ پاکستان کی سیاسی پارٹیوں میں پائی جانے والی روایتی تنظیمی و ادارہ جاتی کمزوری کا خاتمہ ہوجائے گا۔ جب پیپلز پارٹی کی اساسی دستاویز کی تشکیل ہوئی جس میں قرار دیا گیا تھا: ''عوام۔۔۔ موجودہ صورتحال کو زیادہ عرصے تک برداشت نہیں کریں گے۔ وہ ایسے نظام کے خواہش مند ہیں جو انصاف پر مبنی ہو اور کروڑوں محروم لوگوں کے لازمی مفادات کے ساتھ جڑا ہوا ہو۔۔۔۔ صرف ایک نئی پارٹی ہی ان ذمہ داریوں سے عہدہ برا ہو سکتی ہے'' (۱۷)۔ جب پارٹی کی جانب سے یہ اساسی دستاویز مرتب کی گئی تو اس توقع نے جڑ پکڑ لی تھی کہ اب سیاسی پارٹیوں میں روایتی سرپرستی اور شخصیات کی بالادستی کی بجائے نظریے کو فوقیت حاصل ہوگی۔

پیپلز پارٹی کی جانب سے اپنے منشور کی روح کو ''اسلامی مساوات'' کی

اصطلاح میں سمو دیا گیا تھا جسے مقبول عام بنانے میں حنیف رامے جیسے لکھاریوں اور دانشوروں نے زور قلم صرف کر دیا تھا۔ اگر ایک جانب بھٹو کی کرشماتی شخصیت ۱۹۷۰ کے عام انتخابات میں پیپلز پارٹی کی کامیابی کی بنیاد بنی تھی تو دوسری جانب اس پارٹی کے ترقی پسند خیالات جنہیں ''روٹی کپڑا اور مکان'' کے نعرے میں ملخص کر دیا گیا تھا ووٹروں کو اپنی جانب کھینچنے کا باعث بنے تھے۔ ان دونوں عوامل کی وجہ سے پاکستان کے سیاسی افق پر نمودار ہونے والے اس نئی پارٹی نے مغربی پاکستان میں ۱۳۸ میں سے ۸۱ نشستیں جیت لی تھیں۔

کیتھ جونز کے الفاظ میں ''اس دور میں پیپلز پارٹی کی سپورٹ عوام کی جانب سے نظام میں تبدیلی کی یکراں خواہش کا اظہار تھی۔ اس وقت پیپلز پارٹی کو جتنا بھی ووٹ پڑا وہ پارٹی اور اس کے پروگرام کیلئے تھا نہ کہ چند مخصوص شخصیات کیلئے'' (۱۸)۔ تاہم اس امر کے باوجود یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ پنجاب میں پیپلز پارٹی نے آدھی سے زیادہ ٹکٹیں روایتی اشرافیہ کو دی تھیں ''جن کے پیچھے طویل سیاسی سفر کی گرد موجود تھی'' (۱۹)۔ پیپلز پارٹی کے ساتھ کمیٹڈ بہت سے ایسے سماجی گروپوں کو قانون ساز اسمبلی میں پہنچنے سے محروم رکھا گیا جو پارٹی کے پروگرام کے ساتھ جڑے ہوئے تھے۔ اس صورتحال نے پنجاب میں پارٹی کارکنوں اور پارلیمنٹ کے ان ارکان کے درمیان کشیدگی کی فضا پیدا کر دی تھی جن کی ذاتی وابستگیاں بھٹو کی ذات کے ساتھ وابستہ تھیں۔ صورتحال کا یہ رخ ہمیں اس دھڑے بندی کی سیاست کو سمجھنے میں مدد دے سکتا ہے جو ہر دور میں پیپلز پارٹی کا نمایاں وصف رہا ہے۔ پارٹی میں دھڑے بندی کے حوالے سے صورتحال کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ پیپلز پارٹی کی حکومت میں شامل وزراء اور دیگر مقتدر لوگوں کے نکتہ نظر کی ترجمانی ''مساوات'' اور ہفت روزہ ''نصرت'' کے ذریعے کی جارہی تھی جبکہ پارٹی کے کارکنوں کی آواز کو بلند کرنے میں روزنامہ ''آزاد'' ہفت روزہ ''دہقان'' اور ''الفتح'' (۲۰) اپنا کردار ادا کر رہے تھے۔ اسی طرح پیپلز پارٹی پنجاب کی تنظیم نے اپنی سرگرمیوں کا مرکز لاہور میں مزنگ روڈ کے ہیڈ کوارٹر کو بنا رکھا تھا جبکہ وزیر اعلیٰ غلام مصطفیٰ کھر اور اس کے حواری اپنی سرگرمیوں کیلئے

ٹمپل روڈ کے دفتر کو استعمال کرتے تھے۔ بھٹو نے اس تقسیم کو اس وقت مزید گہرا کردیا جب اپنی پاور میں اضافے کیلئے انہوں نے داخلی دھڑے بندیوں کو استعمال کرنا شروع کردیا۔ بجائے اس کے کہ شخصیات کے گرد گھومنے والی روایتی سیاست کاری سے دامن چھڑا کر پارٹی کے اندر جمہوری قدروں کو فروغ دیا جاتا وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ پیپلز پارٹی زیادہ سے زیادہ پرانی طرز سیاست کی جانب جھکتی چلی گئی۔ اس میں جو نیا پن تھا وہ یہ تھا کہ ۱۹۷۲ کے بعد سے آج تک جاری داخلی لڑائیاں جن میں ملوث پارٹی کے دھڑے نظریاتی اور مفاداتی طور پر ایک دوسرے سے دور ہوتے چلے گئے۔

پارٹی کا ڈھانچہ، منتخب اداروں کی طرز پر آگے بڑھنے کی بجائے شخصیات کے گرد گھومتا تھا۔ پیپلز پارٹی کی بڑھتی ہوئی تنظیمی کمزوریوں کو بھٹو کی روایتی مقتدر اشرافیہ کے ساتھ بڑھتی ہوئی قربت کے ساتھ جوڑا جاسکتا ہے، وہ اشرافیہ جسے ۱۹۷۰ کے انتخابات کے دوران مغربی پاکستان میں خود پیپلز پارٹی کے ہاتھوں خود کو اقتدار کے کھیل سے ہمیشہ کیلئے باہر کردیئے جانے کا خطرہ لاحق تھا۔ بھٹو کے صدر بننے سے پہلے دیہات میں جاگیرداروں کی جانب سے پولیس اور افسر شاہی کی مدد سے اپنے مزارعین کی بے دخلی کے حوالے سے ''اشرافیہ کی جانب سے خاموش رد انقلاب'' کا آغاز کردیا گیا تھا(۲۱)۔ اس ''رد انقلاب'' کو خاص طور پر پیپلز پارٹی میں موجود لیفٹسٹوں کو سبق سکھانے کیلئے ڈیزائن کیا گیا تھا کہ وہ اس بات کو اپنے ذہنوں سے نکال دیں کہ انتخابات میں پیپلز پارٹی کی فتح کا مطلب ''کسان مزدور راج'' کے دور کا آغاز ہے۔ اس موقع پر بھٹو نے لیفٹسٹوں کا ساتھ دینے کی بجائے مستقبل میں اپنے اقتدار کے ساتھیوں کے خلاف عوامی مزاحمت کو کنٹرول کرنے پر زور دیا تھا۔ ان کے اس عمل نے آنے والے دنوں میں پیپلز پارٹی کے ریڈیکل عناصر کی قیمت پر اقتدار کے مستقل کھلاڑیوں کے ساتھ معاملات طے کرنے کیلئے ایک مثال کا کام کیا۔ جے اے رحیم جنہوں نے پیپلز پارٹی کے اساسی منشور کو تحریر کیا تھا انہیں جولائی ۱۹۷۴ میں کابینہ اور پارٹی پوزیشن سے نکال باہر کیا گیا اور جب انہوں نے کھلے عام بھٹو کے طرز عمل کے خلاف آواز اٹھانے کی کوشش کی تو انہیں ایف ایس ایف نے بہت بری طرح تشدد کا

نشانہ بنایا تھا۔ دسمبر ۱۹۷۶ میں پیپلز پارٹی کی جامع تنظیم نو میں موثر ادارہ جاتی تشکیل کی بجائے ذاتی وفاداری پر زور دیا گیا تھا۔ تیزی سے آمریت کی طرف مائل ہوتے ہوئے بھٹو نے اس دوران پارٹی اور اس کے سیکریٹریٹ کے اعلیٰ عہدوں، حتیٰ کہ ضلعی اور تحصیل کی سطح کے عہدے داروں کو بھی خود نامزد کیا۔ پیپلز پارٹی کے بانی ارکان کو ایک ایک کرکے کھڈے لائن لگایا جاچکا تھا۔ پارٹی میں موثر ہونے کے سلسلے میں چاپلوسی نے تخلیقی سوچ کو شکست دے دی۔

المیہ یہ ہوا کہ پیپلز پارٹی تیزی سے کوئی دوسری پارٹی بنتی چلی گئی۔ اس نے ووٹوں کے حصول کیلئے موقع پرست جاگیرداروں کو اپنی صفوں میں نمایاں جگہ دے دی اور خود کو ان کی دھڑے بندی کی روایتی سیاست کا شکار بنادیا۔ مثال کے طور پر پنجاب میں پیپلز پارٹی کے وزیر اعلیٰ غلام مصطفےٰ کھر نے اپنے مخالفین کو پولیس کیسوں میں پھنسانے کی فرسودہ سیاست کو حرز جاں بنائے رکھا۔ کھر نے اسی روایتی طرز سیاست کو اپناتے ہوئے اپنے سیاسی حریف شیخ رشید کو کھڈے لائن لگانے کی کوشش کی تھی اور بعد ازاں ان کے حامیوں پر حکومتی شکنجہ کسا تھا۔ اس سے کہیں زیادہ تشویشناک کھر کے مخالفین کے اغواء اور سیاسی قتل کی خبریں تھیں جو ان دنوں عام گردش کررہی تھیں۔ اس کی حکومت کو عوامی حکومت کی بجائے ڈنڈا راج کہا جاتا تھا۔ کھر کے گنڈاسہ بردار افتخار احمد تاری کے بارے میں عام خیال تھا کہ اس کے مجرموں کے ساتھ تعلقات ہیں۔ اسے کبھی لوگوں نے اچھے الفاظ سے یاد نہیں کیا۔ کھر کو آخر کار مارچ ۱۹۷۴ میں وزارت اعلیٰ سے برطرف کردیا گیا لیکن اس سے نا پیپلز پارٹی کی مقبولیت پر کوئی فرق پڑا نہ پارٹی کی صفوں میں دیہی اشرافیہ کے بڑھتے ہوئے غلبے میں کوئی کمی آئی۔ دیہی اشرافیہ کا پارٹی میں کس حد تک غلبہ ہوچکا تھا اس کی ایک مثال ۱۹۷۵ کے وسط میں پنجاب کی وزارت اعلیٰ پر نواب صادق حسین قریشی کی تعیناتی کی صورت میں دکھائی دیتی ہے۔

ذاتی دشمنیاں صرف پنجاب کی حد تک محدود نہیں تھیں بلکہ صوبہ سرحد اور سندھ میں بھی ان کی وجہ سے تشدد کی فضا قائم ہوچکی تھی۔ بھٹو نے اگست ۱۹۷۳ میں اپنے میمو میں لکھا تھا، ''پستول ہماری دائیں جانب ہیں، پستول ہماری بائیں جانب ہیں، پستول

ہمارے اردگرد ہر جانب موجود ہیں۔لگتا ہے کہ یہی پارٹی کا موٹو ہے۔چھوٹی سے چھوٹی بات پر بھی پستول نکال لیے جاتے ہیں اور گولیاں چلنا شروع ہوجاتی ہیں'' (۲۲)۔بھٹو اس صورتحال میں محض تماشائی کا کردار ادانہیں کررہے تھے بلکہ وہ خود اپنا راستہ صاف کرنے کیلئے دھمکی آمیز انداز استعمال کرنے کیلئے تیار رہتے تھے۔یہی صورتحال آگے چل کر انہیں نواب محمد احمد خان کے قتل کے الزام میں گھیرنے والی تھی جس نے جنرل ضیاء کوایک سابق وزیراعظم کو پھانسی پر لٹکانے کا موقع فراہم کردیا تھا(۲۳)۔

بھٹو نے نیپ پر پابندی عائد کرتے ہوئے ، پاکستان پینل کوڈ کی دفعہ ۱۴۴ ، غداری کی دفعات، ریاست کے خلاف سرگرمیوں کی روک تھام کے قانون اور پریس اینڈ پبلیکیشنز ایکٹ کے بے دریغ استعمال کے ذریعے اس بڑھتے ہوئے انتشار کوجواس کی طرز سیاست نے پیدا کیا تھادبانے کی کوشش کی۔ایک نئے دور کا آغاز کرنے کی بجائے ان حوالوں سے بھٹو کی حکومت اپنے فوجی پیشرووں ایوب اور یحییٰ کی حکومتوں کا چربہ معلوم ہوتی ہے۔اس حکومت نے ان دانشوروں اور طالبعلموں کے احساس لاتعلقی کو مکمل کردیا جنہوں نے پارٹی کی تشکیل کے ساتھ امیدوں کے دیئے روشن کیے تھے۔اس وقت یہ خوف پیدا ہوچکا تھا کہ بھٹو افسر شاہی کوسیاست زدہ کرنے اور فیڈرل سیکورٹی فورس (ایف ایس ایف) اور پیپلز گارڈ کی تشکیل کے ذریعے ملک میں ون پارٹی سسٹم قائم کرنا چاہتے ہیں(۲۴)۔

بھٹو کی حکومت کی سب سے بڑی کمزوری سیاسی مخالفین کو جائز مقام دینے اور خود اپنی پارٹی کی ایک ادارے کے خطوط پر تشکیل(Institutionalization) میں ناکامی قرار دی جاتی رہی ہے۔ولیم میلم کے الفاظ میں:

> ''بہت دور تک مرتب ہونے والے اثرات کی حامل بھٹو کی کمزوری اس کا اپنی پارٹی کوایک کرشماتی لیڈر کے گردجمع متضاد مفادات کے حامل افراد کے اجتماع کی بجائے ایکInstutionalized پارٹی بنانے یا دوسرے الفاظ میں ایک حقیقی سیاسی پارٹی بنانے سے مجنونانہ اورنا عاقبت اندیشانہ انکار کا رویہ تھا۔پیپلز پارٹی اس کے بعد بھی ہمیشہ

> ایک غیر جمہوری پارٹی رہی جو میرٹ یا امتیازی خصوصیات کی حامل ہونے کی بجائے سرپرستانہ سیاست اور Clientelism پر انحصار کرتی ہے۔شاید آرمی کی قوم کے محافظ کی حیثیت سے اپنا خود ساختہ سیاسی رول کرنے کیلئے واپسی ہموار کرنے کے سلسلے میں ان وجوہات کا بہت زیادہ عمل دخل تھا'' (۲۵)۔

بھٹو اور اسلام

بھٹو کے لبرل ازم کا مطلب یہ تھا کہ وہ کبھی بھی اسلام کو دوقومی نظریئے کو بے اعتبار کرنے کیلئے نظریاتی گلیو کے طور پر استعمال کرنے کے بارے میں سنجیدگی سے نہیں سوچیں گے۔بھٹو ازم اس قدر ابتدائی مرحلے پر تھا کہ وہ اس کا موثر متبادل نہیں ہوسکتا تھا۔جس طرح بھٹو کی حکومت کا اہم وصف دھیرے دھیرے مطلق العنانیت کی جانب سفر کرنا تھا اسی طرح اس کی ایک اور خصوصیت پاکستان کی نئے سرے سے اسلامی تعبیر وتعریف طے کرنے کیلئے راستے کا کھلنا بھی تھا۔یہ اس کی ذاتی کاوشوں کا ماحصل نہیں تھا بلکہ یہ حتمی نتیجہ تھا ان کوششوں کا جو اس دور میں پاکستانی تفاخر کا رشتہ شدت کے ساتھ اسلامی دنیا کے ساتھ جوڑنے کیلئے کی گئی تھیں۔

پاکستان کے مشرق وسطیٰ کے ساتھ قریبی تعلقات قائم کرنا اور مغرب پر ملک کے انحصار کو ختم یا کم کرنا بھٹو حکومت کا مستقل خواب تھا۔اسی بنا پر پاکستان نے پہلے ۳۰ جنوری ۱۹۷۲ کو دولت مشترکہ کو خیر باد کہا اور پھر ۸ نومبر ۱۹۷۲ کو سیٹو سے علیحدگی اختیار کرلی۔اس حوالے سے ہم پہلے ہی تفصیل کے ساتھ ۱۹۷۴ کو لاہور میں ہونے والی اسلامی سربراہ کانفرنس کا ذکر کرچکے ہیں۔بھٹو کے پاکستان کو نیوکلیئر سٹیٹ بنانے کی خواہش کی تکمیل کیلئے اس کانفرنس کے دواہم شرکاء سعودی عرب اور لیبیا سے مالی امداد کا حصول ناگزیر تھا۔بھٹو اس بارے میں ۱۹۶۰ سے بات کرتے آئے تھے۔وہ پاکستان کو ہرصورت میں ایٹمی قوت بنانا چاہتے تھے چاہے اس کیلئے ''قوم کو گھاس یا درختوں کے پتے بھی کھانا پڑیں''۔تاہم بھٹو نے جنوری ۱۹۷۲ سے پہلے تک پاکستان کو نیوکلیئر

ریاست بنانے کا فیصلہ نہیں کیا تھا۔ بھارت نے اس کے محض دو سال کے بعد اپنا پہلا ایٹمی دھماکہ کیا تھا۔ بھٹو کی جانب سے پاکستان کو نیوکلیائی طور پر محفوظ ریاست کے طور پر دیکھنے کی وجہ یہ تھی کہ وہ بھارت کے ساتھ دفاعی ڈیٹرنٹ قائم کرنا چاہتے تھے کیونکہ پاکستان بھارت کی فوجی برتری کا مقابلہ روایتی انداز میں نہیں کرسکتا تھا۔ اس کے علاوہ وہ ۱۹۷۱ کی جنگ میں بدترین شکست کے بعد دنیا میں پاکستان کے مقام کو بحال کرنا چاہتے تھے۔ لیکن یہ ان کے اقتدار سے باہر ہونے تک نہیں ہوا کہ پاکستان آخر کار ''اسلامی بم'' حاصل کرسکے۔

اگر ایک جانب اسلامی دنیا کے ساتھ قریبی روابط پاکستان کی معاشی حالت کی بہتری اور اس کے خفیہ نیوکلیائی پروگرام کو شروع کرنے کیلئے ضروری تھے وہیں دوسری جانب تیل سے مالا مال ریاستوں کی دولت بھٹو کے متوقع سیاسی حریفوں کے خزانوں کو بھرنے کا باعث بھی بن رہی تھی۔ عرب ریاستوں میں پاکستانی افرادی قوت کی برآمد نے اسلامی دنیا کے ساتھ قریبی تعلقات کے آئیڈیا کی مزید حوصلہ افزائی کی۔

ادھر اسلامی کانفرنس کے آخری سیشن کو ختم ہوئے مشکل سے دو ماہ ہوئے تھے کہ علماء کے آٹھ جماعتی اتحاد پاکستان تحریک ختم نبوت ایکشن کمیٹی جس کی سربراہی مولانا محمد یوسف بنوری کررہے تھے نے احمدی کمیونٹی کے خلاف اپنے سوروزہ احتجاج کا اعلان کردیا۔ اس سے پہلے ہم دیکھ چکے ہیں کہ ۱۹۵۳ میں بھی ختم نبوت کے مسئلے پر احمدیوں کے خلاف ایک تحریک چلائی گئی تھی جو اپنے بنیادی ہدف احمدیوں کو دائرہ اسلام سے خارج کرانے کو حاصل کیے بغیر ختم ہوگئی تھی۔ موجودہ تحریک کے دوران پنجاب میں بڑے پیمانے پر تشدد پھوٹ پڑا۔ جب حالات قابو سے باہر ہوتے دکھائی دیئے تو ذوالفقار علی بھٹو نے پارلیمنٹ کے ایک ہنگامی اجلاس میں احمدیوں کا موقف سنے بغیر ۱۹۷۳ کے آئین میں دوسری ترمیم پاس کرائی اور انہیں دائرہ اسلام سے خارج قرار دے دیا۔ اس اقدام کے نتیجے میں بھٹو کی نہ صرف آئندہ کیلئے اسلامی نوعیت کے مطالبات کے سلسلے میں پوزیشن خاصی کمزور ہوگئی بلکہ فرزانہ شیخ کے الفاظ میں ''یہ مثال بھی قائم ہوگئی کہ ایک سیکولر انتخابی عمل کے ذریعے قائم ہونے والے سیاسی ادارے کو

شہریوں کے عقائد کے معاملات کو بھی چھیڑنے کا اختیار حاصل ہے'' (۴۶)۔ اس اقدام نے آگے چل کر ضیاء دور میں احمدی کمیونٹی کے خلاف امتیازی سلوک کے دروازے کھول دیئے۔

بھٹو نے محض اپنے اسلامی تشخص کو مضبوط کرنے اور اس الزام کے رد کیلئے کہ پیپلز پارٹی احمدیوں کی فنڈنگ سے چل رہی ہے انہیں بھیڑیوں کے آگے لا پھینکا۔ اس کے مذہبی عناصر کے سامنے ہتھیار ڈالنے کے اس عمل نے بھی اسے ان عناصر کی جانب سے اپنی حکومت پر حملوں سے باز نہیں رکھا۔ آگے چل کر اس تحریک میں شریک عناصر مثلاً حق نواز جھنگوی وغیرہ نے ایک دہائی کے بعد پاکستان میں فرقہ ورانہ دہشت گردی کی قیادت کا فریضہ سرانجام دینا تھا (۴۷)۔

بھٹو نے اپنے پیشرو ایوب خان کی طرح اپنے حکومت کو اسلامی جواز فراہم کرنے کیلئے صوفی اسلام کے دامن میں پناہ لے لی۔ انہیں نے سندھ کے مشہور صوفی بزرگ لال شہباز قلندر کے مزار کی سرپرستی کا ذمہ لے لیا۔ بھٹو کی اس حوالے سے سرتوڑ کوششیں پنجاب اور سندھ کے دیہی علاقوں کے معمولی درجے کے پیروں تک کو اپنے خلاف چلنے والی نظام مصطفیٰ کی تحریک میں شامل ہونے سے نہ روک سکیں جسے اس کے روایتی مخالف علماء نے منظم کیا تھا۔ نفاذ اسلام اور اسلامی عدل کے مبہم تصورات کے گرد گھومنے والی اس سیاسی تحریک میں معاشرے کے دیگر طبقات کے ساتھ پنجاب میں چھوٹے تاجروں پر مشتمل طبقے نے بھی علماء اور مذہبی سیاسی پارٹیوں کی اپیل پر اس تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا جو بھٹو حکومت کی اقتصادی اصلاحات سے کوئی فائدہ نہیں حاصل کرسکے تھے۔ بھٹو حکومت کی لیبر اصلاحات نے چھوٹے درجے کے مینوفیکچرر حضرات کی زندگی کو پہلے سے زیادہ مشکل بنادیا تھا۔ بھٹو کی گھی، کاٹن اور رائس کی فیکٹریوں کو قومیانے کی پالیسی نے اس صنعت سے وابستہ بہت سے چھوٹے تاجروں کو براہ راست متاثر کیا تھا۔ ان تاجروں اور دکانداروں کی اکثریت مشرقی پنجاب سے ہجرت کرکے آنے والی کمیونٹی سے تعلق رکھتی ہے۔ نچلے متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والے ان چھوٹے تاجروں اور دکانداروں کے علاوہ پیپلز پارٹی کا ووٹ بنک سمجھے جانے والے

مزدور طبقے میں بھی تیل کے بحرانی دور میں تیل کی قیمتی بڑھنے کی وجہ سے ہونے والی گرانی کے نتیجے میں سخت ناراضی پائی جاتی تھی۔

پیپلز پارٹی کو اس وقت ناراض غریب طبقے اور اس دولت مند طبقے کے درمیان قائم ہونے والے اتحاد کا سامنا تھا جن کے مفادات کو حکومت کی جانب سے صنعتوں کو قومیانے جیسی معاشی اصلاحات سے براہ راست خطرہ درپیش تھا۔بعد ازاں مارچ ۱۹۷۷ میں ہونے والے عام انتخابات میں بائیں بازو کی جماعتوں سے انتہائی دائیں بازو کی جماعتوں کے درمیان پاکستان قومی اتحاد (پی این اے) کے نام سے بھٹو حکومت کے خلاف انتخابی اتحاد تشکیل پا گیا۔بعد ازاں جیسے ایران میں انقلاب کے دوران ہوا، پاکستان میں بھی حکومت کے خلاف مساجد کو بھرپور طریقے سے استعمال کیا گیا لیکن حکومت کی جرات نہ تھی کہ وہ ان مساجد میں ہونے والی اشتعال انگیز تقاریر پر کسی طرح کی پابندی عائد کر سکے۔ایران کی طرح ہی اس تحریک کو مالی امداد بھی بازاروں کے چھوٹے تاجروں کی جانب سے فراہم کی جارہی تھی جو روایتی طور پر مولویوں کے قریبی اتحادی رہے ہیں۔اس بات کا مسلسل پراپیگنڈا کہ بھٹو نے ۷۷ کے انتخابات کے دوران بڑے پیمانے پر دھاندلی کی تھی نے پی این اے کی جاری تحریک کی کامیابی کیلئے قوت محرکہ کا کام کیا۔بھٹو اس تحریک کو اپنے اسلام پسند حریفوں کو مزید رعائتیں دینے کے ذریعے غیر موثر کرنا چاہتے تھے۔اس مقصد کیلئے انہوں نے جوے پر پابندی، شراب پر پابندی عائد کرتے ہوئے شراب کی دکانوں کو بند کرنے کا حکم دینے، نائٹ کلبوں کو بند کرنے اور اتوار کی بجائے جمعہ کے روز چھٹی کرنے جیسے اقدامات کیے۔انہوں نے اسلامی ضابطہ اخلاق کے نفاذ کا بھی وعدہ کیا۔تاہم بھٹو کی جانب سے مذہبیت کا یہ نیا لبادہ بھی حکومت اور پی این اے کے درمیان ڈیڈ لاک کو ختم نہ کر سکا۔اس کے نتیجے میں آخر ۵ جولائی ۱۹۷۷ کا پر امن فوجی انقلاب ظہور پذیر ہوا جس کے نتیجے میں بھٹو کو اقتدار سے ہاتھ دھونا پڑے۔اس فوجی انقلاب نے بھٹو کی اسلامائزیشن سے کہیں زیادہ منظم انداز میں اس عمل کو آگے بڑھانے کا سلسلہ شروع کیا۔

بھٹو اور فوج

بھٹو کی جانب سے ابتدا میں فوجی افسروں کی فوج سے بے دخلی کے ذریعے فوج کی تطہیر کے عمل نے فوج کو پچھلے قدموں پر لا کھڑا کیا تھا۔اس کی جانب سے فیڈرل سیکورٹی فورس (ایف ایس ایف) اور پیپلز گارڈ جیسے متوازی مسلح اداروں کے قیام نے بھی فوج میں شدید ناراضی کے بیج بو دیئے تھے۔ایک موقع پر تو بھٹو نے ریگولر فوجی دستوں کی بجائے پیپلز گارڈ سے گارڈ آف آنر لینے کا اقدام بھی کیا تھا (۲۸)۔ایف ایس ایف کے قیام کا بنیادی مقصد ایک ایسی فورس کا قیام تھا جو شہروں میں امن و امان کی صورتحال کو بہتر بنانے کے سلسلے میں پولیس کی مدد کر سکے لیکن بھٹو کے مخالفین نے اسے نجی فوج بنانے کے اقدام سے منسوب کیا۔اس گمان کے واضح طور پر جواز بھی موجود تھے کیونکہ یہی ایف ایس ایف تھی جسے نیپ اور جماعت اسلامی جیسے بھٹو کے کٹر مخالفین کے خلاف بھی استعمال کیا گیا تھا۔ایف ایس ایف کے حوالے سے فوج کی ناراضی کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس نے اس متوازی فورس کو تربیت فراہم کرنے اور اسے ٹینک اور دیگر بھاری اسلحہ فراہم کرنے سے انکار کر دیا تھا۔یہی وجہ ہے کہ ضیاء حکومت کا پہلا اقدام یہ تھا کہ اس نے ایف ایس ایف کی تنظیم کو توڑ دیا (۲۹)۔

فوج کی ناراضی کی ایک اور وجہ بھارت کی جیلوں میں قید جنگی قیدیوں کو چھڑوانے کیلئے حکومت کی سست روی تھی۔یہی وہ فیکٹر تھا جو مارچ اپریل ۱۹۷۳ میں فوج کے اور ائیر فورس کے کچھ افسروں کی جانب سے بھٹو حکومت کا تختہ الٹنے کی سازش تیار کرنے کی بنیاد بنا تھا۔گو کہ جب ان افسروں پر مقدمہ چلا تو ۳۵ میں سے ۱۱ کو رہا کر دیا گیا جبکہ صرف دو افسروں کو عمر قید کی سزا سنائی گئی (۳۰)۔بھارت کی قید میں موجود قیدیوں کی رہائی میں تاخیر کی اصل وجہ جنگ کے بعد بھٹو کی جانب سے بھارت اور بنگلہ دیش کے ساتھ سفارتی امور میں پیش آنے والی رکاوٹیں تھیں۔ان سفارتی کوششوں میں اس امر کا اہتمام کیا گیا تھا کہ سفارتی امور طے کرتے ہوئے کہیں بھی تاشقند ٹائپ ''سودے بازی'' کا تاثر پیدا نہ ہو سکے۔بھٹو کی جانب سے جولائی ۱۹۷۲ میں شملہ

مذاکرات کے دوران اندرا گاندھی کا موثر انداز میں آمنا سامنا کرنے کے عمل نے انہیں یہ دعویٰ کرنے کے قابل کر دیا کہ انہوں نے ''امن جیت لیا ہے''۔ یقینی طور پر شملہ مذاکرات کے دوران بھارتی وفد میں سے کوئی بھی جنگ نہ کرنے کے جامع معاہدے یا مسئلہ کشمیر کے مستقل حل کی توقع نہیں کر رہا تھا۔ داخلی حوالے سے بھٹو کی ایک اور کامیابی جماعت اسلامی کی جانب سے ''بنگلہ دیش نامنظور'' کی تحریک کا موثر انداز میں مقابلہ کرنا تھا(۳۱)۔ بھٹو کی اس کامیابی نے یقینی طور پر جبل پور اور کلکتہ کے فوجی کیمپوں میں بند پاکستانی فوجی افسروں اور جوانوں کیلئے تھوڑی بہت راحت کا سامان فراہم کیا جو ان کیمپوں میں طویل مدت سے سبزی اور دال بھات کھانے پر مجبور تھے(۳۲)۔ اس کے باوجود انہیں اگست ۱۹۷۳ سے پہلے رہائی نصیب نہ ہو سکی تھی۔

بھٹو کی فوج کے حوالے سے محتاط روی کا اندازہ ان کے ان اقدامات سے لگایا جا سکتا ہے جو انہوں نے مستقبل میں فوج کی سیاسی امور میں مداخلت کو روکنے کیلئے کیے تھے۔ اس سلسلے میں انہوں نے فوج کے سربراہ کی مدت ملازمت کم کر کے تین سال کر دی۔ انہوں نے جوائنٹ چیفس آف آرمی سٹاف کمیٹی کی مستقل آسامی پیدا کر کے آرمی چیف کے اختیارات کو کم کرنے کی بھی کوشش کی۔ ۱۹۷۳ کے آئین میں فوج کے حاضر سروس افسران کیلئے ایک حلف نامہ بھی شامل کیا گیا جس کے تحت انہیں اپنی مدت ملازمت کے دوران سیاسی سرگرمیوں سے دور رہنے کا پابند کر دیا گیا۔ آئین کی شق ۲۴۵ کے تحت ''طاقت کے استعمال یا طاقت کے اظہار یا کسی بھی دوسرے غیر آئینی طریقے سے'' آئین کو توڑنے یا اس سے ماوراء اقدامات کرنے کو ملک سے غداری کے مترادف قرار دے دیا گیا۔ آئین کی منظوری کے ایک مہینے کے اندر پارلیمنٹ نے ایک قانون منظور کیا جس کے تحت خلاف آئین اقدامات کرنے والوں کیلئے سزائے موت یا عمر قید کی سزا تجویز کی گئی تھی۔ جیسا کہ حسن عسکری کا کہنا ہے کہ ''پچھلے کسی بھی آئین میں اس قسم کے حفاظتی اقدامات شامل نہیں کیے گئے تھے''(۳۳)۔ بعد ازاں جب بھٹو نے مارچ ۱۹۷۶ میں بظاہر ایک غیر سیاسی اور بے ضرر جنرل ضیاء الحق کو چیف آف آرمی سٹاف کے عہدے پر نامزد کیا تو اپنی نادانست میں انہوں نے اپنی پوزیشن کو ہمیشہ کیلئے

مستقبل کے خطرات سے محفوظ کر لیا۔

ہم اس جانب پہلے ہی توجہ مرکوز کر چکے ہیں کہ کیسے بھٹو نے اپنی پارٹی کو جمہوری خطوط پر منظم نہ کر کے اور بلوچوں کے جائز مطالبات کو فوجی بوٹوں کے تلے کچلتے ہوئے نادانستہ طور پر ایسے حالات پیدا کر دیئے تھے جو فوجی مداخلت پر منتج ہوئے تھے۔ ان کی بھارت کا مقابلہ کرنے کیلئے ایک مضبوط فورس کے قیام کی خواہش بھی فوج پر سویلین بالادستی قائم کرنے کی کوششوں کو ناکام کرنے کا باعث بنی تھی۔

جیسا کہ ہم قبل ازیں دیکھ چکے ہیں کہ بھارت کی جانب سے یہ توقع کہ ایک بازو سے محروم ہونے کے بعد پاکستان علاقے میں اس کی اجارہ داری کو تسلیم کر لے گا شملہ مذاکرات میں اپنی موت آپ مر گئی تھی۔ علاوہ ازیں مئی ۱۹۷۴ میں راجستھان کے ریگستان میں بھارت کے پہلے ایٹمی تجربے نے بھارت کے حوالے بھٹو کے ارادوں کو مزید پختہ بنیادوں پر استوار کر دیا تھا۔ پیپلز پارٹی کے قیام کے دوران پارٹی کی انسانی ترقی کے اہداف کو حاصل کرنے کے عزم کے باوجود فوج کو ملک کے قلیل وسائل میں سے بہت بڑا حصہ دینے کی پرانی پالیسی کو جاری رکھا گیا جس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ بھٹو دور میں دفاعی اخراجات میں ۲۰۰ فیصد تک اضافہ کیا گیا۔ اس سارے دور کے دوران فوج پر فی کس ۸ ڈالر تک خرچ کیے جا رہے تھے(۳۴)۔ ملک کی معیشت میں بگاڑ کا اندازہ اس حقیقت سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ دفاع پر اٹھنے والے اخراجات جی ڈی پی کے تناسب سے بھارت کی نسبت دو گنا ہو گئے تھے۔ ۱۹۷۱ سے ۱۹۸۰ کی مدت کے دوران پاکستان کے ہتھیاروں کا بل ۱۔۵۴ ارب ڈالر تک پہنچ چکا تھا۔ پاکستان کو ہتھیاروں کی فراہمی کے سلسلے میں بھٹو دور کی ابتدا میں چین نے سبقت حاصل کرتے ہوئے ٹینک، بحری جہاز اور لڑاکا طیارے فراہم کیے تھے۔ تاہم ۱۹۷۵ میں پاکستان پر عائد فوجی پابندیاں اٹھنے کے بعد امریکہ بدستور فوجی سامان کی فراہمی کے سلسلے میں سب سے بڑا فراہم کنندہ رہا۔ چین نے ٹیکسلا میں ٹینکوں کی مرمت اور کامرہ میں جنگی طیاروں کی مرمت کیلئے ایک بہت بڑی فیکٹری بھی قائم کی تھی۔

پاکستان میں ہتھیاروں پر خرچ ہونے والا ہر ڈالر تعلیم، صحت اور رہائش کی

سہولتوں کی فراہمی میں کمی کا باعث بنتا ہے۔اس کے ساتھ ہی یہ قومی بجٹ میں خسارے
کا باعث بھی بنتا ہے۔اپریل ۱۹۷۴ء اور بعد میں حکومت کی جانب سے خوراک میں
سبسڈی کم کرنے کے ذریعے بجٹ خسارے پر قابو پانے کی کوششوں نے ان لوگوں میں
پیپلز پارٹی کی حمایت میں دوبارہ اضافہ کردیا جنہوں نے ۱۹۷۰ کے انتخابات میں پارٹی
کے پروگرام سے توقعات باندھی تھیں۔جیسا کہ ہم اس باب کے آخری حصے میں دیکھیں
گے کہ بھٹو اپنے دولت مند مخالفین کے دباؤ میں آنے کے باعث پارٹی کے غریب
ہمدردوں کی حمایت سے تباہ کن طور پر محروم ہوتے جارہے تھے۔

بھٹو حکومت نے وفاقی اخراجات کے معاملے میں گذشتہ حکومتوں کے طرزعمل
کی متابعت کرنے کے باوجود کشمیر کے مسئلے پر بھارت کے خلاف مذہبی جذبات کے
ساتھ کھیلنے سے گریز کیا۔اس فیکٹر کو سمجھنے کی بہت سے تجزیہ نگاروں نے کوشش کی
ہے۔ان تجزیوں میں داخلی سیاست میں اسلام پسندوں کے ساتھ جاری مسائل سے لے
کر وسیع البنیاد علاقائی معاملات تک کا احاطہ کیا گیا ہے (۳۵)۔بھٹو نے بلوچستان میں
قوم پرست قوتوں کا مقابلہ کرنے کیلئے وہاں موجود مذہبی عناصر کو میدان میں اتارنے
سے گریز کیا تھا۔صرف صوبہ سرحد میں پختونستان کا نیا ابھرتا ہوا خطرہ تھا جس کے سد
باب کیلئے بھٹو کو پاکستان میں پناہ گزین گلبدین حکمت یار جیسے لوگوں کے ساتھ تعلقات
استوار کرنا پڑے تھے (۳۶)۔

اس دور میں اس پیٹرن کے مطابق جو بعد میں ۱۹۹۰ کی دہائی میں دہرایا گیا،
سویلین سیاستدانوں نے اپنے سیاسی مخالفین کی سرکوبی کیلئے فوج کو مداخلت پر اکسانے
کی کوششیں کی تھیں۔۱۹۷۲ء میں سندھی زبان کے مسئلے پر جاری محاذ آرائی کے دوران اور
پھر اس کے بعد ۱۹۷۳ء میں مذہبی جماعتوں نے بھٹو حکومت کے خاتمے کیلئے فوج سے
تعاون کی درخواست کی تھی۔تاہم فوج پر مداخلت کے سلسلے میں پی این اے کی تحریک
کے دوران بہت زیادہ اضافہ ہوگیا تھا۔تنظیمی کمزوریوں کی وجہ سے منتشر الحال پیپلز پارٹی
ان کوششوں کو ناکام بنانے کی صلاحیت سے محروم تھی۔پی این اے کی تحریک کے دوران
مظاہرین قابو سے باہر ہونے لگے تو پولیس اور ایف ایس ایف نے انہیں کنٹرول

کرنے کی کوشش کی۔تحریک کے دوران ایک پرتشدد مرحلے پر بھٹو کو لاہور، حیدرآباد اور
کراچی ڈویژن کے شورش زدہ علاقوں میں مارشل لاء کا نفاذ کرنا پڑا۔

اس محدود مارشل لاء نے بھٹو حکومت کی رخصتی کا راستہ ہموار کردیا۔فوج میں
افسران کی بھرتی کے مڈل کلاس پیٹرن نے (فوج میں درمیانے طبقے سے تعلق رکھنے
والے افسران کی شمولیت کے عمل کو ضیاء دور میں بڑھادیا گیا) فوج کو نظام مصطفےٰ کے
قیام کے پی این اے کے نعرے کا بہت زیادہ ہمدرد بنادیا تھا۔مارشل لاء کے بعد جنرل
ضیاء الحق کے چیف آف سٹاف جنرل عارف کے بیان کے مطابق: "بھٹو اور ضیاء کے
ساتھ مسلسل ملاقاتوں کے نتیجے میں کور کمانڈروں کی سیاست زدگی نے بھی مارشل لاء کے
قیام میں بنیادی کردار ادا کیا تھا (۳۷)۔لاہور میں انتخابی دھاندلی کے خلاف ہونے
والے ایک پرتشدد احتجاجی مظاہرے پر فائرنگ کا حکم دینے سے تین بریگیڈئروں کے
انکار کے بعد فوج میں یہ خوف بھی پیدا ہوچکا تھا کہ اس تحریک کے نتیجے میں فوج کے
اندر تقسیم نہ پیدا ہوجائے" (۳۸)۔جنرل عارف نے اپنے اس بیان کو سمیٹتے ہوئے
جنرل ضیاء کی جانب سے فوجی مداخلت کے جواز کے طور پر فوج کا آزمودہ نسخہ استعمال
کرتے ہوئے قرار دیا کہ اس کی وجہ "جھگڑالو سیاستدانوں کی جانب سے مفاہمت،
ایک دوسرے کیلئے گنجائش پیدا کرنے اور برداشت کرنے کے رویے کا فقدان تھا"
(۳۹)۔

جنرل ضیاء کی فوجی بغاوت کا مختلف حلقوں کی جانب سے خاموشی سے
استقبال کیا گیا کیونکہ اس وقت اس کے نتائج کا پورے طور پر اندازہ نہیں لگایا جاسکا
تھا۔جنرل ضیاء نے قوم کے نام اپنے پہلے خطاب میں ۹۰ روز کے اندر الیکشن کرانے کا
اعلان کیا۔اس کے تین ہفتے بعد ذوالفقار علی بھٹو کو حفاظتی تحویل سے رہا کردیا گیا۔مزید
براں یہ کہ اس مارشل لاء کے بغیر خون بہائے نفاذ کے عمل کو بھٹو کی مقبولیت گرنے کے
مترادف ٹھہرایا گیا۔

بھٹو کی مقبولیت: امیدیں اور دم توڑتی ہوئیں توقعات

۱۹۶۷ کے بعد سے بھٹو کی اچانک حاصل ہونے والی اور غیر معمولی مقبولیت نے پاکستان کے ماضی سے ڈرامائی قطع تعلقی کی امیدوں کو بام عروج پر پہنچادیا تھا۔وہ عوام کے نزدیک معاشی خوشحالی اور سیاسی قوت کے حصول کی علامت بن گئے تھے۔اگر یہ سب کچھ حاصل کرلیا جاتا تو مستقبل میں ہونے والی فوجی مداخلت سے بھٹو کو محفوظ رکھنے کے سلسلے میں آئینی موشگافیوں اور ایف ایس ایف کے بھونڈے استعمال سے کہیں زیادہ موثر اور دیرپا ثابت ہوتا۔بھٹو کی زرعی اصلاحات، صنعتوں کو قومی تحویل میں لینے کے اقدامات اور لیبر قوانین پاکستان کیلئے کسی بہتری کی نوید نہ بن سکے تھے۔ان اقدامات نے محض بھٹو کے سیاسی مخالفین میں اضافہ کیا جو ان کے جنگجویانہ طرز سیاست کے باعث پیدا ہوچکے تھے۔

بھٹو کی مقبولیت میں کمی کے حوالے سے متعدد وضاحتیں سامنے آچکی ہین۔کچھ تجزیوں میں ان کی ذاتی ناکامیوں اور بے انتہا مراعات یافتہ سندھی جاگیردار کی جانب سے سوشلزم کی ''تبلیغ'' کے منطقی تضاد پر فوکس کیا گیا ہے(۴۰)۔جبکہ کچھ اور تجزیوں میں کہا گیا ہے کہ اگر بھٹو کے اقتدار کی موزوں طور پر تنظیم کاری کی جاتی تو اس دور میں ہونے والی اصلاحات کو زیادہ موثر انداز میں نافذ کیا جاسکتا تھا۔ان میں ہمیں اس فیکٹر کو بھی ضرور شامل کرنا چاہیے کہ جیسے بھارت اور افغانستان کے حوالے سے پاکستان کے جیوپولیٹیکل عدم تحفظ کو کم کرنے کیلئے بھٹو کی جانب سے فوج کو اپنے قابو میں رکھنے کی کوششیں الٹ نتائج کی حامل تھیں اسی طرح پاکستان کے معاشی تناظر میں شدید عدم مساوات کو کم کرنے کی کوششوں کو ۱۹۷۳ میں ہونے والی عرب اسرائیل جنگ کے نتیجے میں عالمی سطح پر ہونے والی گرانی اور افراط زر سے سخت دھچکا پہنچا تھا۔عام آدمی کیلئے اشیائے ضرورت کی قیمتوں میں سالانہ ۲۰ فیصد اضافے کی حقیقت کے سامنے مساوات اور انسانی برابری کے نعروں کا کھوکھلا پن کھل کر سامنے آچکا تھا۔

بھٹو کی زرعی اصلاحات ایوب کی جانب سے کی جانے والی زرعی اصلاحات

کے مقابلے میں بہت زیادہ انقلابی نوعیت کی تھیں لیکن یہ ۱۹۷۰ کے انتخابات میں ''جاگیرداری کے بچے کھچے آثار مٹادینے'' کی امنگوں کے ساتھ لگا نہیں کھاتی تھیں۔ان زرعی اصلاحات میں بھی نہری زمینوں کی زیادہ سے زیادہ حد ۱۱۵۰ ایکڑ اور بارانی زمینوں کی ۱۳۰۰ ایکڑ فی کس تھی۔ان اصلاحات میں خاندان کے اندر زمین کے انتقال کی اجازت تھی اور کاشت کاری میں ٹریکٹر اور ٹیوب ویل وغیرہ کے استعمال سے بہتری لانے کا ثبوت فراہم کرنے کی صورت میں انفرادی حد ملکیت میں اضافہ کیا جاسکتا تھا۔اس کا مطلب تھا کہ ۱۹۵۹ میں کی جانے والی ایوب کی زرعی اصلاحات کی طرح ان کے نتیجے میں بھی بے زمین کسانوں میں تقسیم کیلئے بہت کم زمین بچتی تھی۔بھٹو حکومت کی جانب سے زرتلافی نہ دیئے جانے کا مطلب یہ تھا کہ بڑے زمیندار زرخیز زمینوں کو اپنے پاس رکھ کر ناکارہ زمین کو اپنے مزارعین یا غریب کاشتکاروں میں تقسیم کرنے میں آزاد تھے۔۱۹۵۹ کی طرح اس بار بھی معاملات میں مزید ابتری لاتے ہوئے جعلی انتقال کے بے شمار واقعات رونما ہونا شروع ہوگئے تھے۔ستم بالائے ستم یہ کہ بجائے اس کے کہ دیہی قوتوں کے درمیان طاقت کا توازن قائم ہوتا ان اصلاحات نے پنجاب اور سندھ کے زمینداروں کی جانب سے اپنی زمینوں کو بچانے کیلئے پیپلز پارٹی میں شمولیت کی حوصلہ افزائی کی۔دوسری جانب پیپلز پارٹی کی کمزور تنظیم کاری نے ان زمینداروں کو پارٹی پر گرفت قائم کرنے کے آزادانہ مواقع فراہم کردیئے۔اپنے تمام تر دعوؤں کے باوجود بھٹو نے ۱۹۷۷ کے عام انتخابات میں انہی وڈیروں اور جاگیرداروں کو بڑے پیانے پر پارٹی ٹکٹ دے دیئے۔اس عمل نے پیپلز پارٹی کی صفوں میں مزید بگاڑ اور انتشار کی صورتحال پیدا کردی۔

قابل ذکر بات یہ ہے کہ اپنی زرعی اصلاحات کی ناکامی کا اعتراف کرتے ہوئے بھٹو نے ۱۹۷۷ کے عام انتخابات کے موقع پر مزید سخت اقدامات کرنے کا اعلان کردیا۔اس اعلان کے مطابق زمین کی ملکیت کی حد کم کر کے ۱۰۰ ایکڑ نہری زمین اور ۲۰۰ ایکڑ بارانی زمین کیلئے مقرر کردی گئی۔ان اقدامات کے نتیجے میں بھی کسی زرعی انقلاب کی توقع نہیں تھی لیکن ان سارے دعوؤں کا انجام یہ ہوا کہ ۵ جولائی کو نافذ ہونے

والے مارشل لاء کے بعد اس اعلان پر عمل درآمد معطل کردیا گیا۔

ذوالفقار علی بھٹو کی لیبر ریفارمز جو ۱۹۷۲ میں ہی منظر عام پر آئی تھیں کہیں زیادہ دیرپا نتائج کی حامل تھیں اور اس کا سہرا ان کے لیبر منسٹر محمد حنیف کے سر جاتا ہے۔ان اصلاحات کے تحت ورکس کونسلوں اور صنعتی تنازعات کو طے کرانے کیلئے لیبر کورٹس کے قیام کے ذریعے یونین کی پاور میں اضافہ کردیا گیا تھا۔فیکٹریوں میں مزدوروں کو سستی مصنوعات کی فراہمی کیلئے ہر فیکٹری میں ایک دکان کو لازمی قرار دے دیا گیا تھا۔فیکٹری مالکان سے اصلاحات کے تحت مطالبہ کیا گیا تھا کہ وہ ہر مزدور کیلئے سستی رہائش اور کم از کم ایک بچے کیلئے میٹرک تک تعلیم کے اخراجات برداشت کرے۔ریاست نے ان اصلاحت کے تحت مزدوروں کیلئے بڑھاپے میں پنشن اور زخمی ہونے والوں کیلئے انشورنس کی ادائیگی کو لازمی قرار دے دیا گیا (۴۱)۔

پیپلز پارٹی کے بہت سے کارکنوں کے نزدیک یہ اصلاحات ناکافی تھیں ۔ان کا مطالبہ تھا کہ مزدوروں کیلئے کم از کم تنخواہ کا اعلان کیا جائے اور ان اصلاحات کو دیہاڑی دار مزدوروں تک توسیع دی جائے۔نئے نئے طاقت پکڑنے والے مزدوروں نے اپنے مطالبات کے حق میں ہڑتالوں اور فیکٹریوں کے گھیراؤ کا سلسلہ شروع کردیا جس کے نتیجے میں پہلے سے بدانتظامی کی شکار تازہ تازہ قومیائی گئی صنعتوں میں پیداوار کا عمل بری طرح متاثر ہوا۔انہی دنوں کراچی میں ہڑتالی مزدوروں اور کچھ مالکان کے درمیان خونریز تصادم ہوگیا جس پر قابو پانے کیلئے وہاں فوج کو بلالیا گیا۔اس کے نتیجے میں بھٹو اور پیپلز پارٹی کے بہت سے ریڈیکل کارکنوں کے درمیان تعلقات میں دراڑیں پڑگئیں۔پیپلز پارٹی سے تعلق رکھنے والے نچلے درمیانے طبقے کے بہت سے چھوٹے فیکٹری مالکان کو مزدوروں کی پنشن اور میڈیکل سہولیات کی فراہمی کے سلسلے میں خاصا نقصان اٹھانا پڑا۔وہ انتظامیہ میں مزدوروں کی شمولیت کے عمل سے خاصے متاثر بھی ہوئے۔بہت سے چھوٹے فیکٹری مالکان نے مثال کے طور پر سیالکوٹ میں سپورٹس کی صنعت سے وابستہ چھوٹے مالکان نے ان اصلاحات کو ناکام بنانے کیلئے مال باہر سے تیار کرانا شروع کردیا یوں پیداوار کو فیکٹری میں حاصل کرنے کی بجائے پیداوار کی

مرکزیت ختم کردی (۴۲)۔ان اصلاحات کے نتیجے میں صرف چھوٹے مالکان ہی متاثر نہیں ہوئے بلکہ درحقیقت مجموعی طور پر کاروباری حضرات کے اعتماد کو دھچکا لگا۔اس عمل کے نتیجے میں مزدوروں کی بے روزگاری میں بے انتہا اضافہ ہوگیا جو پہلے ہی مہنگائی کی چکی میں پس رہے تھے۔دلچسپ بات یہ ہے کہ مزدوروں کے کچھ حصوں کی زندگیوں میں بہتری ضرور آئی لیکن اس کی وجہ اصلاحات کا پروگرام نہیں بنا جس کا بہت ڈھول پیٹا گیا بلکہ حکومت کی جانب سے خلیجی ملکوں میں امیگریشن کی حوصلہ افزائی بنی جس نے ورکنگ کلاس کے ایک بڑے حصے کی زندگیوں میں انقلاب برپا کردیا۔

لیبر اصلاحات صنعتوں کو قومیانے کے دیرپا اثرات کے حامل پروگرام کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے آگے بڑھیں۔جن صنعتوں کو قومی تحویل میں لیا گیا تھا ان میں بنک اور انشورنس کمپنیوں کے علاوہ انجینئرنگ، کیمیکلز اور سٹیل کی بھاری صنعتیں بھی شامل تھیں تاہم اس کے ساتھ ہی گھی، چاول چھڑنے کے یونٹ، فلورملیں اور کاٹن کی چھوٹی صنعتیں بھی قومیالی گئیں۔ہم پچھلے صفحات میں پہلے ہی بیان کرچکے ہیں کہ ان ملوں کے مالکان چھوٹے تاجروں اور دکانداروں کے ہمراہ بھٹو کے خلاف تحریک کے دوران ہراول دستے کا کردار ادا کررہے تھے۔صنعتوں کو قومیانے کا مقصد پاکستان سے ہمیشہ کیلئے غربت اور امتیاز کا خاتمہ کرنا تھا (۴۳)۔ تاہم اس بلند و بانگ دعوے کی عملی صورت ندارد تھی، صرف اس لیے نہیں کہ غربت اور معاشی ناہمواری کے دیگر بہت سے عوامل بدستور موجود تھے بلکہ اس لیے بھی کہ جن صنعتوں کو قومیایا گیا انہیں شدید نوعیت کی بدانتظامی کے حوالے کردیا گیا۔مزید براں مزید صنعتوں کو قومیانے کے خطرے نے ملک سے سرمائے اور ہنرمند افرادی قوت کے فرار کی راہ کھول دی۔ان عوامل کے نتیجے میں نجی شعبے میں ہونے والی سرمایہ کاری میں شدید انحطاط کی جگہ ایوب دور کی معاشی ترقی کی جگہ معاشی انجماد نے لے لی۔

نیشنلائزیشن اپنے ساتھ بہت بڑے پیمانے پر کرپشن اور اقرباپروری بھی لے کر آئی۔یہ عمل انفرادی اور سیاسی دونوں سطحوں پر ہوا۔پیپلز پارٹی میں شامل بڑے زمینداروں کو نئے قومیائے جانے والے بنکوں نے سستے قرضوں سے نوازنا شروع

کردیا۔یوں ایک مثال قائم ہوگئی کہ آنے والی حکومتیں بھی اپنی حمایت میں اضافے کیلئے سرکاری تحویل میں موجود بنکوں سے سستے قرضوں کو استعمال کرسکتی ہیں۔اسی وجہ سے ۱۹۹۰ کی دہائی کے وسط تک بنکوں کے قرضے واپس نہ کرنے کی سطح ۱۰۸ارب روپے تک پہنچ چکی تھی۔"برے قرضوں" (Bad Loans) نے سرکاری تحویل میں لیے جانے والے بنکوں کی لیکویڈٹی کی شرحوں کو خطرے میں ڈالنے کے علاوہ بین الاقوامی مالیاتی اداروں میں پاکستان کی ساکھ کو نقصان پہنچایا اور نامختتم کرپشن کے کلچر کو فروغ دیا۔

بھٹودور کی اصلاحات کے جو نادانستہ نقصانات مرتب ہوئے ان میں پیپلز پارٹی کا انتشار اور اقربا پروری کا شکار بن جانا، شہری اور دیہی اشرافیہ میں طاقتور حریفوں کو پیدا کرنا اور عدل و انصاف پر مبنی معاشرہ جو حکومت کے جمہوری نظام کو تقویت بخشنے کے قابل ہو، کے قیام کی راہ مسدود کردینا شامل ہیں۔اس دور کو "ہیروانہ ناکامی"، ضائع شدہ موقع" جیسے القابات سے یاد کیا جاسکتا ہے یا پاکستان کی شخصیات کے گرد گھومنے والی سیاست کو آگے بڑھانے کے عمل کے طور پر یاد کیا جاسکتا ہے۔ان سماجی و معاشی اصلاحات کے فوری نتائج کو ۱۹۷۷ میں ہونے والے انتخابات اور ان کے انتشار زدہ نتائج کی صورت میں دیکھا جاسکتا ہے جنہوں نے بھٹو کے تھیٹریکل پروگراموں پر پردہ گرادیا۔

بھٹو نے دیگر شعبوں کے ساتھ تعلیمی اداروں کو بھی قومی تحویل میں لے لیا۔صرف ان سکولوں اور کالجوں کو چھوٹ دی گئی جو براہ راست مشنری اداروں کے کنٹرول میں تھے۔تعلیمی اداروں کو قومیانے کے عمل کو "پاکستان کے تعلیمی شعبے کو جدید اور توانا سوسائٹی کے تقاضوں کو پورا کرنے کی غرض سے تیار کرنے" کے طور پر دیکھا گیا(۴۴)۔تعلیم اور ایمپاورمنٹ کے درمیان تعلق کو واضح کرنے کیلئے یکم اکتوبر ۱۹۷۲ کو ۱۳سال کی عمر تک کے تمام بچوں کیلئے مفت لیکن غیر لازمی تعلیم کی فراہمی کے پروگرام کو متعارف کرایا گیا۔بھٹو کا خیال تھا کہ تعلیمی اصلاحات کا پروگرام ان کے بہت بڑے کارناموں میں سے ایک ہے۔تاہم دیگر اقدامات کی طرح یہ بھی پاکستان کی محرومیوں کے پیچیدہ اور الجھے ہوئے اسباب کو سمجھنے میں بری طرح ناکام رہا۔انتہائی غریب

والدین کو اپنے بچوں کو مفت تعلیم دلانے کیلئے سکولوں میں بھیجنے پر آمادہ نہ کیا جاسکا کیونکہ وہ بچے چھوٹی موٹی مزدوری کرکے گھر کی آمدنی میں اپنا ہاتھ بٹاتے تھے۔یہ حقیقت ہے کہ سکول جانے والی عمر کے بچوں کی ایک تہائی تعداد محنت مزدوری کرنے پر مجبور ہے۔اعداد و شمار کے مطابق ۱۹۷۱ میں ملک کی مجموعی افرادی قوت کی ۵۔۳۹ فیصد تعداد چھوٹی عمر کے بچوں پر مشتمل تھی (۴۵)۔ان حالات میں ۷۴۔۱۹۷۲ کے درمیانی عرصے میں سکولوں میں حاضری میں بمشکل پانچ فیصد تک اضافہ کیا جاسکا تاہم اس سلسلے میں ہمیں آبادی میں اضافے کی شرح کو بھی ملحوظ خاطر رکھنا ہوگا۔قومیائے گئے سکولوں اور کالجوں میں معیار تعلیم بہت زیادہ گر گیا جس سے شہری متوسط طبقے کے اندر تشویش کی لہر دوڑ گئی۔یوں ایک بار پھر پیپلز پارٹی کی حکومت اپنے بلند آہنگ طرز فکر پر نظر ثانی سے گریزاں رہتے ہوئے اپنے دشمنوں کی تعداد میں اضافے کی مرتکب ہو رہی تھی۔

حرف آخر

ذوالفقار علی بھٹو نے پاکستان کو بدلنے کے عزم کا اظہار کیا تھا۔ان کا دور اقتدار بہت سے طوفانی واقعات سے عبارت ہے لیکن اس دور کے اختتام تک صورتحال جوں کی توں رہی۔ان دعوؤں کے باوجود کہ وہ ملک سے جاگیرداری کا خاتمہ کردیں گے، پنجابی جاگیرداروں اور سندھی وڈیروں کی ایک بڑی تعداد اقتدار کے ایوانوں میں فروکش رہی۔غریب کو ایمپاور کرنے کے وعدوں کو بہت محدود پیمانے پر کامیابی نصیب ہوئی۔ملکی سیاست بدستور سیاسی وڈیرے اور سیاسی مزارعے کے رشتے کی غلام رہی جس میں آئیڈیالوجی یا پارٹی کی ادارہ سازی کی بجائے شخصیت کو غلبہ حاصل ہوتا ہے۔پارٹی سسٹم قوت اور ترقی کا مظہر بننے کی بجائے عدم استحکام اور عدم بلوغت کا اظہار کرتا رہا جس کا نتیجہ فوجی مداخلت کی صورت میں برآمد ہوا۔ڈھاکہ میں فوج کی شکست اور اس کے مورال کے گرنے کے چند ہی برس کے بعد اسے دوبارہ شہری انتظامیہ کی مدد کے ذریعے عوامی زندگی میں اپنے وجود کے اظہار کا موقع فراہم کیا گیا۔دفاع کی مد میں بھاری رقومات کو مختص کرنے کے عمل کو برقرار رکھا گیا جس کی وجہ سے آزادی کے بعد

سے پاکستان کی معیشت بگاڑ کا شکار چلی آرہی تھی۔فوج کی ادارہ جاتی بحالی اور داخلی سیاست میں اسے ایک طاقتور فریق کی حیثیت سے دوبارہ ابھارنے کے عمل کی مشابہت کو ۱۹۷۴ میں ترک فوج کے قبرص پر حملے کے بعد یونانی فوج اور ۱۹۸۲ میں فاک لینڈ کی جنگ میں شکست کے بعد ارجنٹائن کی فوج کے کردار کے تناظر میں دیکھا جاسکتا ہے۔

بھٹو نا صرف یہ کہ سول ملٹری تعلقات کی تشکیل نو کے قابل نہ ہوسکے بلکہ وہ صوبوں اور مرکز کے درمیان کشیدگی کو ہمیشہ کیلئے ختم کردینے میں بھی ناکام رہے۔ایک نئے دور کی ابتداء کی امیدیں خود ان کے مطلق العنانیت پر مبنی رجحانات اور علاقائی سیکورٹی کے خطرناک ماحول کی وجہ سے دم توڑ گئیں۔جبکہ پنجاب کو ۱۹۷۱ کے بعد زیادہ جیتے پن کے ساتھ ڈیل کیا گیا،سندھی بھی مختصر مدت کے سہی بھٹو کے سیاسی اقتدار کے دوران ایک کامیاب پلیئر کے طور پر ابھرے۔

بھٹو نے سیکولر نظریات کا حامل ہونے کے باوجود مذہبی جماعتوں کے مطالبات کو بہت زیادہ پذیرائی بخشی۔۱۹۷۳ کے آئین میں پاکستان کے غیر مسلم شہریوں کو مملکت کے سب سے بالاتر عہدوں پر فائز ہونے کے حق سے انکار کردیا گیا۔ملک میں نافذ ہونے والے پہلے مارشل لاء کے بعد دو دہائیوں سے بھی کم
عرصے میں علماء نے احمدیوں کے خلاف پرتشدد مظاہروں کے ذریعے انہیں غیر مسلم قرار دلوانے کے ہدف کو حاصل کرلیا۔اپنے آخری دنوں میں بھٹو کی حکومت نے مذہبی عناصر کو حرید رعائتیں دیں جنہوں نے ضیاء دور میں ریاستی سرپرستی میں وسیع البنیاد اسلامائزیشن کا دروازہ کھول دیا۔بھٹو جیسی طاقتور شخصیت کی زد پذیری نے منکشف کردیا کہ کیسے ایک بڑی غیر مسلم اقلیت کے حامل مشرقی پاکستان سے محرومی نے پاکستان میں مذہبی جماعتوں کے اثر ورسوخ کو غیر معمولی حد تک بڑھادیا ہے۔

ذوالفقار علی بھٹو آخر دم تک پاکستان کے اس دیرینہ موقف کے ساتھ کمیٹڈ رہے کہ ایک مضبوط فوج اور مضبوط مرکزیت کی حامل ریاست ملک کی بقاء کیلئے ضروری ہے۔انہیں موبلائزیشن کے افقی نیٹ ورکوں کی بجائے گھوم پھر کر عمودی اور مربیانہ سیاسی تصور کی طرف بھی لوٹنا پڑا۔محمد وسیم کے الفاظ میں اس کا نتیجہ پیپلز پارٹی کی حکمران اشرافیہ

کی باندی کا کردار ادا کرنے والی مرکزیت پسند سیاسی پارٹیوں میں سے ایک اور پارٹی کی شکل اختیار کرنے کی صورت میں نکلا (۴۶)۔پاکستان کو تبدیل کرنے کے سلسلے میں بھٹو کی ناکامی ناگزیر ہرگز نہ تھی۔اپنی شخصیت کے زور،پاپولر سپورٹ اور فوج کے مورال گرجانے کے ذریعے بھٹو کو تاریخ نے پاکستان کو تبدیلی کی نئی راہ پر گامزن کرنے کا سنہری موقع عطا کیا تھا۔درحقیقت انہوں نے ہر اس شخص اور ادارے کو بے توقیر کیا جو اصلاحاتی تبدیلی لانے میں معاون ہوسکتا تھا اور جو عوامی نوعیت کی جمہوریت کے امکان سے خوفزدہ مخصوص مفادات کے حامل لوگوں سے بچاسکتا تھا۔جنرل ضیاء کے ہاتھوں ان کی دوبارہ گرفتاری،ٹرائل اور آخرکار پھانسی نے پاکستانی معاشرے کے بہت بڑے حصے کو ان کی کمزوریوں اور ناکامیوں کو بھلانے اور بھٹو کو ایک متھ کے طور پر قبول کرلینے پر آمادہ کرلیا۔انہیں خاص طور پر سندھ میں ایک شہید اور پیر کا درجہ حاصل ہے جہاں ایک سندھی وزیراعظم کو پنجابی فوج کی طرف سے پھانسی چڑھانے کے موقف کو بہت پذیرائی ملی اور اس کے نتیجے میں سندھی قوم پرستی کے جذبات میں شدت پیدا ہوئی۔حتمی طور پر بھٹو کی موت محض ایک ذاتی، خاندانی یا سندھی المیہ نہیں رہا بلکہ یہ پوری پاکستانی قوم کا المیہ بن گیا جو ملک کو جمہوریت کی راہ پر چلانے کے دوسرے موقع سے محرومی کی بھی گواہ ہے۔جیسا کہ کیتھ جونز نے استدلال کیا ہے،''پیپلز پارٹی کے مسلسل انحطاط نے ۱۹۴۷ کے بعد مسلم لیگ کے تجربے کی تخلیق نو کی ہے'' (۴۷)۔وہ اس حوالے سے مزید کہتا ہے:

> ''زوال کے دونوں ادوار کے بعد غالب شخصیت کے حامل کسی لیڈر کی زیر قیادت عوامی تحریکوں کے حکمت عملی اور قوم پرستی کو ریڈیکل سماجی پروگرام کے ساتھ جوڑنے کے نتیجے میں اتحاد اور انتخابی کامیابی کے ادوار بھی آئے۔مسلم لیگ اور پیپلز پارٹی دونوں متنوع اور متحارب مفادات کے اشتراک سے فائدہ اٹھانے میں ناکام رہیں اور دونوں جماعتوں کو اپنی تنظیمی سرحدوں کو برقرار رکھنے میں یا داخلی جھگڑوں کو طے کرنے کیلئے میکانزم تلاش کرنے میں مشکلات پیش آئیں۔دونوں

جماعتوں کیلئے اقتدار پر فائز ہونے کی قیمت پارٹی تنظیم میں ضعف در آنے اور پارٹی کی یکجہتی کو نقصان پہنچنے کی صورت میں چکانی پڑی"(۴۸)۔

آگے چل کر جمہوریت کو ایک اور موقع نصیب ہونا تھا۔پیپلز پارٹی کے بانی قائد کی بیٹی بے نظیر بھٹو کی زیر قیادت اسٹیبلشمنٹ کے مفادات کو چیلنج کرنے والی پارٹی کے طور پر اسے پھر سے ابھرنا تھا۔تاہم طاقت کی ری الائنمنٹ کے امکانات اس سے کہیں کم تھے جتنا ۱۹۷۱-۷۱ کے سنہرے دنوں میں اس پارٹی کو حاصل ہوئے تھے۔ذوالفقار علی بھٹو کا نام یادوں میں اسی شدت کے ساتھ جھلملا رہا تھا لیکن سماجی و معاشی ٹرانسفارمیشن اور جمہوری استحکام کے امکانات اس سے کہیں زیادہ معدوم تھے جتنے وہ ۱۹۶۰ کی دہائی کے آخر اور ۱۹۷۰ کی دہائی کے شروع میں تھے۔

☆☆☆

حوالہ جات

۱۔ A.H. Sayed, "The Pakistan People's Party: Phases One and Two" in L. Ziring, R. Braibanti and W. Howard Wriggins, "Pakistan: The Long View" (Durham, NC: Duke University press, 1977)

۲۔ Hasan Askri Rizvi, "Military, State and Society in Pakistan" (Basingstoke: McMillan, 2000)

۳۔ یحییٰ خان ۱۹۷۰ کے انتخابات کے موقع پر قیوم مسلم لیگ اور اپنی حکومت کی پسندیدہ اسلامی جماعتوں کی جانب سے زیادہ بہتر انتخابی کارکردگی کی توقع کر رہا تھا۔اس کی توقعات کے برعکس پیپلز پارٹی نے مغربی پاکستان میں فتح حاصل کرلی جبکہ مشرقی پاکستان میں عوامی لیگ نے جھاڑو پھیر دیا۔عوامی لیگ نے مشرقی پاکستان کیلئے مختص قومی اسمبلی کی ۱۶۲ نشستوں میں سے ۱۶۰ نشستیں جیت کر فوجی حکمرانوں کو پریشان کردیا تھا۔

۴۔ For further details on all these issues see R. sisson and Leo E. Rose, "War and Secession: Pakistan, India and the Creation of Bangladesh (Berkeley: University of California Press, 1990)

۵۔ روزنامہ جاوداں لاہور، ۱۹ دسمبر ۱۹۷۱۔اس سے پچھلے شمارے میں اخبار نے زیادہ بولڈ انداز میں لکھا تھا "پاکستان کی شکست کا ذمہ دار یحییٰ خان ہے"

۶۔ Tariq Ali, "Can Pakistan Survive?" (Harmondsworth: Penguin, 1983)

۷۔ Lt. General A.A. K. Niazi, " The Betrayal of East Pakistan" (Karachi: Oxford University Press, 1988)

۸۔ S. Wolpertz, "Zulfi Bhutto of Pakistan" (Oxford: Oxford University Press, 1993)

۹۔ Zulifqar Ali Bhutto, "Speeches" (Islamabad, Government of Pakistan, 1973)

۱۰۔ J. Piscatori, "Asian Islam: International Linkages and their Impact on International Relations" in J.L. Esposito (ed), "Islam in Asia (New York: Oxford University Press, 1987)

۱۱۔ For further details see, Ian Talbot, "A modern History" 2nd edition (London: Hurst, 2009)

۱۲۔ Z. A. Bhutto, "If I am Assassinated" (New Delhi: Vikas, 1979)

۱۳۔ یہ تنازعہ محض بھٹو کی جانب سے سیاسی مخالفین کے حوالے سے عدم برداشت کے رویئے کی وجہ سے نہیں پیدا ہوا تھا بلکہ سردار محمد داؤد نے جو جولائی ۱۹۷۳ کنگ ظاہر شاہ کا تختہ الٹ کر افغانستان کے اقتدار پر فروکش ہوا تھا، پختونستان کے مسئلے کو دوبارہ زبان دے دی تھی حالانکہ یہ کئی برسوں سے خوابیدہ ہے۔

۱۴۔ See, Ian Talbot, "A modern History" 2nd edition (London: Hurst, 2009)

۱۵۔ ایرانیوں کی مداخلت کے حوالے سے متضاد تشریحات کو جاننے کیلئے ملاحظہ کیجئے: S. Harrison, "Baluch Nationalism and Super Power's Rivalry", "International Security 5, 3 (1980-1), G. Wirsing, "Pakistan's Security Under Zia: The Policy Imperatives of a Peripheral Asian State (Basingstoke: McMillan, 1991)

۱۶۔ See, Frederic Grare, "Pakistan: The Resurgence of Baluch Nationalism" Carnegie Papers 65 (January 2006)

۱۷۔ Maleeha Lodhi, "The Pakistan People's Party", unpublished 1979, London School of Economics

۱۸۔ Philip E. Jones, (Karachi: Oxford University Press, 2003)

"Pakistan People's Party: Rise to Power"

۱۹۔ ایضاً۔

۲۰۔ ایضاً۔

۲۱۔ ایضاً۔

۲۲۔ A.H. Sayed, "The Pakistan People's Party: Phases One and Two"

۲۳۔ وہ پاکستان پیپلز پارٹی کے بانی ارکان میں سے ایک احمد رضا خان قصوری کا والد تھا۔ بعد میں قصوری بھٹو کا سخت ترین ناقد بن گیا اور اسے اکتوبر ۱۹۷۲ میں پارٹی سے نکال دیا گیا تھا۔ اس کے والد کی کار پر نومبر ۱۹۷۴ میں اس وقت فائرنگ کی گئی تھی جب وہ لاہور میں ایک شادی کی تقریب سے واپس آرہا تھا۔ نواب محمد احمد خان، جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ اس فائرنگ کا اصل نشانہ نہیں تھا، کے قتل کی تحقیقات کو جنرل ضیاء نے دوبارہ شروع کرنے کا حکم دیا تھا۔ ازسرنو ہونے والی تحقیقات میں بتایا گیا کہ اس قتل کے آثار وشواہد بھٹو سے جا کر ملتے ہیں۔

۲۴۔ بھٹو کی جانب سے سی ایس ایس کیڈر کے بیوروکریٹوں کا فارغ کرکے ان کی جگہ پارٹی کے وفاداروں کو (جن کے بارے میں ''بھٹوکریٹ'' کی اصطلاح تراشی گئی) بیوروکریسی میں شامل کرنے کے حوالے سے تفصیلی بحث کیلئے دیکھیے: C. Kennedy, "Bureaucracy in Pakistan" (Karachi: Oxford University Press, 1987)

۲۵۔ William B. Millam, "Bangladesh and Pakistan: Flirting with Failure in South Asia (London: Hurst, 2009)

۲۶۔ Farzna Sheikh, "Making Sense of Pakistan (London: Hurst, 2009)

۲۷۔ جھنگوی نے آگے چل کر فرقہ پرست جماعت ''انجمن سپاہ صحابہ'' کے نام سے بنائی بعد ازاں اپنے نام پر اس کا مسلح ونگ ''لشکر جھنگوی'' بھی بنایا۔ مزید تفصیلات کیلئے ملاحظہ فرمائیے اگلا باب۔

۲۸۔ Hasan Askri Rizvi, "Military, State and Society in Pakistan"

۲۹۔ ایضاً۔

۳۰۔ ایضاً۔

۳۱۔ بھٹو نے بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے کیلئے اسلامی کانفرنس کی آڑ لی۔ بھارت پاکستانی جنگی قیدیوں کی رہائی کیلئے اسی بات پر زور دے رہا تھا تاہم آخر کار وہ الگ سے ہونے والے مذاکرات کے دوران ان کی رہائی پر آمادہ ہو چکا تھا۔

۳۲۔ Lt. General A.A. K. Niazi, " The Betrayal of East Pakistan"

۳۳۔ Hasan Askri Rizvi, "Military, State and Society in Pakistan"

۳۴۔ S. J. Burki, "Pakistan Under Bhutto 1971 - 1977 (London: McMillan, 1980)

۳۵۔ Farzna Sheikh, "Making Sense of Pakistan, Praveen Swami, "India, Pakistan and the Secret Jihad: The Covert War in Kashmir (London: Hurst, (Milton Park, Abingdom: Toutledge, 1947 - 2001 2009)

۳۶۔ Praveen Swami, "India, Pakistan and the Secret Jihad: The Covert War in Kashmir 1947

۳۷۔ General K. M. Arif, "Working with Zia: Pakistan's Power Politics, 1977 - 1988 (Karachi: Oxford University Press, 1995)

۳۸۔ ایضاً۔

۳۹۔ ایضاً۔

۴۰۔ S. Wolpertz, "Zulfi Bhutto of Pakistan" (Oxford: Oxford Taheer, "Bhutto: A Political See, University Press, 1993). S. Biography (London: Ithaca Press, 1979)

۴۱۔ For details see, W. E. Gustafson, "Economic Reforms Under Bhutto", Journal of Asian and African Studies, (July - October, 1973)

۴۲۔ Nita Weiss, "Culture, Class and Development in Pakistan: The Emergence of an Industrial Bourgeoisies in Pakistan" (Colorido: Westview Press, 1991)

۴۳۔ ذوالفقار علی بھٹو، قوم کے نام خطاب جس میں صنعتوں کی دس کیٹگریوں کی نیشنلائزیشن کرنے کا اعلان کیا گیا تھا، ۱۲ جنوری، ۱۹۷۲ء۔

۴۴۔ S. J. Burki, "Pakistan Under Bhutto 1971 - 1977 (London: McMillan, 1980)

۴۵۔ Iftikhar H. Malik, "State and Civil Society in Pakistan: Politics of Authority, Ideology and Ethnicity (Basingstoke: MacMillan, 1997)

۴۶۔ Muhammad Waseem, "Politics and the State in Pakistan (Islamabad: National Institure of Historical and Cultural Research, 1994)

۴۷۔ Philip E. Jones, "Pakistan People's Party: Rise to Power"

۴۸۔ ایضاً۔

☆☆☆

5

جنرل ضیاء اور پاکستان کے استحکام کی جستجو

جنرل ضیاء الحق کا عرصہ اقتدار (۱۹۷۷۔۸۸) صدر کی اتھارٹی میں اضافے اور فوج کے بڑھتے ہوئے سیاسی اور معاشی کردار سے عبارت ہے۔اس دور نے پاکستان کے شہریوں کو کلاشنکوف کلچر کی وراثت، فوج اور اسلامی انتہاپسندوں کے درمیان مضبوط تعلقات اور فرقہ واریت کے تحفے بھی دیئے۔اس عرصے کے دوران کھمبیوں کی طرح ہر طرف اگنے والے مدارس شدید فرقہ وارانہ جذبات کے حامل اور بین الاقوامی جہادی نکتہ نظر کے ساتھ جڑے ہوئے تھے۔جنرل ضیاء کے بعد آنے والی حکومتیں ان ریڈیکل مدارس اور ان میں پنپنے والے عسکریت پسندوں کو لگام میں ڈالنے میں ہمیشہ ناکام رہیں۔

ضیاء دور کی اس اہم خصوصیت پر زیادہ بات نہیں ہوئی لیکن مستقبل کے منظر نامے پر جس کے گہرے اثرات مرتب ہوئے ہیں کہ اس دور میں موصول ہونے والی بے تحاشہ غیر ملکی امداد کے باوجود سماجی بہبود کے شعبے کو بہت شد و مد کے ساتھ نظر انداز کیا گیا۔پاکستان نے اس دور میں معاشی ترقی کی شرح اور فی کس آمدنی کے اعتبار سے بھارت کو بدستور پیچھے چھوڑے رکھا تھا (ضیاء دور میں پاکستان کی ترقی کی مجموعی شرح ۶ فیصد کے لگ بھگ تھی)۔تاہم اس کے باوجود پاکستان میں ناہموار ترقی اور انسانی سرمائے کی سرمایہ کاری میں کمی کی وجہ سے بیسویں صدی کے آخری برسوں میں گلوبلائزیشن کے ثمرات سمیٹنے کے حوالے سے پاکستان بھارت سے کہیں پیچھے رہا۔پاکستان میں انسانی ترقی کو نظر انداز کرنے کا عمل سول سروس، یونیورسٹیوں اور عدلیہ

جیسے اہم ریاستی اداروں کی مزید کمزوری کے شانہ بشانہ آگے بڑھا۔ضیاء کی حکمرانی کا عرصہ سول سوسائٹی پر حملے اور جناح کے تکثریت پر مبنی تصور پاکستان کو نصابی کتب سے خارج کرنے سے بھی عبارت رہا تھا۔

اس دور کی یہ افسوسناک وراثت اس قدر نمایاں ہے کہ مصنفین کی اکثریت پاکستان کو درپیش تمام مسائل کی واحد جڑ ضیاء دور کو قرار دینے پر مصر رہی ہے۔ہم پچھلے صفحات میں جائزہ لے چکے ہیں کہ گذشتہ حکومت کے ایسے طویل مدتی اثرات کارفرما رہے ہیں جنہوں نے پاکستان کے موجودہ بحرانوں کے سلسلے میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔مزید براں یہ سمجھنا بھی ضروری ہے کہ پاکستان کے دوسرے مارشل لاء کی ذمہ دار شخصیت نے ملک کے سماجی و معاشی دھاروں کی سمت متعین کرنے کے علاوہ ملک کو تبدیلیوں کے ایک نئے راستے پر گامزن کرنے کے سلسلے میں فرد واحد کی حیثیت سے نہایت اہم کردار ادا کیا تھا۔

ضیاء دور کا پاکستان

ذوالفقار علی بھٹو نے مستحکم مفادات کیلئے خطرے کی گھنٹیاں بجائی تھیں اور عوام کو ایک منصفانہ معاشرے کے قیام کی امید دلا کر متحرک کیا تھا۔تاہم یہ بھی حقیقت ہے کہ اس کی اصلاحات کے اثرات محض کاسمیٹک نوعیت کے رہے تھے۔ایک اندازے کے مطابق بھٹو کی زرعی اصلاحات کے نتیجے میں صرف ایک فیصد نہری و بارانی آبپاشی کی حامل زمین ہی بے زمین ہاریوں اور کاشتکاروں میں تقسیم ہو پائی تھی (۱)۔بھٹو نے جاگیرداری کو جڑ سے اکھاڑنے کی بجائے وقت کے ساتھ ساتھ انہی وڈیروں اور جاگیرداروں کو اپنی صفوں میں نمایاں مقام دے دیا تھا۔یوں ضیاء نے ورثے میں ایسی صورتحال پائی تھی جس میں بااثر زمینداروں کا ایک طاقتور حصہ آمرانہ حکومتوں کو قانونی جواز فراہم کرنے کیلئے بدستور قومی افق پر موجود تھا۔بھٹو نے اپنی نیشنلائزیشن کی پالیسی کے نتیجے میں سرمایہ دار طبقے کو بھی اپنا دشمن بنالیا تھا۔جنرل ضیاء نے ایوب دور کی پالیسیوں کا احیاء کرتے ہوئے ان تمام لوگوں کو گلے سے لگالیا جو بھٹو کی دور حکومت میں

احساس محرومی کا شکار ہوئے تھے۔اس کی سب سے اہم مثال شریف خاندان کا اتفاق بزنس گروپ ہے۔

نواز شریف نے اپنی سیاست کی ابتدا جنرل ضیاء کے دور میں کی تھی اور بعد ازاں ترقی کرتے کرتے دو مرتبہ ملک کی وزارت عظمیٰ پر فائز ہوئے تھے۔کئی برسوں تک ان کا سیاسی کردار پنجاب میں پیپلز پارٹی کو کارنر کرنے کی کوششوں میں فوج کا ہاتھ بٹانے کی حد تک محدود تھا۔فوج کی ان کوششوں میں جن طبقات کی حمایت کا سہارا لیا گیا تھا ان میں مذہبی رجحانات کا حامل نچلا متوسط طبقہ، ٹریڈرز اور مرچنٹس گروپس، کاروباری اور صنعتی اشرافیہ اور سب سے اہم جاگیرداری طبقے کا ایک بڑا حصہ شامل تھا۔

طبقاتی تقسیم کے علاوہ ۱۹۷۷ کا پاکستان علاقائی، دیہی و شہری اور صنفی عدم توازن کا منظر پیش کر رہا تھا۔بھٹو نے ان میں سے چند مسائل کو حل کرنے کی کوشش کی لیکن نا صرف یہ کہ وہ کوئی موثر اور ریڈیکل تبدیلیاں لانے میں ناکام رہے جو مستحکم مفادات کیلئے خطرے کا باعث بن سکتیں۔جہاں تک جنسی امتیاز کا معاملہ ہے، ۱۹۷۳ کے آئین کی شق ۲۵ کے تحت جنس یا صنف کی بنیاد پر امتیاز برتنے کو غیر آئینی قرار دے دیا گیا۔بھٹو نے اس حوالے سے پہلی مرتبہ پاکستان کی وزارت خارجہ میں عورتوں کی شمولیت کیلئے راستہ ہموار کیا۔۳۱ جنوری ۱۹۷۶ میں انہوں نے عورتوں کے حقوق کی ۱۳ رکنی کمیٹی تشکیل دی جس کی سربراہی اس وقت کے اٹارنی جنرل یحییٰ بختیار کے سپرد کی گئی۔اس کمیٹی کی سفارشات میں سرکاری ملازمتوں میں خواتین کا کوٹہ مقرر کرنا، کھیلوں، ثقافتی سرگرمیوں اور میڈیا میں عورتوں کی شراکت کی حوصلہ افزائی کرنا اور سب سے اہم یہ کہ عورت کیلئے زرعی جائیداد سمیت ہر قسم کی وراثت میں اپنا حصہ وصول کرنا لازمی قرار دینے جیسے اہم اقدامات شامل تھے(۲)۔

دوسری جانب ضیاء کا دور عورتوں کے حقوق کے حوالے سے چنداں خوشگوار نہ تھا۔عورتوں کے حوالے سے ضیاء کی امتیازی پالیسیوں کی ایک وضاحت یہ کی جاتی ہے کہ ان کا مقصد روایت پرست آبادی کی خوشنودی حاصل کرنا تھا جو ''چادر اور چار دیواری'' کے نعرے کی آڑ میں لڑکھڑاتے ہوئے روایتی صنفی رشتوں کو محفوظ بنانا چاہتی

تھی۔ضیا کی جانب سے اسلامی اصلاحات کے رسوائے زمانہ عناصر پر عالمانہ ارتکاز کے دوران اس حقیقت کو نظر کر دیا جاتا ہے کہ ایسی اسلامی تعلیمات کو اس دور میں یکسر نظر انداز کر دیا گیا جن میں عورتوں کے حقوق بشمول جائیداد کے حق وراثت پر زور دیا گیا ہے(۳)۔

۱۹۸۰ میں پاکستان میں آبادی میں اضافے کی شرح تین فیصد تھی جو دنیا میں سب سے زیادہ شرح پیدائش کے حامل ملکوں میں سے ایک تھی۔اس شرح پیدائش کے نتیجے میں ملک میں نوجوانوں کی تعداد میں بھی انتہائی اضافہ ہو چکا تھا جس کے ساتھ جڑی ہوئی ہوئی بے روزگاری کی بلند شرح نے ضیاء دور میں نسلی اور مذہبی انتہاپسندی کو بہت زیادہ ہوا دے دی تھی۔۱۹۸۰ میں کراچی کے اندر ایم کیو ایم کے صرف کارکن ہی نہیں بلکہ اعلیٰ قیادت بھی کم و بیش عمر کی بیسویں دہائی میں تھی۔ضیاء دور میں یہی نوجوان تھے جو صوبہ سندھ میں دیہی سندھ کے استثنیٰ کے ساتھ انتہائی زیادہ سرگرم دکھائی دیتے تھے۔اس میں زراعت میں مشینوں کے استعمال کے نتیجے میں رونما ہونے والے سبز انقلاب اور ملازمتوں کے نئے مواقع پیدا ہونے کا بھی کافی عمل دخل تھا۔پاکستان میں ہمیشہ نقل مکانی دو سطحوں پر رہی ہے: دیہات سے قصبات یا چھوٹے شہروں کی جانب اور یہاں سے کراچی اور لاہور جیسے بڑے شہری مراکز کی جانب۔اسی کا نتیجہ تھا کہ کراچی پختونوں اور بلوچوں کی دنیا میں سب سے زیادہ آبادی کا حامل شہر بن چکا تھا۔۱۹۸۰ کی دہائی میں یہاں پھوٹ پڑنے والا سیاسی تشدد اس بات کا اشارہ ہے کہ یہاں آبادی میں بے تحاشہ اضافہ ٹرانسپورٹ، ہاؤسنگ اور فراہمی آب جیسی سہولتوں کی ناکامی کا باعث بن چکا تھا۔

پنجاب میں چھوٹے قصبوں کے اندر بھی آبادی میں بہت زیادہ اضافہ دیکھنے میں آتا ہے۔یہ وہ قصبات ہیں جہاں آبادی میں اضافے نے مرکزی شاہراہوں کے ساتھ ورکشاپس اور چھوٹی انڈسٹری کے پھیلتے ہوئے نیٹ ورکس کو جنم دیا۔اس کے ساتھ ہی ہمیں اس دور میں دیہات اور قصبات میں بہت بڑی تعداد میں مساجد کی تعمیر بھی دکھائی دیتی ہے۔اس دور میں کراچی بلوچ اور پختونوں کے علاوہ مہاجر اور سندھی آبادی کے میلٹنگ پوائنٹ کے طور پر ابھرنا شروع ہو گیا تھا۔ملک میں ٹرانسپورٹ کے کاروبار کا

ایک حصہ ایسا تھا جس پر پختونوں کی اجارہ داری قائم تھی۔ جنرل ضیاء کیلئے اپنی حکومت کے خلاف سندھیوں کی مزاحمت کا توڑ کرنے کے ذریعے سندھ کی آبادی میں عدم توازن پیدا کرنے کیلئے کراچی کی نسلی شناخت کو استعمال کرنا بہت آسان ہو چکا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ اس ابھرتی ہوئی شہری طبقے کی رجعت پسندانہ اقدار کی عکاسی بھی کر رہا تھا جو تیز رفتاری تبدیلیوں کے دور میں زندگی کے روایتی تصورات کا دفاع کرنے کی کوششوں میں مصروف تھا اور اس کے ساتھ ہی اپنی روایتی ''سادگی'' کو اعلیٰ طبقے کی زوال آمادہ چکا چوند سے محفوظ کرنے کیلئے بھی کوشاں تھا۔ ایک اہم سفارتکار اقبال اخوند نے ضیاء دور کے حوالے سے اپنی یادداشتوں کا سلسلہ تحریر کیا تھا جس میں وہ ہمیں یاددہانی کراتے ہیں کہ کیسے جنرل ضیاء تواتر سے کہا کرتا تھا کہ وہ ایک ''سادہ آدمی'' ہے۔ ایک موقع پر سفارتکاروں اور سفیروں کے ایک اہم اجلاس کے دوران اچانک اس نے اجلاس کو ادھورا چھوڑا اور ظہر کی نماز پڑھنے کیلئے جونیئر افسران کے ہمراہ نماز کیلئے مختص جگہ میں چلا گیا۔ اس دوران سفیر حضرات، سفارتکار اور اعلیٰ افسران بے چینی کے ساتھ ٹہلتے ہوئے اور گپیں ہانکتے ہوئے وقت کاٹنے کی کوشش کرتے رہے تھے (۴)۔

بھٹو دور کے آخر آخر میں داخلی نقل مکانی کے ساتھ ساتھ بیرون ملک نقل مکانی کا سلسلہ بھی زور پکڑ چکا تھا۔ اندازوں کے مطابق ۱۹۸۰ تک پندرہ لاکھ پاکستانی بیرون ملک کام کر رہے تھے جبکہ ان کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہو رہا تھا۔ پانچویں معاشی منصوبے (۱۹۷۸۔۱۸۳) کے دوران ملکی افرادی قوت کا تیسرا حصہ ان افراد پر مشتمل تھا جو بیرون ملک جا کر روزی کما رہے ہیں (۵)۔ بیرون ملک نقل مکانی کرنے والوں کی اکثریت پنجابیوں اور پختونوں پر مشتمل تھی۔ یہی وہ دو نسلی اکائیاں تھیں جن کی حمایت کے سہارے ضیاء حکومت کھڑی تھی۔ اس سے قبل ملک سے ہونے والی نقل مکانی کا بڑا ہدف مغربی ممالک تھے لیکن ۱۹۸۰ سے شروع ہونے والی نقل مکانی کا بہت زیادہ رخ خلیجی ممالک اور سعودی عرب کی جانب ہو چکا تھا۔ نقل مکانی کی اس نئی لہر کے نا صرف ڈسپوزایبل معیشت بلکہ ثقافتی سطح پر بھی اثرات مرتب ہو رہے تھے۔ معاشی اثرات کا جائزہ لیتے ہوئے جوناتھن ایڈلٹن لکھتا ہے: ''خلیجی ممالک کی جانب نقل مکانی نے

پاکستان میں متوسط طبقے کو مضبوط کر دیا تھا'' (۶)۔ زیریں متوسط طبقے کی اسلامی مراکز کی جانب نقل مکانی نے اسلامائزیشن کے حوالے سے ان کے رجحانات کو مزید پختگی عطا کر دی تھی جبکہ جنرل ضیا نے اندازہ لگایا کہ فرقہ واریت پر اس کے اثرات بے یقینی کی کیفیت اور امکانی طور پر عدم استحکام کی حالت کو دوچند کرنے کے سلسلے میں کارآمد ہو سکتے ہیں۔

تقسیم کے وقت مشرقی پنجاب سے شہری آبادی کی ہجرت نے بھی جنرل ضیاء کو سیاسی میدان میں اپنے گھوڑے دوڑانے کے سلسلے میں بہت بڑی حمایت کی بنیاد فراہم کر دی تھی۔ وہ بذات خود ایک نچلے متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والی ارائیں خاندان سے تعلق رکھتا تھا جو تقسیم کے دوران جالندھر سے ہجرت کر کے پشاور میں آباد ہوا تھا۔ وہ فکری طور پر مشرقی پنجاب کی ارائیں اور شیخ برادری کے رجحانات کے ساتھ منسلک تھا۔ یہ برادریاں شدید اینٹی انڈیا رجحانات کی حامل تھیں اور تقسیم کے دور ابتلا کے بعد پاکستانی معاشرے میں ''باعزت مقام'' کے حصول کی تگ و دو میں مصروف تھیں۔ جنرل ضیاء نے ایک مرتبہ اسلام آباد میں منعقد ہونے والی بین الاقوامی اسلامی کانفرنس میں خطاب کرتے ہوئے کہا تھا: ''میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ میرے لیے اسلام اور پاکستان کا کیا مطلب ہے۔ یہ میری ماں کا وژن ہے جس نے اس حالت میں سرحد پر کر کے پاکستان کی سرزمین پر قدم رکھا تھا کہ وہ تھکی ماندی تھی اور وہ اپنا کل اثاثہ اپنے سر پر اٹھائے ہوئے تھی'' (۷)۔ ضیاء کے چند قریبی فوجی ساتھیوں مثلاً اس کے وائس چیئرمین آف آرمی سٹاف جنرل کے ایم عارف اور جنرل اختر عبدالرحمٰن جو ۸۸۔۱۹۸۴ میں آئی ایس آئی کی سربراہی کر رہے تھے، کا تعلق بھی مشرقی پنجاب سے ہجرت کر کے آنے والے طبقے سے تھا جبکہ اس کے ایک اور جالندھری ساتھی لیفٹیننٹ جنرل فیض علی چشتی نے جنرل ضیاء کے مارشل لاء کے نفاذ میں بنیادی کردار ادا کیا تھا۔ یہ رول کال لاہور ہائیکورٹ کے چیف جسٹس مولوی مشتاق حسین کے تذکرے کے بغیر ادھوری رہے گی جس نے ۱۸ مارچ ۱۹۷۸ کو ذوالفقار علی بھٹو کو پھانسی کی سزا سنائی تھی۔ وہ جالندھر سے تعلق رکھنے والی ایک اور شخصیت تھی جسے جنرل ضیاء نے خود لاہور ہائیکورٹ کے چیف

جسٹس کے طور پر نامزد کیا تھا۔

۱۹۸۰ کے عشرے کی ابتداء میں سرکاری اعداد و شمار ظاہر کرتے ہیں کہ بیرون ملک کام کرنے والے پاکستانی ملک میں ۲.۲ ارب ڈالر سالانہ زرمبادلہ بھیج رہے تھے(۸)۔اگر رقومات کی ترسیل کے ہنڈی جیسے متبادل ذریعے کو بھی ذہن میں رکھا جائے تو یہ اعداد و شمار اندازوں سے کہیں زیادہ ہو جاتے ہیں۔افغانستان میں روسی قبضے کے نتیجے میں پاکستان کو حاصل ہونے والے فرنٹ لائن سٹیٹس کے بعد تارکین وطن پاکستانیوں کی جانب سے بھیجے جانے والے زرمبادلہ کے ساتھ ساتھ غیر ملکی قرضوں کے بہاؤ نے بھی پاکستان کی معاشی ترقی کی شرح میں اضافے میں نمایاں کردار ادا کیا تھا (۹)۔اس کے ساتھ ساتھ دولت کی اس ریل پیل نے ضیاء دور کی طول عمری کو بھی یقینی بنا دیا تھا۔ممتاز ماہر معاشیات شاہد جاوید برکی کے اندازوں کے مطابق جنرل ضیاء کے دور میں ایک متوسط پاکستانی کی آمدنی میں ۴۱ فیصد تک اضافہ ہو چکا تھا (۱۰)۔۱۹۷۰ اور ۱۹۸۰ کے عشروں میں پنجاب سے بہت بڑی تعداد میں افرادی قوت نے خلیجی ممالک کی جانب نقل مکانی کی تھی جس کی وجہ سے یہاں زرمبادلہ کا بہاؤ اور اوسط آمدنی کی شرح بھی زیادہ تھی۔اس وجہ سے ملک میں علاقائی بنیادوں پر عدم مساوات میں بھی اضافہ ہو گیا تھا۔اعجاز احمد اور عمر نعمان جیسے مصنفین پورے ضیاء دور میں پنجاب کے اندر اطمینان کی صورتحال کو اسی ''خلیجی فیکٹر'' اور صوبے کے فوج کے ساتھ تعلقات کی روشنی میں دیکھتے ہیں۔سندھ میں ضیاء کے خلاف بھڑکنے والے جذبات کا محرک محض سیاسی طور پر صوبہ سندھ کو مارجنلائز کرنا ہی نہیں تھا بلکہ اس کے پیچھے یہ حقیقت بھی کارفرما تھی کہ صوبہ سندھ سے بہت کم لوگوں کو بیرون ملک جانے کے مواقع ملے تھے جس کی وجہ سے ملک میں آنے والی دولت کے بہاؤ میں اسے بہت کم حصہ مل سکا تھا (۱۱)۔

سنٹرل پنجاب میں بھارت کے ساتھ لگنے والے علاقوں اور سندھ میں آبپاشی کے نئے اضلاع میں پرانے زمیندار طبقے کو فوجی زمینداروں کے ابھرتے ہوئے طبقے کے ساتھ مل کر چلنا پڑتا تھا۔ان فوجی زمینداروں کی اکثریت نے ۱۹۵۹ میں ایوب خان کی زرعی اصلاحات کے دوران ان علاقوں میں اونے پونے داموں زمینیں خریدی

تھیں۔دیہی علاقوں کے تبدیل شدہ منظر نامے نے نا صرف جنرل ضیاء کی حکومت کو دیہی علاقوں میں حمایت کی ایک اور بنیاد فراہم کر دی تھی بلکہ اس نے دیہی و شہری پس منظر کا حامل ایسا متوسط طبقہ پیدا کرنے میں اہم کردار ادا کیا تھا جو اپنی ترقی کیلئے فوج میں بھرتی کو ترجیح دیتا تھا۔ضیاء کے اقتدار سنبھالنے سے پہلے ہی فوج میں افسران کے رینک میں قدیم زمیندار کلاس سے مڈل کلاس میں شفٹ آ چکی تھی۔اس فیکٹر نے جنرل ضیاء کو فوج کے اندر حمایت کی مضبوط بنیاد فراہم کر دی تھی۔اسے کچھ مصنفین نے فوج میں اسلامائزیشن کی حمایت کی بھرپور حمایت کی اہم وجہ قرار دیا ہے۔

سٹیفن کوہن کا کہنا ہے کہ پاکستانی فوج میں افسروں کا طبقہ زیادہ تر جنرل ضیاء کے تصورات کے ساتھ ہم آہنگ تھا۔ضیاء کا ہرگز ارادہ اسلامی فوج بنانے کا نہیں تھا اس کی بجائے اس کا خیال تھا کہ فوج میں اسلامی رجحانات کی ترویج اس میں حب الوطنی اور پروفیشنل ازم کی جڑیں مضبوط کرنے میں ممد و معاون ثابت ہوگی۔ضیاء ذاتی طور پر رائے ونڈ میں ہونے والے سالانہ تبلیغی اجتماع میں شرکت کرتا تھا جس میں شرکاء کی تعداد اکثر ۲۰ لاکھ سے بھی تجاوز کر جاتی ہے۔جنرل ضیاء نے تبلیغی جماعت کو فوج کے اندر بھی رسائی دے دی تھی جس کے نتیجے میں بے شمار فوجی افسران تبلیغی سرگرمیوں میں شریک ہوتے تھے۔۳-۱۹۹۲ کے دوران آئی ایس آئی کی سربراہی کرنے والے جنرل جاوید ناصر تبلیغی سرگرمیوں میں بہت زیادہ انوالو تھا۔تبلیغی جماعت بظاہر غیر سیاسی تنظیم ہے تاہم یہ اپنے طرزِ اسلام میں کٹر طور پر دیوبندی رجحانات کی حامل ہے۔جب طالبان اور اس کی اتحادی پنجابی فرقہ ورانہ تنظیموں نے ریاست کے خلاف ہتھیار اٹھائے تو دیوبندی رجحانات کے باوجود تبلیغی جماعت ان کی مخالفت کا نشانہ بنی۔

پاکستان آرمی میں اکثر افسران روایتی طور پر جماعت اسلامی کی جانب بھی میلان رکھتے ہیں۔تاہم وہ اپنی وابستگیوں کا عملی مظاہرہ فوج سے ریٹائرمنٹ کے بعد کرتے ہیں جب وہ باقاعدہ طور پر جماعت اسلامی کی تنظیمی سرگرمیوں میں حصہ لینا شروع کر دیتے ہیں۔سٹیفن کوہن کا کہنا ہے کہ ۱۹۹۱ میں اسلام آباد کے اندر ہونے والے جماعت اسلامی کے کنونشن میں ۱۹ ریٹائرڈ جرنیل شریک تھے(۱۲)۔افغانستان

میں تعینات فیلڈ افسران خاص طور پر وہ جو آئی ایس آئی کے ساتھ وابستہ تھے ان کی ایک بڑی تعداد وہاں کے انتہا پسند اسلامی گروپوں کے ساتھ ذہنی ہم آہنگی پیدا کر لیتی ہے۔اس کی ایک مثال ریٹائرڈ جنرل حمید گل ہیں جنہوں نے ان گروپوں کے ساتھ قریبی روابط استوار کر لیے تھے۔بہت سے حوالوں سے فوج کے بڑھتے ہوئے اسلامی رجحانات نے افسران کے رینک کی کمپوزیشن تبدیل کر دی ہے جبکہ مجموعی طور پر پاکستانی معاشرہ بھی مجموعی طور پر مذہبی رجعت پسندی کے رنگ میں رنگا جا چکا ہے۔

ضیاء کے دور کو نا صرف پاکستان کے تناظر میں دیکھا جانا چاہیے بلکہ اسے خطے کے نیز علاقائی تبدیلیوں کے تناظر میں دیکھا جانا بھی ضروری ہے۔۱۹۷۹ میں برپا ہونے والے ایرانی انقلاب نے بین الاقوامی سطح پر اسلامی شدت پسندی کے احیاء میں بنیادی کردار ادا کیا تھا۔اس کے علاوہ یہ انقلاب ایرانی اور عرب قیادت کے درمیان نہ ختم ہونے والی محاذ آرائی کا سبب بھی بنا ہے۔اس محاذ آرائی کے نتیجے میں آگے چل کر پاکستان فرقہ ورانہ لڑائی کا میدان بننے والا تھا جس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ جنرل ضیاء نے خود کو سعودی عرب کے ساتھ وابستہ کرتے ہوئے ملک کو سنی اسلامی قیادت کا مرکز بنانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔دوسری جانب افغانستان میں ہونے والی خانہ جنگیوں نے پاکستان اور امریکہ کے درمیان تعلقات کے نئے دور کی صورت گری کی ہے۔امریکی صدر کارٹر کی حکومت کا خارجہ امور کے حوالے سے نکتہ نظر شدید طور پر انسانی حقوق اور ایٹمی عدم پھیلاؤ کے زیر اثر تھا۔ان دونوں حوالوں سے پاکستانی ریاست امریکی امداد کی حق دار نہیں ٹھہرتی تھی۔یہی وجہ ہے کہ امریکہ نے ۱۹۷۹ میں پاکستان کی فوجی اور اقتصادی امداد معطل کر دی تھی۔پاکستان اور امریکہ کے درمیان اس وقت کم ترین سطح پر پہنچ گئے جب یہ افواہیں پھیلائی گئیں کہ خانہ کعبہ پر سعودی شاہی خاندان کے خلاف بغاوت کرنے والوں کے قبضے میں امریکہ کا ہاتھ ہے۔اس کے نتیجے میں مسلمان ملکوں میں امریکہ کے خلاف شدید غم و غصے کی لہر دوڑ گئی تھی۔پاکستان میں بھی اس کا شدید ردعمل ہوا اور اسلام آباد میں ہونیوالے پرتشدد مظاہروں کے دوران مشتعل ہجوم نے ۲۱ نومبر ۱۹۷۹ کے روز امریکہ سفارتخانے پر حملہ کر دیا جس کے دوران ہونے والے تصادم کے نتیجے میں

سفارتخانے کے دو امریکی اور دو پاکستانی ملازمین ہلاک ہوگئے۔

اس صورتحال میں اس وقت اچانک ڈرامائی تبدیلی آ گئی جب امریکہ میں حکومت تبدیل ہوئی اور اس کے بعد ۲۸ دسمبر ۱۹۷۹ میں سوویت فوجوں نے افغانستان پر قبضہ کر لیا۔ثور انقلاب کے بعد افغانستان میں نور محمد ترکئی کی کیمونسٹ حکومت اور مجاہدین کے درمیان خانہ جنگی شروع ہو چکی تھی۔اس کے ساتھ ساتھ افغان حکومت کے دو دھڑوں جن کی قیادت نور محمد ترکئی اور حفیظ اللہ امین کر رہے تھے، کے درمیان بھی خانہ جنگی کا آغاز ہو گیا۔یہی وہ دھڑوں کی لڑائی تھی جو افغانستان میں سوویت مداخلت کا باعث بنی تھی۔واشنگٹن میں اس صورتحال کو ماسکو کے ساتھ سرد جنگ کے تناظر میں دیکھا گیا۔نئی صورتحال میں جنرل ضیاء امریکہ کا فرنٹ لائن اتحادی بن چکا تھا۔امریکہ میں نئے منتخب ہونے والے صدر ریگن نے سابق صدر جمی کارٹر کی خارجہ پالیسی کو نئی صورتحال کے تناظر میں ڈھالنا شروع کر دیا۔اس کے نتیجے میں چھ سال کے عرصے میں پاکستان میں ۳٫۲ ارب ڈالر کے قریب امریکی امداد موصول ہوئی۔یوں پاکستان اسرائیل اور مصر کے بعد امریکی امداد وصول کرنے والا تیسرا سب سے بڑا ملک بن گیا (۱۳)۔امریکی امداد نے پاکستانی فوج کو جمہوری قوتوں کے مقابلے میں زیادہ توانا بنا دیا۔اپنے مفادات کیلئے امریکہ نے پاکستان میں انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں اور نیوکلیائی عدم پھیلاؤ کی پالیسی کے حوالے سے پریسلر ترمیم کی موجودگی میں بھی پاکستان کے غیر تسلی بخش ٹریک ریکارڈ کے حوالے سے آنکھیں بند کر لیں (۱۴)۔ایک جانب امریکہ کیلئے افغانستان سوویت یونین کو نیچا دکھانے کی بین الاقوامی مہم کے نئے محاذ کا کام دے رہا تھا وہیں دوسری جانب پاکستان اسے بھارت کے خلاف اپنی دیرینہ پالیسی کے حوالے سے سٹریٹجک گہرائی کے طور پر دیکھ رہا تھا۔افغانستان میں جاری تصادم کے حوالے سے باریک بینی سے تیار کی گئی پالیسیوں کے نتیجے میں پاکستان روس کی جانب سے بھرپور جوابی حملے کے خطرے سے محفوظ ہو گیا۔افغانستان میں سوویت یونین کے خلاف کامیاب حکمت عملی نے پاکستان کے حوصلے بڑھا دیئے اور اس نے اس حکمت عملی کا دائرہ کشمیر تک پھیلانے کا فیصلہ کر لیا۔

تاہم افغانستان میں امریکہ اور پاکستان کے درمیان سب اچھا نہیں تھا۔دونوں ملکوں کے درمیان تعلقات کو اس وقت دھچکا لگا جب افغان مجاہدین کو فراہم کیے جانے والے امریکی ہتھیار چوری ہوئے، منشیات کی وبا پھیلنے لگی اور پاکستان میں افغان مہاجرین کے سیلاب میں بے پناہ اضافہ ہونا شروع ہوا۔اس دور میں پاکستانی فوج اور آئی ایس آئی کے افغان مجاہدین کے ساتھ مثالی تعلقات استوار ہو چکے تھے۔آئی ایس آئی کے ایک سابق اہم عہدیدار کے مطابق ۱۹۸۷ تک کم از کم ۸۰،۰۰۰ مجاہدین پاکستان میں موجود تربیتی کیمپوں سے ٹریننگ حاصل کر چکے تھے(۱۵)۔ان عسکری مجاہدین کی تنظیم دراصل جماعت اسلامی اور جمعیت العلماء اسلام کی ہی پروردہ تھیں۔بعد ازاں انہی عسکری تنظیموں نے پاکستان میں فرقہ ورانہ دہشت گردی کو بام عروج تک پہنچادیا۔

ضیاء کی مطلق العنانیت

جیسا کہ اقبال اخوند نے بیان کیا ہے، ضیاء پاکستانی حکمرانوں کی اس طویل قطار میں شامل تھا جو آمرانہ ہتھکنڈوں سے کام لیتے تھے اور قانون کی عمل داری کو گھٹانے کی کوشش کرتے تھے(۱۶)۔ان کے اقدامات جوان کی ہوس اقتدار کے گرد گھومتے تھے، پاکستان میں جمہوری عمل کو بے پناہ نقصان پہنچانے کا باعث تھے۔تاہم جنرل ضیاء کا دور اپنی طوالت اور شدت کی وجہ سے سب سے زیادہ نقصان دہ ثابت ہوا۔جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، ایوب خان کا دور بھی آزادی صحافت کیلئے بہت کڑا تھا لیکن ضیاء نے رائے عامہ کی آنکھوں کے سامنے صحافیوں کو کوڑے مار کر سفاکیت کی نئی مثال قائم کردی تھی۔یہ مئی ۱۹۷۸ کے بدقسمت دن تھے جب لاہور میں چار صحافیوں کو کوڑے مارے گئے صرف اس وجہ سے کہ انہوں نے روزنامہ مساوات کی جبری بندش کے خاتمے کیلئے بھوک ہڑتال کردی تھی۔ان کے علاوہ سیاسی کارکنوں کو جیل کے قیدیوں سے سرعام کوڑے مروانا ایسی حرکت تھی جو ضیاء کے مارشل لاء کے چہرے پر بدنام داغ کی حیثیت رکھتی ہے۔ضیا مارشل لاء کے دوران سیاسی سرگرمیاں شجر ممنوع قرار پا گئی تھیں۔مارشل لا

ریگولیشن نمبر ۴۸ کے تحت سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لینے کی زیادہ سے زیادہ سزا ۲۵ کوڑے مقرر کی گئی تھی جبکہ ''ممنوع مواد'' کی اشاعت کے جرم میں ایڈیٹر کو ۱۰ سے ۲۵ سال تک قید بامشقت سنائی جاسکتی تھی۔اس سے قبل ستمبر ۱۹۸۳ میں پاکستان میڈیکل ایسوسی ایشن کی کراچی برانچ نے حکومت سے مطالبہ کیا تھا کہ وہ کوڑوں کی سزا کے دوران ڈاکٹروں کو انوالو نہ کیا کرے۔ایسوسی ایشن نے یہ مطالبہ بھی کیا کہ تمام قیدیوں کی کوڑوں کی سزا انسانی ہمدردی کی بنیاد پر منسوخ کردی جائے(۱۸)۔

ضیاء حکومت کے دوران سیاسی حریفوں کو تشدد کا نشانہ بنانا معمول کی بات بن چکی تھی۔اس رویئے پر اس شدت سے عمل کیا جارہا تھا کہ ۱۹۸۱ اور پھر ۱۹۸۳ میں سیاسی مخالفین پر فوج کے کریک ڈاؤن نے عالمی رائے عامہ کی توجہ بھی اپنی جانب مبذول کرائی تھی اور دنیا بھر میں اس رویئے کی شدید مذمت کی گئی تھی۔ضیاء دور کے دوران پرتشدد رجحانات کی گونج پاکستانی ادب میں بھی بہت واضح طور پر سنائی دیتی ہے۔اس دور میں ضیاء حکومت کے ظلم کے خلاف لکھے جانے والے ادب کو ''مزاحمتی ادب'' کا نام دیا جاتا ہے(۱۹)۔

جہاں ایک جانب ضیاء حکومت نے اپنے سیاسی مخالفین اور باغیوں کی آواز کو دبانے کیلئے ظلم کی نئی مثالیں قائم کیں وہیں دوسری جانب اس نے میڈیا کی آواز دبانے کیلئے سنسر شپ کا آزمودہ حربہ بھی بے دریغ استعمال کیا۔یہ وہ حربہ تھا جو گزشتہ ادوار میں صحت مند مباحث اور پھولتی پھلتی جمہوری اقدار کو کچلنے کیلئے فراوانی سے استعمال کیا جاتا تھا تاہم اس میں بھی ضیاء حکومت نے نئی انتہائی اختراع کی تھیں۔اکتوبر ۱۹۷۹ کو حکم جاری کیا گیا کہ آئندہ سے تمام اخبارات پری سنسر شپ کروانے کے پابند ہوں گے۔اس مقصد کے تحت اخبارات اور جرائد کے پروف اشاعت سے پہلے سکروٹنی کیلئے جمع کروانے لازمی تھے۔مارشل لاء حکام اور وزارت اطلاعات کی جانب سے یہ ہدایات بھی جاری کی جاتی تھیں کہ اخبارات اور جرائد کو اپنی اشاعت میں کیا کچھ شامل کرنا چاہیے اور انہیں مسائل کو کس انداز میں کور کرنا چاہیے۔۱۹۷۹ میں موشن پکچرز آرڈیننس کا اجراء کیا گیا جس کے تحت پاکستان میں بننے والی فلموں کو اخلاقی اقدار اور مذہبی

تعلیمات اور پاکستان کے وقار کو نقصان پہنچانے کے بہانوں سے کاٹ پیٹ کر رکھ دیا جاتا تھا۔اس آرڈی نینس کا استعمال صرف اور صرف پاکستان میں موجود تخلیقی ٹیلنٹ کو دبانے کیلئے استعمال کیا جا رہا تھا وگرنہ ہالی ووڈ اور بالی ووڈ کی فلموں کی وڈیو کیسٹ اس دور میں بھی بازار میں عام دستیاب تھیں۔

اس دور میں ریاست نے تعلیمی اداروں کے نصاب اور کتابوں کی اشاعت پر کنٹرول میں بھی اضافہ کر دیا تھا۔حکومت نے ہائی سکول سے یونیورسٹی کی سطح تک مطالعہ پاکستان کو لازمی مضمون کی حیثیت سے تعلیمی نصاب میں شامل کر دیا تھا۔اس میں شامل حکومت کا منظور کردہ مواد نا صرف تاریخ کا یک رخا تصور پیش کرتا تھا بلکہ جیسا کہ تاریخ دان کے۔کے عزیز نے قرار دیا ہے کہ یہ مواد جنگی جنون کو ہوا دیتا تھا اور نوجوان نسل کے کچے ذہنوں میں فوجیوں کی ہیرو ورشپ کے بیج بوتا تھا(۲۰)۔بہت سے دیگر آمروں کی طرح ضیاء کو بھی از سر نو تاریخ کو لکھنے کا خبط تھا۔تعلیمی اداروں میں پڑھائی جانے والی تاریخ میں تحریک پاکستان کی مبہم اور قابل بحث باتوں کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے اسلامی ریاست کے قیام کی جدوجہد کو قیام پاکستان کا واحد مقصد قرار دیا گیا تھا۔سرکاری تاریخ میں محمد علی جناح کو اسلام کا سپاہی قرار دیا گیا تھا جبکہ علماء جن کا تحریک پاکستان کے ساتھ بہت معمولی تعلق رہا تھا کو تحریک پاکستان کے ہراول دستے میں شامل کرا دیا گیا تھا۔۲۵ دسمبر کو محمد علی جناح کی سالگرہ کے موقع پر اخبارات کے خصوصی ایڈیشنوں کی اشاعت میں ان کی دستور ساز اسمبلی میں کی گئی اس تقریر کو نکال دیا گیا جس میں انہوں نے مذہبی آزادی اور عقیدے کو افراد کی نجی زندگی کے حوالے سے دیکھنے کی بات کی تھی۔اس سے اگلے برس ضیا حکومت کو خیال آیا کہ کیوں نہ جناح صاحب کی زندگی پر فیچر فلم بنائی جائے۔اس حوالے سے حکومت فلم انڈسٹری سے چاہتی تھی کہ وہ قائداعظم محمد علی جناح کو اسلام کے سچے سپاہی اور مبلغ کی حیثیت سے پیش کرے۔حکومت نے اس حوالے سے خود فلم کی پروڈکشن کا فیصلہ کیا۔فلم انگریزی زبان میں تھی اور اس کا ٹائٹل Stand Up from the Dust تھا۔اس فلم کی پروڈکشن میں وزارت اطلاعات ونشریات پاکستان ٹیلیویژن کارپوریشن کی شراکت کے ساتھ سرگرم ہوگئی۔فلم کی تکمیل کیلئے حکومت

کے ہمدرد دانشوروں اور صحافیوں کی خدمات حاصل کی گئیں۔اس فلم کے سکرپٹ کیلئے حسب ذیل معیارات مقرر کیے گئے:

☆۔ مذکورہ فلم مارشل لاء حکومت کی پالیسیوں سے انحراف نہ کرے۔

☆۔ قائداعظم کو گاندھی سے بڑا لیڈر دکھایا جائے اور یہ ظاہر کیا جائے کہ تخلیق پاکستان اس وجہ سے ممکن ہوئی کہ انہیں مسلم لیگ اور اس کے ہمدردوں پر مکمل کمانڈ حاصل تھی۔

☆۔ اس بات پر زور دیا جائے کہ قائداعظم کی تمام تر کوششوں کا مرکز پاکستان کو ایک اسلامی ریاست بنانے کا عزم تھا جیسا کہ مارشل لاء حکومت کا موقف ہے۔

فلم کے آغاز میں بحیرہ عرب کی جانب سے ایک مسلح گھڑسوار کو آتے ہوئے دکھایا جاتا ہے جو اس بات کا اظہار تھا کہ پاکستان کی سرزمین پر پہلے مسلمان حملہ آور محمد بن قاسم کی آمد کے ساتھ ہی ہندوستان میں دوقومی نظریے کی بنیاد پڑ گئی تھی۔فلم کے راوی نے بات کو مکمل کرتے ہوئے کچھ ایسی ہی بات دہرائی تھی، ''پاکستان اس کا کارنامہ تھا، ہندوستان کے مسلمانوں کا ایک آزاد وطن، ایک خود مختار ریاست جہاں اسلام نا صرف اپنے مذہبی رسومات کے مطابق پھل پھول سکتا ہے بلکہ اس کا اظہار کلچر، قانون، معاشیات اور درحقیقت زندگی کے ہر شعبے میں ہوگا''(۲۲)۔

اس فلم کے رش پرنٹ کو دیکھنے کے بعد ضیاء نے کسی خاص گرمجوشی کا اظہار نہیں کیا جس کے نتیجے میں وہ فلم ہمیشہ کیلئے ڈبے میں بند ہوگئی حالانکہ اس فلم پر حکومت کا بہت پیسہ خرچ ہوا تھا۔جیسا کہ ہم آگے چل کر دیکھیں گے کہ پاکستانی معاشرے اور اس کی معیشت کی اسلامائزیشن اس حکومت کی تمام تر کوششوں کا مرکز ومحور تھا۔ضیاء نے اس عمل کو پاکستان کے دیرینہ شناخت کے مسئلے کے جامع حل کے طور پر بھی دیکھا تھا۔تاہم اس کی توقعات کے برعکس اسلام قومی یکجہتی کو پیدا کرنے کیلئے سلسلے میں زیادہ موثر کردار ادا نہیں کر سکا۔

ضیاء کے دور کا ابتدائی حصہ انتخابات کرانے کے وعدوں سے اٹا ہوا ہے۔تاہم ہر بار وعدہ کرنے کے بعد عام انتخابات کے انعقاد کو ملتوی کیا جاتا رہا۔اس کی وجہ حکومت کی یہ پریشانی تھی کہ انتخابات میں پیپلز پارٹی کو فتح یاب ہونے سے نہیں روکا جاسکے گا جو اقتدار میں آنے کے بعد مارشل لاء لگوانے میں سرگرم کردار ادا کرنے والوں کا احتساب کرسکتی ہے۔اس حوالے سے اقبال اخوند اور جنرل فیض علی چشتی دونوں کا خیال ہے کہ عدالتی قتل کے ذریعے ''بھٹو کے مسئلے'' کو حل کرنا دراصل ضیاء کے خدشات کا منطقی نتیجہ تھا (۲۳)۔جنرل ضیاء نے اکتوبر ۱۹۷۹ میں عام انتخابات ملتوی کیے تو اس کے ساتھ ہی سیاسی پارٹیوں پر بھی پابندی عائد کردی تھی۔۱۹۸۳ میں سندھ میں ایم آرڈی کی تحریک کے دوران ضیاء نے ایک قدم آگے بڑھاتے ہوئے پیپلز پارٹی کے تمام کارکنوں پر دس سال کیلئے سیاست میں حصہ لینے پر پابندی عائد کردی تھی۔

اپنے پیشرو جنرل ایوب خان کی طرح ضیاء نے بھی اپنی حکومت کو موثر بنانے کیلئے اس کی بنیادوں کو وسیع کرنے کا عمل شروع کیا۔مارشل لاء کا پہلا سال مکمل ہونے پر ضیاء نے اپنی کابینہ میں توسیع کرتے ہوئے اس میں کچھ سویلین وزیروں کو بھی شامل کیا جبکہ اس سے قبل یہ کابینہ فوجی اور سول افسر شاہی کی حد تک محدود تھی۔اس کابینہ میں جماعت اسلامی کے علاوہ سندھ سے پیر پگاڑو کی مسلم لیگ کو بھی نمائندگی دی گئی اور پگاڑو کے مرید محمد خان جونیجو کو ریلوے کی وزارت کا انچارج وزیر بنادیا گیا۔۱۹۸۱ کے اختتام پر جنرل ضیاء نے سابق انگریز حکمرانوں کی روایت کو تازہ کرتے ہوئے ایک مشاورتی اسمبلی تشکیل دی جس کے ارکان کو براہ راست ڈپٹی کمشنروں کی رپورٹوں کی روشنی میں نامزد کیا گیا تھا۔اپنے اسلامائزیشن کے عمل کی روشنی میں ضیاء نے اپنی نامزد کردہ مشاورتی اسمبلی کو مجلس شوریٰ کا نام دیا۔اس اقدام کے نتیجے میں اچانک جنرل ضیاء کے اپنے سب سے بااعتماد اتحادیوں یعنی علماء کے ساتھ اختلافات پیدا ہو گئے جن کا موقف تھا کہ اسلامی تعلیمات کی رو سے مجلس شوریٰ کی حیثیت فیصلہ ساز ادارے کی ہے نہ کہ محض مشاورتی ادارے کی اور یہ کہ مجلس شوریٰ کسی حکمران کے فیصلوں پر مہر تصدیق ثبت کرنے کیلئے نہیں بلکہ باہمی مشاورت سے آزادانہ فیصلے کرنے کیلئے ہوتی ہے۔دوسری

جانب ضیا کی پرجوش حمایتی جماعت اسلامی نے بھی ضیاء کے ساتھ فیصلے پیدا کرنے شروع کردیئے جس کی بنیاد جماعت کا یہ موقف تھا کہ ضیاء اسلام کے نفاذ میں تاخیر کا مرتکب ہورہا ہے۔اس کے بعد جماعت اسلامی نے زور وشور سے ملک میں عام انتخابات کرانے کا مطالبہ کرنا شروع کردیا جن کے بارے میں اس کا خیال تھا کہ انتخابات کے نتیجے میں اسلامائزیشن پر پوری طرح عملدرآمد ممکن ہوسکے گا۔ضیاء کی جانب سے انتخابات کرانے میں لیت ولعل کی پالیسی نے جماعت اسلامی کو زیادہ ناراض کردیا۔اس ناراضی میں اس وقت مزید اضافہ ہوگیا جب جماعت اسلامی کی طلبہ تنظیم اسلامی جمعیت طلباء نے جماعت کے مطالبوں کے حق میں ہنگامہ آرائی شروع کردی جس کے جواب میں مارشل لاء انتظامیہ نے سیاسی جماعتوں کے ساتھ وابستہ دیگر طلباء تنظیموں سمیت اسلامی جمعیت طلباء پر بھی پابندی عائد کردی۔

جنرل ضیاء نے انتخابات کے حوالے سے دو رخی پالیسی پر عمل درآمد شروع کردیا۔اول یہ کہ اس نے ایک ریفرنڈم کے انعقاد کے ذریعے خود اپنے صدر بننے کی راہ ہموار کرنے کی کوشش کی۔دوم یہ کہ اس نے اس عزم کا اظہار کیا کہ ملک میں ہونے والے متوقع انتخابات ''غیر جماعتی'' بنیادوں پر ہوں گے۔جہاں تک ریفرنڈم کا تعلق ہے تو اس میں پوچھے جانے والے سوال کے الفاظ کو ۱۹ دسمبر ۱۹۸۴ میں جلدی سے کچھ انداز میں طے کیا گیا کہ اس میں اسلام کے خلاف ووٹ دیئے بغیر جنرل ضیاء کو پانچ سال تک کیلئے صدر منتخب کرنے سے انکار کرنا ممکن نہ رہا تھا (۲۴)۔ریفرنڈم کے روز کراچی سمیت ملک کے تمام شہروں میں کچھ اس طرح کا منظر تھا کہ تنبو قناتیں لگا کر بنائے جانے والے پولنگ اسٹیشنوں پر مردوں اور عورتوں کے حصوں میں تعینات سرکاری عملہ ہاتھوں میں ووٹوں کی پرچیاں تھامے دن بھر جمائیاں لیتا اور گپیں ہانکتا رہا۔لیکن شام تک سرکاری ملازموں کے سوا کوئی بھی عام شہری ووٹ ڈالنے کیلئے نہ آیا۔اس روز سرکاری عملہ دن بھر آتے جاتے راہگیروں کی منتیں کرتا رہا کہ وہ آکر اپنا ووٹ کاسٹ کریں (۲۵)۔ملک کے تمام شہروں اور قصبوں میں یہی ایک منظر دن بھر دہرایا جاتا رہا لیکن شام کو پاکستان ٹیلیویژن کی نشریات دیکھ کر لوگ حیران رہ گئے کہ خبروں کے بلیٹن

اور خصوصی رپورٹوں میں دھڑلے سے ایسے پولنگ اسٹیشن دکھائے جاتے رہے جہاں لوگ ہجوم در ہجوم ریفرنڈم میں اپنا ووٹ کاسٹ کرنے کیلئے طویل قطاروں میں کھڑے تھے۔سرکاری طور پر اس ریفرنڈم میں ٹرن آوٹ ۶۲ فیصد کے قریب بتایا گیا جس میں سے جنرل ضیاء نے ۹۷،۷۱ فیصد ''ہاں'' ووٹ حاصل کیے تھے۔

آخر فروری ۱۹۸۵ میں غیر جماعتی بنیاد پر قومی اسمبلی کے انتخابات کروادیئے گئے ان انتخابات نے اگلے دسمبر میں ملک سے مارشل لاء کے خاتمے کا راستہ ہموار کردیا۔یہ جمہوریت کے طلوع ہونے کی بجائے مارشل لاء کا خاکی وردی اتار کر سول کپڑے پہننے جیسا عمل تھا۔ان انتخابات کو''گونگے بہرے'' انتخابات قرار دیا گیا کیونکہ ان کے دوران عوامی جلسوں، جلوسوں اور پبلک ایڈریس سسٹم پر سختی سے پابندی کا عائد کردی گئی تھی (۲۶)۔ایوب خان کی جانب سے غیر جماعتی انتخابات کرانے سے بھی کہیں زیادہ ان انتخابات کے نتائج جمہوری وسیاسی عمل کیلئے تباہ کن ثابت ہوئے۔ان کے نتیجے میں برادری ازم، سیاسی مزارع پن اور وڈیرہ شاہی کو پورے جاہ وجلال کے ساتھ ملک کے منظرنامے پر ابھرنے کا موقع مل گیا۔یہ عناصر پاکستان میں ہونے والے ہر انتخابات خاصا رہے ہیں اور روایتی طور پر جدید طرز سیاست کی راہ میں رکاوٹ بنتے چلے آئے ہیں۔سندھ میں ہونے والی تبدیلیوں کے دوران غیر جماعتی انتخابات نے سیاسی شناخت کو نسلی رنگ میں رنگے جانے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔

جنرل ضیاء نے اس بات کا پورا اہتمام کر رکھا تھا کہ وہ مارشل لاء اٹھانے کے بعد پہلے سے کہیں زیادہ طاقت کے ساتھ ابھرے۔اس مقصد کے تحت اس نے بظاہر بے ضرر دکھائی دینے والے محمد خان جونیجو کو وزارت عظمیٰ کیلئے نامزد کیا اور خود اپنی طاقت میں اضافے کیلئے آئین پاکستان میں آٹھویں ترمیم متعارف کرادی جس کے تحت صدر کو کسی بھی وقت منتخب وزیراعظم کو گھر بھیجنے اور اسمبلیوں کو تحلیل کرنے کے اختیارات حاصل ہوگئے تھے۔صدر نے صوبائی گورنروں کی نامزدگی اور مسلح افواج کے سربراہ کے تقرر کے اختیارات بھی اپنے ہاتھ میں رکھے تھے۔اس آئینی ترمیم نے آن والی حکومت کیلئے ایسی وراثت چھوڑی جس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ضیاء کے جانشین صدور کیلئے

جمہوریت کو تہہ تیغ کرنا آسان ہوگیا تھا۔جنرل ضیاء نے اس بات کو بھی یقینی بنایا کہ پارلیمنٹ ۱۹۷۷ کی فوجی بغاوت سمیت اس کے تمام اقدامات کو سند جواز عطا کردے۔

ضیاء ہر قیمت پر پیپلز پارٹی کو کچلنا چاہتا تھا۔ذوالفقار علی بھٹو کے ساتھ روا رکھے جانے والے سلوک کے پیچھے یہی ایک مقصد کارفرما تھا۔وہ اپنے اس مقصد میں کبھی کامیاب نہیں ہوسکا تھا۔اس کے پیپلز پارٹی کے ساتھ اپنائے جانے والے رویئے کے نتیجے میں ذوالفقار علی بھٹو کی بیٹی بے نظیر بھٹو ضیاء دور کے آخری برسوں میں اس کے اقتدار کیلئے بہت بڑے خطرے کی حیثیت سے ابھری تھی (۲۷)۔اپریل ۱۹۸۶ میں اس کی وطن واپسی پر چشم کشا استقبال کیا گیا۔تاہم ضیاء نا صرف اس کی طاقت کو ایک طویل عرصے تک دبائے رکھنے بلکہ پیپلز پارٹی کی مخالف جماعتوں کو مضبوط کرنے میں کامیاب ضرور رہا تھا۔جنرل ضیاء کی موت کے بعد ۱۹۸۸ میں ہونے والے انتخابات میں آئی ایس آئی نے پیپلز پارٹی کی مخالف جماعتوں کو ایک چھتری تلے جمع کرکے ان کی قوت کو مجتمع کرنے کے سلسلے میں بہت متحرک کردار ادا کیا تھا۔اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب بے نظیر بھٹو کو ان انتخابات کے نتیجے میں اقتدار پر فائز ہونے کا موقع ملا تو اس نے خود اعتراف کیا کہ اس کا ایک ہاتھ اس کی پشت کے ساتھ بندھا ہوا ہے۔

مارشل لاء اٹھائے جانے کے بعد بھی جنرل ضیاء کی اقتدار پر گرفت ایوب خان کی نسبت کہیں زیادہ مضبوط تھی۔۱۹۸۸ میں محمد خان جونیجو نے وزیراعظم کی حیثیت سے خاص طور پر خارجہ امور کے حوالے سے کسی حد تک خودمختاری حاصل کرنے کی کوشش ضرور کی تھی اور جیسا کہ ہم آگے چل کر بات کریں گے کہ فوجی اشرافیہ کی شاہانہ طرز زندگی کو لگام ڈالنے کی بھی کوشش کی تھی۔یہی وجہ ہے کہ جنرل ضیاء نے اسی برس مئی میں محمد خان جونیجو کو گھر کا راستہ دکھانے میں ذرا جھجک نہ دکھائی۔جونیجو نے اس بات کی بھی قیمت ادا کی تھی کہ اس نے افغانستان میں پاکستان کی بے تحاشہ سٹریٹجک سرمایہ کاری کے ثمرات سمیٹنے میں کامیابی حاصل نہیں کی تھی۔اس جمہوری تجربے کے بعد جنرل ضیاء اپنی موت سے کچھ عرصہ پہلے اپنے مارشل لاء کو مہذب بنانے کے تمام تر عمل کو برباد کرنے پر سنجیدگی سے آمادہ دکھائی دے رہا تھا۔وہ یقیناً اس پوزیشن میں تھا کیونکہ ایوب

خان اور مشرف کے برعکس اس نے اپنے پورے عرصہ اقتدار کے دوران فوج کی سربراہی نہیں چھوڑی تھی۔وہ پاکستان کے سابق فوجی حکمرانوں کی نسبت اپنی اپوزیشن کو تگنی کا ناچ نچانے میں کہیں زیادہ ماہر ثابت ہوا تھا۔یہاں تک کہ وہ لوگ بھی جو اسے عدم برداشت رکھنے والا اور منتقم مزاج حکمران کہتے ہیں یہ اعتراف کرنے پر مجبور ہیں کہ وہ ایک مخصوص قسم کی عیاری میں بے مثال تھا۔کچھ مخصوص قسم کے میلانات کے حامل آبادی کے ایک بڑے حصے نے ۲۰ اگست ۱۹۸۸ کو فیصل مسجد اسلام آباد میں اس کی تدفین کے موقع پر شدید غم زدہ ہجوم کی صورت میں جنازے میں شرکت کی تھی۔

ضیاء اور اسلامائزیشن

اسلامائزیشن ضیاء حکومت کی بنیاد کا پتھر تھا۔اس نے افغان جنگ کے علاقائی تناظر میں نشو ونما پائی اور داخلی طور پر اس نے ۱۹۷۰ کی دہائی کے آخر میں تیز رفتار سماجی و معاشی تبدیلیوں نیز ریاست کی داخلی کمزوریوں سے اپنی طاقت کشید کی تھی۔اس بارے میں آراء ابھی تک بٹی ہوئی ہیں کہ کیا اسلامائزیشن کا عمل ضیاء کی دیوبندی مکتبہ فکر سے متاثر سوچ کی پیداوار تھا یا اپنے اقتدار کیلئے جواز حاصل کرنے کی آشفتگی کا ماحصل تھا۔اگست ۱۹۸۳ میں اسلامک آئیڈیالوجی کی مشاورتی کونسل نے اعلان کیا تھا کہ صدارتی نظام حکومت اسلام کے قریب ترین ہے۔بعد ازاں یہ فتویٰ بھی سامنے آیا کہ سیاسی پارٹیوں کا وجود خلاف اسلام ہے۔اس کے پیچھے جو بھی محرکات ہوں لیکن یہ بات واضح ہے کہ اپنی نادانست میں ضیاء اسلامائزیشن کو پاکستان کے استحکام اور یکجہتی کی بنیاد سمجھتا تھا۔اپنے اقتدار سنبھالنے کے ابتدائی عرصے کے دوران اس نے اپنے ایک بیان میں کہا تھا کہ ”پاکستان جو اسلام کے نام پر وجود میں آیا تھا صرف اسی صورت میں اپنا وجود برقرار رکھ سکتا ہے اگر یہ سختی کے ساتھ اسلام کے اصولوں پر عمل پیرا رہے۔یہی وجہ ہے کہ میں سمجھتا ہوں کہ اسلامی نظام ہی اس ملک کی بقاء کیلئے شرط اولین ہے“ (۲۸)۔ مئی ۱۹۸۲ میں اس نے قرار دیا کہ پاکستان کی نظریاتی سرحدوں کی حفاظت اتنی ہی ضروری ہے جتنی جغرافیائی سرحدوں کی حفاظت (۲۹)۔

ہم پچھلی سطور میں دیکھ چکے ہیں کہ پاکستانی اسلام یک رنگ نہیں ہے۔کٹر دیوبندی اپروچ صوفیانہ مذہبی تعبیرات سے یکسر متضاد ہے۔ضیاء کی اسلامائزیشن نے عقیدے کے ان مختلف تصورات کے درمیان کشیدگی کو انتہا تک پہنچا دیا تھا۔قابل ذکر بات یہ ہے کہ ۱۹۸۳ میں سندھ میں ضیاء کے خلاف ایم آر ڈی کے احتجاج کے دوران صوفی درگاہوں نے ہراول دستے کا کردار ادا کیا تھا۔اس احتجاج کے دوران ایک موقع پر مخدوم آف ہالہ کے پچاس ہزار مریدوں نے کافی دنوں تک قومی شاہراہ کو بلاک کیے رکھا تھا۔اس سے بھی زیادہ خطرناک بات یہ ہوئی کہ اسلام کی مخصوص طرز کی حامل اسلامائزیشن نے ملک کی سماجی زندگی کو فرقہ واریت کی راہ پر ڈال دیا تھا۔موجودہ پاکستان میں تقسیم در تقسیم کا عمل اسی اسلامائزیشن کے عمل کا ثمر ہے۔

علماء حضرات اسلام کے حوالے سے اپنے عوامی فکری اظہار میں اتنے متحد دکھائی نہیں دیتے جتنا کہ وہ ۱۹۵۳ میں لاہور میں لگنے والے مارشل لاء کے وقت تھے۔ضیا دور میں انہوں نے اپنی توانائیوں کا بڑا حصہ فرقہ وارانہ تنازعات کو ابھارنے اور خود کو چھوٹے اور غیر اہم معاملات کا اسیر بنا دیا تھا۔اب توانائیاں ان باتوں پر صرف ہو رہی تھیں کہ کیا خون کا انتقال یا آنکھوں کا عطیہ دینا اسلامی ہے یا غیر اسلامی ہے۔اس دور میں انہوں نے عورتوں کو شرعی لباس اور برقع پہنانے اور داڑھی رکھنے کو لازمی قرار دینے کیلئے مارشل لاء آرڈی نینس جاری کروانے کے سلسلے میں ایڑھی چوٹی کا زور لگا دیا تھا۔

ابتدائی طور پر جماعت اسلامی کے کارکن اسلامائزیشن کے عمل میں پیش پیش تھے۔اس عرصے میں جمعیت العلماء اسلام اور جمعیت العلماء پاکستان سے وابستہ علماء حضرات ضیاء دور کی اسلامائزیشن سے کنارہ کشی اختیار کیے ہوئے تھے۔بعد میں جنرل ضیاء اور جماعت اسلامی کے درمیان بڑھتی ہوئی کشیدگی نے ضیاء کو دیگر دھڑوں کے علماء سے تعاون مانگنے پر مجبور کر دیا۔دیوبند مکتبہ فکر کے زیر اثر جمعیت العلماء اسلام نے پہلی مرتبہ اپنے شدت پکڑتے ہوئے بنیاد پرستانہ ورلڈ ویو میں ”اسلام ازم“ کے عناصر کو داخل کرنا شروع کر دیا تھا۔فرزانہ شیخ اس کیلئے ”شریعتائزیشن“ کی اصطلاح استعمال

کرتے ہوئے اسلام کی سیاسی اجارہ داری قائم کرنے اور اسلامی ریاست کے قیام کی خواہش کے درمیان ایک واضح خط امتیاز کھینچتی ہیں (۳۰)۔اول الذکر نظریہ اسلام کی بین الاقوامیت سے متعلق ہے جو مخصوص حالات میں جغرافیائی سرحدوں کے جواز پر سوال اٹھاتا ہے جبکہ دوسرا نظریہ اسلام کے نفاذ کیلئے ریاست کے قبضے کی جانب مائل ہوتا ہے اور اس خیال کے حامیوں کا ایک حصہ اپنے اس تصور کو ریاست پاکستان کے استحکام کیلئے ناگزیر خیال کرتا ہے۔ان دونوں متضاد تصورات کے نتائج و عواقب ضیاء دور میں کھل کر سامنے نہیں آسکے تھے۔تاہم موجودہ دور میں یہ تصورات نہایت واضح صورت اختیار کرتے ہوئے ہمارے سامنے آچکے ہیں جس کے مطابق ''شریعتائزیشن'' کے پیروکار طالبان ریاست کے خلاف برسر پیکار ہو چکے ہیں کیونکہ وہ اسلام کے نفاذ کیلئے ریاست پر قبضہ کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔جیسا کہ ہم آگے چل کر دیکھیں گے کہ جے یو آئی کے زیادہ متشدد دھڑے کی ریڈیکلائزیشن کا براہ راست تعلق افغانستان کی صورت حال اور فوج کی جانب سے اپنے علاقائی اہداف کے حصول کیلئے مسلح تنظیموں کو استعمال کرنے کے ساتھ ہے۔

۱۹۸۳ میں اسلامائزیشن کے عمل کو آگے بڑھانے کیلئے بہت سے اقدامات متعارف کرائے گئے تھے جو مختلف امور کے بارے میں اصلاحات پر مبنی تھے۔ان میں عدالتی اصلاحات (شریعت عدالتوں کا قیام)، اسلامی پینل کوڈ کا نفاذ (حدود آرڈی نینس)، معاشی سرگرمیوں کے حوالے سے اصلاحات (بلاسود بنکاری اور اسلامی ٹیکسوں، زکواۃ اور زرعی ٹیکس عشر کا نفاذ) تعلیمی پالیسیوں کی اصلاحات (ذریعہ تعلیم کے طور پر اردو پر زور، اسلام آباد میں اسلامک یونیورسٹی کا قیام اور مدارس کی ریاستی سرپرستی) جیسے اہم امور شامل تھے۔ان میں موخر الذکر نے آگے چل کر مسلح سیاسی و فرقہ ورانہ شناخت کے حامل مدارس کی حوصلہ افزائی اور ان مدارس کیلئے ریاستی کنٹرول سے آزاد ہونے کی آسانی فراہم کرنے کا باعث بنا تھا۔تاہم یہاں ہم سب سے پہلے عدالتی اصلاحات کے بارے میں بات کرتے ہیں۔

۱۔عدالتی اصلاحات

یہاں ابتداء میں ہی یہ واضح کردینا ضروری ہے کہ شریعت کورٹس کے قیام نے ناصرف سیکولر ذہن رکھنے والے وکلاء کو اس عدالتی عمل سے لاتعلق کردیا اور ملک کے عدالتی نظام میں الجھاؤں کو جنم دیا بلکہ خود آگے چل کر اسلام پسندوں اور علماء کو مایوس کردیا جن سے ضیا الحق ''ملا ملٹری ٹیکسس'' کے قیام کے سلسلے میں تعاون کی توقع کررہا تھا۔صوبوں میں موجود شریعت کورٹس کے ججوں نے ناصرف نئے شریعت قوانین پر عمل درآمد کرانا تھا بلکہ یہ بھی طے کرنا تھا کہ ملک کے موجودہ قوانین میں کون سے غیر اسلامی ہیں اور کون سے قوانین ایسے ہیں جو اسلامی تعلیمات کی مطابقت میں ہیں۔ان کورٹس کے قیام کے تھوڑے ہی عرصے کے بعد ان میں متضاد نوعیت کے الجھے ہوئے کیسوں پر مشتمل پٹیشنوں کی بھرمار ہوگئی۔ان میں سے بہت سی پٹیشنیں نہایت مضحکہ خیز معاملات کے بارے میں تھیں۔مثال کے طور پر سندھ ہائیکورٹ کے شریعت بنچ کے روبرو ایک پٹیشن کی شنوائی ہوئی کہ عورتوں کی ہاکی اور کرکٹ کی ٹیمیں اسلامی شریعت کے احکامات کی خلاف ورزی ہیں کیونکہ ان میں پردے کا خیال نہیں رکھا جاتا۔اسلامی عدالتی نظام کی ٹکڑوں میں تعمیر نے موجودہ قوانین کو خلاف اسلام قرار دینے جیسے امور کے حوالے سے شرعی عدالتوں اور ۱۹۸۰ میں قائم ہونے والی اسلامی نظریاتی کونسل کے درمیان عدالتی حدود کے تنازعے کو بھی جنم دیا۔۱۹۸۴ میں قاضی کورٹس جن میں اسلامی قوانین کے مطابق مقدمات کا فیصلہ کیا جاتا تھا کو وفاقی وزیریں شریعت کورٹس کے نظام کا حصہ بنادیا گیا۔علماء ان عدالتوں کے کنفیوزڈ اور سست رفتار عمل اور اس نئے نظام کی محدودیت پر شکایت کناں تھے۔صورتحال یوں تھی کہ اسلامی نظریاتی کونسل محض ایک مشاورتی ادارہ تھی جبکہ فیڈرل شریعت کورٹ کے پاس ایوب خان کے عائلی قوانین پر نظر ثانی کرنے کا اختیار نہ تھا جس کے بارے میں علماء حضرات کی متفقہ رائے تھی کہ یہ اسلامی تعلیمات کے خلاف ہیں۔عدالتی اصلاحات نے ملک میں فرقہ ورایت کے فروغ میں بھی نمایاں کردار ادا کیا۔اس کی ایک اہم وجہ یہ تھی کہ ان عدالتوں میں کوئی ایک بھی شیعہ جج مقرر

نہ کیا گیا جس کی وجہ سے شیعہ کمیونٹی نے مجموعی طور پر اس سارے عمل کا اور ان عدالتوں کی جانب سے کیے جانے والے فیصلوں کا بائیکاٹ کر رکھا تھا۔

تاہم سنی شیعہ جھگڑے کو فروغ دینے میں سب سے بڑا کردار جنرل ضیاء کی معاشی اصلاحات نے کیا جو ایرانی انقلاب کے بعد شیعہ ایکٹوازم کے ردعمل میں نافذ کی گئی تھیں۔

۲۔معاشی اصلاحات

ریاست کی جانب سے اسلامی قوانین جو اپنی روح میں انسانی ہمدردی کے جذبات کے تحت رضاکارانہ نوعیت کے حامل تھے کے جبری نفاذ نے ملک میں ایک تلخ فرقہ ورانہ اختلاف کی لہر دوڑادی۔زکواۃ وعشر آرڈی نینس (جس کے تحت اسلامی ٹیکسوں کو غیر رضاکارانہ طور پر نافذ کر دیا گیا تھا) کے نفاذ کو شیعہ کمیونٹی نے ریاست کو سنی بالادستی کے سلسلے کی ایک کڑی قرار دیا۔اس کے خلاف ردعمل یوں سامنے آیا کہ ''تحریک نفاذِ فقہ جعفریہ پاکستان'' نام کی ایک شیعہ پارٹی کا قیام عمل میں لایا گیا جس کا مقصد پاکستان کو سنی فقہ کی حامل ریاست بنانے کی کوششوں کی مزاحمت کرنا تھا۔شیعہ حضرات کو زکواۃ کے رضاکارانہ نفاذ پر اعتراض نہیں تھا لیکن اس کے جبری نفاذ پر انہیں شدید اعتراض تھا جس کے تحت ملک کے تمام بنکوں کے سیونگز اکاؤنٹس سے ۲ء۵ فیصد کی شرح سے جبری کٹوتی کر کے اس رقم کو سنی فلاحی اداروں پر خرچ کیا جانے کا امکان تھا۔جولائی ۱۹۸۰ میں تحریک نفاذ فقہ جعفریہ نے ملک میں سیاسی اجتماعات پر پابندی کی کھلم کھلا خلاف ورزی کرتے ہوئے دوروزہ احتجاج کا اعلان کیا۔اس موقع پر ملک بھر سے بہت بڑی تعداد میں شیعہ کمیونٹی سے تعلق رکھنے والے افراد اسلام آباد میں اکٹھے ہو گئے اور انہوں نے ضیاء حکومت اور زکواۃ آرڈی نینس کے خلاف پرتشدد احتجاج کیا۔اس احتجاج کے بعد مجبوری کے عالم میں ضیاء الحق نے شیعہ کمیونٹی کو زکواۃ سے مستثنیٰ قرار دے دیا تاہم اس کے ردعمل میں دیوبندی اور اہلحدیث فرقے سے تعلق رکھنے والی سنی تنظیموں نے شیعوں کو کافر قرار دلوانے کیلئے ایک منظم مہم شروع کر دی۔اس کے بعد ہی ضیاء

حکومت نے سنی مدارس کی شدومد کے ساتھ سرپرستی شروع کی تھی جس کا مقصد ملک کے اندر موجود اور ایران کی جانب سے آنے والے ''شیعہ مسئلے'' کا توڑ کرنا تھا۔ایک مشاہدہ کار کے مطابق ''بلوچستان اور صوبہ سرحد میں ریاست کے خرچے پر مدارس کی تعمیر کا مقصد ایران کے اثرات کو پاکستان میں داخل ہونے سے روکنے کیلئے دیوار تعمیر کرنا تھا'' (۳۱)۔

تحریک نفاذ فقہ جعفریہ کی قیادت فروری ۱۹۸۴ میں علامہ عارف الحسینی نے سنبھالی تھی جو ایران اور عراق کے مدارس کے فارغ التحصیل تھے اور اس دوران آیت اللہ خمینی کے افکار کو اپنی ذات میں سمو چکے تھے۔اگست ۱۹۸۸ میں ان کے قتل کے بعد تحریک فقہ جعفریہ میں سے ایک مسلح تنظیم پیدا ہوئی تھی۔ ''سپاہ محمد'' نام کی یہ تنظیم ملک کے مختلف حصوں میں سپاہ صحابہ اور سنی تحریک نامی دیوبندی مسلح تنظیموں کے ساتھ طویل عرصہ تک برسرپیکار رہی تھی۔دیوبندی مکتبہ فکر کی حامل ان دونوں تنظیموں کے ارکان کو افغانستان میں روسی فوجوں کے خلاف لڑنے والے مجاہدین کے کیمپوں میں تربیت اور اسلحہ فراہم کیا جاتا تھا۔افغان جنگ کے خاتمے کے بعد ان تنظیموں نے پاکستان کے اندر اپنے تربیتی کیمپ قائم کر لیے تھے جو نا صرف ان تنظیموں کے وابستگان کو تربیت فراہم کرتے بلکہ ان کیلئے محفوظ پناہ گاہوں کا کام بھی کرتے تھے۔بعد ازاں جب سپاہ صحابہ میں تقسیم ہوئی اور اس کے زیادہ شدت پسند حصے نے ایک اور مسلح تنظیم ''لشکر جھنگوی'' کے نام سے تشکیل دے دی جو خالص فرقہ ورانہ بنیادوں پر شیعہ کمیونٹی کے قتل کی حامی تھی۔اس نئی تنظیم کے ارکان کو افغانستان میں سرگرم حرکت الانصار نے تربیت فراہم کرنا شروع کی۔حرکت الانصار بھی ایک اینٹی شیعہ تنظیم تھی جو کشمیر جہاد میں بھی نمایاں طور پر سرگرم رہی اور جس کی اسامہ بن لادن کی القاعدہ کے ساتھ وابستگی تھی۔جہادیوں اور شدت پسند سنی تنظیموں کے درمیان تال میل موجودہ پاکستان میں ضیاء دور کی وراثتوں میں ایک اور افسوسناک وراثت ہے۔

زکواۃ کے نظام نے نا صرف قانونی جواز اور رقومات کی تقسیم کے حوالے سے شیعہ سنی تنازعہ کو جنم دیا بلکہ یہ ایک فلاحی مسلمان ریاست کی تشکیل میں بھی ناکام رہا۔اس

نظام کے تحت ''مستحقین'' میں تقسیم کرنے کیلئے بہت قلیل مقدار میں رقم دستیاب ہوتی ہے جبکہ زکواۃ کمیٹیوں میں بہت بڑے پیمانے پر کرپشن کی کہانیاں بھی زیر گردش رہتی ہیں۔اسی طرح دیگر آرڈی نینسوں کے ذریعے قوم کے اخلاقی معیارات کو بلند کرنے کی کوششیں بھی ناکامی سے دوچار ہوئیں۔ان میں رمضان آرڈی نینس بھی شامل ہے جس کے تحت ماہ رمضان میں سرعام کھانے پینے کو قابل سزا جرم قرار دے دیا گیا تھا نیز نماز قائم کرانے کیلئے وارڈنوں کی بھرتی بھی شامل ہے جن کا کام راہ چلتے لوگوں کو نماز کیلئے مسجد جانے پر آمادہ کرنا اور یہ نگرانی کرنا تھا کہ ان کے اردگرد موجود لوگوں میں سے کون نماز پڑھنے کیلئے مسجد میں جاتا ہے اور کون نہیں۔ضیاء دور میں اسلامائزیشن کے حوالے سے اٹھائے جانے والے تمام ریاستی اقدامات عملی طور پر نفاذ کے بعد ناکامی سے دوچار سے دوچار ہو چکے تھے۔

۳۔اسلامی سزاؤں کے ضابطہ (اسلامک پینل کوڈ):

اسلامائزیشن کا عمل قومی اتفاق رائے پیدا کرنے میں بری طرح ناکام رہا تھا کیونکہ اس نے شروع میں ہی فرقہ ورانہ کشیدگی کو بڑھا دیا تھا۔اس عمل کے ذریعے علماء کے اس طبقے کو بھی طاقت حاصل ہوگئی جو قومی شناخت کو مفروضہ ''اسلامی امہ'' کے تصور کے سانچے میں ڈھالتے ہوئے اس کی روشنی میں نیشنل ازم کی از سر نو تعریف متعین کرنے پر بضد ہے (۳۲)۔اسلامائزیشن نے مذہبی اسٹیبلشمنٹ اور لبرل طبقات کے درمیان پہلے سے موجود خلیج کو بھی وسیع تر کردیا تھا۔وکلاء، انسانی حقوق کے کارکن اور پڑھی لکھی خواتین ضیاء کی اسلامائزیشن کے نتیجے میں مسلط کیے جانے والے انتقامی اور امتیازی عناصر کے خلاف سول سوسائٹی کی جدوجہد کی اگلی صفوں میں شامل تھے۔دوسری جانب غیر مسلموں کو جداگانہ انتخابی نظام میں معاشرے کے مرکزی دھارے سے کاٹ کر الگ کردیا گیا تھا اور وہ توہین رسالت جیسے الزامات کا آسان نشانہ بن چکے تھے۔صدارتی آرڈی نینس کے ذریعے پاکستان پینل کوڈ میں کی جانے والی ترمیم کے ذریعے احمدیوں کو مسلمانوں کی علامات استعمال کرنے، مخصوص اسلامی اصطلاحات

استعمال کرنے اور مسلمانوں جیسی عبادات کرنے کو قابل سزا جرم قرار دے دیا تھا۔جہاں ایک جانب غیر مسلموں کو انتخابی حوالے سے مسلمان اکثریت سے کاٹ دیا گیا تھا وہیں دوسری جانب ضیاء کی وراثت نے عسکریت پسند گروہوں کو محض عقائد کے حوالے سے احمدیوں کے خلاف ہر قسم کی کارروائیوں کی اجازت عطا کردی تھی۔

طبقہ اشرافیہ سے تعلق رکھنے والی خواتین نے ''وومن ایکشن فورم'' تشکیل دے کر اس کے پلیٹ فارم سے قانون شہادت (۳۳) اور حدود آرڈی نینس پر عمل درآمد کے خلاف اپنی جدوجہد کا آغاز کردیا تھا (۳۴)۔قانون شہادت نا صرف عورتوں کے قانونی سٹیٹس کی نفی کرتا ہے بلکہ یہ آئین میں دیئے گئے عورتوں کے مساوی حقوق کو بھی غصب کرتا ہے۔حدود آرڈی نینس زنا کے ارتکاب پر عورتوں کو سرعام کوڑے لگانے کی اسلامی تعزیر کے سزاوار ٹھہراتا ہے۔زنا آرڈی نینس نا صرف عورتوں کے خلاف امتیازی قانون ہے بلکہ اس کے ذریعے غیرت کے نام پر بیٹی، بیوی اور بہن کے قتل کی راہ بھی ہموار ہو جاتی ہے۔قانون شہادت کے خلاف عورتوں کے لاہور ہائیکورٹ کے باہر ہونے والے ایسے ہی ایک مظاہرے کے دوران پولیس نے ان پر حملہ کردیا اور انہیں لاٹھی چارج اور آنسو گیس کا نشانہ بنایا گیا۔اس واقعے پر رجعت پسند حلقوں اور لبرل طبقات کے درمیان واضح تفریق بھی دیکھنے میں آئی۔علماء نے عورتوں کے اس مظاہرے کو گمراہی پر مبنی اور اسلامی تعلیمات کے خلاف قرار دیا جبکہ لاہور لائیکورٹ بار ایسوسی ایشن نے پولیس کی بربریت پر سخت ترین احتجاج کیا۔حدود آرڈی نینس کو آج تک ختم نہیں کیا جا سکتا ہے جو اس بات کا اظہار ہے کہ ضیاء دور میں طاقت پکڑنے والے رجعت پسند طبقے کی پوزیشن سماجی اور سیاسی طور پر کس حد تک مضبوط ہے۔

۴۔ تعلیمی اصلاحات

تعلیمی حوالے سے ضیاء دور کی اہم ترین وراثت ملک کے مختلف علاقوں میں کھمبیوں کی طرح دینی مدارس کا قائم ہونا تھا۔ان میں سے زیادہ تر مدارس کی فنڈنگ زکواۃ کے پیسے سے کی جاتی تھی۔ریاست کی جانب سے بچوں کو تعلیم کی فراہمی میں

ناکامی کے بعد یہ مدارس آبادی کے انتہائی غریب اور پسماندہ ترین طبقات کے بچوں کیلئے حصول تعلیم کے واحد ذریعے کی حیثیت رکھتے تھے۔ان مدارس میں مذہبی تعلیم حاصل کرنے کی حیثیت میں اس وقت اضافہ ہوگیا جب ضیاء نے ان کی ڈگریوں کے رتبے میں اضافہ کردیا (درجہء عالیہ، درجہ عالیہ)۔ریاست ان مدارس کی ڈگریوں کوتسلیم کرنے کی پابند تھی اس کے باوجود یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کوان کے نصاب پر کسی طرح کا کنٹرول حاصل نہیں تھا۔ضیاء دور میں یہ مدارس کس تیزی کے ساتھ پھیلے اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ۱۹۸۳-۴ تک ملک بھر میں ۱۲ ہزار مدارس قائم ہوئے ۱۹۴۷-۳۵ میں پورے ملک میں کل ۲۵۰ دینی مدارس ہوا کرتے تھے۔جیسا کہ ہم پہلے بیان کرچکے ہیں کہ ان مدارس کے قیام کے سلسلے میں سرکاری طور پر امداد فراہم کی جاتی تھی تاکہ یہ دیوبندی مدارس کامیابی کے ساتھ ''شیعہ خطرے'' کا مقابلہ کرسکیں۔ضیاء حکومت کے اس رویئے نے ملک میں فرقہ واریت کی جڑوں کو مضبوط کیا خاص طور پر اس صورت میں بھی کہ ان مدارس کا کوئی طے شدہ معیاری نصاب مقرر نہیں کیا گیا تھا۔ان مدارس میں غالب تعداد دیوبندی مسلک کے حامل مدارس کی تھی تاہم اس میں بریلوی اور وہابی تنظیموں کے ساتھ وابستگی رکھنے والے بھی شامل تھے تاہم بریلوی مسلک کے مدارس کے قیام کے سلسلے میں حکومت زیادہ حوصلہ افزائی نہیں کرتی تھی۔ان مدارس میں بہت بڑی تعداد میں ایسے مدارس بھی شامل تھے جن کی مالی سرپرستی سعودی حکومت کرتی تھی۔ان مدارس میں وہابیت اور دیوبندی مسلک کا حامل مخلوط نصاب رائج تھا۔خیبر پختونخوا اور دیگر جگہوں پر پختون اور افغان اکثریتی آبادی کے علاقوں میں قائم مدارس میں خاص طور پر ایسا نصاب رائج تھا اور اب بھی ہے جس میں فرقہ وارانہ خیالات کو پروان چڑھانے کے ساتھ ساتھ جہادی نکتہ نظر کو طلباء کے ذہنوں میں راسخ کیا جاتا تھا تاکہ افغان جہاد کو فروغ دیا جاسکے۔ان کے علاوہ جنرل ضیاء نے دانستہ طور پر ایسے اداروں کی سرپرستی کی جو جہادی کلچر کو فروغ دینے کیلئے کام کرتے تھے۔بعدازاں انہی مدارس سے موجودہ طالبان تحریک کا آغاز ہوا تھا۔

یقینی طور پر مدارس کی اکثریت اپنے طلباء کو جہاد میں بھیجنے کیلئے عسکری تربیت

فراہم نہیں کرتی ہے۔جبکہ قلیل تعداد میں ایسے مدارس بھی ہیں جن کا تعلق جماعت اسلامی اور اہل حدیث مکتبہ فکر کی جماعتوں کے ساتھ ہے جو اپنے طلباء کو روایتی دینی تعلیم فراہم کرنے کے ساتھ ساتھ جدید زمانے کی تعلیم بھی فراہم کرتے ہیں۔ان تمام مدارس سے فارغ ہونے والے زیادہ تر طلباء عملی زندگی میں کیریئر کے حوالے سے زیادہ کامیاب ثابت نہیں ہوتے ہیں الا یہ کہ وہ مساجد میں خدمات سرانجام دینے لگیں یا دینی سرگرمیوں کے حوالے سے کسی اور کیریئر میں کھپ جائیں۔ سٹیفن کوہن ان مدارس سے فارغ التحصیل طلباء کے ہجوم کو،''مذہبی آوارہ گرد پرولتاریہ پر مشتمل طبقہ'' قرار دیتا ہے۔

مساجد سے ملحق ان مدارس کو ضیاء دور میں مخصوص داخلی اور علاقائی حالات کے ساتھ جوڑا جاتا ہے لیکن ان کی تعداد میں بعد کے سالوں میں بھی مسلسل اضافہ ہوتا رہا ہے۔مغربی ممالک نے نائن الیون کے بعد ان کی سرگرمیوں کو اپنی توجہ کے قابل سمجھا ہے۔کچھ تجزیہ کاروں کا خیال ہے کہ ان مدارس میں تعلیم حاصل کرنے سے زیادہ اہم ویڈیوز، پمفلٹوں اور پوسٹروں کے ذریعے انتہاپسندی کی حوصلہ افزائی کرنا زیادہ اہمیت کے حامل ثابت ہوئے ہیں۔تاہم اس کے باوجود چند مخصوص مدارس کی اہمیت یہ ہے کہ یہاں عسکریت پسند اور ان کے ریکروٹ کیلئے اجلاس کرنے کی جگہ فراہم کرتے ہیں۔

مغربی ممالک کا پاکستان پر اس دباؤ کا ردعمل حیل و حجت کا سا رہا ہے کہ وہ دینی مدارس کو رجسٹر کرے اور ان کے نصاب پر اپنا کنٹرول قائم کرے۔ یہاں پر اس بات کو زور دے کر دہرانا ضروری ہے کہ ان مدارس میں بہت کم ایسے مدارس ہیں جو جہادی اور عسکری سرگرمیوں کا مرکز ہیں۔تاہم قلیل تعداد میں سہی لیکن عسکریت پسندوں کے ساتھ روابط رکھنے اور انہیں سہولیات فراہم کرنے والے مدارس بہت زیادہ اہمیت کے حامل ہیں۔ان میں اسلام آباد میں واقع لال مسجد کو بطور خاص نمایاں اہمیت حاصل ہے۔۲۰۰۷ میں فوج کو اس مسجد کے خلاف ''آپریشن سائلنس'' کرنا پڑا تھا کیونکہ اس مسجد سے وابستہ دو مدارس کے طلبا نے طاقت کے زور پر دارالحکومت میں شریعت نافذ کرنے کی کوشش کی تھی۔لال مسجد کے کمپلیکس کو جنرل ضیاء کی سرپرستی میں مولانا عبد اللہ نے توسیع دی تھی۔اور یہ اس وقت ہوا تھا جب اس نے افغان جہاد کیلئے مجاہدین کو

بھرتی کرنے پر آمادگی ظاہر کی تھی۔

جنرل ضیاء نے گوجرانوالہ کے قریب مرید کے میں دعوۃ الارشاد کے تعلیمی کمپلیکس کی تعمیر کے سلسلے میں بھی سرپرستانہ کردار ادا کیا تھا۔اس ادارے کی تعلیمی فلاسفی تبلیغ اور جہاد کو "نیو فنڈامینٹل ازم" (۳۷) کے دائرے میں لاکر باہم یکجا کرتی ہے۔یہ ایسے مسلمانوں کی بھرتی پر زور دیتی ہے جو ایسی ٹرانسمیٹو پاور کے خواہشمند ہوں جو سائنس اور ٹیکنالوجی کو اپناتے ہوئے مغربی جمہوریت کو مسترد کرتی ہے۔اس بات کو ذہن نشین کریں تو یہ جان کر حیرت نہیں ہوتی کہ اس تحریک کے روح رواں پروفیسر حافظ محمد سعید کسی زمانے میں یونیورسٹی آف انجینئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی لاہور کے فیکلٹی ممبر ہوا کرتے تھے۔قابل ذکر بات یہ ہے کہ وہ بھی مشرقی پنجاب سے ہجرت کرنے والوں میں شامل ہیں۔اور ہجرت کے دوران ان کے خاندان کے ۳۶ افراد کو چن چن کر قتل کردیا گیا تھا۔جیسا کہ ہم اگلے باب میں دیکھیں گے کہ دعوۃ والارشاد کو ضیاء کی موت کے ایک دہائی بعد اس کی عسکری تنظیم لشکر طیبہ کے حوالے سے بھارت میں کی جانے والی بعض بہت اہم دہشت گردی کی کارروائیوں میں ملوث کیا جاتا ہے۔

جنرل ضیاء نے کراچی کے بنوری ٹاؤن میں دیوبندی مدرسے جامع علوم الاسلامیہ کی بھی سرپرستی کی تھی جسے بھارت سے ہجرت کرنے والے مولانا محمد یوسف بنوری نے قیام پاکستان کے فوری بعد قائم کیا تھا۔جامع بنوری کی سرخ میناروں والی مسجد جو اپنے ساتھ منسلک ایک مدرسے کے ساتھ تمام اسلامی دنیا کے دینی علوم کے طالبعلموں کو اپنی جانب کھینچتی ہے، پاکستان میں دوسری بڑی دینی درسگاہ ہے جس میں آٹھ ہزار طالبعلموں کی گنجائش ہے۔جنرل ضیاء نے اس کے بانی کو اسلامی نظریاتی کونسل کا رکن بنایا جس نے ۱۹۷۹ میں کونسل کی سربراہی بھی کی۔یہ مسجد افغان جہاد کو پروموٹ کرنے میں پیش پیش رہی ہے۔اس کے بہت سے فارغ التحصیل طالبعلم ۱۹۹۰ کی دہائی میں افغان جنگ میں حصہ لینے والی جہادی تنظیموں میں بہت اونچے مقامات پر فائز ہوئے اور ابھی تک یہ سلسلہ جاری ہے۔ان میں مولانا مسعود اظہر بھی شامل ہے جو یہاں سے فارغ ہونے کے بعد جہادی سرگرمیوں میں ملوث ہوا۔وہ حرکت الانصار نامی

جہادی اور فرقہ پرست تنظیم کا اہم لیڈر تھا تاہم بعد میں وہ اختلافات کی بنا پر الگ ہوا اور اس نے ایک اور متشدد عسکریت پسند گروپ جیش محمد کی بنیاد رکھی۔جیش محمد بھارت کے اندر بہت سی دہشت گرد کارروائیوں میں ملوث رہی ہے۔اسامہ بن لادن جب ۱۹۹۶ میں سوڈان سے افغانستان منتقل ہوا تو اس نے اس کے ساتھ نہایت قریبی تعلقات استوار کر لیے تھے۔

ضیاء کے پاکستان میں نسل پرستی کی سیاست

ایک نظریاتی ریاست ہونے کے حوالے سے ضیاء کا تصور پاکستان کی بنیاد اسلام تھی جسے اردو نے ثقافتی طور پر متحد کر رکھا ہو۔یہ وہ یک رنگ تصور تھا جو ہمیشہ سے ریاست کی تعمیر و تشکیل میں شامل تھا۔ناگزیر طور پر مملکت کے اس تصور کو چھوٹے صوبوں سے تعلق رکھنے والے قوم پرستوں کی جانب سے مزاحمت کا سامنا تھا۔گوکہ جنرل ضیاء اس قابل تھا کہ وہ بلوچستان اور شمال مغربی سرحدی صوبے میں اس صورتحال سے عہدہ برا ہوسکتا لیکن صوبہ سندھ نے اس حوالے سے کسی طرح کی مفاہمت سے انکار کردیا تھا۔

جنرل ضیاء نے بلوچستان میں صورتحال کو بہتر بنانے کیلئے ایسے نو ہزار قیدیوں کو رہا کردیا جو بھٹو کے زمانے سے بغاوت کے جرم میں جیلوں میں پڑے سڑ رہے تھے۔جبکہ علیحدگی پسند لیڈر خیر بخش مری اور عطاء اللہ مینگل اس دوران بدستور جلاوطنی کی زندگی گذارتے رہے اور باہر بیٹھے عظیم تر بلوچستان کی بات کرتے رہے، بہت سے دیگر سردار جلاوطنی ختم کرکے اپنے گھروں کو واپس لوٹ آئے اور پاکستان نیشنل پارٹی کی بدولت آہستہ آہستہ مرکزی سیاسی دھارے میں شامل ہوگئے تھے۔جنرل ضیاء نے بھی استحکام کی ضرورت کو عقیدہ پرستی پر ترجیح دی اور خود کو ۱۹۷۸ میں قائم ہونے والی تحریک ختم نبوت سے علیحدہ کرلیا۔اس تحریک نے ضیاء پر زور دیا کہ وہ بلوچستان میں بہت تھوڑی تعداد میں بسنے والے ذکریوں کو غیر مسلم قرار دے اور بلوچستان میں شریعت کے نفاذ کا اعلان کرے (۳۸)۔بھٹو کے برعکس ضیاء ان مطالبات کے خلاف ڈٹ گیا جس کی وجہ سے بہت سے علماء نے اس پر الزام لگانا شروع کردیا کہ وہ اسلام کے نفاذ میں

مخلص نہیں ہے اور وہ اسلام کو محض اپنی حکومت کو جائز قرار دلوانے کیلئے استعمال کر رہا ہے۔

دوسری جانب شمال مغربی سرحدی صوبے میں جاری افغان جنگ کے تناظر میں پختون قوم پرستوں کے ساتھ ناصرف بنائے رکھنا وقت کی ضرورت تھی بلکہ ان کا تعاون بھی درکار تھا۔ضیاء دور میں بڑے پیمانے پر پختونوں کو فوج اور بیوروکریسی میں شامل کیا گیا۔ضیاء دور کے خاتمے تک فوج میں پختونوں کی تعداد بڑھ کر ۲۰ فیصد ہو چکی تھی جبکہ بیوروکریسی میں بھی ان کا حصہ ۱۰ فیصد سے زیادہ تھا۔ضیاء دور میں بزرگ پختون لیڈر خان عبدالغفار خان کو جیل سے رہا کر دیا گیا اور اسے افغانستان جانے کی اجازت دے دی گئی۔اسی طرح اس کے بیٹے خان عبدالولی خان کو بھی رہا کر دیا گیا۔اس دور میں جب ضیاء کے خلاف ۱۹۸۳ کی ایم آر ڈی کی احتجاجی تحریک شروع ہوئی تو اے این پی نے خود کو اس سے لاتعلق کر لیا اور اپنی توانائیوں کو افغانستان میں جاری جدوجہد پر مرکوز کیے رکھا۔تاہم بعد میں جب صوبہ افغان مہاجرین کے سیلاب کی زد میں آیا اور افغانستان میں روسی مداخلت کی بھاری قیمت ادا کرنے لگا تو وہاں پر احتجاج کی لہر اٹھی جبکہ اس دوران پنجاب مغربی ممالک کی اقتصادی اور فوجی امداد سے مستفید ہوتا رہا۔اس صورتحال کو ولی خان نے اپنے دلچسپ انداز میں یوں بیان کیا ہے کہ ۳۰ لاکھ افغان مہاجرین کا ہجوم ایک بہت بڑی گائے ہے جس کے سینگوں کو صوبہ سرحد نے تھام رکھا ہے جبکہ اس کے تھنوں کو پنجاب نے اپنے ہاتھوں میں لے رکھا ہے(۳۹)۔تاہم اس کے باوجود پختون قوم پرستی تیزی سے مذہبی رنگ میں رنگتی جا رہی تھی اور اس کے ساتھ ہی پختون فوج اور بیوروکریسی میں بڑی تعداد میں شامل بھی ہو رہے تھے۔اس کے ساتھ ساتھ معاشی سرگرمیوں کے حوالے سے پختون پان پاکستان لیول پر نمایاں ہو رہے تھے کیونکہ اس دور میں تیزی سے بڑھتی ہوئی تعمیراتی سرگرمیوں میں پختون مزدور کو روزگار مل رہا تھا اور ٹرانسپورٹ کے میدان میں اس کی اجارہ داری میں اضافہ ہو رہا تھا۔ان تبدیلیوں کے نتیجے میں پختون قوم پرستوں میں علیحدگی پسندی کے رجحانات میں شدید زوال آیا۔یہاں تک کہ پختون قوم پرست جماعتوں نے

پختونستان کے مطالبے سے تائب ہو کر اپنے صوبے کے نام کو شمال مغربی سرحدی صوبے کی بجائے ''پختونخوا'' قرار دلوانے کی جدوجہد پر اکتفا کر لیا(۴۰)۔

صوبہ سندھ، جیسا کہ ہم پچھلے ابواب میں بات کر چکے ہیں، خلیجی ممالک میں بڑی تعداد میں اپنی افرادی قوت بھیجنے میں ناکام رہا تھا لہٰذا نتیجے کے طور پر اسے زرمبادلہ سے جنم لینے والی خوشحالی میں سے بہت کم حصہ ملا تھا۔جنرل ضیاء کے فوجی اقتدار نے سندھ میں پنجابی غلبے کے خلاف روایتی جذبات کو ہوا دے دی تھی جنہوں نے اس وقت آتش فشاں کی صورت اختیار کر لی جب فوجی حکومت نے سندھ سے تعلق رکھنے والے وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو کو راولپنڈی کی جیل میں پھانسی پر لٹکا دیا۔اس صورت میں یہ کوئی حیران کن امر نہیں کہ سندھ جنرل ضیاء کے خلاف مزاحمت کے دوران اگلی صف میں شامل رہا۔اس مزاحمت کو کچھ اپوزیشن پارٹیوں نے منظم کیا تھا جو تحریک بحالی جمہوریت (ایم آر ڈی) کی چھتری تلے جمع ہو گئی تھیں۔جب ۱۹۸۳ میں پیپلز پارٹی اور کسانوں میں کام کرنے والی قوم پرست جماعت سندھی عوامی تحریک نے اس تحریک کو قیادت فراہم کی تو اس میں شدت پیدا ہو گئی۔سندھیوں کی اس بغاوت کو ٹھٹھہ، دادو، لاڑکانہ اور سانگھڑ کے دیہات میں بہت زیادہ پذیرائی ملی تھی۔فوجی حکومت کیلئے اس تحریک کو دبانا اس وقت ممکن ہوا جب گن شپ ہیلی کاپٹروں سے مسلح تین ڈویژن فوج کو سندھ میں تعینات کر دیا گیا۔ضیاء حکومت کے خلاف سندھیوں کی بغاوت تو اس کے بعد بھی جاری رہی تاہم بعد ازاں اس نے ادب و شعر اور فنون لطیفہ میں اپنے اظہار کی صورتیں تلاش کر لی تھیں۔اس دور میں سندھ سے تعلق رکھنے والے ادیبوں رحمت اللہ منجوٹھی، نصیر مرزا، طارق عالم، نیاز ہمایونی ۴۱ اور عادل سومرو وغیرہم نے اپنی شاعری اور اپنی تحریروں کے ذریعے ضیاء کی نظریاتی ریاست کو بہت واضح طور پر للکارا۔عطیہ داؤد نے اس دور میں عورتوں کے استحصال کے خلاف آواز اٹھائی۔ممتاز بھٹو نے ایک ڈھیلی ڈھالی فیڈریشن کیلئے آواز بلند کی جس کے اندر سندھ کو زیادہ سے زیادہ خودمختاری حاصل ہو۔اس کے ساتھ ساتھ سندھ میں مکمل آزادی کیلئے بھی آوازیں اٹھ رہی تھیں۔

ضیاء دور میں ایک نئی بات یہ ہوئی کہ سندھ میں ایک مہاجروں کی نئی لسانی

شناخت کو سیاسی افق پر نمودار ہوتے ہوئے دیکھا گیا۔اس سیاسی لسانی شناخت نے مہاجر قومی موومنٹ (ایم کیو ایم) کی شکل میں تنظیم کاری حاصل کی جس کے روح رواں وہ طالبعلم تھے جو ۱۹۷۰ کی دہائی میں کراچی کے تعلیمی اداروں میں آل پاکستان مہاجر سٹوڈنٹس آرگنائزیشن (اے پی ایم ایس او) کے پلیٹ فارم سے سرگرم عمل رہے تھے۔ہم پچھلے ابواب میں اس حوالے سے بات کر چکے ہیں کہ کیسے مہاجروں کے پاکستان میں غالب کردار کو پنجابی اشرافیہ نے ختم کر کے خود ان کی جگہ لے لی تھی۔ہم یہ بھی دیکھ چکے ہیں کہ کیسے بھٹو کی جانب دارانہ سیاست نے سندھ میں مہاجروں اور سندھیوں کے درمیان کشیدگی کو ہوا دے دی تھی۔اس پس منظر کے باوجود بہت سے مصنفین اس بات پر متفق ہیں کہ ایم کیو ایم کو آئی ایس آئی نے منظم کیا تھا۔یہ وہ جماعت تھی جو مارچ ۱۹۸۴ میں سندھ میں پیپلز پارٹی اور ایم آر ڈی کا زور توڑنے کیلئے وجود میں لائی گئی تھی (۴۲)۔گو ایم کیو ایم کے طلسماتی شخصیت کے حامل لیڈر الطاف حسین نے بہت سے مواقع پر ان الزامات کی سختی سے تردید کی ہے۔تاہم یہ بات یقینی ہے کہ اپنے آغاز میں ایم کیو ایم نے سندھ میں آباد پنجابیوں، پختونوں، بلوچوں اور افغانوں کے خلاف سندھی قوم پرستوں کے ساتھ ہاتھ ملائے تھے۔یہ بات بھی واضح ہے کہ ۱۹۸۵ میں ہونے والے غیر جماعتی انتخابات نے سیاسی عمل کو نسلیت کی بنیادوں پر متحرک ہونے کی حوصلہ افزائی کی تھی۔اس تناظر میں یہ قابل فہم بات ہے کہ ایم کیو ایم نے شد و مد سے یہ دعویٰ کیا کہ مہاجروں کو پاکستان کی پانچویں قومیت کے طور پر جانا جائے۔

ایک ایسے شہر میں جہاں ۱۹۸۰ کی دہائی سے افغان جنگ کے نتیجے میں منشیات اور اسلحہ کی بھرمار ہو چکی تھی، ریاست کی کمزوری ایم کیو ایم کے ظہور کو سمجھنے کیلئے ایک اور اہم فیکٹر ہے۔منشیات اور اسلحہ کی سمگلنگ کے درمیان نہایت قریبی تعلق ہے کیونکہ افغان مجاہدین منشیات کی سمگلنگ کے ذریعے اسلحہ کی خریداری کیلئے رقومات حاصل کرتے تھے۔ان دونوں قسموں کی اشیاء کی آزادانہ ترسیل کے سلسلے میں کراچی کو مرکزی مقام حاصل تھا۔دسمبر ۱۹۸۶ میں فوج اور پولیس کی جانب سے پختونوں کے گڑھ سہراب

گوٹھ میں کیے جانے والے آپریشن کے ردعمل کے طور پر پختونوں/افغانوں کی جانب سے مہاجروں کی غریب آبادیوں پر حملوں کے دوران ایم کیو ایم نے خود کو مہاجروں کے محافظ کے طور پر پیش کیا۔سہراب گوٹھ کو آج بھی شمالی کراچی میں مبینہ طور پر پختونوں/افغانوں پر مشتمل ڈرگ مافیا کے مرکز کی حیثیت حاصل ہے۔تاہم جب ایم کیو ایم نے مہاجر کمیونٹیوں پر اپنا اجارہ دارانہ کنٹرول حاصل کر لیا اور جب کراچی کی مقامی حکومت کا انتظامی کنٹرول بھی اس کے ہاتھ میں آ گیا تو تصادم کا پیٹرن مہاجر پختون بنیادوں کی بجائے مہاجر سندھی بنیادوں پر استوار ہو گیا۔۱۹۹۰ کی دہائی کے وسط میں مہاجروں کے اجتماعات کا سب سے مقبول نعرہ تھا ”سندھ میں کیسے ہوگا گزارہ۔۔۔آدھا تمہارا آدھا ہمارا“ (۴۳)۔پاکستان کے اس تجارتی مرکز میں بڑھتا ہوا شدید انتشار محض ضیاء کی میکاولی سے متاثرہ تقسیم کرو اور حکومت کرو کی پالیسی کا مرہون منت نہیں ہو سکتا بلکہ یہ واضح طور پر لسانیت اور سماجی و معاشی ٹرانسفارمیشن کی سیاست کاری کا نتیجہ تھا جس نے ضیاء کے اقتدار کے دوران فروغ پایا تھا۔

ضیاء اور فوج

ضیاء کی سیاسی طاقت کا مطلب فوج کی پاکستان کے انتظامی اور اقتصادی امور میں زیادہ سے زیادہ مداخلت تھی۔ضیاء نے اس طرح کا تاثر پھیلانے پر بہت زور لگایا کہ صرف وہی ایک ایسا ادارہ ہے جو پاکستان پر موثر انداز میں حکمرانی کر سکتا ہے۔فوج ریاستی کنٹرول کو اپنا حق سمجھتا تھا کیونکہ ریاستی کے وسائل کا آزادانہ رخ اس کی جانب تھا اور اسے احتساب سے بالاتر ادارہ سمجھا جاتا تھا۔

یہاں پر یاد دہانی کیلئے یہ جاننا ضروری ہے کہ ایوب خان نے اقتدار سنبھالنے کے بعد بیوروکریسی پر حد سے زیادہ انحصار کا رویہ اپنایا تھا جبکہ ضیاء الحق بیوروکریسی کو ریاستی اقتدار میں فوج کا جونیئر پارٹنر سمجھتا تھا۔جنرل ضیاء نے ملازمتوں کے وفاقی کوٹے میں فوج کی ترجیحی حیثیت کو متعارف کرایا تھا علاوہ ازیں ضیاء نے بہت سی کارپوریشنوں میں فوج کے سینئر افسران کو منافع بخش عہدوں پر تعینات کرانے کی پالیسی پر عمل شروع

کر رکھا تھا۔مثال کے طور پر واپڈا کی سربراہی جنرل فضل رازق کو سونپ دی گئی تھی جبکہ دیگر کارپوریشنوں میں سے اکثریت کی سربراہی پر حاضر یا ریٹائرڈ جرنیل قابض تھے۔۵۔۱۹۸۰ کی مدت کے دوران سینٹرل سپیریئر سروسز میں ۹۶ فوجی افسران کو مستقل بنیادوں پر تعینات کیا گیا تھا جبکہ عارضی بنیادوں پر تعینات ہونے والے فوجی افسران کی تعداد ۱۱۵ تھی (۴۴)۔محمد خان جونیجو نے جب وزارتِ عظمیٰ کا حلف اٹھایا اس وقت چاروں صوبوں میں فوجی افسران گورنر کے طور پر فرائض سر انجام دے رہے تھے۔یہ بات ایک جانب تو سویلین افراد کی اہلیت کے بارے میں ضیاء کے حقیقی جذبات کی عکاسی کرتی ہے تو دوسری جانب اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ فوج میں اپنے وفادار افسروں کو نوازنے کی پالیسی پر عمل پیرا تھا۔اس دور میں نا صرف سرکاری اداروں اور پبلک خدمات کے شعبوں میں بلکہ رفاعی تنظیموں میں بھی اعلیٰ عہدے فوجی افسران کیلئے مختص کر دیئے گئے تھے۔یہ تمام وہ لوگ تھے جنہیں ضیاء کا ذاتی وفادار سمجھا جاتا تھا یوں فوج میں بھی امتیازی سلوک روا رکھا جا رہا تھا جس پر فوج کے ایک حصے میں بددلی کے جذبات پائے جاتے تھے۔اس کا اظہار اس وقت سامنے آیا جب ۱۹۸۵ میں حکومت کا تختہ الٹنے کی ایک مبینہ سازش بے نقاب ہوئی۔اس سلسلے میں فوجی عدالتوں نے ان کیمرہ ٹرائل کے بعد جولائی ۱۹۸۵ کو سات فوجی اہلکاروں کو سزائیں سنائیں جو تمام جونیئر افسران تھے۔

جنرل ضیاء کی سروائیول کی جبلت کا اس انداز میں بھی اظہار ہوتا ہے کہ اس نے اپنے نامزد کردہ فوجی افسران کو مالی بے ضابطگیوں کی کھلی چھوٹ دے رکھی تھی۔اس حوالے سے انہیں مالی خودمختاری حاصل تھی جس کی طرف اس نے ہمیشہ اپنی آنکھیں بند کیے رکھیں۔مثال کے طور پر تمام کور کمانڈروں کو اپنے زیر کنٹرول خفیہ فنڈز کے استعمال کا پورا استحقاق حاصل تھا اور اس سلسلے میں ان فنڈز کا کوئی آڈٹ نہیں کیا جاتا تھا۔کرپشن کا سب سے بڑا منبع فوج کی جانب سے رئیل اسٹیٹ کے بزنس میں کودنا تھا جس کا راستہ جنرل ضیاء کے دور میں ہموار کیا گیا۔بڑے فوجی افسران ہاؤسنگ کیلئے سستے داموں زمینیں خریدنے کے مواقع سے بھرپور فائدہ اٹھاتے اور الاٹمنٹ کے بعد ان زمینوں کو

مارکیٹ ریٹ پر فروخت کر دیا کرتے تھے۔

ایوب دور کی یادیں تازہ کرتے ہوئے جب فوج کے فلاحی اداروں نے بہت بڑے پیمانے پر کمرشل سرگرمیاں شروع کیں تو اس کے نتیجے میں ''ملبس'' کا عمل تیز تر ہو گیا۔۱۹۷۷ اور ۱۹۸۲ میں ائرفورس (شاہین فاؤنڈیشن) اور نیوی (بحریہ فاؤنڈیشن) نے اپنے فلاحی اداروں کی بنیاد رکھی۔یہ دونوں ادارے بری فوج کے اداروں فوجی فاؤنڈیشن اور آرمی ویلفیئر ٹرسٹ کی نسبت محدود پیمانے پر قائم تھے اس کے باوجود انہوں نے بہت بڑے پیمانے پر کاروباری سرگرمیاں شروع کر دی تھیں۔بحریہ فاؤنڈیشن اپنی یونیورسٹی سے لے کر بیکریوں اور ٹریول ایجنسیوں تک مختلف النوع کاروباری سرگرمیوں میں مشغول تھی۔دوسری جانب شاہین فاؤنڈیشن اپنی ائرلائن شاہین ائرلائن کے علاوہ پے ٹی وی، انفرمیشن ٹیکنالوجی کے کاروبار کے علاوہ ایک نٹ ویئر فیکٹری بھی چلا رہی تھی (۴۵)۔

اس دور میں فوج کی سب سے بڑی فلاحی آرگنائزیشن فوجی فاؤنڈیشن اپنے معمول کے کاروباروں کے علاوہ معیشت کے کئی دوسرے شعبوں میں بھی داخل ہو چکی تھی جن میں فرٹیلائزر کا کاروبار بھی شامل تھا۔فوجی فرٹیلائزر کا سب سے پہلا پلانٹ ۱۹۸۲ میں لگایا گیا تھا۔فوجی فاؤنڈیشن اسی دور میں آئل اینڈ گیس کے شعبے میں بھی دخل انداز ہوئی۔اس سلسلے میں اس نے نا صرف اپنی کمپنیاں قائم کیں بلکہ پہلے سے موجود کمپنیوں میں بہت بڑے پیمانے پر حصص کی خریداری بھی کی۔قبل ازیں اس قسم کے کاروباروں کو ریٹائرڈ فوجی افسران چلایا کرتے تھے۔جنرل ضیاء نے ایک نیا سلسلہ متعارف کرایا کہ حاضر سروس افسران کو ان فلاحی تنظیموں اور ان کے ذیلی اداروں میں بھیج کر ان کی ملازمت میں توسیع کر دی جاتی تھی۔مثال کے طور پر میجر جنرل رضوی کو ۱۹۸۴ میں آرمی ویلفیئر ٹرسٹ کا سربراہ مقرر کیا گیا (۴۶)۔دلچسپ بات یہ ہے کہ نا سابق فوجی افسران اور نا حاضر سروس افسران کو کسی قسم کی کاروباری تربیت فراہم نہیں کی جاتی تھی۔اس کی بجائے ان کے نئے کردار کی یہ توجیح پیش کی جاتی تھی کہ فوج کی ملازمت اور اس میں لاجسٹک مینجمنٹ کا تجربہ انہیں نئی ذمہ داریوں سے عہدہ برا ہونے کے قابل

بنانے کیلئے کافی ہے۔ ریٹائرڈ لیفٹیننٹ جنرل محمد امجد کا دعویٰ ہے کہ "اگر فوجی افسران ملک کو چلا سکتے ہیں تو وہ کاروباری اداروں کو کیوں نہیں چلا سکتے؟ ہم انتظامی امور میں پہلے ہی تربیت یافتہ ہوتے ہیں" (۴۷)۔

فوجی افسران کی سویلین امور میں حد سے زیادہ مداخلت کاری نے ایوب خان کے دور کی نسبت مستقبل میں جمہوری عمل کے استحکام کے امکانات کو کہیں زیادہ مشکل بنادیا تھا۔ کیونکہ جوں جوں فوج کی کاروباری سرگرمیوں کا دائرہ پھیلتا گیا، ان کیلئے سویلین اقتدار کو برداشت کرنا زیادہ سے زیادہ مشکل ہوتا چلا گیا کیونکہ اس طرح ان کے کاروباری مفادات خطرے کی زد میں آسکتے تھے۔ جنرل ضیاء نے ۱۹۷۳ کے آئین کی آٹھویں ترمیم کے ذریعے فوج کے مفادات کو محفوظ بنانے کی کوشش کی تھی جس کے تحت صدر کو کسی بھی وقت قومی اسمبلی کو تحلیل کرنے کے اختیارات حاصل ہوگئے تھے۔ اس نے نیشنل سیکورٹی کونسل کے قیام کے ذریعے بھی فوج کو گورننس کے معاملات میں دائمی طور پر دخیل رکھنے کی کوشش کی تھی۔ یہ الگ بات کہ حالات کے جبر کے باعث اسے اپنے اس خیال کو عملی جامہ پہنانے کی مہلت نہ مل سکی تھی۔ یوں فوجی اثر ونفوذ کو مزید پھیلنے کیلئے ابھی جنرل پرویز مشرف کے اقتدار کا انتظار کرنا پڑا۔

ضیاء اور افغان کشمکش

افغان کشمکش ضیاء حکومت کی بہت سی وراثتوں کے عین قلب میں واقع ہے۔ یہ بات بھی یقینی طور پر قابل بحث ہے کہ اگر افغان جنگ نہ ہوتی تو کیا اس کا دور اس قدر طوالت اختیار کرسکتا تھا۔ ہم اس پر تفصیل سے بات کرچکے ہیں کہ اس کی حکومت نے امریکی امداد کے نتیجے میں تقویت حاصل کی تھی اور اس دور میں پیدا ہونے والے سازگار حالات نے اس کی اسلامائزیشن کی راہ ہموار کی تھی۔ اس موضوع تلے ہم نسبتاً زیادہ تفصیل کے ساتھ اس کی علاقائی وراثتوں اور افغان جنگ کے بطن سے پھوٹنے والی پاکستان میں اسلحے کی بھرمار کے بارے میں بات کریں گے۔

ایوب خان کی طرح ضیاء الحق نے بھی جنوبی ایشیاء کی جیو پولیٹکل صورتحال

کے حوالے سے امریکہ کی سرد جنگ کی اپروچ کو زیادہ اہمیت کے قابل نہیں سمجھا تھا۔ اس کی بجائے اس نے علاقے میں امریکہ کی مداخلت کو پاکستان کے اہداف کو آگے بڑھانے کا موقع جانا۔ پاکستان کیلئے اس وقت بھی سب سے بڑا خطرہ سوویت یونین کی بجائے بھارت تھا۔ جون ۱۹۸۴ کے بعد سے سیاچن گلیشیئر پر پاکستان اور بھارت کے درمیان شدید فوجی تصادم کا سلسلہ چل رہا تھا۔ اس صورتحال کے دوران اس وقت کشیدگی اپنے نکتہ انتہا کو پہنچ گئی جب بھارت نے ریگن کے ایڈ پیکج کے تحت پاکستان کو ایف سولہ طیاروں کی فراہمی پر سخت احتجاج کیا۔ دونوں ملکوں کے درمیان کشیدگی اس وقت حالت جنگ میں بدل گئی جب بھارت نے ۱۹۸۶-۷ کے موسم سرما میں آپریشن براس ٹیک کے نام سے پاکستانی سرحدوں کے قریب فوجی مشقیں شروع کردیں۔

اس حوالے سے کہا جاسکتا ہے کہ پاکستان فی الاصل افغانستان میں "شیطان ایمپائر" کو شکست دینا نہیں چاہتا تھا گو کہ بعد میں اس نے سوویت یونین کی شکست کا تمام تر کریڈٹ اپنے نام کرلیا۔ افغانستان کے معاملات میں پاکستان کی مداخلت کا اصل مقصد وہاں ایک کلائنٹ سٹیٹ قائم کرنا تھا جو نا صرف پختون علاقے میں بھارت کے بڑھتے ہوئے اثر ونفوذ کو ختم کردے بلکہ بھارت کے ساتھ مستقبل میں کسی ممکنہ جنگ کی صورت میں اسے "سٹریٹجک ڈیپتھ" (Strategic Depth) فراہم کرسکے۔ افغانستان نے ایک ایسے مفروضہ قلعے کی فراہمی کے ساتھ ساتھ جہاں پاکستانی فوج آزادانہ نقل و حرکت کرسکتے، پاکستان کو جموں وکشمیر میں مسلح آپریشن کرنے کے سلسلے میں غیر فوجی عسکریت پسندوں کو تربیت کی فراہمی کیلئے آزاد کشمیر کے قریب ایک ممکنہ ٹریننگ بیس بھی فراہم کردیا تھا۔ پاکستان کے یہ اہداف ضیاء کے پورے دور میں سرکاری پالیسی کے طور پر قائم رہے۔ سوویت یونین کے انہدام نے پاکستان کیلئے افغانستان کے راستے وسط ایشیاء کی نوآزاد ریاستوں میں بھی معاشی پیش رفت کے دروازے کھول دیے تھے۔ ابھی آگے چل کر مستقبل کی طالبان حکومت نے ایک اطاعت شعار پڑوسی کی حیثیت سے پاکستان کی امیدوں پر پانی پھیرنا تھا جبکہ نائن الیون نے بھی اپنے جلو میں واقعات کا سلسلہ لے کر آنا تھا جن کے نتیجے میں افغانستان کے اندر بھارت کے اثر و رسوخ میں

اضافہ ہونا تھا اور پاکستان کی سٹریٹجک گہرائی کے حسین خواب کو ڈراؤنے خواب میں تبدیل ہونا تھا۔

امریکہ کی جانب سے افغانستان پر سوویت قبضے کے خلاف اسلامی پراکسی کو استعمال کرنے کے فیصلے نے پاکستان اور امریکہ کے درمیان تعلقات کو تاریخ کی بلند ترین سطح پر پہنچا دیا تھا۔ پاکستان مجاہدین کی ٹریننگ کیلئے نہایت اہم محل و وقوع کا حامل تھا۔ سی آئی اے نے افغان مجاہدین کو ہتھیاروں کی سپلائی کے سلسلے میں نیشنل لاجسٹک سیل (این ایل سی) کے ٹرانسپورٹ نیٹ ورک کو استعمال کرنے کی غرض سے آئی ایس آئی کے ساتھ نہایت گہرے تعلقات استوار کر لیے تھے (۴۸)۔ ادھر آئی ایس آئی نے بھی افغان جنگ کے تناظر میں اپنی صلاحیتوں اور اثر و رسوخ میں بے پناہ اضافہ کر لیا تھا (۴۹)۔ کچھ مصنفین کا یہ بھی خیال ہے کہ آئی ایس آئی نے اپنے اہداف کو حاصل کرنے کیلئے فوج کی معاونت کے بغیر بھی آزادانہ طور پر اقدامات کرنے کی صلاحیت حاصل کر لی تھی۔ اس تاثر کو مفرور اسامہ بن لادن کی طویل عرصہ تک ایبٹ آباد میں روپوشی کے حوالے سے بھی تقویت ملتی ہے۔ امریکہ حکمت عملی کی ایک اور وراثت جس کے نا صرف پاکستان بلکہ بین الاقوامی سطح پر دور رس نتائج برآمد ہوئے، سرد جنگ کے خاتمے کیلئے جہاد کے اسلامی تصور کو استعمال کرنا تھا۔ اس وجہ سے امریکہ کو مصر اور سعودی عرب کی معاونت بھی حاصل ہو گئی۔ ایک اندازے کے مطابق ان دنوں سی آئی اے نے دنیا کے ۴۰ ملکوں سے تقریباً ۳۵،۰۰۰ غیر ملکی افراد کو افغان جنگ میں لڑنے کیلئے بھرتی کر کے پشاور میں پہنچا دیا تھا (۵۰)۔ ان غیر ملکی جنگجوؤں کی تعداد کو افغان جنگجوؤں اور پاکستانی مدارس کے طالبعلموں کی کل تعداد سے ۱:۳ کی نسبت حاصل تھی۔ ان غیر ملکی جنگجوؤں کی بہت بڑی تعداد افغانستان سے روسی فوجوں کے انخلا کے بعد بھی پاکستان اور افغانستان کے علاقوں میں مقیم رہی اور انہوں نے اپنے جہاد کو جاری رکھا۔ ان غیر ملکی جنگجوؤں میں عربوں کو اپنی تعداد اور دولت کے حوالے سے غلبہ حاصل تھا۔ عرب جنگجوؤں کی بہت سی با اثر شخصیات "جہاد" کو آگے بڑھانے کیلئے القاعدہ کی اگلی صف میں موجود تھیں ان میں شیخ تاثیر عبداللہ، ایمن الظواہری، اسامہ بن لادن، شیخ عمر

عبدالرحمٰن، شیخ عبداللہ عزیز اور کئی دیگر لوگ شامل تھے۔ اسامہ بن لادن کا زیادہ وقت پاکستان میں گزرا جہاں وہ ۱۹۸۰ میں پشاور کے اندر القاعدہ کا ایک باقاعدہ دفتر قائم کر کے پاکستان کے مختلف علاقوں سے جہاد کے نام پر جنگجوؤں کو بھرتی کیا کرتا تھا۔ اس نے پاکستان کی کئی ایک جہادی اور فرقہ ورانہ تنظیموں کے ساتھ روابط استوار کیے جنہوں نے آگے چل کر امریکہ اور اسرائیل کے خلاف لڑنے کیلئے مئی ۱۹۹۸ میں قائم کی جانے والی اسامہ کی تنظیم "انٹرنیشنل اسلامک فرنٹ فار جہاد" کا حصہ بن کر دہشت گردی کی کارروائیوں میں شریک ہونا تھا۔ اسامہ بن لادن کے سب سے زیادہ قریبی تعلقات کراچی کی جامعہ بنوریہ اور مرید کے کے مرکز دعوۃ والارشاد کے ساتھ قائم ہو چکے تھے جن کی جنرل ضیاء براہ راست سرپرستی کرتا تھا۔ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ اسامہ بن لادن نے مرید کے کے مرکز میں ایک گیسٹ ہاؤس کی تعمیر کیلئے مالی امداد فراہم کی تھی جہاں وہ اس کمپلیکس میں آمد و رفت کے دوران قیام کرتا تھا۔ وہ مجاہدین کی بھرتی کیلئے اکثر و بیشتر کراچی میں جامعہ بنوریہ بھی آیا جایا کرتا تھا۔ ایک دورے کے دوران جامعہ بنوریہ کے مہتمم مفتی نظام الدین شامزئی نے اس کی مستقبل میں طالبان کے لیڈر ملا عمر کے ساتھ ملاقات کا بھی اہتمام کیا تھا۔

ضیاء افغانستان میں پاکستان کے مفادات کو کئی طریقوں سے آگے بڑھانا چاہتا تھا۔ مجاہدین کو ہتھیاروں کی فراہمی بہت زیادہ کنٹرولڈ انداز میں کی جاتی تھی اس سلسلے میں ان عسکری تنظیموں کو ترجیح دی جاتی تھی جو مستقبل کے افغانستان میں پاکستان کیلئے ہمدردانہ جذبات رکھتی ہوں۔ ایک دہائی بعد کشمیر کے محاذ پر سرگرم تنظیموں کے حوالے سے بھی یہی پالیسی اپنائی گئی۔ پاکستان کے نزدیک سب سے پسندیدہ لیڈر گلبدین حکمت یار تھا جس کے جماعت اسلامی کے ساتھ براہ راست مراسم تھے۔ جماعت اسلامی کے پختون لیڈر قاضی حسین احمد جنرل ضیاء کی حکومت اور گلبدین حکمت یار کے درمیان رابطے کی کڑی کے فرائض سرانجام دے رہے تھے۔ سوویت انخلا کے بعد افغان گروپوں میں ہونے والی خانہ جنگی کے دوران گلبدین حکمت یار کی تنظیم حزب اسلامی کی جانب سے کابل پر قبضے میں ناکامی کے بعد یہ ہوا کہ آئی ایس آئی نے

دیوبندی مکتبہ فکر سے تعلق رکھنے والی تنظیموں کی جانب اپنا دست شفقت دراز کیا جس کا نتیجہ آگے چل کر طالبان کے ظہور کی صورت میں رونما ہوا۔تاہم افغان جنگ اور بعد میں ہونے والی خانہ جنگی کے دوران پاکستان آرمی نے خود کو جماعت اسلامی کی بغل بچہ جہادی تنظیموں تک محدود نہیں رکھا بلکہ سی آئی اے کے ساتھ مل کر اس نے دیوبندی تنظیموں حرکت الجہاد اسلامی اور حرکت المجاہدین جیسی تنظیموں کی بھی سرپرستی کی۔حرکت المجاہدین الاسلامی نام کی تنظیم کی بنیاد جامع بنوریہ کے طالبعلموں نے ۱۹۷۹ میں رکھی تھی۔اس میں سے چھ سال بعد ایک دھڑا الگ ہوا اور اس نے اپنا نام حرکت المجاہدین رکھ لیا۔جیسا کہ ہم آگے چل کر دیکھیں گے کہ دونوں دھڑوں کو ۱۹۹۳ میں ایک دوسرے کے ساتھ مفاہمت پیدا کرنے پر قائل کیا گیا اور یوں ایک نئی تنظیم حرکت الانصار کے نام سے وجود میں آئی۔یہ تنظیم نا صرف فرقہ پرست تنظیموں کے قریب تھی بلکہ اس کے اسامہ بن لادن کے ساتھ بھی براہ راست تعلقات تھے۔

ضیاء حکومت کی جانب سے مجاہدین گروپوں کو پسندیدگی کی بنیاد پر اسلحہ کی فراہمی پاکستان میں کلاشنکوف کلچر کے پھیلاؤ کی بنیاد بنی تھی۔آئی ایس آئی اور مجاہدین دونوں زیادہ بولی دینے والوں کو اسلحہ بیچ دیتے تھے۔۱۰ اپریل ۱۹۸۸ کو راولپنڈی اور اسلام آباد کے درمیان فیض آباد کے قریب اوجھڑی اسلحہ ڈپو کے سانحے کی ایک ممکنہ توجیح یہ ہوسکتی ہے کہ آئی ایس آئی نے امریکہ معائنہ کاروں کے سامنے ہتھیاروں کی لیکج کا راز فاش ہونے کے خوف سے خود اسلحہ کے اس ذخیرے کو دھماکے سے اڑا دیا تھا(۵۱)۔

سوویت انخلا کے بعد کے دور میں ہتھیاروں کی اتنے بڑے پیمانے پر چوری کے دوررس نتائج مرتب ہونا تھے۔یونس صمد کا اس حوالے سے کہنا ہے:

> "بہت بڑی تعداد میں ہتھیاروں بشمول ہلکے ہتھیاروں اور اینٹی ٹینک گنوں اور آرٹلری کے ہتھیاروں کے فاٹا خاص طور پر ان علاقوں میں جو افغان سرحد کے ساتھ ملحق ہیں اور جن پر مجاہدین کا قبضہ تھا جمع کیے گئے اور ان کی سیل لگا دی گئی"(۵۲)۔

پاکستان کا قبائلی علاقہ تاریخی طور پر ہتھیاروں کی تیاری اور فروخت کا مرکز رہا ہے۔تاہم افغان کنفلکٹ کے دوران اس کے بازاروں میں بہت بڑی تعداد میں بھاری ہتھیاروں کی موجودگی کی پہلے کوئی نظیر نہیں ملتی ہے۔ان ہتھیاروں کی سیل سے مستفید ہونے والوں میں اسلامی عسکریت پسند، ڈرگ مافیا، نسل پرست گروپ یہاں تک کہ سیاسی جماعتوں سے وابستہ طلباء تنظیمیں بھی شامل تھیں جو اس بہتی گنگا میں نہانے کے بعد پہلے سے کہیں زیادہ طاقتور ہوگئی تھیں۔ضیاء کی موت کے بعد کے برسوں میں کراچی جیسے شہروں میں بڑھتے ہوئے تشدد کو اسی دور کے تناظر میں دیکھا جاسکتا ہے۔

قابل ذکر بات یہ ہے کہ سوویت یونین کے انخلا کے فوری بعد افغانستان سے نکل جانے کی امریکی خواہش نے جنرل ضیاء اور جونیجو کے درمیان کشیدگی پیدا کردی تھی۔محمد خان جونیجو کی جانب سے اپریل ۱۹۸۸ میں جینوا معاہدے پر دستخط کردینے کے باوجود جس کے ذریعے سوویت فوجوں کا افغانستان سے انخلا ممکن ہوا تھا، امریکی حکام پاکستان آرمی کے ساتھ کمیونیکیشن کیلئے متبادل راستوں کی تلاش میں تھے۔جینوا معاہدے میں جونیجو کے کردار نے جنرل ضیاء کے ہاتھوں اس کی حکومت کے خاتمے کی راہ ہموار کی تھی۔جونیجو نے بیوروکریسی کیلئے پاکستان کی بنی ہوئی چھوٹی کاروں کی پابندی لگانے کے ساتھ ہی فوجی افسران سے بھی یہ سوال پوچھنا شروع کردیا تھا کہ جبکہ وہ پاکستان ساختہ سوزوکی کاروں کو استعمال کرسکتے ہیں پھر وہ اپنے ذاتی استعمال کیلئے بیرون ملک سے مہنگی گاڑیاں منگوانے کی عیاشی پر کیوں مصر ہیں (۵۳)۔افغان جنگ کے خاتمے کے بعد جو دوررس نتائج سامنے آئے ان میں فوری طور پر کابل پر قبضے کیلئے افغان گروپوں کے درمیان ہونے والی خانہ جنگی بھی شامل تھی۔اس کے علاوہ بہت بڑی تعداد میں جنگجوؤں کی موجودگی بھی ایک بہت بڑا مسئلہ تھا جن کے کرنے کو اب کوئی کام باقی نہیں رہ گیا تھا۔پاکستانی ریاست کے پاس ان تمام مسائل کا حل طالبان کی تنظیم کاری اور ان اسلامی عسکریت پسندوں کو کشمیر کے محاذ پر مصروف کرنے کی صورت میں موجود تھا۔تاہم نئی حکمت عملیوں کے نتائج ایسے نکلے جن کی پہلے سے کوئی پیش گوئی نہیں کی جاسکتی تھی۔

حرف آخر

جنرل ضیاء نے پاکستان کے استحکام کے حوالے سے اٹھنے والے سوالات کا جواب اسلامائزیشن اور معاشرے کو سیاست سے پاک کرنے کی صورت میں دیا۔ان دونوں کا نتیجہ ضیاء کے بعد کے برسوں میں ملک میں اٹھنے والی فرقہ واریت کی پرتشدد لہراور شدید لسانی کشمکش کی صورت میں برآمد ہوا۔ضیاء کے دور نے مغربی تعلیم یافتہ اشرافیہ اور عوام کے درمیان تقسیم کو بھی وسیع تر کردیا جس کے آنے والے زمانوں پر گہرے اثرات مرتب ہوئے۔فوجی حاکمیت نے چھوٹے صوبوں اور پنجاب کے درمیان محاذ آرائی میں بھی شدت پیدا کردی تھی۔ بلوچستان اور سندھ میں پنجابی غلبے کی حامل انتظامیہ کے خلاف طویل عرصے سے جاری نسل پرست اپوزیشن کے مسئلے کا حل اسلامائزیشن میں موجود نہ تھا۔تاہم صوبہ سرحد میں افغان جنگ کے تناظر میں پختون مسلم کیمونل شناخت کی تخلیق کیلئے سازگار حالات پیدا ہوچکے تھے بعد میں یہی شناخت پختون اسلامی شناخت میں تبدیل ہوگئی۔

پاکستان کی پریٹورین کیفیت کو بلاشبہ ضیاء دور میں بام عروج نصیب ہوا تھا۔اس دور میں فوج نے اپنے دائرہ اثر کو انتظامیہ اور کاروباری سرگرمیوں میں مزید بڑھالیا تھا۔آئی ایس آئی نے اپنی صلاحیتوں اور خودمختاری کی اہلیت میں بہت زیادہ اضافہ کرلیا تھا۔ضیاء نے فوج اور اسلامی جماعتوں کے درمیان قربتوں میں ماضی کی نسبت کہیں زیادہ اضافہ کردیا تھا۔تاہم جماعت اسلامی کے ساتھ اس کے ظاہری تعلقات گومگو کی کیفیت سے دوچار رہے تھے۔اس دور میں سول سوسائٹی کو سنسرشپ، نماز پڑھانے والے وارڈنوں (Prayer Wardens) اور سرعام کوڑے لگانے کی مشق کے حوالے کردیا گیا تھا۔جہاں مفاہمت کی صورت پیدا نہ ہوسکے جیسا کہ سندھ کے ساتھ معاملہ تھا وہاں طاقت کا بے رحمانہ استعمال کیا گیا۔تاہم جنرل ضیاء کبھی بھی اپنی سب سے سخت جان حریف پیپلز پارٹی کو کچلنے کے قابل ہوسکا نہ وہ سول سوسائٹی کو لگام ڈالنے میں کامیاب ہوسکا جس کا ایک ثبوت ودمن ایکشن جیسی عورتوں کے حقوق کیلئے

کام کرنے والی تنظیموں کی جاری سرگرمیاں تھیں۔اس کا مطلب یہ ہے کہ تمام تر کوششوں کے باوجود مستقبل میں جمہوریت کے پنپنے کے امکانات ختم نہیں ہوئے تھے تاہم یہ امکانات بہت زیادہ کمزور ضرور ہوگئے تھے۔

جنرل ضیاء کے دور کی افسوسناک باقیات میں ملک کے اندر منشیات اور اسلحے کا بہاؤ اور اس کے نتیجے میں بڑھتی ہوئی مذہبی جنونیت اور بے قابو ہوتا ہوا تشدد شامل ہے۔اب یہ بات واضح ہوچکی ہے کہ ضیاء دور کی یہ خطرناک ترین وراثت علاقے میں بھارت کی اجارہ داری قائم ہونے سے روکنے کے سلسلے میں جنرل ضیاء کے اقدامات کا حتمی نتیجہ تھا۔اس سمت میں اٹھائے جانے والے اقدامات جن کا کھرا بھٹو دور تک جاتا ہے کا ایک پہلو یہ تھا کہ ریاست پاکستان کو اپنا ایٹمی پروگرام شروع کرنا اور اسے منطقی انجام تک پہنچانا پڑا اور بھارت کے ساتھ دیرینہ محاذ آرائی میں سٹریٹجک اثاثوں کے طور پر اسلامی انتہاپسندوں کو استعمال کرنے کی پالیسی پر عمل پیرا ہونا پڑا۔

ان معاملات میں پیش رفت کے سلسلے میں پاکستان کو سرد جنگ کے خاتمے اور افغانستان میں سوویت یونین کے قبضے کو ختم کرانے کیلئے امریکی جدوجہد کے دوران پاکستان کو فرنٹ لائن سٹیٹ کے طور پر استعمال کرنے کی امریکی ضرورت کا بہت بڑا ہاتھ ہے جس کی وجہ سے امریکہ نے پاکستان کی ہر طرح سے کھل کر امداد کی اور اس کے کئی قابل اعتراض معاملات پر آنکھیں بند کیے رکھیں۔مثال کے طور پر اس سارے عرصے کے دوران امریکہ نے پاکستان کے ایٹمی پروگرام کو نظرانداز کیے رکھا۔سی آئی اے نے افغان مجاہدین کو فوجی تربیت کی فراہمی اور انہیں مسلح کرنے کے سلسلے میں آئی ایس آئی کے ساتھ بہت زیادہ قریبی تعلقات استوار کرلیے۔جنرل ضیاء کو افغانستان پر سوویت قبضے سے کہیں زیادہ اس بات کی فکر تھی کہ وہاں بھارت اپنے پنجے پھیلانے میں کامیاب نہ ہوجائے۔افغان جنگ کے خاتمے کے بعد کابل کے حصول کیلئے افغان گروپوں کے درمیان چھڑنے والی جنگ سے یہ بات عیاں ہوگئی کہ جن جہادی گروپوں کو پاکستان نے پالا پوسا تھا وہ پاکستان کے اتنے تابع فرمان بھی نہ تھے جتنا ان کے بارے میں پاکستان نے سوچ رکھا تھا۔تاہم جنرل ضیاء کی موت کے ایک دہائی بعد تک

بھی افغانستان میں اپنے مفادات کو محفوظ کرنے اور کشمیر میں جہادیوں کو استعمال کرنے کی پالیسیوں پر عمل جاری رہا۔اس صورتحال کی قیمت امریکہ کے ساتھ بڑھتی ہوئی کشیدگی، پاکستان میں شدت پکڑتا فرقہ ورانہ تشدد اور برصغیر کی دو ایٹمی طاقتوں کے درمیان گہری ہوئی ہوئی محاذ آرائی کی کیفیت تھی۔اس طرح کے حالات کے بیج بھی بوئے جا چکے تھے جن کے نتیجے میں اسلامی انتہاپسندوں کے ہتھیاروں کا رخ اپنے مربی اور سرپرستوں آئی ایس آئی اور پاکستانی فوج کی طرف ہوگیا جبکہ پاکستانی ریاست کو اس کی کڑوی فصل نائن الیون کی ڈرامائی تبدیلی کے فوری بعد کاٹنا پڑی۔

☆☆☆

حوالہ جات

۱۔ Iftikhar H. Malik, "State and Civil Society in Pakistan: Politics of Authority, Ideology and Ethnicity (Basingstoke: MacMillan, 1997)

۲۔ Nighat Saeed Khan, "The New Global Order: Polilitics and the Women's Movements in Pakistan", in Soofia Mumtaz, Jean-Luc Racine, Imran Anwar Ali (eds), "Pakistan: The Contours of State and Society (Karachi: Oxford University Press, 2002)

۳۔ Matthew J. Nelson, "In the Shadow of Shari'ah: Islam, Islamic Laws and Democracy in Pakistan" (London: Hurst, 2011)

۴۔ Iqbal Akhund, "Memoirs of a Bystander: a Life in Diplomacy" (Karachi: Oxford University Press, 2002)

۵۔ O. Noman, "Impact of Migration on Pakistan's Economy and Society", in Hastings Donnan and Pnina Werbner (eds), "Economy and Culture in Pakistan: Migration and Cities in a Muslim Society (London: Palgrave MacMillan, 1991)

۶۔ J. S. Adelton, "Undermining the Centre (Karachi: Oxford University Press, 1992)

۷۔ Ian Talbot, " A Modern History (London: Hurst, 2009)

۸۔ J. Piscatori, "Asian Islam: International Linkages and their Impact on International Relations" in J.L. Esposito (ed), "Islam in Asia (New York: Oxford University Press, 1987)

۹۔ انہوں نے ۸۸۔۱۹۷۸ کے دوران تجارت میں فرق کے ۵۰ فیصد اور کل سرمایہ

کاری کے ۵۰ فیصد ادا کے مساوی سرمایہ کاری کی۔

۱۰۔ S. J. Burki, "Politics of Power and its Economic Imperatives: Pakistan 1947-99", in Anita M. Weiss and S. Zulifqar Gilani (eds) " Power and Civil Society in Pakistan (Karachi: Oxford University Press, 2001)

۱۱۔ Aijaz Ahmed, "The Rebellions of 1983: A Balance Sheet" South Asia Bulletin (Spring 1984), O. Noman, "Impact of Migration on Pakistan's Economy and Society" in Hastings Donnan and Pnina Werbner (eds), "Economy and Culture in Pakistan: Migration and Cities in a Muslim Society (London: Palgrave MacMillan, 1991)

۱۲۔ Stephen Cohen, "The Idea of Pakistan (New Delhi: Oxford University Press, 2004)

۱۳۔ James Raymond Vreeland, "Between the Lines: Pakistan's Debt of Gratitude", Foreign Policy 129 (March-April 2002)

۱۴۔ R. G. Wirsing, "Pakistan's Security Under Zia, 1977-1988: The Policy Imperatives of a Peripheral Asian State (Basingstoke: MacMillan, 1991)

۱۵۔ Praveen Swami, "India, Pakistan and the Secret Jihad: The Covert War in Kashmir 1947-2004 (London: Routledge, 2007)

۱۶۔ Iqbal Akhund, "Memoirs of a Bystander: a Life in Diplomacy"

۱۷۔ ایضاً۔

۱۸۔ المشیر ۱،۲۶ (۱۹۸۳)

۱۹۔ See Such Works as Afzal Tauseef, "Testimony; Badar Abro, "Furnance Days; Siraj, "The Eighth Man etc.

۲۰۔ K.K. Aziz, "The Pakistani Historian: Pride and Prejudices in the Writing of History (Lahore: Vanguard, 1993)

۲۱۔ M. Guzdar, "Pakistani Cinema 1947-1997 (Karachi: Oxford University Press, 1997)

۲۲۔ ایضاً۔

۲۳۔ Faiz Ali Chishti, "Betrayal of Another Kind: Islam, Democracy and the Army in Pakistan (London: Asia Publishing House, 1989)
Iqbal Akhund, "Memoirs of a Bystander: a Life in Diplomacy"

۲۴۔ Ian Talbot, " A Modern History (London: Hurst, 2009)

۲۵۔ Iqbal Akhund, "Memoirs of a Bystander: a Life in Diplomacy"

۲۶۔ Muhammad Waseem, "Election Politics 1985", The Muslim (April, 1985)

۲۷۔ See, Benazir Bhutto, "Daughter of the East: An Autobiography (London: Palgrave MacMillan, 2003)

۲۸۔ Farzna Sheikh, "Making Sense of Pakistan (London: Hurst, 2009)

۲۹۔ Hasan Askri Rizvi, "Military, State and Society in Pakistan" (Basingstoke: McMillan, 2000)

۳۰۔ Farzna Sheikh, "Making Sense of Pakistan

۳۱۔ V.R. Nasr, "Islam, the State and the Rise of Islamic Militancy" in C. Jaffrelot (ed), "Pakistan: Nationalism without a Nation (New Delhi: Manohar, 2002)

۳۲۔ ایضاً۔

۳۳۔ اکتوبر ۱۹۸۴ میں جاری ہونے والے صدارتی آرڈی نینس میں یہ قرار دیا گیا تھا

2009)

۴۱۔ اس کی پر اثر اور مقبول نظم ''وطن کی محبت'' کے انگریزی ترجمے کیلئے ملاحظہ کیجئے آئن ٹالبوٹ کی کتاب پاکستان: اے ماڈرن ہسٹری۔

۴۲۔ ایم کیو ایم کے ظہور کے سلسلے میں تفصیلی مطالعے کیلئے ملاحظہ فرمائیے I. Malik, "Ethno-Nationalism in Pakistan: A Commentary on Mohajir Qaumi Mahaz (MQM) in Sindh", South Asia 18, 2 (1995) ۔اس حوالے سے عائشہ صدیقہ کا خیال ہے کہ آئی جے آئی کی طرح ایم کیو ایم بھی سندھ میں بھٹو کی مقبولیت کو ختم کرنے کے سلسلے میں فوج کا ہتھیار ہے۔ملاحظہ کیجئے: Ayesha Siddiqa, "Military Incorporation: Inside Pakistan's Military Economy (London: Pluto Press, 2007)

۴۳۔ نیوز لائن کراچی، ۲۸ مارچ، ۱۹۹۴ء۔

۴۴۔ R. Laporte, "Administrative Restructuring During the Zia Period", in S. J. Burki and C. Baxter (eds), Pakistan Under the Military: Eleven Years of Zia ul Haq (Boulder, Co: Westview Press, 1991)

۴۵۔ Ayesha Siddiqa, "Military Incorporation: Inside Pakistan's Military Economy (London: Pluto Press, 2007)

۴۶۔ ایضاً۔

۴۷۔ ایضاً۔

۴۸۔ نیشنل لاجسٹک سیل کا قیام ۱۹۷۸ میں عمل میں لایا گیا جس کا جواز کراچی میں کارگو ٹرانسپورٹ کے بڑھتے ہوئے مسائل تھے۔

۴۹۔ سی آئی اے کی آئی ایس آئی کے ساتھ مہارتوں اور خفیہ معلومات کے تبادلے کے حوالے سے تفصیلی بیان کیلئے ملاحظہ کیجئے: J. L. Cooley, "Unholy Wars, Afghanistan, America and International Tourism (London: Pluto

کہ دو عورتوں کی گواہی ایک مرد کے برابر ہے۔ حدود آرڈیننس جن کے اجراء کا مقصد قرآن و سنت میں دی گئی اسلامی تعزیرات کا نفاذ تھا، متنازعہ طور پر جنسی جرائم کے سلسلے میں قانون شہادت پر انحصار کرتا ہے۔سزا کیلئے ضروری ہے کہ ملزم خود اقبال جرم کرے یا زنا کے عمل کو خود اپنی آنکھوں سے دیکھنے والے چار ''صالح'' مرد اس کی گواہی دیں۔زنا بالجبر کے کیسوں میں اقبال جرم زبانی کلامی ہے تاہم عورتوں کیلئے ضروری ہے کہ ثبوت کے طور پر وہ حاملہ ہوں یا طبی معائنے سے گذریں۔جن عورتوں کو زنا بالجبر کا شکار بنایا گیا ہو انہیں زنا کے جرم میں کوڑوں کی سزا سنائی جاتی تھی جبکہ زنا کا ارتکاب کرنے والا مرد عام طور پر سزا سے بچ نکلتا تھا۔

۳۴۔ عورتوں کے ساتھ امتیازی سلوک کی ایک اور شہادت دیت کا مقرر کیا جانا تھا جس کی رقم عورت کی صورت میں مرد کے نصف مقرر کی گئی تھی۔

۳۵۔ Ian Talbot, " A Modern History (London: Hurst, 2009)

۳۶۔ Stephen Cohen, "The Idea of Pakistan (New Delhi: Oxford University Press, 2004)

۳۷۔ See, Saeed Shafqat, "From Official Islam to Islamism: The Rise of Dawat -ul- Irshad and Lashkar-e-Tayyaba", in C. Jaffrelot (ed), "Pakistan: Nationalism without a Nation (New Delhi: Manohar, 2002)

۳۸۔ ذکری سید محمد کے پیروکار ہیں جسے وہ مہدی سمجھتے ہیں۔ان کے ہاں مسجد یا نماز پڑھنے کیلئے کسی مخصوص جگہ کا کوئی تصور نہیں ہے تاہم اس کے باوجود وہ مسلمان ہونے کے دعویدار ہیں۔ان کا روایتی مسلمانوں کے ساتھ سب سے بڑا فرق ان کی جانب سے مکہ کی بجائے مکران کے شہر تربت میں کوہ مراد میں حج کرنا ہے۔

۳۹۔ R. G. Wirsing, "Pakistan's Security Under Zia, 1977-1988: The Policy Imperatives of a Peripheral Asian State

۴۰۔ Farzna Sheikh, "Making Sense of Pakistan (London: Hurst,

Press, 1999)

۵۰۔ Saira Yamin, "Peace Building in Afghanistan: Rervisiting the Global War on Terrorism (Colombo: Regional Centre for Strategic Studies, 2008)

۵۱۔ Ian Talbot, " A Modern History (London: Hurst, 2009), Yunus Samad, "In and Out of the Power but Not Down and Out: Mohajir Identity Politics" in C. Jaffrelot (ed), "Pakistan: Nationalism without a Nation (New Delhi: Manohar, 2002)

۵۲۔ ایضاً۔

۵۳۔ Ayesha Siddiqa, "Military Incorporation: Inside Pakistan's Military Economy

☆☆☆

6

پاکستان کا جمہوری تماشہ

۱۹۸۸ـ۹۹

جنرل ضیاء الحق کی موت کے بعد پاکستان میں شروع ہونے والے جمہوری سفر سے لوگوں کو امید بندھی تھی کہ اب ملک میں جدید پارٹی سسٹم کا آغاز ہوگا، دیرینہ سماجی ناانصافیوں کا ازالہ ہوگا نیز مرکز اور صوبوں کے درمیان مسائل کا خاتمہ ہوگا جس نے ملک کو مشکلات میں مبتلا کر رکھا تھا۔ایک نوجوان وزیر اعظم کی حیثیت میں بے نظیر بھٹو کے اقتدار پر فائز ہونے سے یہ امید بھی پیدا ہو چلی تھی کہ ایک خاتون وزیر اعظم کی موجودگی میں ملک میں صنفی عدم مساوات کے مسئلے پر بھرپور توجہ دی جائے گی اور پاکستان ایک ترقی پسند اور رواداری پر مبنی جدید مسلم ریاست بنے گا۔افسوس ان تمام امیدوں نے جلد ہی اپنی موت مر جانا تھا۔

اس عرصے کے دوران بے نظیر بھٹو اور نواز شریف کا ایک کے بعد ایک کر کے اقتدار پر فائز ہونا اقتدار کی جنگ، مالیاتی سکینڈلز، محدود پیمانے پر قانون سازی کے عمل اور معاشی ناکامیوں سے عبارت ہے۔انتہائی سست رفتار ترقی کی وجہ سے ملک میں غربت کی شرح میں مسلسل اضافہ ہوتا رہا باجود اس امر کے کہ نواز شریف نے معیشت کو لبرل خطوط پر ڈھالنے کی کوشش کی تھی۔اس مدت کے دوران جمہوری استحکام انجماد کا شکار بھی رہا۔خرابی کہاں پر تھی؟ ایسا کیوں ہوا کہ سویلین اقتدار ملک کے دیرینہ مسائل کو حل کرنے میں ناکام رہا؟ کیا تاریخ کا بوجھ بہت زیادہ تھا؟

اس دور کی جانب مڑ کر دیکھتے ہوئے جنرل پرویز مشرف نے جسے ''جعلی جمہوریت'' کا نام دیا، اس عہد کا خود ایک آسان اور گمراہ کن جواب پیش کیا کہ یہ تمام کی تمام سیاستدانوں کی ناکامی تھی۔انہوں نے ملک کو لوٹا اور کرپشن، بدانتظامی اور غیر ذمہ داری کے ذریعے اسے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا۔جنرل مشرف کی طرف سے سیاستدانوں پر اس طرح کی الزام تراشی نئی بات نہیں تھی۔فوجی حکمران اپنی مداخلت کو جائز ثابت کرنے کیلئے اسی طرح کی تاویلیں پیش کرتے آئے ہیں۔اس قسم کے رویئے فوجی افسران کے کیڈر کی نفسیات کا حصہ بن چکے ہیں۔میجر جنرل راشد قریشی جو مشرف دور کا پہلا ڈی جی آئی ایس پی آر تھا قرار دیتا ہے کہ فوجی افسران کسی اوسط درجے کے سول سرونٹ سے زیادہ ذہین اور کوالیفائیڈ ہوتے ہیں اور یقینی طور پر کسی بھی سیاستدان سے زیادہ موثر ہوتے ہیں(۱)۔

لبرل حضرات اس کا کچھ اور ہی جواب دیتے ہیں۔ان کا کہنا ہے کہ تاریخ کے بوجھ کی وجہ سے جمہوریت ناکام ہوئی۔پاکستان کے دیرینہ مسائل میں شدت جنرل ضیاء کے عہد میں آئی تھی۔اس نے عدم برداشت، مذہبی جنون اور تقسیم کی وراثت آگے منتقل کی تھی جسے ختم کرنا مشکل ثابت ہو رہا ہے۔بھٹو کے سپورٹرز اس سے بھی ایک قدم آگے جا کر کہتے ہیں کہ فوج نے آئی ایس آئی کی مدد سے جان بوجھ کر اسلامی جمہوری اتحاد (آئی جے آئی) کی چھتری تلے بھٹو مخالف سیاسی قوتوں کو منظم کیا تھا تا کہ ملک کو آگے لے کر جانے والے سیاسی ایجنڈے کا راستہ روک دیا جائے۔

اس باب میں ۱۹۸۸ کے بعد سے جمہوریت کے سفر کا تجزیہ پیش کیا جائے گا۔اس بات پر بھی توجہ مبذول کی جائے گی کہ اس نے پاکستان کے ان دیرینہ مسائل اور حالات و واقعات پر کیا اثرات مرتب کیے جن کی وجہ سے جمہوریت کا استحکام اب تک ممکن نہیں ہو پایا ہے۔تاریخ کے بوجھ سے متعلق دلائل کو تسلیم کرتے ہوئے ہم یہ بھی دیکھیں گے کہ غیر جمہوری قوتوں کے ٹریپ میں آ کر یا حتیٰ کہ اپنے سیاسی ایجنڈے کیلئے ان کے ساتھ گٹھ جوڑ بناتے ہوئے اس دور کے لیڈروں نے خود اپنے لیے زندگی کو کیسے مشکل بنایا۲۔اگر انہیں وارہ کھاتا تھا تو انہوں نے سول سوسائٹی کو دبانے اور

قانونی ڈھانچے کی آزادی کو چیلنج کرنے کیلئے کیسے خطرناک حد تک بے تابی کا مظاہرہ کیا۔اس آئینی ٹکو کے حالات و واقعات کا تجزیہ کرنے سے پہلے جس نے نواز شریف اور بےنظیر کی حکومتوں کو گھر بھیجا ہم ان دونوں لیڈروں کی اپنی پارٹی کی تنظیم سازی میں ناکامی کا جائزہ لیں گے۔اس کے بعد اس باب میں یہ دیکھا جائے گا کہ یہ جمہوری وقفہ مرکز اور صوبوں کے تعلقات، فوج کی سول معاملات میں مداخلت کاری اور بھارت کے ساتھ تعلقات کے حوالے سے گذشتہ ادوار سے کیسے مختلف تھا۔اس باب میں ہم شدت پکڑتے ہوئے فرقہ ورانہ تشدد اور ریاست پاکستان کے خلاف مسلح عسکریت پسندوں کی جانب سے درپیش چیلنجوں کا بھی جائزہ لیں گے۔

تنظیم کاری کے مسائل

۔ان سطور میں اس حوالے سے استدلال کیا گیا ہے کہ سیاسی تنظیم سازی میں ناکامی پاکستان میں جمہوری استحکام میں ایک بڑی رکاوٹ کی حیثیت رکھتی ہے۔عوام میں اپنی حمایت میں اضافے کیلئے لیڈر حضرات اپنی ذات کی کشش اور سرپرستانہ انداز کو ترجیح دیتے ہیں۔پاکستان میں اب تک عوامی سطح پر تحرک کو ادارہ جاتی حیثیت نہیں دی جا سکی ہے۔یہاں سیاست آئیڈیاز اور اداروں کی بجائے ہمیشہ سے شخصیات اور سرپرستی کے گرد گھومتی رہی ہے۔معاملات کی یہ صورت ۱۹۹۰ کی دہائی میں بھی جاری رہی۔

اپنے والد کی طرح بےنظیر بھٹو نے بھی پیپلز پارٹی کو اپنی ذات کی توسیع سمجھتے ہوئے اس کی ترقی کے راستے مسدود کر دیئے تھے۔۱۹۸۶ میں ملک میں اپنی فاتحانہ واپسی کے فوری بعد بےنظیر بھٹو نے پارٹی کے پرانے رہنماؤں ممتاز علی بھٹو، عبدالحفیظ پیر زادہ اور غلام مصطفیٰ جتوئی وغیرہ کو باہر کا راستہ دکھا دیا تھا۔ان کی جگہ وہ ایسے افراد کو آگے لے کر آئی تھی جو پارٹی اور اس کی بنیادی فکر کی بجائے خود اس کے ذاتی وفادار تھے۔غلام مصطفیٰ جتوئی تو اس قدر بد دل ہوئے کہ انہوں نے اپنی الگ جماعت بنا لی جو ۱۹۸۸ میں بےنظیر حکومت کے خلاف بننے والے اتحاد آئی جے آئی میں شامل تھی۔بےنظیر کی جانب سے پارٹی کے پرانے رہنماؤں سے پیچھا چھڑانے کے سلسلے میں زیادہ تر الزام

آصف علی زرداری پر عائد کیا جاتا ہے لیکن اپنی شادی سے پہلے بھی بے نظیر بھٹو نے جمہوریت کیلئے اپنی جدوجہد کے دوران پیپلز پارٹی کو مضبوط بنانے یا اسے جمہوری خطوط پر استوار کرنے میں کوئی خاص دلچسپی نہیں لی تھی۔

آئی جے آئی نے کبھی خود کو موثر طور پر جدید سیاسی تنظیم میں ڈھالنے کی کوشش نہیں کی۔اس سیاسی اتحاد کا کوئی مرکزی سیکرٹیریٹ تھا نہ اس کے اندر انتخابات کا کوئی تصور تھا۔اس میں شامل سب سے اہم پارٹی نواز شریف کا مسلم لیگی دھڑا بھی اسی طرح کمزور تنظیم کاری کا شکار تھا۔بلاشبہ اسے اپنی سیاسی حریف بے نظیر بھٹو پر ایک سبقت ضرور حاصل تھی کہ وہ پرانے طرز سیاست میں زیادہ مہارت رکھتا تھا۔نواز شریف نے ۱۹۸۸ میں ہونے والے انتخابات میں مسلم لیگ کے صدر محمد خان جونیجو کی کمزور انتخابی کارکردگی کا خوب فائدہ اٹھایا اور جونیجو کی مسلم لیگ کے دھڑے کو سائیڈ لائن کرتے ہوئے خود اپنے دھڑے کو نمایاں کرلیا۔

اس قسم کی سیاسی پینترہ بازی آزادی کے بعد سے پنجاب کی سیاست کی نمایاں خصوصیت رہی ہے۔جبکہ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ نواز شریف کا دھڑا مسلم لیگ میں پہلی مرتبہ ایک بڑی تعداد میں شہری اور متوسط طبقے کے لوگوں کو لے کر آیا وہیں یہ بھی سچ ہے کہ پارٹی میں توازن نواز شریف کی ذات اور طاقت کے اردگرد گھومتا رہا۔پرو جونیجو دھڑا ۱۹۹۳ کے بحرانی دور میں نواز شریف کی مخالف صفوں میں اکٹھا ہوگیا۔اس وقت کے پنجاب اسمبلی کے سپیکر منظور وٹو نے وزیر اعلیٰ غلام حیدر وائیں کو اسمبلی کی رکنیت سے نااہل قرار دیتے ہوئے خود صوبے کی وزارت اعلیٰ پر قبضہ کرلیا۔یہ مسلم لیگ نون میں اس فل سکیل بغاوت کی ایک طرح سے ریہرسل تھی جو اکتوبر ۱۹۹ کی فوجی بغاوت کے بعد جنرل مشرف کے اشارے پر عمل میں لائی گئی۔

نواز شریف اور بے نظیر دونوں نے ۱۹۹۰ کی دہائی میں نا صرف پارٹی ڈیموکریسی کو مضبوط کرنے کے مواقع ضائع کیے بلکہ جانتے بوجھتے ہوئے ریاستی اداروں کو سیاست کا شکار بنادیا۔ان کے اس رویے کی سب سے نمایاں مسائل ہائی کورٹس کو اپنے آدمیوں سے بھردینے کا عمل ہے۔جب مارچ ۱۹۹۶ میں سپریم کورٹ نے اس

پریکٹس کو روکنے کی کوشش کی تو اس وقت کے صدر فاروق لغاری کی جانب سے اس فیصلے پر عمل درآمد کے نتیجے میں بے نظیر ان کی مخالف ہوگئیں۔اٹھارہ ماہ پہلے انہوں نے پیپلز پارٹی کے ۱۳ جیالوں کو لاہور ہائیکورٹ کا جج بنادیا تھا۔ان میں سے چند ایسے بھی تھے جن کی پیشہ ورانہ اہلیت مشتبہ سمجھی جاتی تھی۔اگست ۱۹۹۷ میں نواز شریف کا عدالت عظمیٰ میں خالی اسامیاں پر کرنے کے معاملے پر سپریم کورٹ کے چیف جسٹس سید سجاد علی شاہ سے تصادم ہوگیا۔اس کے نتیجے کے طور پر نواز شریف کو توہین عدالت کی کارروائی کا سامنا کرنا پڑا۔اس موقع پر نواز شریف کے حامیوں کے ایک حصے نے جذبات سے بے قابو ہوکر سپریم کورٹ کی عمارت پر دھاوا بول دیا۔بعد ازاں جب صدر لغاری نے نئے چیف جسٹس کی تعیناتی سے انکار کیا تو نواز شریف نے انہیں مواخذے کی دھمکی دے دی۔۱۹۹۳ میں جب غلام اسحاق خان نے نواز شریف کے ساتھ محاذ آرائی شروع کی تو اس میں فوج نے صدر کا ساتھ دیا تھا لیکن اس موقع پر اس نے لاتعلقی اختیار کرلی کیونکہ فوج ۱۹۹۷ کے انتخابات کے کچھ ہی عرصے کے بعد کوئی مزید انتشار نہیں چاہتی تھی۔۲ دسمبر کو لغاری نے صدارت سے استعفیٰ دے دیا تو نواز شریف کیلئے ۱۹۹۸ کے سال کے پہلے روز محمد رفیق تارڑ کو صدر بنانے کی راہ ہموار ہوگئی جو ان کے والد کے دوست تھے۔تاہم اس سے پہلے قائم مقام صدر وسیم سجاد چیف جسٹس سجاد علی شاہ کو فارغ کر چکے تھے۔گوکہ اسے نواز شریف کی ذاتی فتح قرار دیا جاسکتا ہے تاہم یہ پاکستان کے جمہوری استحکام پر ایک اور کاری وار ثابت ہوا۔

جمہوریت اور مطلق العنانیت

۱۹۹۰ کی دہائی میں قومی اسمبلی کی برطرفی اور منتخب وزرائے اعظم کو اقتدار سے محروم کرنے کا صدارتی اختیار تین مواقع پر استعمال ہوا۔بے نظیر بھٹو کو دو مرتبہ مذکورہ آئینی شق کی تلوار کے گھاٹ اترنا پڑا (۱۹۹۷،۱۹۹۰) جبکہ نواز شریف نے ایک مرتبہ اس کا ذائقہ چکھا (۱۹۹۳)۔اس انتظامی اختیار کا جواز وزرائے اعظم کی قانونی ذمہ داریاں پوری کرنے اور امن وامان کی بحالی میں ناکامی قرار دیا گیا۔کرپشن کے آزمودہ

الزامات ان کے علاوہ تھے جو دونوں وزرائے اعظم کے خلاف لگائے گئے۔ تینوں مرتبہ وزرائے اعظم کو گھر بھیجنے کے بعد عبوری حکومتیں قائم کی گئیں اور ان کے تحت نئے انتخابات کرائے گئے جن میں ہارنے والی پارٹی نے دھاندلی کے الزامات عائد کیے۔ مثال کے طور پر ۱۹۹۱ میں انتخابات میں ناکامی کے بعد پیپلز پارٹی نے مبینہ انتخابی دھاندلیوں کے حوالے سے وائٹ پیپر جاری کیا جس کا عنوان تھا ''کیسے الیکشن کو چرایا گیا؟''۔ ۱۹۹۳ میں نواز شریف کی برطرفی کا منظر اس حوالے سے مختلف تھا کہ اس کے نتیجے میں آئینی بحران پیدا ہو گیا اور صدر اور وزیر اعظم دونوں کو اقتدار سے محروم ہونا پڑا۔ غلام اسحاق خان کے فوج کے ساتھ قریبی تعلقات نے ۱۹۹۰ اور ۱۹۹۳ میں اس کی جانب سے آئینی اختیار کو استعمال کرنے کے سلسلے میں حوصلہ افزا ثابت ہوئے اور اس حوالے سے یہ بھی کہا جاتا ہے کہ انہیں فوج کی جانب سے آشیر باد حاصل تھی۔ تاہم فاروق لغاری کی جانب سے بے نظیر بھٹو کی ۱۹۹۷ میں برطرفی نہایت غیر متوقع تھی کیونکہ وہ قبل ازیں پیپلز پارٹی کے وفاداروں میں شامل تھے اور خود ان کے نامزد کردہ تھے۔ صدر کی حیثیت سے اپنے انتخاب سے پیشتر فاروق لغاری نے وعدہ کیا تھا کہ وہ صدر کی حیثیت سے غیر جانبدار رہیں گے۔ ان کے انتخاب کے نتیجے میں ہر ایک کو یقین تھا کہ ۱۹۸۵ کے بعد بے نظیر بھٹو وہ واحد وزیر اعظم ہوں گی جو اپنی پانچ سال کی مدت پوری کریں گی۔ جب فاروق لغاری نے انہیں برطرف کیا تو وہ سخت صدمے سے دوچار ہوئیں۔ لغاری نے بعد ازاں کہا کہ انہوں نے یہ اقدام فوج کو اعتماد میں لے کر اٹھایا تھا اور اس میں فوج کی منظوری بھی شامل تھی (۳)۔

نواز شریف نے ۱۹۹۳ میں اپنی برطرفی سے یہ سبق حاصل کیا کہ صدارتی اختیار کا خاتمہ ضروری ہے۔ انہوں نے ۱۹۹۷ میں حاصل ہونے والی دو تہائی اکثریت کو آئین سے آٹھویں ترمیم سے نکالنے کیلئے استعمال کیا۔ ان کے مخالفین کے خیال میں انہوں نے اپنی طاقت کو پارلیمانی خودمختاری حاصل کرنے کی بجائے آئینی آمریت قائم کرنے کیلئے استعمال کیا۔ آٹھویں ترمیم کے بغیر فوج کی جانب سے دستوری انقلاب کے امکانات باقی نہیں رہے تھے لہٰذا اس مرتبہ وزیر اعظم کو ہٹانے کیلئے ۱۲ اکتوبر ۱۹۹۹ میں فوج کو براہ راست بغاوت کرنا پڑی۔

صدارت کے علاوہ فوج کی سیاست میں دخل اندازی کو کونسل آف ڈیفنس اینڈ نیشنل سیکورٹی (سی ڈی این ایس) کے ذریعے یقینی بنایا جا سکتا تھا۔ اس خیال کے ڈانڈے کہ فوج رسمی طور پر سیاستدانوں کے ساتھ فیصلہ سازی کے عمل میں شرکت کرے جنرل ضیاء کے دور سے ملتے ہیں جب اس نے نیشنل سیکورٹی کونسل کی تجویز پیش کی تھی۔ ۱۹۹۷ میں بے نظیر کی دوسری برطرفی کے بعد قائم ہونے والی عبوری حکومت کے وزیر اعظم ملک معراج خالد نے سی ڈی این ایس کو ایک مشاورتی ادارے کی حیثیت سے قائم کر دیا تھا جس کی حیثیت عارضی تھی کہ انتخابات کے بعد برسر اقتدار آنے والی حکومت چاہے تو اس ادارے کو باقی رہنے دے اور چاہے تو ختم کر دے۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ اس ادارے کی سربراہی وزیر اعظم کی بجائے صدر کو سونپی گئی تھی۔ سی ڈی این ایس کی سب سے زیادہ مخالفت جماعت اسلامی کی جانب سے سامنے آئی جس کے خیال میں یہ ادارہ اس ''امریکی منصوبے'' کا حصہ ہے جس کے تحت وہ پاکستان پر آئی ایم ایف اور ورلڈ بنک کی اجارہ داری قائم کرنا چاہتا ہے اور اسلامی تحریکوں کو محدود کرنا چاہتا ہے (۴)۔ درحقیقت یہ ادارہ ''ٹرائیکا'' کے تصور کو رسمی شکل دینے کے مترادف جس کے تحت ۱۹۸۸ کے بعد سے اقتدار کے عمل میں تین افراد شریک تھے یعنی وزیر اعظم، صدر اور آرمی چیف جبکہ اس میں وزیر اعظم کا کردار جونیئر حاصل کا حامل تھا۔ اگر وسیع تر تناظر میں دیکھا جائے تو سی ڈی این ایس پاکستان کی ''وائسر یگل'' روایات کا جدید ایڈیشن تھا۔ وزارت عظمیٰ پر فائز ہونے کے بعد فروری ۱۹۹۷ میں نواز شریف نے سی ڈی این ایس پر سخت اظہار ناپسندیدگی کرتے ہوئے اس کا پہلا اجلاس منعقد نہ ہونے دیا تھا۔ یہاں سے نواز شریف اور فوج کے درمیان اس کشیدگی کا آغاز ہوا جس کا نکتہ انتہا ۳۰ ماہ بعد ہونے والی فوجی بغاوت اور ان کی برطرفی تھا۔ نواز شریف کی بربادی کا سبب بننے والے جنرل پرویز مشرف اس خیال کو عملی جامہ پہناتے ہوئے سیاسی فیصلہ سازی کے قلب میں فوج کے رسمی کردار کا تعین کر دیا۔

احتساب ایک اور آزمودہ طریقہ کار ہے جس کے تحت فوج اپنے سیاسی مخالفین

کو اپنے بوجھ تلے کچلتی آئی ہے۔ہم پچھلے ابواب میں تفصیل سے بات کرآئے ہیں کہ کیسے فوجی حکمرانوں نے پاکستان کی پوری تاریخ میں سیاسی مخالفین کو کنٹرول کرنے کیلئے کرپشن کی یک طرفی اور جانبدارانہ شکل کو استعمال کیا ہے۔انہیں یا تو ڈس کوالیفائی قرار دے دیا جاتا تھا یا طویل عدالتی چکروں میں الجھادیا جاتا تھا۔یوں ناصرف ان کی توانائیاں عدالتی برآمدوں میں خرچ کردی جاتی تھیں بلکہ ووٹروں کے سامنے بھی ان کی ساکھ کو برباد کرنے کی کوششیں کی جاتی تھیں۔جب غلام اسحٰق خان اور فاروق لغاری نے بےنظیر اور نواز شریف کی حکومتوں کو برطرف کیا تو کرپشن کے سنگین الزامات ان کے خلاف جاری ہونے والی فرد جرم کا لازمی حصہ ہوا کرتے تھے۔ وہ ان الزامات کو مسترد کرتے اور انہیں سیاسی انتقام کا شاخسانہ قرار دیتے تھے۔تاہم بےنظیر بھٹو کے شوہر آصف زرداری پر کرپشن کے داغ اتنے پکے تھے کہ انہوں نے ان کی ساری شخصیت کو داغدار کردیا اور ان کی ساکھ اور اعتبار کا ناقابل تلافی نقصان پہنچایا۔کرپشن کے داغ ایسے ہیں جنہیں دھونا تقریباً ناممکن ہے۔کیا یہ فوج کی طرف سے ایک طرح کے کرپٹ سیاستدانوں کی جگہ دوسری طرح کے کرپٹ سیاستدانوں کو لانے کا کیس تھا تاکہ ان کے بنیادی مفادات کو کوئی چیلنج نہ کرسکے؟

یقینی امر ہے کہ جس نوعیت کی سیاست پاکستان میں رائج ہے سیاستدان کرپشن کے الزامات کے نہایت آسان ہدف ہوتے ہیں۔نواز شریف اور بےنظیر دونوں نے روایتی پیٹرن کلائنٹ طرز سیاست کو پارٹی کے مضبوط تنظیم کاری کے حامل ڈھانچوں سے بدلنے کی کوشش نہیں کی۔جیسے آل انڈیا مسلم لیگ نے ۱۹۴۶ کے انتخابات سے قبل ٹکٹوں کی تقسیم کی تھی عین اسی طرح بےنظیر بھٹو نے ۱۹۸۸ میں ان موقع پرستوں کو پارٹی ٹکٹ بانٹے جو پارٹی کی یقینی فتح کو دیکھتے ہوئے اس کی کشتی میں چھلانگ لگا کر سوار ہوگئے تھے۵۔مسلم لیگ اور پیپلز پارٹی دونوں نے اپنے منتخب ارکان پارلیمان کو یہ باور کرانے کی کوشش نہیں کی کہ ان کی اصل ذمہ داری اپنے حلقوں کیلئے ترقیاتی فنڈز حاصل کرکے اپنے قریبی لوگوں کو خوش کرنا نہیں ہے بلکہ قانون سازی ہے۔اس سارے عرصے کے دوران آرڈیننسوں کے اجراء کے ذریعے حکومت چلانے کا رواج بدستور

جاری رہا۔یہاں تک کہ بےنظیر کے ہمدرد بھی اعتراف کرنے پر مجبور ہیں کہ ۱۹۸۸ سے ۱۹۹۰ تک چلنے والی حکومت قانون سازی کے عمل کو مضبوط کرنے میں ناکام رہی تھی۔اس دور کی سب سے نقصان دہ بات اسمبلی میں اپنی حمایت خریدنے کیلئے قومی ملکیت میں موجود بنکوں سے بے دریغ قرضوں کی سہولت حاصل کرنا تھا۔ان مالی بے قاعدگیوں کا بھانڈا اس وقت پھوٹا جب نگران وزیراعظم معین قریشی نے ۵،۰۰۰ سے زیادہ بنکوں کے نادہندگان کہ فہرست شائع کی۔ان دو سالوں کے دوران بنکوں سے تقریباً ۹۲ ارب روپے کے قرضے وصول کیے گئے یا معاف کرائے گئے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ جن لوگوں کے اقتدار پر فائز لوگوں کے ساتھ مراسم ہوتے ہیں ان کیلئے بنکوں کو لوٹنا کس قدر آسان کام ہوتا ہے۔معین قریشی نے غالباً سی آئی اے کی مدد سے سیاستدانوں پر اس وقت ایک اور کاری ضرب لگائی جب اس نے ایک فہرست شائع کی جن میں ان اہم سیاستدانوں کے نام شامل تھے جو منشیات کے کاروبار میں ملوث رہے ہیں(۶)۔

ضیاء ور میں فوج کے ریاست میں اثر ونفوذ کو دیکھتے ہوئے کہا جاسکتا ہے کہ ''صاف ستھری'' سویلین حکومتوں کیلئے بھی اس کے رسوخ کو کم کرنا ممکن نہ ہوتا۔تاہم اس سلسلے میں پیش رفت کی جاسکتی تھی اگر حکومت اور اپوزیشن دونوں اس معاملے پر یکجا ہوجاتیں۔اس حوالے سے نواز شریف کے پرانے وفادار اور پرویز مشرف کی پروردہ مسلم لیگ (ق) کی حکومت میں بہت اہم مقام حاصل کرنے والے سید مشاہد حسین اس حوالے سے کہتے ہیں:

''خطِ تقسیم کے دونوں جانب موجود سیاست دانوں نے اپنے محدود مفادات سے بالاتر ہونے کے حوالے سے نااہلیت کا مظاہرہ کیا ہے۔وہ صرف اس وقت ''سیدھے'' ہوتے ہیں جب انہیں خاکی وردی والوں کی جانب سے ''تابع داری'' کا حکم صادر ہوتا ہے۔یہ ان کے اپنے امیج کیلئے بہتر ہوتا کہ وہ خود اپنے تئیں مفاہمت کے راستے اپناتے نا کہ اس وقت جب ان پر ''اوپر والوں'' کی جانب سے دباؤ

آئے''(۷)۔

جب دونوں لیڈر اقتدار میں ہوتے تھے تو وہ اپنے مخالفین کو دبانے کیلئے آمرانہ ہتھکنڈے اختیار کرتے تھے جبکہ جو فریق اقتدار سے باہر ہوتا وہ حکومتی فریق کو باز رکھنے کیلئے اسٹیبلشمنٹ والوں سے رابطے شروع کر دیتا تھا۔ ایسا دکھائی دیتا ہے کہ ۱۹۵۰ کی دہائی میں جمہوری ناکامیوں سے سیاست دانوں نے کوئی سبق نہیں سیکھا ہے۔ پاکستان میں اقتدار کو ملک کے دیرینہ سٹرکچرل مسائل کو حل کرنے کیلئے استعمال کرنے کی بجائے اپنے حامیوں کو نوازنے اور مخالفوں کو دبانے کیلئے استعمال کیا جاتا ہے۔ بے نظیر بھٹو کے پہلے دور حکومت میں نواز شریف اور دیگر اپوزیشن رہنماؤں کو ۱۶۰ مقدموں کا سامنا تھا جو ٹیکس چوری اور قرض نادہندگی سے متعلق تھے۔ ایک موقع پر پاکستان کی ریلوے نے اس عذر کے تحت کہ اس کے پاس مطلوبہ تعداد میں بوگیاں نہیں ہیں اتفاق فاؤنڈری کو خام مال کی فراہمی سے انکار کر دیا تھا(۸) جبکہ سیاسی حریف تکلیف کے عالم میں تھے، بے نظیر بھٹو ضیاء کے تاریک دور میں ریاستی ظلم کا شکار ہونے والے پیپلز پارٹی کے جیالوں کو دل کھول کر نواز رہی تھیں(۹)۔ جب ۱۹۹۰ میں نواز شریف برسر اقتدار آئے تو جوتی میں موجود پاؤں تبدیل ہو گیا۔ انہوں نے ترقیاتی فنڈز کے دھارے کا رخ اپنے مضبوط سیاسی مرکز وسطی پنجاب کی طرف موڑ دیا۔ اس دور میں بے نظیر بھٹو کو سیکرٹ سروس فنڈز کے غلط استعمال کے الزامات کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ پیپلز پارٹی کے اقتدار سے باہر ہونے کے کچھ ہی دیر کے بعد آصف علی زرداری کو کرپشن کے کیسوں کی طویل فہرست تھما دی گئی تھی۔ ابتدائی طور پر ان پر یہ الزام عائد کیا گیا کہ انہوں نے غلط بیانی کر کے ایک بنک سے قرضہ حاصل کیا تھا۔ معاملات نے اس وقت سنگین صورت اختیار کر لی جب مئی ۱۹۹۱ میں ان پر سیاسی مخالفین کے قتل کے الزامات عائد کیے گئے۔

بے نظیر بھٹو کے پاس یہ کہنے کا جواز موجود تھا کہ اس قسم کے گھڑے گھڑائے الزامات کی موجودگی میں ان سے ذمہ دار اپوزیشن لیڈر کے طور پر پیش آنا ممکن نہیں تھا خاص طور پر جب مذہبی امور کے ایک وزیر نے انہیں ''کافر'' قرار دیا ہو اور وزیر اعظم

کے سندھی اتحادی جام صادق علی نے انہیں ''دہشت گرد'' قرار دے رکھا ہو۔ تاہم اس کے باوجود ۱۹۹۳ میں ان کا صدر غلام اسحاق خان سے خفیہ طور پر ملنا اور انہیں کہنا کہ اگر وہ وزیر اعظم ہوتیں تو وہ ان کی بحیثیت صدر دوسری مدت کی حمایت کرتیں، جمہوریت پسندی کے دعوے دار کیلئے ناقابل معافی جرم ہے۔

ہر ''آئینی گو'' اس وقت ہوا جب منتخب لیڈر کا فوج کے مفادات کے ساتھ ٹکراؤ ہوا۔ ہر مرتبہ حکومت کی برطرفی پر اپوزیشن نے اس کی حمایت سے گریز کیا جس کی ایک وجہ تلخ سیاسی دشمنیاں تھیں۔ سویلین حکومتوں کی جانب سے اقتصادی مسائل کی طرف توجہ دینے میں ناکامیوں کا مطلب یہ تھا کہ سول ملٹری تعلقات کو نئے خطوط پر استوار کرنے کیلئے سیاسی سطح پر مضبوط حمایت عنقاء تھی۔ نواز شریف اور بے نظیر بھٹو دونوں جمہوری جدوجہد کی علامتیں نہیں بلکہ محض اپنے دھڑوں کی سرپرست شخصیات تھیں۔ حالانکہ بے نظیر جلاوطنی سے ملک واپسی پر یہ رول ادا کر چکی تھیں۔ ان میں سے کوئی بھی حکومت جو چاہے آئینی شق کی تلوار کا نشانہ بنی ہو یا براہ راست فوجی بغاوت کا شکار ہوئی ہو پاکستان بھر میں چاہے جانی والی حکومت نہیں تھی۔ ان کے خاتمے کو اتنے ہی سکون سے لیا جاتا جتنے جنرل ضیاء کے مارشل لاء کو لیا گیا تھا۔

ا۔ بے نظیر بھٹو کی عزت و منزلت سے محرومی

اقبال اخوند جو بے نظیر بھٹو کے پہلے دور حکومت میں قومی سلامتی و خارجہ امور کے مشیر ہوا کرتے تھے، انہیں اس وجہ سے ہدف تنقید بناتے ہیں کہ انہوں نے ۱۹۸۸ میں اس کے باوجود اقتدار کو قبول کر لیا کہ انہیں اسٹیبلشمنٹ کے ساتھ دفاعی بجٹ، خارجہ پالیسی اور سلامتی کے امور پر سمجھوتا کرنا پڑا تھا۔ ان کا کہنا ہے کہ ''اس سمجھوتے کا مطلب کسی طرح کی مفاہمت نہیں تھی بلکہ اسٹیبلشمنٹ کو وقت دینا تھا کہ وہ اپنی آسانی کے مطابق بے نظیر کے زوال کی سازش تیار کر سکے اور اس کے بعد آرام سے ان کی راہوں میں کانٹے بچھا سکے اور ہر قسم کے بوبی ٹریپ نصب کر سکے''(۱۰)۔ انہوں نے درست طور پر نشاندہی کی ہے کہ ان کی حکومت کی توجہ اپنے پروگرام پر عمل کرنے کی بجائے پہلے

روز سے اپنی بقاء کی جدوجہد کی طرف رہی تھی۔اس کے نتیجے کے طور پر شروع ہونے والی کشمکش میں پارٹی کے ابتدائی پاپولسٹ آؤٹ لک کو پارٹی سے نکال پھینکنے کی وجہ سے رونما ہونے والے واضح وژن کے فقدان کی وجہ سے مزید شدت آتی چلی گئی۔واضح سماجی ومعاشی ایجنڈے کی عدم موجودگی میں بھی اداروں کے استحکام اور قانون کی حکمرانی کے احترام کورواج دیتے ہوئے بھی ترقی کی جاسکتی تھی۔اس کی بجائے بقول مشاہدہ کاروں کے بے نظیر نے خود کوصدر اور آئی جے آئی کے ساتھ محاذ آرائی میں پھنسا لیا۔اپنے مخالفین کے ساتھ لڑائی کے دوران اکثر ان کی مزاحمت میں شدید تلخی اور ابتذال آجاتا تھا(۱۱)۔سیکورٹی ایجنسیوں پر سویلین کنٹرول قائم کرنے کے حوالے سے ان کی اپروچ میں ابہام پایا جاتا تھا۔انہوں نے ریٹائرڈ ائر مارشل ذوالفقار علی خان کی سربراہی میں اس حوالے سے ایک کمیٹی قائم کی تھی تاہم اس کی رپورٹ کو طاق کی زینت بنادیا گیا۔درحقیقت وہ اچھی طرح سے جانتی تھیں کہ خفیہ ایجنسیاں ان کے ساتھ کیا کچھ کرسکتی ہیں لیکن شاید وہ اس سے زیادہ اس بات سے دلچسپی رکھتی تھیں کہ وہ ان کیلئے کیا کچھ کرسکتی ہیں(۱۲)۔

عائشہ صدیقہ کے مطابق فوج کے ساتھ بے نظیر کے مسائل اس وقت شروع ہوئے جب انہوں نے جنرل حمید گل کو آئی ایس آئی کی سربراہی سے ہٹا کر ان کی جگہ اپنے پسندیدہ ریٹائرڈ میجر جنرل شمس الرحمٰن کلو کو تعینات کیا تھا(۱۳)۔اس وقت جنرل حمید گل افغان مجاہدین کے آپریشن کی نگرانی کرنے کے فرائض سرانجام دے رہے تھے۔اقبال اخوند شاید اس وجہ سے کہ اس تبدیلی کی سفارش خود انہوں نے کی تھی، اس حوالے سے کہتے ہیں،"سب کچھ کہا اور کیا جاچکا تھا۔یہ ایک فوجی افسر کی ایک اہم جگہ سے دوسری اہم جگہ پر تبدیلی کا معمول کا عمل تھا" (جنرل حمید گل کو آئی ایس آئی کی سربراہی سے ہٹا کر کور کمانڈر ملتان لگایا گیا تھا)(۱۴)۔وہ یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ اس وقت کے آرمی چیف جنرل مرزا اسلم بیگ نے ایک نجی محفل میں کہا تھا کہ" جمہوریت فوج کی عنایت اور مہربانی" کی وجہ سے سروائیو کررہی ہے(۱۵)۔مرزا اسلم بیگ نے اپنی ریٹائرمنٹ کے بعد یہ اعتراف کیا تھا کہ انہوں نے ۱۹۹۰ کے انتخابات کے موقع پر

آئی ایس آئی کیلئے پیپلز پارٹی کے مخالف امیدواروں کو کامیاب کرانے کی غرض سے ۱۴ کروڑ روپے حاصل کیے تھے۔اخوند کا یہ بھی کہنا ہے کہ بے نظیر نے فوج کے حوالے سے معقول طرزِ عمل اختیار کیا تھا۔اس طرزِ عمل کے ساتھ فوج کے ساتھ تسلیم و رضا کی خو پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ نہایت مہارت کے ساتھ اس کے مفادات میں مداخلت کا عمل بھی شامل تھا۔مثال کے طور پر انہوں نے لاہور کے کور کمانڈر لیفٹیننٹ جنرل عالم خان محسود کی مدت ملازمت میں توسیع کیلئے فوج کے سلیکشن بورڈ پر اثر انداز ہونے کی کوشش کی تھی۔قابل ذکر بات یہ ہے کہ فوج کے پیشہ ورانہ معاملات میں جرات مندانہ مداخلت پر فوجی حکام اس قدر ناراض ہوئے کہ کور کمانڈروں نے صدر اسحاق خان کو آگاہ کردیا کہ وہ پیپلز پارٹی کی حکومت سے مطمئن نہیں ہیں(۱۶)۔دوسری جانب بے نظیر بھٹو سندھ میں بڑھتے ہوئے لسانی تشدد کے حوالے سے نازک پوزیشن میں تھیں۔ایک ماہ بعد ہی انہیں وزارت عظمیٰ سے برطرف کردیا گیا۔

۲۔ نواز شریف کی پہلی حکومت کی برطرفی

نواز شریف کے پرو اسٹیبلشمنٹ پس منظر اور ان کی رجعت پسندی کو دیکھتے ہوئے توقع کی جارہی تھی کہ فوج کبھی بھی انہیں اپنا لقمہ تر نہیں بنائے گی۔لیکن اول وہ فوج کے سربراہ جنرل اسلم بیگ کے خلیجی جنگ کے حوالے سے اپنائے جانے والے موقف سے ناراض ہوئے اور بعد ازاں مئی ۱۹۹۲ میں جب فوج نے ان کے کندھوں پر بندوق رکھتے ہوئے ان کی رضامندی کے بغیر کراچی میں فوجی آپریشن کیا تو ان کے فوج کی اعلیٰ قیادت کے ساتھ سخت اختلافات پیدا ہوگئے۔بے نظیر بھٹو کی اقتدار سے رخصتی کے بعد قائم ہونے والی نگران حکومت کے وزیراعظم غلام مصطفیٰ جتوئی نے سعودی عرب میں مقامات مقدسہ کی حفاظت کیلئے ۱۱،۰۰۰ فوجی بھیج کر پاکستان کو عراق کے خلاف بننے والے بین الاقوامی اتحاد میں شامل کرلیا تھا۔مرزا اسلم بیگ نے عراق جنگ کے دوران ملک میں صدام حسین کے حق میں پائی جانے والی ہمدردی کی لہر کو دیکھتے ہوئے کھلے عام پاکستانی وزارت خارجہ کی مغرب نواز پالیسی کو ہدف تنقید بنانا شروع کردیا تھا۔جماعت

اسلامی جو آئی جے آئی کے اتحاد کا حصہ تھی نے جے یو پی کے ہمراہ صدام حسین کے حق میں مظاہرے شروع کردیے جن میں شریک مظاہرین عراقی پرچم، صدام حسین کی تصویریں اور ڈمی سکڈ میزائل اٹھائے ہوتے تھے۔ان مظاہروں میں امریکہ پرچم اور صدر بش کے پتلوں کو جلایا جاتا تھا۔ادھر ایک مذہبی طلباء تنظیم انجمن طلباء اسلام نے بین الاقوامی جہاد کے نام پر اتحادی فوجوں سے لڑنے کیلئے ہزاروں رضاکاروں کی رجسٹریشن شروع کردی (۱۷)۔یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ کچھ مخصوص مذہبی حلقے بین الاقوامی جہاد کو سپورٹ کررہے ہیں۔نواز شریف کی اقتدار سے رخصتی کے قریبی عرصے میں پاکستان اور امریکہ کے درمیان تعلقات بہت نچلی سطح پر پہنچ چکے تھے۔جنوری ۱۹۹۳ میں امریکہ نے پاکستان کو چھ ماہ کیلئے ممکنہ دہشت گرد ریاستوں کی فہرست میں بھی شامل کردیا تھا۔اگلے اگست میں امریکہ نے ایم الیون میزائلوں کی فراہمی کے بعد پاکستان اور چین کو مبینہ طور پر میزائل ٹیکنالوجی کنٹرول کی خلاف ورزی پر دونوں ملکوں کے خلاف تجارتی پابندیاں بھی عائد کردی تھیں (۱۸)۔

تاہم سندھ کی صورت حال کے حوالے سے وزیراعظم کا اپنے جرنیلوں کے خلاف اختلاف زیادہ خطرناک صورت اختیار کرتا جارہا تھا۔فوج کی جانب سے کراچی میں مئی ۱۹۹۲ میں اندرون سندھ میں امن وامان کی بگڑتی ہوئی صورتحال اور کراچی میں ایم کیو ایم کی دو دھڑوں میں تقسیم کے بعد ان کے درمیان چھڑنے والی لڑائی کی آڑ میں کیا جانے والا آپریشن کلین اپ شروع کیا جاچکا تھا۔نواز شریف کراچی کی صورتحال میں فوج کی مداخلت سے سخت ناراض تھے جس کا رخ واضح طور پر ان کی اتحادی جماعت ایم کیو ایم کی جانب تھا۔انہی دنوں میں جماعت اسلامی نے نواز حکومت کو خیر باد کہہ دیا جس کے بعد نواز شریف کی اقتدار پر گرفت پہلے سے زیادہ کمزور ہوگئی۔پیپلز پارٹی کی سرکردگی میں بننے والے سیاسی اتحاد پی ڈی اے کے ساتھ مسلسل محاذ آرائی اور پنجاب میں کواپریٹو سوسائٹیوں کے خاتمے کے بعد حکومت پر لگنے والے مالی بد انتظامی کے انتظامات کے نتیجے میں بھی نواز حکومت کی پوزیشن خاصی کمزور ہوچکی تھی (۱۹)۔سٹیفن کوہن کے خیال میں نواز شریف کے تیز رفتار نجکاری پروگرام نے بھی غالباً فوج کو

ناراض کردیا تھا کیونکہ اس کے نتیجے میں مارکیٹ میں کمرشل اداروں کے درمیان مسابقت میں اضافہ ہوسکتا تھا جس کے نتیجے میں فوج کی فاؤنڈیشنوں کے مفادات خطرے میں پڑسکتے تھے (۲۰)۔نواز شریف کی مشکلات میں اس وقت مزید اضافہ ہوگیا جب جنوری ۱۹۹۳ میں فوج کے نئے سربراہ کی نامزدگی کے معاملے میں ان کے صدر غلام اسحاق خان کے ساتھ اختلافات پیدا ہوگئے۔علاوہ ازیں غلام اسحاق خان کی دوسری مدت کیلئے صدر منتخب ہونے کی خواہش پر اس وقت اوس پڑگئی جب اس معاملے پر نواز شریف نے خاموشی اختیار کرلی۔منتقم مزاج غلام اسحاق خان نے اسے اپنی ذاتی توہین پر محمول کیا۔اس کے بعد اسحاق خان نے نواز شریف پر کرپشن، اقرباپروری اور بد انتظامی کے الزامات عائد کرکے ان کی حکومت کو برطرف کردیا۔بعد ازاں جب عبوری حکومت بنائی گئی تو اس میں وزیراعظم کے طور پر پرانے مسلم لیگی میر بلخ شیر مزاری پر نظر کرم پڑی۔مزاری نے جب اپنی کابینہ تشکیل دی تو اس میں آصف علی زرداری کو بھی وزیر کی حیثیت سے شریک کیا جو دو سال کی جیل کاٹنے کے بعد ضمانت پر رہا ہوئے تھے۔

محمد خان جونیجو اور بے نظیر بھٹو کے برعکس نواز شریف نے اپنی برطرفی کو سپریم کورٹ میں چیلنج کردیا۔اس کے نتیجے میں ناصرف ایک آئینی بحران پیدا ہوگیا بلکہ نواز شریف کے سیاسی قد کاٹھ میں بھی اضافہ ہوگیا۔اب وہ ایک ''بزدل کاروباری'' نہیں بلکہ ''لڑاکا سیاستدان'' کی حیثیت سے تسلیم کیے جانے لگے۔عدلیہ کی آزادی کا مظاہرہ دیکھنے میں آیا، جس کی بعد ازاں پرویز مشرف کے دور میں شدید بازگشت سنی گئی۔اس موقع پر سپریم کورٹ نے نواز شریف کی پٹیشن کے حق میں فیصلہ دے دیا اور غیر متوقع طور پر نواز حکومت بحال ہوگئی۔اب وزیراعظم اور صدر کے درمیان کشمکش کا میدان پنجاب اسمبلی قرار پایا۔تاہم اس سارے بحران میں یہ جمہوریت نہیں بلکہ فوج تھی جو فاتح بن کر ابھری۔طاقتور کور کمانڈروں کے ایک ہنگامی اجلاس کے نتیجے میں نواز شریف پر دباؤ میں بے پناہ اضافہ ہوگیا۔فوج کے فارمولے کے مطابق وسط مدتی انتخابات منعقد کرانے کے حق میں آوازیں اٹھنا شروع ہوگئیں۔تاہم ۱۸ جولائی کو فوج کے سربراہ نے

ایک ڈیل کرائی جس کے تحت صدر اور وزیر اعظم دونوں کو رخصت ہونا پڑا۔ اس مرتبہ عبوری حکومت کی سربراہی کا قرعہ فال ایک امریکی شہری معین قریشی کے نام نکلا جس کے ساتھ قائم مقام صدر کی حیثیت سے وسیم سجاد نے حلف اٹھالیا۔

۳۔ بے نظیر بھٹو کی دوسری برطرفی

بے نظیر بھٹو نے جب ۱۹۹۳ کے انتخابات کے بعد دوسری مرتبہ وزارت عظمٰی کا حلف اٹھایا تو وہ پانچ سال پہلے کے مقابلے میں خاصی طاقتور پوزیشن میں دکھائی دے رہی تھیں۔ علی الترتیب ۶ اور ۸ اکتوبر کو ہونے والے قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات میں پاکستان مسلم لیگ (نواز) کا ستارہ غروب ہوگیا اور بظاہر ایسا دکھائی دینے لگا کہ اب پنجاب طاقت کا متبادل مرکز نہیں رہا (۱۲)۔ نیا منتخب ہونے والا صدر ضیاء دور کی بیوروکریسی کی باقیات نہیں تھا بلکہ وہ پیپلز پارٹی کا وفادار تھا۔ آصف علی زرداری نے فاروق لغاری کو ایوان صدر میں پہنچانے کیلئے بہت سرگرم کردار ادا کیا تھا۔ دوسری مرتبہ اقتدار میں لانے اور جرنیلوں کے ساتھ بہتر تعلقات قائم کرنے کے سلسلے میں بے نظیر بھٹو کے امریکہ میں موجود رابطوں نے بھی بہت اہم کردار ادا کیا کیونکہ جرنیل فوجی امداد کے حصول کیلئے امریکہ کے ساتھ تعلقات کو خوشگوار رکھنا چاہتے تھے۔ نواز شریف نے فوج کی امیدوں کو اس وقت خطرے میں ڈال دیا جب انہوں نے ۲۳ اگست ۱۹۹۴ میں سرعام کہہ دیا کہ پاکستان کے پاس ایٹمی ہتھیار موجود ہیں۔ تاہم ۱۹۹۵ میں امریکہ کے اندر موثر لابنگ کے ذریعے حکومت اور فوج نے اگست ۱۹۹۰ میں نافذ ہونے والی پریسلر ترمیم کے تحت عائد پابندیوں کو ختم کرانے کامیابی حاصل کرلی۔ اس ترمیم کے تحت امریکہ نے اس وقت تک پاکستان کی فوجی اور اقتصادی امداد پر پابندی عائد کردی تھی جب تک پاکستان اپنے نیوکلیئر پروگرام کو قابل تصدیق طور پر منجمد نہیں کرتا۔ تاہم جلد ہی بے نظیر بھٹو پھر سے دباؤ محسوس کرنا شروع ہوگئی تھیں۔

بدعنوانی کی سیاست ابھی تک پورے شد و مد سے جاری تھی۔ اس کے شاخسانے کے طور پر کرپشن کے الزامات کی ایک مرتبہ پھر بازگشت سنائی دینے لگی۔ اس

مرتبہ یہ الزامات ان کے شوہر آصف علی زرداری کی ذات کے گرد گھوم رہے تھے جنہیں بے نظیر حکومت میں وزیر کی حیثیت سے شامل کرلیا گیا تھا۔ انہیں مبینہ طور پر کمرشل ٹھیکوں کی منظوری میں بھاری کک بیکس وصول کرنے کی بنا پر ''مسٹر ٹین پرسنٹ'' کا خطاب دیا جانے لگا جس کی بازگشت بین الاقوامی میڈیا میں بھی سنائی دی جانے لگی۔ بے نظیر حکومت اس قدر کمزور ہوگئی کہ وہ اپنے پروگرام کو آگے بڑھانے کیلئے پارلیمنٹ میں قانون سازی کی بجائے آرڈی نینسوں کا سہارا لینے لگی۔ پیپلز پارٹی سے تعلق رکھنے والے وہ تمام لوگ جنہیں ضیاء دور میں مصائب کا سامنا کرنا پڑا تھا یہ دیکھ کر سخت مایوس ہوئے کہ بے نظیر حکومت میں زیادہ تر وہی چہرے دکھائی دے رہے تھے جو جنرل ضیاء کے قریب سمجھے جاتے تھے۔ مثال کے طور پر بے نظیر نے جون ۱۹۹۵ میں ضیاء کے معتمد خاص لیفٹیننٹ جنرل راجہ سروپ خان کو گورنر پنجاب نامزد کردیا۔ اس صورتحال سے بددل ہوکر پیپلز پارٹی کے بہت سے پرانے جیالے متبادل قیادت کے طور پر بے نظیر کے بھائی میر مرتضٰے بھٹو کے گرد جمع ہونا شروع ہوگئے تھے۔ میر مرتضٰی بھٹو نومبر ۱۹۹۳ میں دمشق سے اپنی جلاوطنی ختم کرکے ملک میں واپس آچکے تھے اور ان کے ریڈیکل خیالات کی وجہ سے انہیں ذوالفقار علی بھٹو کے ابتدائی دور کے رجحانات کے زیادہ قریب سمجھا جاتا تھا۔ ذوالفقار علی بھٹو کی سیاسی وراثت پر اولاد میں پیدا ہونے والے تنازعے کے نتیجے میں بے نظیر اور ان کی والدہ نصرت بھٹو کے درمیان دوریاں پیدا ہوگئیں۔ نصرت بھٹو کو دسمبر ۱۹۹۳ میں شریک چیئر پرسن کی حیثیت سے ان کے عہدے سے ہٹا دیا گیا تھا۔ ۲۰ ستمبر ۱۹۹۶ کی شام نیو کلفٹن گارڈن کراچی میں میر مرتضٰی بھٹو کو ایک مبینہ پولیس مقابلے میں ہلاک کردیا گیا جس کے نتیجے میں افواہوں کی فیکٹری چلنا شروع ہوگئی تھی (۲۲)۔ بہت سے لوگوں کا دعوٰی تھا کہ اس قتل کے پیچھے زرداری کا ہاتھ ہے۔ جذبات سے بوجھل بے نظیر نے قتل کے بعد دعوٰی کیا کہ مرتضٰی کا قتل بھٹو خاندان کو ختم کرنے کی سازش کا حصہ ہے۔ جب خدشہ پیدا ہوا کہ بے نظیر اس واردات کی ذمہ داری صدر فاروق لغاری پر عائد کرنے والی ہیں تو دونوں کے درمیان خلیج پیدا ہوگئی۔

۱۹۹۶ تک پیپلز پارٹی کو بڑھتے ہوئے اقتصادی مسائل کا سامنا تھا۔ ضیاء کے

آخری برسوں میں ملک پر قرضوں کے بوجھ میں اضافہ ہو چکا تھا جبکہ جی ڈی پی کی شرح گر چکی تھی۔ٹیکسوں کا تمام تر بوجھ روایتی طور پر متوسط طبقے کو برداشت کرنا پڑ رہا تھا جبکہ بے نظیر سمیت تمام جاگیردار زرعی ٹیکس کی مد میں کچھ بھی دینے کو تیار نہیں تھے۔یہ سٹرکچر مسائل فرنٹ لائن سٹیٹ کی حیثیت میں دی جانے والی امریکی امداد کے پردے میں اب تک چھپے ہوئے تھے۔ان اقتصادی مسائل کا سیدھا سا مطلب یہ تھا کہ ملک اپنے وسائل سے کہیں زیادہ خرچ کر رہا ہے۔آئی ایم ایف کی جانب سے ہاتھ کھینچ لیے جانے کے بعد بے نظیر حکومت نے مزید اقتصادی اصلاحات کیلئے ایک سال کی مہلت مانگ لی۔تاہم بے نظیر حکومت کے خاتمے کے قریبی عرصے میں حکومت کو ایک مرتبہ پھر اقتصادی امداد کیلئے آئی ایم ایف کے پاس جانا پڑا۔اس مرتبہ آئی ایم ایف نے پہلے سے کہیں زیادہ سخت شرائط عائد کردیں۔حکومت کی سیاسی مجبوریوں نے اسے ٹیکسوں میں اضافے اور غریب طبقات کی توقعات کو پورا کرنے کے قابل نہ چھوڑا تھا۔حکومتیں قومی بجٹ پر کٹ لگانے کی عادی تھیں لیکن وہ دفاعی بجٹ کو چھیڑنے کی ہمت نہیں رکھتی تھیں یوں چاہے حالات کچھ بھی ہوں ہر سال دفاعی بجٹ میں اضافہ ہوتا رہتا تھا۔

ایک معاملے میں بے نظیر نے پورے شد ومد کے ساتھ اسٹیبلشمنٹ کے ایجنڈے پر عمل درآمد کیا اور وہ تھا افغانستان میں علاقائی اہداف کو پورا کرنے کیلئے اسلامی پراکسیز کو استعمال کرنا۔یہ انہی کا دور تھا جب طالبان بنائے گئے اور انہیں فوج اور آئی ایس آئی سے ہدایات ملنا شروع ہوئیں۔اس سلسلے میں بے نظیر نے اپنے والد کے دور کے ماہرین کو استعمال کیا۔اس پالیسی پر عمل درآمد کی ذمہ داری وزیر داخلہ ریٹائرڈ جنرل نصیر اللہ بابر کو سونپ دی گئی۔دوسری جانب بے نظیر نے جے یو آئی ایف کے لیڈر مولانا فضل الرحمٰن کو اپنی حکومت کا حصہ بنایا جس کے نتیجے میں شمال مغربی صوبے اور بلوچستان میں دیوبندی مساجد تک حکومت کو رسائی مل گئی۔ان مساجد کو طالبان کی بھرتی کیلئے استعمال کیا جانا تھا۔مغربی ممالک میں آئی ایس کی جانب سے طالبان کو ٹریننگ فراہم کرنے اور انہیں منظم کرنے کے عمل کو چھپایا گیا جہاں بے نظیر خود کو پاکستان کے ماڈریٹ اور سیکولر چہرے کے طور پر پیش کرتی تھیں۔

فوج کے علاقائی مفادات کو پورا کرنے کے باوجود ان کے والد کی یادیں ان کا تعاقب کرتی رہیں جس کا مطلب یہ تھا کہ فوج اسٹیبلشمنٹ کی طرف سے بے نظیر کو برداشت تو کیا جاتا رہا لیکن ہمیشہ ان کی حیثیت ایک آؤٹ سائیڈر کی رہی۔کچھ مصنفین کا کہنا ہے کہ جب یہ بات واضح ہوگئی کہ اب امریکہ پر بے نظیر کا جادو فوج کیلئے امداد کے حصول میں معاون ثابت نہیں ہو رہا ہے تو فوری طور پر انہیں بوجھ سمجھا جانے لگا (۲۳)۔کرپشن کے الزامات اور ملک کی بگڑتی ہوئی معاشی صورتحال کی ذمہ داری کے علاوہ بے نظیر بھٹو پر ایک اور بڑا الزام ملک میں امن و امان کی صورتحال کو بہتر بنانے میں ناکامی بھی تھا۔پاکستان کے تجارتی مرکز کراچی میں ایک بار پھر محدود پیمانے پر بغاوت جیسی صورتحال کا سامنا تھا۔کراچی میں فرقہ ورانہ تشدد میں بھی اضافہ ہو رہا تھا جو ریاست کی جانب سے سنی عسکریت پسندوں کو اپنے علاقائی مفادات کیلئے استعمال کرنے کا براہ راست نتیجہ تھا۔حکومت کے ''خطا کاروں'' کی طویل ہوتی ہوئی فہرست نے اگلے ''آئینی گو'' کیلئے گھڑا گھڑایا جواز فراہم کردیا تھا۔زیر بحث مسئلہ صرف ٹائمنگ کا تھا۔بے نظیر کو امریکہ میں ہونے والے صدارتی انتخابات کے دوران برطرف کیا گیا غالباً اس خیال سے کہ امریکہ میں ان کے دن بدن کم ہوتے ہوئے سپورٹرز کو موزوں طور پر الجھایا جا سکے۔دختر مشرق ایک بار پھر ایسی شخصیت کی حیثیت سے عزت و منزلت سے محروم کردی گئی جس کیلئے کوئی آنسو بہانے والا نہ ہو۔شدید معاشی بحران کے ممکنہ خطرات ،عدلیہ کی آزادی کو تباہ کرنے اور سندھ میں ماورائے عدالت قتلوں کی ذمہ دار ٹھہراتے ہوئے بے نظیر کو برطرف کردیا گیا۔پاکستان کا خود ساختہ جمہوری چہرہ ایک بار پھر اپنے کاز کو آگے بڑھانے میں ناکام رہا۔اب کے نواز شریف کی باری تھی کہ وہ ایک بار پھر مسند اقتدار پر فروکش ہو۔آئین سے آٹھویں ترمیم کو نکالنے کا نواز شریف کا اقدام بظاہر اس تاثر کو مضبوط کر رہا تھا کہ اب اور کوئی ''آئینی گو'' نہیں ہوگا۔

سویلین اقتدار اور ملبس

١٩٨٨ کے بعد بننے والی تمام حکومتیں فوج کے معاشی معاملات یا دفاعی بجٹ کے مسائل سے نمٹنے میں ناکام رہی تھیں۔ بلاشبہ بے نظیر بھٹو نے دفاعی بجٹ کے حوالے سے آئی ایم ایف اور ورلڈ بنک کا بہت زیادہ دباؤ برداشت کیا تھا۔ جیسا کہ ان کے والد کے دور میں رائج تھا کہ جمہوری اقتدار کا مطلب دفاعی اخراجات کے حوالے سے ریاستی ترجیحات میں تبدیلی نہیں تھی۔ بے نظیر کے دوسرے دور حکومت میں دفاعی بجٹ میں صرف اعشاریہ تین فیصد کمی ہو پائی تھی۔ جب بے نظیر بھٹو کا دوسرا دور ختم ہوا تو دفاعی اخراجات جی ڈی پی کا ٦ء٦ فیصد تھے جبکہ صحت اور تعلیم پر ہونے والے اخراجات بالترتیب ٨ء٠ اور ٤ء٢ فیصد تھے (٢٤)۔

فوج کی بزنس ایمپائر کو محدود کرنے کی محض علامتی کوشش اس وقت سامنے آئی جب ١٩٩٩ میں نواز شریف نے آرمی ویلفیئر ٹرسٹ کی ری سٹرکچرنگ کرنے کی تجویز پیش کی تھی۔ اس سے پہلے انہوں نے اس ادارے کی معاشی مشکلات کو بیل آؤٹ کر دیا تھا جیسا کہ بے نظیر نے ٦-١٩٩٥ میں کیا تھا۔ نواز شریف کے دور میں فوج کے کاروباروں کو ماضی کی نسبت زیادہ بڑے پیمانے پر معاشی مسابقت کا سامنا تھا تاہم نجکاری نے نئے مواقع فراہم کردیئے تھے گو اس میں اکثر جانبداری بھی برتی جاتی تھی۔ اس حقیقت کو ذہن میں رکھا جائے تو یہ کوئی انہونی بات نہیں کہ بڑے پیمانے پر نجکاری کا پروگرام جو نواز شریف کے پہلے دور میں شروع ہوا تھا، میں پوچھ گچھ کے عنصر کی کمی تھی نیز نجی انٹر پرینیئرز سماجی ذمہ داریوں کی بھی پرواہ نہیں کرتے تھے (٢٥)۔ ١٩٩٠ کی دہائی کے دوران جب کہ ابھی ریڈیو اور ٹیلیویژن کے شعبوں میں نجی سرمایہ کاری شروع نہیں ہوئی تھی، اس وقت بھی شاہین فاؤنڈیشن کو ایک ایف ایم ریڈیو اور ایک پے ٹی وی سٹیشن چلانے کی آزادی حاصل تھی۔ اس دہائی کے آخر میں فوجی فاؤنڈیشن کی شوگر ملوں کو انڈیا میں چینی برآمد کرنے کے سلسلے میں بھاری مقدار میں سرکاری سبسڈی دی جاتی تھی۔ شریف برادران کے سڑکوں کی تعمیر کے قومی اور صوبائی سطح کے پروگراموں میں فوج کے اداروں

فرنٹیئر ورکس آرگنائزیشن اور نیشنل لاجسٹک سیل کو کاروبار کے بھاری مواقع فراہم کیے جاتے تھے۔ فوج کے زیر انتظام چلنے والی کمپنیوں نے عملی طور پر محکمہ ہائی وے کو بہت نقصان پہنچایا اور اپنے کمرشل حریفوں کو تباہ کرکے رکھ دیا۔ شہباز شریف نے نیشنل لاجسٹک سیل کو تعمیراتی کام مکمل ہونے کے بعد ٹال ٹیکس اکٹھا کرنے کی ذمہ داری بھی سونپ دی تھی۔

یوں کہا جاسکتا ہے کہ سویلین حکومتوں کے دوران بھی ملبس کا پھیلاؤ جاری رہا۔ ساتھ ہی یہ فاؤنڈیشنیں نئے کمرشل شعبوں میں بھی دخیل ہوگئیں مثلاً مالیاتی شعبے میں عسکری بنک قائم کرلیا گیا۔ نجی سکیورٹی کمپنیاں بنائی گئیں، تیل اور گیس کے شعبے میں کاروباری پیش رفت کی گئی (فوجی آئل ٹرمینل اینڈ ڈسٹری بیوشن کمپنی لمیٹڈ) نیز آئی ٹی کے شعبے میں بھی مہارتوں کے جادو جگائے جانے لگے (فوجی سافٹ اور عسکری انفرمیشن سروسز)۔ فوج کے زیر انتظام چلائے جانے والے سکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کو سویلین کیلئے کھول کر کمرشل بنیادوں پر چلایا جانے لگا۔ یہ تعلیمی ادارے اپنے ڈسپلن اور فیکلٹیوں کی وجہ سے طبقہ اشرافیہ میں بہت مقبول تھے باجود اس امر کہ فوجیوں اور سویلین بیک گراؤنڈ کے حامل بچوں کیلئے الگ الگ فیسیں مقرر کی گئی تھیں۔

سویلین حکومتوں نے فوج کی معاشی سرگرمیوں کو آگے بڑھانے میں تعاون کیوں کیا؟ اس کی اہم ترین وضاحت نواز شریف کے وزیر خزانہ سرتاج عزیز نے ان الفاظ میں کی تھی: ''اگر ہم ان کے مالیاتی مفادات پر قدغن لگانے کی کوشش کرتے تو فوج کی جانب سے فوری طور پر ردعمل آجاتا'' (٢٦)۔ صدر اسحاق خان نے قومی اسمبلی کے ایک سابق سپیکر الٰہی بخش سومرو کے سامنے کچھ ایسے ہی جذبات کا اظہار کیا تھا کہ یہ شہد کی مکھیوں کا چھتہ ہے جسے نہ چھیڑنا ہی بہتر ہے (٢٧)۔ فوج اور سیاستدانوں کے درمیان طاقت کے اس قدر زیادہ عدم توازن کی حقیقت پسندانہ آگاہی کے علاوہ ایک اور بات بھی ہوسکتی ہے کہ ممکنہ طور پر سیاستدان اس ملبس سے فائدہ اٹھانے والوں میں شامل تھے۔ مثال کے طور پر کہا جاتا ہے کہ بے نظیر بھٹو کے شاہین فاؤنڈیشن کے ریڈیو اور ٹیلیویژن کے منصوبوں میں مالی مفادات کارفرما تھے جبکہ فوجی فاؤنڈیشن کے ساتھ ساتھ

نواز شریف کی شوگر ملیں بھی ۹۹۔۱۹۹۷ کے دوران بھارت کو چینی کی برآمد میں دی جانے والی ایکسائز کی چھوٹ سے مستفید ہوتی تھیں ۲۸۔

لسانی سیاست اور مرکز اور صوبوں کے درمیان تعلقات (۹۹۔۱۹۸۸)

جمہوریت کی بحالی نے قوم پرست لیڈروں کی جانب سے تعاون کی فراہمی کے مواقع فراہم کردیئے تھے اگرچہ بھٹو دور میں یہ بات واضح ہوچکی تھی کہ سویلین بھی اتنے ہی مرکزیت پسند اور مطلق العنان ہوسکتے ہیں جتنا فوجی جرنیل۔ ۱۹۸۸ اور ۱۹۹۹ کے دوران بلوچ اور مہاجر سیاست میں آنے والے مختلف ابھاروں نے پارلیمانی جمہوریت کی یکجہتی قائم کرنے کے صلاحیت کی حدود کو منکشف کردیا تھا اور یہ بھی کہ خود نسلی ولسانی تحرک کے نتیجے میں بھی یکجہتی کس قدر کمزور کردی جاتی ہے۔

اس مدت کے دوران بلوچ سیاست جمہوریت کے ساتھ وابستگی اور دھڑے بندی میں شدت سے عبارت ہے۔ مرکز میں طاقت اور اثر ورسوخ حاصل کرنے کے دستیاب مواقع نے بلوچ قوم پرست لیڈروں کو مرکزی دھارے کی پارٹیوں کے ساتھ جڑنے پر آمادہ کردیا تھا۔ سردار اختر مینگل نے بلوچستان نیشنل موومنٹ بنائی اور ۱۹۸۸ کے بعد پیپلز پارٹی کے ساتھ کام شروع کردیا۔ اس کے سیاسی حریف نواب محمد اکبر بگٹی نے اسی دور میں جمہوری وطن پارٹی کی داغ بیل ڈالی اور نواز شریف کے ساتھ الحاق کرلیا۔ اس پارٹی نے صوبائی خودمختاری اور پاکستان کے اندر صوبوں کی تشکیل نو کے نعروں کے ساتھ ۱۹۹۷ کے انتخابات میں حصہ لیا۔ انتخابات کے بعد اس نے پیپلز پارٹی اور بلوچستان نیشنل پارٹی کے ساتھ مل کر مخلوط حکومت تشکیل دی۔ موخر الذکر پارٹی کو اختر مینگل اور میر حاصل بزنجو نے قائم کیا تھا۔ یہ پارٹی اس وقت قومی اسمبلی میں نواز شریف کو سپورٹ کررہی تھی۔ یہ ادلتے بدلتے سیاسی اتحاد اور علیحدگی کے مطالبات کا صوبائی خودمختاری کے مطالبوں میں اس بات کا واضح اشارہ تھا کہ قبل ازیں جس طرح صوبہ سرحد میں پختونستان اور انڈیا کے تامل ناڈو کی علیحدگی کے مطالبے دم توڑ گئے تھے بلوچستان میں بھی یہی ہونے جارہا ہے۔ تاہم نواز شریف کے دور کے آخر میں ہونے

والے دو واقعات نے اس عمل کی کمزوری کو واضح کردیا۔ اول یہ کہ گیس کی رائلٹی کے حوالے سے نیشنل فنانس کمیشن کے فیصلے نے بلوچستان کے استحصال کے مسئلے کو زندہ کردیا۔ دوم، ۱۹۹۸ میں بلوچستان کے ضلع چاغی میں کیے جانے والے ایٹمی دھماکوں کے سلسلے میں صوبائی حکومت سے پیشگی اجازت نہیں لی گئی۔ اس وقت اختر مینگل بلوچستان کے وزیراعلیٰ تھے جنہوں نے بلوچ غیرت کے نام پر اپنے عہدے سے استعفیٰ دے دیا۔ بعد ازاں مشرف کی جانب سے اقتدار پر قبضے نے بلوچستان میں مارجنیلیٹی کی سوچ میں شدت پیدا کردی۔ جس کے بعد قوم پرستوں اور ریاست کے درمیان مسلح تصادم کے ایک اور دور کا آغاز ہوگیا۔

سندھ میں پیپلز پارٹی پرانے زمانے کے سندھی نیشنل ازم جس کی نمائندگی جی ایم سید کرتے تھے اور اس کے زیادہ شدت پسند ایڈیشنوں "شاگرد تحریک" اور "عوامی تحریک" کو محدود رکھنے کی پالیسی پر کاربند تھی۔ پرانے سندھی قوم پرست جی ایم سید نے ۱۹۸۸ میں ایم کیو ایم کو حکومت کا اتحادی بنانے اور سندھ میں نئی چھاؤنیاں بنانے کے معاملات پر بے نظیر کے خلاف اپنی تلوار میان سے نکال لی تھی۔ انہوں نے روزنامہ ڈان کے نمائندے کے ساتھ اگلے سال ستمبر میں بات کرتے ہوئے کہا "سندھو دیش کا مطلب ایک آزاد اور خودمختار ملک ہے جو اقوام متحدہ کا رکن ہو" (۲۹)۔ اس کے کچھ ہی عرصے بعد سکھر ائرپورٹ پر ہونے والی ایک ریلی کے دوران جئے سندھ تحریک کے کارکنوں کی جانب سے پاکستان کا پرچم نذر آتش کیے جانے کے واقعے کے بعد حکومت نے جی ایم سید کو گرفتار کرلیا۔ دوسری جانب ممتاز بھٹو جنہوں نے مارچ ۱۹۸۸ میں سندھ نیشنل فرنٹ تشکیل دیا تھا نے اپنی پارٹی کے ۱۵ نکاتی منشور میں لکھا "سندھ صرف سندھیوں کیلئے ہے" (۳۰)۔ یہ حقیقت کہ سندھ نیشنل الائنس ۱۹۸۸، ۱۹۹۰، ۱۹۹۳ اور ۱۹۹۷ میں پورے سندھ میں ایک بھی نشست حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہوسکا اس بات کا ثبوت ہے کہ پاکستانی جمہوریت میں یکجہتی کا عنصر بہت طاقتور ہے۔

تاہم مہاجروں کے تجربے کے حوالے سے اس کے الٹ سبق بھی اخذ کیا جاسکتا ہے جس کے تحت جمہوریت کی مضبوطی کے ساتھ ساتھ علیحدگی پسندی کے

رجحانات تقویت پکڑتے گئے۔۱۹۹۰ کی دہائی میں پاکستانی ریاست کراچی میں محدود پیمانے پر Insurgency کا سامنا کر رہی تھی۔اس کے حقیقی اسباب متنازعہ فیہ ہیں۔کچھ مصنفین کا خیال ہے کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ ریاست نے لسانی تحریکوں کو آہنی ہاتھوں سے دبانے کی روش اپنا کر انہیں ریڈیکلائز کر لیا ہے۔دوسری جانب کچھ اور تجزیہ کاروں کا کہنا ہے کہ آئی ایس آئی منتخب حکومتوں کو اپنے دباؤ میں رکھنے کیلئے دانستہ طور پر اس صورتحال کو استعمال کر رہی ہے۔

شہری سندھ میں موجود تنازعات کی جڑیں ضیاء دور تک جاتی ہیں۔ایم کیو ایم وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ برادر کشی کے رویئے اور ریاست کے خلاف بغاوت کا زیادہ سے زیادہ شکار ہوتی چلی گئی ہے۔اس گروہ نے بڑے پیمانے پر مہاجر کمیونٹی کو اپنا یرغمالی بنا رکھا ہے۔اس پارٹی کے نمائندے مہاجروں کے ساتھ ہونے والی ''دھوکہ دہی'' کا پرچار کرتے نہیں تھکتے جس کے مطابق ان لوگوں کو جنہوں نے پاکستان بنانے میں سب سے زیادہ قربانیاں دیں تصادم کی راہ پر دھکیلا جا رہا ہے۔

کراچی اور حیدر آباد میں ۱۹۸۸ کے دوران ہونے والے تشدد پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے(۳۱)۔یہاں پر ہمارے لیے جو زیادہ اہمیت کے معاملات ہیں وہ یہ ہیں: اول وہ طریقے جن کے ذریعے جمہوری عمل نے ایم کیو ایم کو اپنی مقامی طاقت کو قومی سطح کی سیاست میں متعارف کرانے کے راستے کھولے؛ دوئم، سول ملٹری تعلقات پر تشدد کے اثرات کا تخمینہ لگانا؛ جمہوریت کو مستحکم کرنے میں ناکامی کے اندر کارفرما اس کی اہمیت کا تخمینہ لگانا۔

ایم کیو ایم کی جانب سے سندھ کی چند مخصوص قومی اور صوبائی اسمبلی کی نشستوں پر کمانڈ سیاسی استحکام کی بجائے عدم استحکام کا منبع ہیں۔ہارس ٹریڈنگ اور سیاسی لڑائیوں کی فضا میں حکومتوں کو استحکام بخشنے کی بجائے انہیں عدم استحکام سے دوچار کرنے کیلئے اس کی سپورٹ کو حاصل کیا جاتا رہا ہے۔اپنی خود ساختہ آئیڈیالوجی کے باوجود جس کی زیریں لہر میں علیحدگی پسندی موجود رہی ہے، ایم کیو ایم دوسری لسانی و نسلی پارٹیوں کی طرح اپنے مفادات کے تحفظ کیلئے ہمیشہ اقتدار کیلئے بے قرار رہی ہے۔ایم کیو ایم نے

۱۹۹۳ میں عام انتخابات کا بائیکاٹ کر کے اپنی مخالف سیاسی جماعتوں کو فری ہینڈ دیا تھا۔بعد میں اس نے کبھی اس تکلیف دہ تجربے کو نہیں دہرایا۔ایم کیو ایم نے ہمیشہ مخلوط حکومتوں میں شمولیت کے دوران خود غرضی کو مقدم رکھا ہے۔۱۹۸۸ میں ایم کیو ایم نے پیپلز پارٹی کی مخلوط حکومت میں شمولیت اختیار کی حالانکہ پیپلز پارٹی دیہی سندھ کے مفادات کے ساتھ وابستہ تھی۔۱۹۹۷ میں اس نے نواز شریف کی حکومت کو جوائن کیا، اس حقیقت کے باوجود کہ ایم کیو ایم کے خلاف ملٹری کریک ڈاؤن ۱۹۹۲۔۱۹۹۳ میں اس کی پچھلی حکومت کے دوران کیا گیا تھا۔فوج اور آئی ایس آئی نے ہمیشہ ایم کیو ایم کے ساتھ ڈیلنگ کے دوران اسی کی طرح خود غرضی کو اپنا شعار بنا کر رکھا ہے۔مثال کے طور پر ایم کیو ایم پر لگایا جانے والا یہ الزام کہ وہ بھارت سے سپورٹ حاصل کرتی ہے، پہلی بے نظیر حکومت کی برطرفی میں اسے ایک کارآمد ٹول کے طور پر استعمال کرنے کی راہ میں رکاوٹ نہیں بنا تھا۔

ایم کیو ایم نے وفاقی سطح پر پیپلز پارٹی سے تعاون کرنے کے صلے میں نا صرف ۹۰۔۱۹۸۸ کے دوران صوبہ سندھ میں اقتدار کی شراکت داری حاصل کی تھی بلکہ دسمبر ۱۹۸۸ میں بے نظیر اور الطاف حسین کے درمیان سمجھوتے کی راہ بھی ہموار کی تھی۔اس سمجھوتے کی مختلف شقوں میں بنگلہ دیش میں پھنسے بے وطن بہاریوں کی سندھ میں آبادکاری بھی شامل تھی۔یہ ایک متنازعہ معاملہ تھا اور سندھ کے ہر مکتبہ فکر کے عوام اور لیڈر یہ سمجھتے تھے کہ بہاریوں کی سندھ میں آبادکاری سندھیوں کو سندھ کی دھرتی پر اقلیت میں بدلنے کی سازش ہے۔بے نظیر کے بڑے مددگار پیر آف ہالہ نے بے نظیر سے ایم کیو ایم کے ساتھ تعلقات منقطع کرنے کا بھی مطالبہ کیا تھا۔دسمبر کے مہینے میں ہونے والے کراچی ڈیکلیریشن کے ختم ہونے کے ردعمل کے نتیجے میں لسانی فسادات میں دوبارہ شدت آ گئی اور ایم کیو ایم نے بے نظیر کو اقتدار سے الگ کرنے کیلئے نواز شریف کے ساتھ خفیہ مذاکرات شروع کر دیئے۔گو کہ بے نظیر نے کسی طرح سے عدم اعتماد کی تحریک کو ناکام بنا دیا تاہم اس کے نتیجے میں جمہوریت کو سخت نقصان پہنچا۔بعد ازاں جب ان کی حکومت کو برطرف کر دیا گیا تو ان پر ایک الزام یہ بھی لگا کہ انہوں نے عدم اعتماد کی

تحریک ناکام بنانے کیلئے ووٹ خریدے تھے اور اس سلسلے میں سیکرٹ فنڈز سے دو کروڑ روپیہ نکلوایا تھا۔

آنے والے مہینوں کے دوران ایم کیو ایم مشترکہ اپوزیشن تحریک میں پیش پیش رہی۔ اس دوران فروری ۱۹۹۰ میں کراچی میں ایک پرامن ہڑتال کی کال دی گئی جس نے پرتشدد رنگ اختیار کرلیا۔ اس دوران کراچی کے مختلف علاقوں میں ہونے والی فائرنگ اور گھیراؤ جلاؤ کے واقعات میں ۵۷ بے گناہ افراد کو جانوں کا نذرانہ پیش کرنا پڑا۔ ان میں سے اکثریت ان بے گناہ لوگوں کی تھی جو پولیس اور ''نامعلوم افراد'' کے درمیان ہونے والی کراس فائرنگ کی زد میں آگئے تھے (۳۲)۔ صدر اسحاق خان نے اس وقت کے وزیر داخلہ اعتزاز احسن کو طلب کر کے ملک کی معاشی شہ رگ میں ہونے والی اس خونریزی کے بارے میں وضاحت طلب کی تھی۔

سندھ میں امن و امان کی بگڑتی ہوئی صورتحال پر قابو پانے کے سلسلے میں فوج اور پیپلز پارٹی کی حکومت کے درمیان اختلافات اس وقت شدت اختیار کرگئے جب پولیس نے ۲۷ مئی ۱۹۹۰ کو حیدرآباد کے علاقے پکا قلعہ میں ایم کیو ایم کے ایک پرامن جلوس پر فائرنگ کردی جس کے نتیجے میں متعدد افراد ہلاک اور زخمی ہوئے۔ جب فوج وہاں سندھی پولیس کی جگہ لینے کیلئے پہنچی تو مقامی مہاجر آبادی نے فوجیوں کو پھولوں کے ہار پہنائے تھے۔ اس وقت آرمی چیف مرزا اسلم بیگ بنگلہ دیش کے دورے پر تھے۔ وہ جب واپس آئے تو سیدھا پکا قلعہ پہنچے۔ اس موقع پر مہاجر لیڈروں نے ان سے ملاقات کی اور ان سے صوبے میں مارشل لاء لگانے کا مطالبہ کیا۔ صرف یہی ایک واقعہ نہیں بلکہ اس واقعے کے نتیجے میں پیدا ہونے والی صورتحال تھی جس نے سول ملٹری تعلقات میں خلیج کو وسیع کردیا۔ فوج نے حکومت سے مطالبہ کیا کہ وہ سندھ میں طاقت کا موثر استعمال کرے اور اس واقعہ کے ذمہ داروں کو قرار واقعی سزا دینے کیلئے فوجی عدالتیں قائم کرے۔ چھ ماہ بعد جب غلام اسحاق خان نے بے نظیر حکومت کو برطرف کیا تو انہوں نے بے نظیر کی جانب سے فوج کے اس مطالبے کو مسترد کرنے کو بھی فرد جرم کا حصہ بنایا تھا (۳۴)۔

فوج کے سندھ میں امن و امان کی صورتحال کو ہینڈل کرنے کے سلسلے میں تحفظات جینوئن تھے لیکن اس کے ساتھ ہی جرنیل ملک کی بگڑتی ہوئی معیشت، بھارت کے تعلقات کے ضمن میں بے نظیر کی ''بے اعتباری'' اور فوج میں ترقیوں کے معاملے میں حکومت کی مداخلت پر بھی برافروختہ تھے۔ بے نظیر کے تناظر میں سندھ میں امن و امان کی صورتحال اس کی حکومت کو کمزور کرنے کی سازش تھی تاہم وہ اس قدر تشویشناک نہیں تھی جس قدر پنجاب میں آئی جے آئی کی حکومت کے ساتھ جاری محاذ آرائی تھی۔

بے نظیر کی طرح نواز شریف کی پہلی حکومت کے دوران ان کی فوج کے ساتھ بڑھتی ہوئی کشیدگی کے سلسلے میں بھی سندھ کی امن و امان کی صورتحال نے اہم کردار ادا کیا تھا۔ تاہم بے نظیر کے کیس کی طرح سندھ کی صورتحال نواز شریف حکومت کی برطرفی کی سب سے بڑی وجہ نہیں تھی۔ فوج کی جانب سے مئی ۱۹۹۲ میں دیہی سندھ اور کراچی میں شروع کیے جانے والے آپریشن کلین اپ نے نواز حکومت اور اس کی مخلوط حکومت میں شامل ایم کیو ایم کو ایک دوسرے کے مقابل لاکھڑا کیا تھا۔ فوج نے ایم کیو ایم کی مشکلات میں اضافے کیلئے اس سے الگ ہونیوالے دھڑے ایم کیو ایم حقیقی کو استعمال کیا تھا۔ اس آپریشن کے دوران ایم کیو ایم کے بہت سے لیڈروں نے جلاوطنی اختیار کرلی یا انہیں انڈر گراؤنڈ جانا پڑا۔ فوج کے اس آپریشن کی خود مسلم لیگ کے اندر بھی مخالفت پائی جاتی تھی۔ نواز شریف کے قریب سمجھے جانے والے کئی پنجابی لیڈروں نے فوج کے اس کردار پر غم و غصے کا اظہار کیا تھا۔ جیسا کہ ہم بات کرچکے ہیں کہ نواز شریف اور صدر اسحاق کے درمیان کشیدہ تعلقات کے ساتھ ساتھ معیشت کے بگڑتے ہوئے معاملات بھی تھے جنہوں نے فوج میں تشویش پیدا کررکھی تھی۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ یہ منتخب قیادت نہیں بلکہ خود فوجی جرنیل تھے جنہوں نے کراچی میں آپریشن کلین اپ ختم کردینے کا فیصلہ کیا تھا۔ دسمبر ۱۹۹۴ میں اس فیصلے پر عمل درآمد کے بعد کراچی ایک بار پھر آگ اور خون میں نہلا دیا گیا۔ کراچی کے مختلف علاقوں میں تشدد کی نئی لہر شروع ہوگئی جس میں فرقہ ورانہ تشدد، ایم کیو ایم کی گروہی لڑائی، لسانی تشدد کے عناصر شامل تھے اور پھر اس کے بعد سیکورٹی فورسز کے خلاف بھرپور Insurgency پھوٹ پڑی۔

پنجاب ہمیشہ سے پاکستانی سیاست میں کلیدی حیثیت کا حامل رہا ہے۔اس حد تک کہ چھوٹے صوبے پنجاب کی اہمیت کو پنجابائزیشن کا نام دے کر اس کے خلاف نفرت کا اظہار کرتے چلے آئے ہیں۔تاہم بے نظیر کی پہلی حکومت کے دور میں غیر معمولی طور پر پنجاب اور مرکز کے درمیان محاذ آرائی کی کیفیت پیدا ہوگئی تھی۔گو کہ نواز شریف نے بے نظیر کے خلاف اس محاذ آرائی کے دوران پنجابی ثقافت کی علامت ''پگ'' کو استعمال کیا تھا اس کے باوجود پنجابی زبان کی بحالی کیلئے کوشاں افراد کی امیدیں پوری نہ ہوسکیں۔محاذ آرائی کی اس حالت کے خاتمے کے بعد پنجاب میں مسلم لیگ دوبارہ اپنے پرو اسٹیبلشمنٹ رویئے کی جانب لوٹ آئی جس کا مقصد صوبے کی آبادی کے ان حصوں کیلئے معاشی فوائد کا حصول تھا جن کے مفادات فوج، بیوروکریسی اور مقامی سیاسی اشرافیہ کے ساتھ وابستہ تھے۔

۱۹۸۸ کے انتخابی نتائج کے مطابق پنجاب کی قیادت نواز شریف کے پاس آ گئی تھی جو آئی جے آئی کی سربراہی بھی کر رہے تھے۔پنجاب میں آئی جے آئی نے پیپلز پارٹی کی ۹۷ کے مقابلے میں ۱۰۸ نشستیں جیتی تھیں تاہم کامیاب ہونے والے ۳۲ اراکین کو اپنے ساتھ ملا کر اس نے اپنی پوزیشن مضبوط بنالی تھی۔سب کو اس بات کا یقین تھا کہ اسٹیلبشمنٹ بے نظیر کو قابو میں رکھنے کیلئے سب سے بڑے صوبے میں اس کی مخالف حکومت دیکھنا چاہتی ہے۔عام انتخابات کے بعد ۲۰ نشستوں کیلئے ۲۸ جنوری ۱۹۸۹ کو ضمنی انتخابات منعقد ہوئے جن میں انتہائی تلخ ماحول دیکھنے میں آیا۔ان انتخابات کے دوران پیپلز پارٹی اور آئی جے آئی دونوں نے اپنی اپنی حکومتوں کے اداروں کو کھل کر استعمال کیا۔اس کے بعد آنے والے مہینوں میں دونوں فریقین کے درمیان کھینچا تانی ذاتی سطح تک پہنچ گئی۔سات ماہ تک وفاقی حکومت کے کنٹرول میں موجود پاکستان ریلوے کے حکام یہ عذر تراشتے رہے کہ ان کے پاس اتفاق فاؤنڈری کو درآمد ہونے والے خام مال کی فراہمی کیلئے مطلوبہ تعداد میں بوگیاں موجود نہیں ہیں۔اس دوران ۱۱ ستمبر ۱۹۸۹ کو لاہور کے مشہور موچی دروازے میں آئی جے آئی کا ایک جلسہ عام منعقد ہوا جن میں شیخ رشید اور دیگر مقررین نے بے نظیر کے خلاف خوب شعلہ فشانی کی۔اس جلسے

میں ہونے والی تقریروں میں بے نظیر کو ملک دشمن قرار دیتے ہوئے کہا گیا کہ وہ پاکستان کو بھارتی قبضے میں دینا چاہتی ہیں۔یہ بھی کہا گیا کہ ''ہم بھٹو خاندان کا احتساب کریں گے اور ان کی باقیات کو بحیرہ عرب میں بہادیں گے'' ۳۵۔اس نوعیت کے سندھی مخالف اور بھارت مخالف جذبات آئی جے آئی کا ان دنوں طرہء امتیاز بنے ہوئے تھے۔اس پراپیگنڈے نے دسمبر ۱۹۸۸ میں اسلام آباد میں منعقد ہونے والی سارک سربراہی کانفرنس کے دوران بے نظیر بھٹو اور راجیو گاندھی کے درمیان ہونے والی ملاقات کے بعد بھارت اور پاکستان کے درمیان مستقل بنیادوں پر خوشگوار تعلقات کے قیام میں رکاوٹیں کھڑی کردیں۔

اس دور میں نواز شریف نے خود کو پنجاب کے مفادات کے محافظ اور صوبائی خودمختاری کے علمبردار کے طور پر بھی پیش کیا۔۱۵ نومبر ۱۹۸۹ میں نواز شریف نے اپنے ۱۰۰ ملین روپے کے سرمائے سے بنک آف پنجاب کا اجراء کیا۔اس کے جواب میں پیپلز پارٹی نے اسے غیر آئینی اقدام اور فیڈریشن کے خلاف بغاوت قرار دیا۔درحقیقت نواز شریف نے بنک آف پنجاب کو قائم کر کے کسی قانون کی خلاف ورزی نہیں کی تھی تاہم بنک کے لوگو میں موجود طلوع ہوتے ہوئے سورج کی شبیہ آزاد اور خودمختار پنجاب کے حکمران رنجیت سنگھ کے شاہی نشان کی یاد دلاتی تھی جس کے حوالے سے نواز شریف کے مخالفوں نے سخت پراپیگنڈا کیا۔اس کے دو ہفتے بعد پنجاب کے ریونیو منسٹر ارشد خان لودھی نے پنجاب کے اپنے ٹیلیویژن اسٹیشن کے قیام کا اعلان بھی کیا کیونکہ ان کے بقول وفاقی حکومت کے کنٹرول میں موجود پاکستان ٹیلی ویژن نے نواز شریف اور حکومت پنجاب کی خبروں کا بائیکاٹ کر رکھا تھا اور وہ بہت سے معاملات پر پنجاب کے موقف کو پیش نہیں کر رہا تھا (۳۶)۔

نواز شریف کے سابقہ سیاسی ریکارڈ کو دیکھا جائے تو اس کی جانب سے پنجاب کی پگ کو اپنے سر پر رکھنا ایک ناقابل یقین سی بات دکھائی دیتی ہے۔اس حوالے سے پیپلز پارٹی کی وفاقی حکومت کے وزیر داخلہ اعتزاز احسن نے طنز بھرے لہجے میں کہا تھا کہ ''اگر نواز شریف وفاق میں ہوتے تو وہ پنجاب کی صوبائی خودمختاری کے سب سے

بڑے مخالف ہوتے"(۳۷)۔ پنجاب کے اندر بھی نواز شریف کو مشرقی پنجاب کا مہاجر ہونے کے حوالے سے وسطی پنجاب کے مفادات کا نگہبان سمجھا جاتا تھا۔اس کی جانب سے واحد پنجابی شناخت کا ردعمل سرائیکی قومی تحریک کے قیام کی صورت میں پیش کیا گیا۔اس تحریک کا مطالبہ تھا کہ بہاولپور، ملتان، ڈیرہ غازی خان، ڈیرہ اسماعیل خان اور جھنگ کے ڈویژنوں پر مشتمل سرائیکی صوبہ بنایا جائے۔سرائیکی بولنے والے علاقوں میں عوامی سطح پر اس تحریک کی کمزور حمایت اور فیوڈل غلبے کی وجہ سے یہ تحریک کبھی بھی انتخابات میں کامیابی حاصل نہ کرسکی تاہم اس کی وجہ سے اتنا ضرور ہوا کہ پنجاب میں کثیرالسانیت کو تسلیم کیا جانے لگا(۳۸)۔

قابل ذکر بات یہ ہے کہ جب نواز شریف مرکز میں برسر اقتدار آئے تو پنجاب کی خودمختاری کے حوالے سے تمام باتوں کو یکسر فراموش کردیا گیا اور سیاست کا کاروبار معمول کے مطابق چلتا رہا۔پنجاب کے تعلق رکھنے والے کاروباری لوگوں کو نجکاری کمیشن کے سربراہ جنرل سعید قادر نے بھرپور فائدہ پہنچایا۔یوں نجکاری کے اس عمل میں سیاسی تعلقات نے کمرشل مفادات کو ایک جانب کردیا۔گجراتی میمن آدم جی فیملی اپنے سابقہ مسلم کمرشل بنک کو واپس لینے میں ناکام رہی حالانکہ اس کے گروپ کی بولی دوسروں سے زیادہ تھی۳۹۔یوں دکھائی دیتا تھا کہ پاکستان کی پنجابائزیشن کا عمل ایک مرتبہ پھر شروع کردیا گیا ہے۔نواز شریف کے دوسرے دور میں یہ عمل اپنی انتہا کو پہنچ گیا کیونکہ اس دور میں اس کی کابینہ کے ۸۵ فیصد ارکان کا تعلق پنجاب سے تھا۔ایک موقع پر تمام کلیدی آسامیوں پر پنجاب سے تعلق رکھنے والی شخصیات متمکن تھیں۔یوں کہ صدارت کی کرسی پر جسٹس رفیق تارڑ، وزارت عظمٰی پر نواز شریف اور فوج کی سربراہی پر جنرل جہانگیر کرامت فروکش تھے، یہ تینوں حضرات پنجاب سے تعلق رکھتے تھے۔اس دور میں اے این پی نے "پونم" کے نام سے ایک اینٹی پنجابی تحریک شروع کی جس نے فوج اور بیوروکریسی میں کوٹہ مقرر کرنے، حقیقی وفاقی سیاسی نظام قائم کرنے اور سرائیکی صوبہ بنانے کے مطالبات پیش کیے۔

فرقہ ورانہ عسکریت اور تشدد

ہم گذشتہ باب میں تفصیل سے جائزہ لے چکے ہیں کہ کیسے ضیاء کی داخلی سیاست نے خطے میں ایرانی انقلاب اور افغانستان کی صورتحال کے نتیجے میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کے ساتھ مل کر ملک میں فرقہ ورانہ عسکریت پسندی پر اثر ڈالا تھا۔اس عسکریت پسندی کے دوران ہونے والے مسلح تصادم کلاشنکوف کلچر کی وجہ سے زیادہ لہو رنگ ہوگئے۔جہادی تنظیموں، فرقہ ورانہ تنظیموں اور جرائم پیشہ گینگو کے آپس میں تعلقات استوار ہوگئے۔افغانستان میں لڑنے والے پرانے جنگجو افغان جنگ کے خاتمے کے بعد کشمیر کے جہاد اور ملک کے اندر فرقہ ورانہ کارروائیوں میں مصروف ہوگئے۔۹۹۔۱۹۸۸ کی مدت کے دوران خطے میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کے نتیجے میں فرقہ واریت کو اس وقت نئی ڈائمنشن مل گئی جب افغانستان میں طالبان ایک منظم قوت بن کر سامنے آئے اور انہوں نے سنی مسلک کی فرقہ پرست تنظیموں کو افغانستان میں پناہ گاہیں اور تربیتی کیمپوں کی سہولیات فراہم کرنا شروع کردیں۔مثال کے طور پر ۳ جنوری ۱۹۹۹ کو نواز شریف پر قاتلانہ حملہ کرنے کی کوشش میں ملوث لشکر جھنگوی کے جنگجوؤں کو افغانستان میں حرکت الانصار کے زیر انتظام چلائے جانے والے خالد بن ولید نامی کیمپ میں تربیت فراہم کی گئی تھی۔جنوری ۱۹۹۸ میں لاہور کے علاقے مومن پورہ میں ۲۵ شیعہ مسلمانوں کے قتل عام میں ملوث دہشت گردوں کو بھی وہیں پر تربیت دی گئی تھی (۴۰)۔

پاکستان میں جمہوری حکومتیں فرقہ پرست عسکریت پسندوں کی سیاسی افادیت کے پیش نظر ان کے خلاف کریک ڈاؤن کرنے سے گریز کرتی رہی ہیں۔تاہم جب کبھی تشدد حد سے بڑھ گیا اور کریک ڈاؤن ناگزیر ہوگیا تو ان دہشت گردوں کے خلاف کارروائی کے دوران ایسا نہیں کیا گیا کہ انہیں ان کے اتحادیوں سے کاٹ دیا جائے۔ستم ظریفی یہ ہے کہ جنرل نصیراللہ بابر نے جب ۹۶۔۱۹۹۴ میں آپریشن سیو پنجاب کے نام سے ان فرقہ پرست تنظیموں پر کریک ڈاؤن کیا تو عین انہی دنوں میں حکومت طالبان کو

منظم کر رہی تھی اور کشمیر میں حرکت السلامی العالمی کی سرپرستی بھی کر رہی تھی (۴۱)۔ انجمن سپاہ صحابہ پاکستان نے خاص طور پر طالبان کے ساتھ گہرے تعلقات استوار کر لیے تھے اور وہ افغانستان میں طالبان کی کامیابیوں کو شیعہ اسلام کے خلاف سنی اسلام کی کامیابیاں قرار دیتے تھے (۴۲)۔

پنجاب میں بہت سی اہم فرقہ پرست تنظیمیں ضیاء دور کے بعد نمودار ہوئیں۔ ان میں سنی تحریک (۱۹۹۳)، لشکر جھنگوی (۱۹۹۰)، لشکر طیبہ (۱۹۹۷) اور سپاہ محمد (۱۹۹۱) قابل ذکر ہیں۔ موخر الذکر عسکری تنظیم کا تعلق شیعہ مسلک تھا اور یہ اس قدر زیادہ مسلح تھی کہ لاہور کے علاقے ٹھوکر نیاز بیگ میں واقع اس کا ہیڈ کوارٹر پولیس اور سیکورٹی اداروں کیلئے نو گو ایریا کی حیثیت رکھتا تھا۔ اہم بات یہ ہے کہ ان فرقہ تنظیموں کے زیادہ تر لیڈروں کا پس منظر مشرقی پنجاب سے مہاجرت تھا۔ یہ ان مہاجرین کی دوسری نسل سے تعلق رکھتے تھے۔ ان میں مستقبل میں لشکر طیبہ کی سربراہی پر فائز ہونے والے حافظ محمد سعید، جیش محمد کے بانی مولانا مسعود اظہر شامل تھے۔ مولانا مسعود اظہر نے جیش محمد ۲۰۰۰ میں بنائی تھی جس کے اگلے ہی سال اس تنظیم نے نئی دہلی میں پارلیمنٹ پر حملہ کر دیا جس کے نتیجے میں پاکستان اور بھارت ایٹمی جنگ کے دہانے تک پہنچ گئے تھے۔ مسعود اظہر نے جنوبی پنجاب کے شہر بہاولپور میں پرورش پائی تھی جو عسکریت پسندوں کے ساتھ اپنے رابطوں کے حوالے سے بدنام ہے۔

یقیناً اس دور میں صرف پنجاب میں ہی عسکری تنظیمیں وجود میں نہیں آئی تھیں۔ موجودہ خیبر پختونخوا میں بھی کئی پختون عسکری گروپوں نے اسی دوران تشکیل پائی تھی۔ ان گروپوں کے طالبان کے ساتھ نہایت قریبی تعلقات تھے اور وہ طالبان سے متاثر ہو کر پاکستان میں جبری طور پر شریعت نافذ کرنے کیلئے سرگرم عمل تھے۔ ان گروپوں میں مولانا صوفی محمد کی ''تحریک نفاذ شریعت محمدی'' بھی شامل تھی جس نے ملاکنڈ ایجنسی کو اپنا مرکز بنا رکھا تھا۔ ۹۵-۱۹۹۴ میں ملاکنڈ ایجنسی اور سوات میں اس کی چھوٹی سطح پر بغاوت ۲۰۰۹ میں ہونے والی ریاست کے خلاف کہیں زیادہ سنگین اور بھرپور بغاوت کی ڈریس ریہرسل تھی۔ اس کے علاوہ اورکزئی ایجنسی میں ''تحریک طلباء'' اور ہنگو میں

''تحریک طالبانِ زرگری'' منظم ہوئی تھیں۔ ان تحریکوں کے ابھرنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس دور میں فاٹا اور اس سے ملحق علاقوں کو دہشت گردی کا مرکز بنانے کیلئے سٹیج تیار کی جا رہی تھی۔ پنجاب سے تعلق رکھنے والی فرقہ پرست تنظیموں اور پختون طالبان کے درمیان مستقبل میں استوار ہونے والے تعلقات جنہوں نے مغرب میں ''پنجابی طالبان'' کی تخلیق کے حوالے سے تشویش پیدا کر دی تھی، اس وقت مضبوط بنیادوں پر ظہور پذیر ہونا شروع ہوئے جب اگست ۱۹۹۸ میں پنجابی طالبان نے افغان طالبان کے ساتھ مل کر شمالی اتحاد کے گڑھ مزار شریف پر قبضہ کیا تھا۔

مسلح فرقہ پرست تنظیموں کا ظہور سپاہ صحابہ جیسی بڑی تنظیموں میں پیدا ہونے والی گروہی تقسیم، لیڈروں کے قتل، مال دولت کی تقسیم پر ہونے والے جھگڑوں کا نتیجہ تھا۔ ان میں سے کئی تنظیمیں ایسی تھیں جنہوں نے کالعدم قرار دیئے جانے کے بعد پولیس کی کارروائیوں سے بچنے کیلئے نئے ناموں سے ظہور کیا تھا۔ یہ کام خاص طور پر مشرف دور میں ہوا۔ فرقہ پرست تنظیموں کے پھیلاؤ کے ساتھ ہی تشدد کی لہر میں اضافہ ہو گیا جس نے بعد میں ٹارگٹ کلنگ اور مساجد اور امام بارگاہوں پر بموں اور مشین گنوں سے حملوں کی شکل اختیار کر لی۔ گو کہ اس زمانے میں ہلاکتوں کی تعداد اتنی زیادہ ہونا نہیں شروع ہوئی تھی جتنی کہ بعد میں اکیسویں صدی کی پہلی دہائی میں دیکھنے میں آئی اور نا ابھی تک اس میں خودکش حملوں نے رواج پایا تھا اس کے باوجود اس دور میں ہونے والا تشدد اپنی مثال آپ تھا۔ ۱۹۹۰ اور ۱۹۹۷ کی درمیانی مدت میں فرقہ وارانہ حملوں میں ہلاک ہونے والوں کی تعداد ۵۸۱ اور زخمیوں کی تعداد ۱۶۰۰ کے قریب رہی۔ اس دوران کرم ایجنسی میں ایک ہفتے تک جاری رہنے والے فرقہ وارانہ قتل عام میں ایک سو سے زیادہ افراد ہلاک اور بہت سے لوگ زخمی ہوئے۔ کرم وادی میں مقامی سنی بنگش اور شیعہ طوری قبائل صدیوں سے پر امن زندگی بسر کرتے آئے تھے لیکن سنی افغان مہاجرین نے آ کر وہاں کے امن کو تہہ و بالا کر کے رکھ دیا (۴۳)۔ ادھر انتشار زدہ کراچی کے اندر سپاہ صحابہ اور سپاہ محمد کے درمیان خونریز جھڑپوں کی تعداد میں مسلسل اضافہ ہو رہا تھا۔ اس دوران شہر میں ۷ دسمبر ۱۹۹۴ کو سپاہ صحابہ کے کراچی کے سربراہ کو ایک حملے کے دوران

گولیاں مار کر ہلاک کر دیا گیا (۴۴)۔ پنجاب کا ضلع جھنگ جو سپاہ صحابہ کی جائے ولادت بھی ہے خاص طور پر اس دوران مصائب کا شکار رہا۔ وہاں پر سپاہ صحابہ کی حمایت مشرقی پنجاب سے ہجرت کر کے آنے والے شہری نچلے متوسط طبقے میں تھی جبکہ ضلع جھنگ اور گردونواح میں روایتی طور پر طاقت شیعہ جاگیرداروں کی حویلیوں کی لونڈی ہوا کرتی تھی (۴۵)۔

فرقہ وارانہ تشدد اور اسلامی عسکریت پسندی ریاست کی پہنچ میں ہونے والے زوال کو ظاہر کرتی ہیں۔ قبائلی علاقوں میں حکومت کی رٹ کا مکمل طور پر خاتمہ اور اس کا عملی طور پر وہاں سے غائب ہو جانے کی پیش گوئی بہت پہلے کی جانے لگی تھی۔ یہاں تک کہ خیبر پختونخوا کے سیٹلڈ اضلاع اور جنوبی پنجاب کے علاقوں میں مسلسل اس بات کے اشارے مل رہے تھے کہ وہاں فرقہ وارانہ اور عسکریت پسندانہ چیلنج مقامی حکومتوں کیلئے چیلنج بنتے جا رہے ہیں۔ ملک میں عسکریت پسندی اور فرقہ پرستی کا فروغ جنرل ضیاء کے زمانے میں مرکزی سیاسی پارٹیوں کو سائیڈ لائن پر لگانے کا حتمی نتیجہ ہے۔ جمہوریت کی بحالی کے بعد ایک ایسی فضا پیدا ہونا شروع ہو گئی تھی جس میں مختلف اوقات میں قومی سطح پر موجود سیاسی پارٹیوں نے پراسی کیوشن کے ذریعے فرقہ وارانہ سرگرمیوں پر قابو پانے میں کامیابی حاصل کی تھی اور ان پارٹیوں کے گڑھ سمجھے جانے والے علاقوں میں اپنی رسائی کو بہتر بنایا تھا۔

۱۹۸۸ کے انتخابات میں پیپلز پارٹی کے روایتی سیکولر امیج اور بھٹو خاندان کے شیعہ رجحانات کی وجہ سے اسے پورے ملک میں شیعہ سپورٹ حاصل ہوئی تھی۔ نواز شریف کے الائنس آئی جے آئی میں سنی علماء کی پارٹیاں بشمول جماعت اسلامی بھی شامل تھی۔ پیپلز پارٹی کے سات اپنی جاری لڑائی کی وجہ سے اس نے پنجاب میں فرقہ پرست سرگرمیوں کو نظر انداز کرنا مناسب سمجھا۔ تاہم سب سے حیران کن بات نواز شریف کی جانب سے فرقہ پرست پارٹیوں کے ساتھ انتخابی سرگرمیوں کیلئے گنجائش پیدا کرنا تھا جس کا کھل کر اظہار بے نظیر کے دوسرے دور حکومت کے دوران ہوا۔ دوسری جانب پیپلز پارٹی بھی اس حوالے سے پیچھے نہ تھی۔ بے نظیر نے جے یو آئی فضل الرحمٰن گروپ کے

ساتھ الائنس کر کے خود کو مذہبی حلقوں کیلئے قابل قبول بنانے کی کوشش کی تھی۔ اسی بات نے اسے افغانستان میں ایسے علاقائی ایجنڈے پر عمل کرنے پر آمادہ کیا جو فوج کیلئے طمانیت کا باعث ہو سکے۔ تاہم اس میں پریشان کن بات یہ تھی کہ جمعیت العلماء اسلام نے اقتدار میں اپنی شرکت کو طالبان اور فرقہ پرست گروپوں کو مضبوط کرنے کیلئے استعمال کیا۔ بے نظیر اپنی سیاسی مصلحتوں کے پیچھے یہاں تک چلیں کہ انہوں نے پنجاب میں اپنی ساکھ کو بہتر بنانے اور ضلع جھنگ کے شیعہ جاگیرداروں کو تنہا کرنے کیلئے وہاں سے تعلق رکھنے والے سپاہ صحابہ کے لیڈر شیخ حاکم علی کو صوبائی کابینہ میں شامل کر لیا، یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس وقت اس پر قتل کے آٹھ مقدمے قائم تھے (۴۶)۔ پیپلز پارٹی کی حکومت سپاہ صحابہ کے لیڈروں اعظم طارق اور ضیاالرحمٰن فاروقی کے خلاف کارروائی کرنے میں ناکام رہی جنہیں بہاولنگر کے ایک اہم شیعہ لیڈر شاہنواز پیرزادہ کے قتل میں نامزد کیا گیا تھا اور جس کا بیٹا ریاض حسین پیرزادہ اس وقت پیپلز پارٹی کا رکن قومی اسمبلی تھا۔ اس صورت حال کے پیش نظر یہ بات زیادہ حیران کن نہیں کہ جنوبی پنجاب کے شیعہ زمینداروں نے پیپلز پارٹی کے ساتھ اپنی روایتی وفاداریاں تبدیل کر کے نواز شریف کی مسلم لیگ میں شمولیت کیوں اختیار کی۔

۱۹۹۷ کے انتخابات میں نواز شریف اس قدر طاقتور حیثیت میں ابھرے کہ انہیں سپاہ صحابہ یا اس کی ہم خیال پارٹیوں کی حمایت کی ضرورت باقی نہ رہی تھی۔ دوسری مرتبہ اقتدار میں آنے کے بعد انہوں نے فرقہ پرست تنظیموں کے خلاف کریک ڈاؤن کرنے کا فیصلہ کیا اور اس سلسلے میں اگست ۱۹۹۷ میں دہشت گردی کے خلاف قانون سازی کی۔ اینٹی ٹیررسٹ لاء کے تحت دہشت گردی کی خصوصی عدالتیں قائم کی گئیں اور قانون نافذ کرنے والوں کو دہشت گردوں کو دیکھتے ہی گولی مارنے کا اختیار مل گیا اور ساتھ ہی انہیں ملکی مفاد کیلئے کام کرنے کے سلسلے میں پوچھ گچھ سے چھوٹ مل گئی۔ ان اقدامات کے نتیجے میں وقتی طور پر فرقہ وارانہ تشدد کافور ہو گیا تاہم ۱۹۹۸ میں دوبارہ اس فتنے نے سر اٹھا لیا۔ نواز شریف نے جب فرقہ پرستوں کا پیچھا جاری رکھا تو ردعمل میں لشکر جھنگوی نے رائے ونڈ کے قریب سڑک کنارے بم رکھ کر وزیر اعظم کو قتل کرنے کی

کوشش کی۔انہی دنوں شیعہ لیڈروں اور اہم شیعہ شخصیات کی ٹارگٹ کلنگ کے باعث
تحریک جعفریہ نے ملک میں مارشل لاء لگانے کا مطالبہ کردیا۔بدقسمتی سے فرقہ واریت
کے دوبارہ سر اٹھانے کی ایک اہم وجہ فوج کے حرکت الانصار کے درمیان بڑھتے ہوئے
تعلقات تھے جسے وہ کارگل کے بدنصیب ایڈونچر میں استعمال کرنے کی خواہاں
تھی۔کارگل ایڈونچر کا مقصد کشمیر کو بھارت کے قبضے سے آزاد کرانا تھا اور آگے چل کر اس
ناکام ایڈونچر کے پاکستان کی صورتحال پر گہرے اثرات مرتب ہونا تھے۔

جمہوری دور میں پاک بھارت تعلقات

یہ امیدیں کہ جمہوریت کی بحالی کے نتیجے میں پاکستان اور بھارت کے
درمیان دیرینہ دشمنانہ تعلقات کا خاتمہ ہوجائے گا اور دوستی کے ایک نئے دور کا آغاز
ہوجائے گا شروع شروع میں بہت درخشاں دکھائی دے رہی تھیں۔سارک کانفرنس کے
موقع پر راجیو گاندھی کی پاکستان آمد کے نتیجے میں بے نظیر اور راجیو گاندھی کے درمیان
خوشگوار مراسم قائم ہوگئے تھے۔درحقیقت یہ تعلقات اس قدر گرم جوشی پر مبنی تھے کہ فوج
کو خطرہ پیدا ہوگیا کہ بے نظیر کی وجہ سے قومی سلامتی خطرے میں نہ پڑجائے۔دسمبر
۱۹۸۸ میں اسلام آباد میں منعقد ہونے والی سارک سربراہ کانفرنس کے چوتھے سالانہ
سیشن کے دوران پاکستان اور بھارت دونوں کے درمیان اس بات پر اتفاق ہوگیا کہ
دونوں ملک ایک دوسرے کے خلاف ایٹمی ہتھیار استعمال نہیں کریں گے۔بھارت کے
ساتھ تعلقات کے ضمن میں بے نظیر کی کوششوں کو نا صرف پنجاب بلکہ فوج کی جانب
سے خطرہ پیدا ہوگیا جو نیوکلیئر پالیسی اور افغانستان جیسے اہم دفاعی معاملات کی بلاشرکت
غیرے مالک تھی۔اس صورتحال کا ایک کھلم کھلا اظہار یہ تھا کہ ضیاء الحق کے وزیر خارجہ
یعقوب علی خان بے نظیر کی کابینہ میں بھی بیٹھے ہوئے تھے۔

اس بات کے واضح ثبوت موجود ہیں کہ بے نظیر کی پہلی حکومت کے دوران
پاکستان نے بھارتی پنجاب میں علیحدگی پسند سکھوں کی امداد سے ہاتھ کھینچ لیا
تھا(۴۷)۔ایسا جمہوریت کی بحالی کی وجہ سے نہیں تھا بلکہ یہ بھارت کی جانب سے اسی

طرح کے ردعمل کے خطرے کی وجہ سے تھا جیسا اس نے ۱۹۶۵ میں کشمیر میں آپریشن
جبرالٹر کے جواب میں کیا تھا۔اس ردعمل کا واضح اشارہ براس ٹیک کی فوجی مشقیں
تھیں۔اس بات کے بھی امکانات موجود ہیں کہ اس وقت بھارت پاکستان کے ساتھ
روایتی جنگ چھیڑنے کے موڈ میں تھا جس سے بھارت کو اس وقت پسپائی اختیار کرنا
پڑی جب جنرل ضیاء نے مشہور کرکٹ ڈپلومیسی کے دوران بھارت کی سرزمین پر کھڑے
ہوکر بھارتی وزیراعظم کو پاکستان کے ایٹمی ہتھیاروں کی موجودگی کا اشارہ دیا تھا۔بھارتی
پنجاب میں کے پی ایس گل کی سربراہی میں پولیس کے کریک ڈاؤن، سرحدوں کی بہتر
نگرانی اور سکھ عسکریت پسندوں کی سپلائی اور ٹریننگ کی سہولتوں کے خاتمے کے ذریعے
بھارت کو ۱۹۹۰ کی دہائی کی ابتداء میں خالصتان کی تحریک کو کچلنے میں کامیابی ہوئی
تھی۔تاہم ۱۹۸۹ میں کشمیر میں اچانک آزادی کی تحریک شروع ہوجانے کی وجہ سے
پاکستان کو خفیہ کارروائیوں کیلئے ایک اور محاذ مل گیا تھا۔اسلامی عسکریت پسند نا صرف ہر
وقت دستیاب تھے بلکہ وہ افغانستان کی جنگ میں آہن و آتش کا امتزاج بن چکے
تھے۔کشمیر کی زمینی ساخت نے بھی عسکریت پسندوں کو اپنی کارروائیوں کیلئے وہ آسانیاں
فراہم کردیں جو انہیں بھارتی پنجاب میں دستیاب نہیں تھیں۔پورے جمہوری دور کے
دوران پاکستان کشمیر کے محاذ میں مصروف کار رہا تھا۔

۱۹۹۰ تک پاکستان جموں وکشمیر لبریشن فرنٹ (جے کے ایل ایف) سے اپنی
حمایت واپس لینے کا عمل شروع کرچکا تھا جو کشمیر کی سب سے بڑی عسکری تنظیم تھی اور جو
پاکستان کے کنٹرول میں تھی۔آزاد کشمیر کی حیثیت اس سلسلے میں بیس کیمپ کی تھی جہاں
ابتدائی طور پر جماعت اسلامی کی حمایت یافتہ حزب المجاہدین کی تربیت کا اہتمام کیا
گیا۔پانچ سال کے عرصے میں افغانستان میں تربیتی کیمپ قائم کیے جاچکے تھے جہاں
لشکر طیبہ اور حرکت الانصار جیسے گروپوں کو جہاد کیلئے تربیتی سہولیات کی فراہمی شروع
ہوچکی تھی۔اس جدوجہد کی ریڈیکلائزیشن سفاکیت اور مقاصد کے پھیلاؤ کے اعتبار
بڑھتی جارہی تھی۔کشمیر کی آزادی (جے کے ایل ایف) یا پاکستان کے ساتھ الحاق
(حزب المجاہدین) کا دائرہ پھیلا دیا گیا تا کہ کشمیر کی جدوجہد عقیدہ رکھنے والوں اور بے

عقیدہ لوگوں کے مابین بین الاقوامی جدوجہد میں بدل جائے۔اس بات کو حرکت
المجاہدین کے لیڈر فضل الرحمٰن خلیل کے ان الفاظ میں سمویا گیا ہے: ''عسکریت پسندوں
کے حقیقی اہداف دہلی، کلکتہ، ممبئی اور واشنگٹن ہیں۔مسلمانوں کو دنیا بھر میں عسکریت
پسندوں کی امداد کرنی چاہیے تاکہ پوری دنیا میں اسلام کا غلبہ قائم ہوجائے'' (۴۸)۔بین
الاقوامی جہاد کی کمٹمنٹ عسکریت پسندوں کو اسامہ بن لادن کے قریب لے آئی تھی جس
کے نا صرف جنوبی ایشیا بلکہ پوری دنیا میں نہایت افسوسناک نتائج برآمد ہوئے۔

بے نظیر اور نواز شریف دونوں نے اپنے اپنے ادوار میں کشمیر میں جہاد کیلئے
سپورٹ میں رکاوٹ بننے کی کوشش نہیں کی۔ممکن ہے کہ وہ اس حکمت عملی سے پورے
طور پر متفق نہ ہوں جیسا کہ نواز شریف نے پرویز مشرف کی طرف سے برپا کیے جانے
والے کارگل آپریشن کے حوالے سے دعویٰ کیا تھا۔یہ بھی ممکن ہے کہ حب الوطنی کے
جذبات نے انہیں اس کی حوصلہ افزائی پر مجبور کیا ہو۔مارچ ۱۹۹۰ میں جب دونوں ملکوں
کے درمیان تعلقات میں بگاڑ پیدا ہوگیا تو بے نظیر اپنے والد کی ''سوسال تک جنگ
کرنے'' کی تھیم کو دہرانے لگیں (۴۹)۔اس کے باوجود ۱۹۸۸ میں راجیو گاندھی اور
۱۹۹۶ میں آئی کے گجرال کے سامنے بے نظیر نے دونوں ملکوں کے درمیان تعلقات میں
بہتری لانے پر آمادگی کا اظہار کیا تھا۔اسی طرح نواز شریف بھی اپنی مشہور زمانہ ''بس
ڈپلومیسی'' کے ذریعے بھارتی وزیراعظم اٹل بہاری واجپائی کے ساتھ دوستانہ تعلقات
استوار کرنے کے معاملے میں بہت آگے بڑھ گئے تھے۔جب نواز شریف کی دعوت پر
واجپائی پاکستان آئے تو دونوں لیڈروں کے درمیان بات چیت کے نتیجے میں اعلامیہ
لاہور طے پایا جس میں عزم ظاہر کیا گیا تھا کہ بھارت اور پاکستان نیوکلیئر پروگرام کے
حوالے سے اعتماد سازی کے اقدامات کریں گے اور کشمیر کے مسئلے کو پرامن بات چیت
کے ذریعے حل کرنے پر آمادگی کا اظہار بھی کیا گیا تھا۔

وجوہات کچھ بھی ہوں لیکن خفیہ کارروائیوں کی فوجی حکمت عملی کی مزاحمت
کرنے میں ناکامی نے جمہوری عمل کو شدید نقصان پہنچایا۔نواز شریف اور پرویز مشرف
کے درمیان کارگل کے معاملے پر اختلافات ۱۲ اکتوبر ۱۹۹۹ میں پرویز مشرف کی فوجی

بغاوت پر منتج ہوئے تھے۔زیادہ بڑے کینوس پر بات کی جائے تو ۱۹۸۸ سے شروع
ہونے والے جمہوری دور کو امن کے فوائد سمیٹنے کے ضائع شدہ موقع کے طور پر دیکھا
جائے گا۔اگر اس دوران پاکستان اور بھارت کے درمیان تعلقات کی بہتری میں کامیابی
حاصل کرلی جاتی تو بڑھتی ہوئی تجارت اور کم ہوتے ہوئے دفاعی اخراجات کے نتیجے میں
سماجی و معاشی ترقی کیلئے بہت زیادہ وسائل مہیا کیے جاسکتے تھے۔اسی طرح یہ بھی کہا
جاسکتا ہے کہ سماجی و علاقائی عدم مساوات میں کمی سیاسی استحکام میں اضافے کا باعث
بنتی۔لیکن اس کی بجائے جہاد کے نام پر اسلامی عسکریت پسندی کے فروغ نے خود
پاکستان کے اندر عسکریت پسندی میں تباہ کن حد تک اضافہ کردیا۔مثال کے طور پر لشکر
طیبہ کے مرید کے میں واقع ہیڈ کوارٹر میں نومبر ۱۹۹۷ میں منعقد ہونے والی ایک کانفرنس
میں واضح طور پر کہا گیا کہ پاکستان میں جمہوریت کو ختم کردینا چاہیے کیونکہ ''لوگوں کی
خودمختاری کا تصور غیر اسلامی ہے''۔

> پاکستانی اخبارات نے لکھا ہے کہ کانفرنس کی جگہ ایسے بینروں
> سے بھری ہوئی تھی جن پر یہ نعرہ تحریر تھا ''جمہوریت کا
> جواب۔۔۔گرینیڈ اور بلاسٹ'' (۵۰)۔

اس وقت تو یہ محض جذباتی نعرے بازی تھی لیکن ایک دہائی سے زیادہ مدت
گزرنے کے بعد طالبان پاکستانی ریاست سے صف آرا ہوکر ان نعروں کو عملی صورت
دینے کی کوشش میں مصروف ہیں۔

☆☆☆

حوالہ جات

۱۔ Ayesha Siddiqa, "Military Incorporation: Inside Pakistan's Military Economy" (London: Pluto Press, 2007)

۲۔ ایضاً۔

۳۔ Zahid Hussain, "Benazir Bhutto Frall From Grace", Newsline (November 1996)

۴۔ روزنامہ ڈان انٹرنیشنل ایڈیشن، ۱۵ جنوری ۱۹۹۷۔

۵۔ Iqbal Akhun, "Trail and Error: The Advent and Eclips of Benazir Bhutto" (Karachi: Oxford University Press, 2000)

۶۔ Ian Talbot, "Pakistan: A Modern History" (London: Hurst, 2009)

۷۔ Ayesha Siddiqa, "Military Incorporation: Inside Pakistan's Military Economy

۸۔ Iqbal Akhun, "Trail and Error: The Advent and Eclips of Benazir Bhutto"

۹۔ ایضاً۔

۱۰۔ ایضاً۔

۱۱۔ ایضاً۔

۱۲۔ ایضاً۔

۱۳۔ Ayesha Siddiqa, "Military Incorporation: Inside Pakistan's Military Economy

۱۴۔ Iqbal Akhun, "Trail and Error: The Advent and Eclips of Benazir Bhutto"

۱۵۔ ایضاً۔

۱۶۔ Saeed Shafqat, "Pakistan Under Benazir Bhutto", Asian Survery (July 1996)

۱۷۔ روزنامہ ڈان (کراچی)، ۱۸ جنوری ۱۹۹۱۔

۱۸۔ See, Tahir Amin, "Pakistan in 1993: Some Dramatic Changes", Asian Survey (February 1994)

۱۹۔ مزید تفصیلات کیلئے ملاحظہ کیجئے: Ian Talbot, "Pakistan: A Modern History" (London: Hurst, 2009)

۲۰۔ نواز شریف نے ریاست کی ملکیت میں موجود ۱۰۰ صنعتوں اور کاروباری اداروں کی نجکاری کیلئے فہرست پیش کی تھی ان میں مسلم کمرشل بنک بھی شامل تھا۔مزید تفصیلات کیلئے ملاحظہ فرمایئے: Stephen Cohen, "The Idea of Pakistan (New Delhi: Oxford University Press, 2004)

۲۱۔ انتخابات کے جامع مطالعہ کیلئے ملاحظہ کیجئے محمد وسیم کی کتاب ''دی ۱۹۹۳ الیکشن ان پاکستان (لاہور: ۱۹۹۴)

۲۲۔ مزید تفصیلات کیلئے ملاحظہ کیجئے: Zahid Hussain, "Who Killed Murtaza Bhutto?", Newsline (October 1996)

۲۳۔ Ayesha Siddiqa, "Military Incorporation: Inside Pakistan's Military Economy"

۲۴۔ ایضاً۔

۲۵۔ Shafik H. Hashmi, "Privatization Policy" in C. H. Kennedy and R. B. Rais (eds.) "Pakistan in 1995 (Boulder, Co: Westview Press, 1995)

۲۶۔ Ayesha Siddiqa, "Military Incorporation: Inside Pakistan's Military Economy"

۲۷۔ ایضاً۔

۲۸۔ ایضاً۔

۲۹۔ روزنامہ ڈان (کراچی)، ۲۹ ستمبر، ۱۹۸۹۔

۳۰۔ L. Ziring, "Pakistan in 1989: The Politics of Stalemate", Asian Survey (February 1990)

۳۱۔ See, Iftikhar H. Malik, "State and Civil Society in Pakistan": Politics of Authority, Ideology and Ethnicity (Basingstoke: Macmillan, 1997), Ian Talbot, "Pakistan: A Modern History" (London: Hurst, 2009), Yunus Samad, " In and Out of Power but not Down and Out: Mohajir Identity Politics" in C. Jaffrelot (ed), "Pakistan: Nationalism without a Nation (New Delhi: Manohar, 2002)

۳۲۔ روزنامہ ڈان (کراچی)، ۹ فروری ۱۹۹۰۔

۳۳۔ Hasan Askri Rizvi, "Military, State and Society in Pakistan" (Basingstoke: McMillan, 2000)

۳۴۔ Iqbal Akhun, "Trail and Error: The Advent and Eclips of Benazir Bhutto" (Karachi: Oxford University Press, 2000)

۳۵۔ ہیرالڈ (کراچی)، اکتوبر ۱۹۸۹۔

۳۶۔ روزنامہ ڈان (کراچی) یکم دسمبر ۱۹۸۹۔

۳۷۔ ہیرالڈ (کراچی)، اکتوبر ۱۹۸۹۔

۳۸۔ ایک مشترکہ سرائیکی زبان کا تصور بذات خود دو مقامی لہجوں ملتانی اور ڈیرہ جٹی کو یکجا کرکے ایک زبان بنانے پر مبنی ہے۔

۳۹۔ S. A. Kochanek, "Ethnic Conflict and the Politicization Business" in C. H. Kennedy and R. B. Rais (eds.) "Pakistan in

1995 (Boulder, Co: Westview Press, 1995)

۴۰۔ See Marian Abu Zahab, "The Regional Dimension of Secterian Conflicts in Pakistan" in C. Jafferlot (ed) "Pakistan: Nationalism without a Nation?"

۴۱۔ V.R. Nasr, "Islam, the State and the Rise of Islamic Militancy" in C. Jaffrelot (ed), "Pakistan: Nationalism without a Nation (New Delhi: Manohar, 2002)

۴۲۔ اس کا سب سے زیادہ متنازعہ بیان ۱۹۹۵ میں سامنے آیا جو بعد میں سپاہ صحابہ کا نعرہ بن گیا: "اگر پاکستان میں مسلمان بن کر رہنا ہے تو شیعہ کو کافر کہنا ہوگا"۔

۴۳۔ Amir Zika, "Tribes and Tribulations", Newsline (Karachi) October 1996

۴۴۔ نیوز لائن (کراچی) مارچ ۱۹۹۵۔

۴۵۔ V.R. Nasr, "Islam, the State and the Rise of Islamic Militancy" in C. Jaffrelot (ed), "Pakistan: Nationalism without a Nation (New Delhi: Manohar, 2002)

۴۶۔ ایضاً۔

۴۷۔ Praveen Swami, "India, Pakistan and the Secret Jihad: The Covert War in Kashmir 1947-2004 (London: Routledge, 2007)

۴۸۔ ایضاً۔

۴۹۔ ایضاً۔

۵۰۔ ایضاً۔

☆☆☆

7

ریاست کا دو چہروں والا محافظ

پاکستان مشرف دور میں

پرویز مشرف ۱۲ اکتوبر ۱۹۹۹ کو ایسے ڈرامائی حالات میں برسر اقتدار آیا جیسے ان کا سکرپٹ بالی ووڈ میں لکھا گیا ہو۔نواز شریف کی جانب سے قومی ٹیلی ویژن پر اس کی برطرفی کا اعلان اور کولمبو سے کراچی آتے ہوئے اس کے طیارے کو مبینہ طور پر اغوا کرنے کی کوشش نے آرمی چیف کو اس قابل بنادیا کہ وہ بظاہر فوجی انقلاب کے متامل (Reluctant) کمانڈر کی طرح اقتدار پر قبضہ کر لے۔درحقیقت آرمی چیف اور وزیر اعظم کے درمیان کشیدگی کی ابتداء کارگل آپریشن کے دوران شروع ہو چکی تھی جس میں مشرف نے قائدانہ کردار ادا کیا تھا۔کمانڈو بٹالین کے کمپنی کمانڈر سے ایلیٹ سپیشل سروسز گروپ کے رکن بننے والے پرویز مشرف کو اکتوبر ۱۹۹۸ میں نواز شرف نے فوج کا سربراہ نامزد کیا تھا۔اس کی نامزدگی ضیاء الحق کی طرح تھی کیونکہ اسے بھی جونیئر حیثیت سے ایک غیر سیاسی شخصیت سمجھتے ہوئے فوج کی سربراہی پر تعینات کیا گیا تھا جس کی فوج میں کوئی بڑی پاور بیس نہیں ہے۔جنرل ضیاء کی طرح وہ بھی پنجابی پختون غلبے کے حامل ادارے میں مہاجر پس منظر کا حامل تھا۔جنرل مشرف اور ضیاء الحق میں بس اتنی سی مشابہت تھی۔بصورت دیگر دونوں شخصیات ایک دوسرے کی ضد تھیں۔مشرف ضیاء کی طرح دیوبندی مکتبہ فکر کے اثر میں نہیں تھا اس کی بجائے وہ پرانی طرز کا فوجی افسر تھا جسے سکاچ اور سوڈے سے کوئی خاص پرہیز نہیں تھا اور جو گالف کورس میں بھی اتنا ہی

آرام دہ محسوس کرتا جتنا پریڈ گراؤنڈ میں۔یوں وہ ضیاء الحق کی بجائے ایوب خان سے مشابہت رکھتا تھا۔اس کا لبرل ازم خاندانی پس منظر کا مرہون منت تھا۔اس کا والد سید مشرف الدین علی گڑھ سے فارغ التحصیل تھا اور اس کی ماں جو اندرا پرستھا کالج دہلی سے انگریزی ادب میں ایم اے کی ڈگری رکھتی تھی اپنے شوہر کی طرح لبرل خیالات کی حامل تھی۔اپنے والد کی انقرہ کے پاکستانی سفارتخانے میں پوسٹنگ کی وجہ سے پرویز مشرف کی زندگی کے ابتدائی سات سال (۵۶-۱۹۴۹) ترکی میں گذرے تھے۔اس باب میں استدلال کیا گیا ہے کہ مشرف اپنے لبرل ازم کے باوجود پاکستانی سیاستدانوں کے خلاف اسی طرح نفرت انگیز جذبات رکھتا تھا جتنا روایتی طور پر دیگر فوجی افسران رکھتے ہیں۔اس کے پاس تعلقات عامہ کی مہارت تو موجود تھی لیکن وہ سیاست سے اتنی شد بد نہیں رکھتا تھا کہ وہ فوجی انقلاب برپا کرنے والے کمانڈر کی حیثیت سے اپنے اقتدار کی قانونی جواز سے محرومی کا ازالہ کر سکے(۱)۔مشرف لبرل رجحانات کا حامل ہونے کے ساتھ ساتھ پاکستان آرمی میں موجود جبلی مطلق العنانیت سے لتھڑا ہوا بھی تھا۔یہی وجہ ہے کہ جب اس کی پالیسیوں پر نکتہ چینی کی جاتی تو وہ برافروختہ ہو جاتا تھا۔اس نے اقتدار پر قبضہ کے بعد اپنے گرد وفاداروں اور خوشامدیوں کا حصار قائم کر لیا تھا جو اسے وہی مشورہ دیتے تھے جو وہ سننا چاہتا تھا۔یوں آخر کار اس نے وہ فاش غلطی کر ڈالی جس کے نتیجے میں اسے ایمرجنسی لگانا پڑی اور یہ غلطی تھی ایک مقبول اور آزاد منش چیف جسٹس افتخار چودھری کی غیر فعالیت کا فیصلہ۔مشرف جو خود کو پاکستانی جمہوریت کے مسیحا کے طور پر پیش کرتا تھا، اس صورتحال میں بری طرح پھنس گیا۔نومبر ۲۰۰۷ میں کیے جانے والے اس اقدام نے اس کی بین الاقوامی ساکھ کو بھی ناقابل تلافی نقصان پہنچایا۔امریکہ نے نائن الیون کے بعد دہشت گردی کے خلاف جنگ میں مشرف کو پرجوش انداز میں گلے سے لگایا لیکن بعد میں اس کے عسکریت کے حوالے سے دورخی اپروچ (Janus-faced approach) پر وہ خاصا پریشان تھا۔پاکستانی عوام بھی اس کی "اچھے" اور "برے" عسکریت پسندوں کے دہرے معیار کی مخالفت کر رہے تھے۔پاکستان کے لبرلائزڈ میڈیا نے بھی پاکستانی صدر کے اس فخریہ اعتراف کو اچھالا تھا

کہ وہ مغرب کی کٹھ پتلی ہے۔

اس کے اقتدار کی ابتداء کے وقت سے صورتحال بہت مختلف رخ اختیار کر چکی تھی۔ حسن عباس نے اپنی کتاب میں اس صورتحال کیلئے ‘‘پاکستان انتہاپسندی کی گود میں بیٹھ گیا ہے’’ الفاظ استعمال کیے ہیں (۲)۔ پرویز مشرف کا اپنے لبرل خیالات کے اظہار کیلئے کتوں کو گود میں اٹھا کر تصویریں کھنچوانا اور خود کو چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کی بجائے چیف ایگزیکٹو کہلوانا خود کا دانستہ طور پر ضیاء الحق سے مختلف شخص کے طور پر پیش کرنے کے ضمن میں تھا۔ ترکی میں بچپن اور بعد ازاں فوجی افسر کی حیثیت سے جوانی کا مختصر سا عرصہ گذارنے کی وجہ سے ابتدائی دور کی تقریروں میں وہ کمال اتاترک کو اپنا رول ماڈل قرار دیتا تھا۔ اس کی حکومت کے پرجوش حمایتی اسے اکثر ‘‘قائد اعظم ثانی’’ کا لقب عطا کرتے ہیں جو جناح کے وژن پر چلتے ہوئے پاکستان کو ایک ماڈریٹ، ترقی پسند مسلم ریاست بنانا چاہتا تھا (۳)۔ مشرف کے تمام عرصہ اقتدار کے دوران ‘‘اسلامی اعتدال پسندی’’ کے الفاظ کا ورد مسلسل سنائی دیتا ہے تاہم اس دوران ‘‘گڈ گورننس’’ کے الفاظ بہت کم سنائی دیئے جس کو رواج دینے کیلئے وہ ۱۹۹۹ میں ‘‘جعلی جمہوریت’’ کو ختم کر کے برسر اقتدار آیا تھا۔

اپنے دعوؤں کے باوجود مشرف نے ٹیکس کے نظام کو کبھی جدید خطوط پر استوار کیا نہ ضیاء الحق کی اسلامائزیشن کو رول بیک کیا۔ انتظامی اصلاحات کے نتیجے میں مقامی حکومتیں تو وجود میں آ گئیں لیکن اس سے دیہی سیاست میں جاگیردارانہ طرز سیاست کا سد باب کرنے کی کوئی کوشش نہ کی گئی۔ علاوہ ازیں حدود آرڈی نینس یا قبائلی روایات سے پھوٹتی ہوئی معاشرتی سطح پر عورت دشمنی کو ختم کرنے کی جانب بھی کوئی توجہ مبذول نہ کی گئی۔ مشرف کا گڈ گورننس کا ایجنڈا، اسلامی اعتدال پسندی اور بھارت کے ساتھ جامع مذاکرات ناکامی سے دوچار ہوئے محض خارجی معاشی و سیاسی دباؤ کی وجہ سے نہیں بلکہ پاکستانی ریاست میں موجود داخلی کمزوریوں اور تضادات کی وجہ سے۔

مشرف کی کرداری خصوصیات کے حوالے سے کیے جانے والے تجزیوں میں ایک نکتے کو نظر انداز کر دیا گیا ہے کہ اسے پاکستان کے دوسرے فوجی حکمرانوں کی طرح

سیاسی اتحادیوں کے ساتھ تعاون کی فضا پیدا کرنے کی ضرورت تھی۔ ایسا کرنے کے چکر میں وہ نا صرف اپنے وسیع البنیاد تبدیلیوں کے ایجنڈے کو بروئے کار نہ لا سکا بلکہ وہ مذہبی اسٹیبلشمنٹ اور جاگیرداری طبقے کے مفادات کا اسیر ہو کر رہ گیا جیسا کہ منتخب لیڈروں کے ساتھ ہوتا آیا ہے۔ فوج کی حمایت یافتہ حکومت ایک بار پھر پاکستان کو جدید شاہراہ پر گامزن کرنے میں ناکام رہی باوجود اس امر کے کہ اس کی سربراہی ایک لبرل اور ترقی پسند ذہن کے حامل شخص کے ہاتھ میں تھی۔ ملک کو درپیش دیرینہ سٹرکچرل مسائل کی وجہ سے اس کے دور میں ہونے والی معاشی ترقی بھی دیرپا بنیادوں پر استوار ہونے کی بجائے محض پانی کا بلبلہ ثابت ہوئی (۵)۔

اس باب میں یہ استدلال بھی کیا جائے گا کہ مشرف دور پاکستان کی آزادی کے بعد کی تاریخ میں ہمیشہ سے موجود تین رجحانات کو مثالی شکل میں پیش کرتا ہے۔ اول، فوجی حکومتیں حتمی طور پر معاشرے کو جدیدیت کی راہ پر ڈالنے، گورننس اور معاشی سدھار میں ناکام ثابت ہوئی ہیں۔ دوم، پاکستان کی جانب سے اسلامی انتہاپسندوں کو اپنے مقاصد کیلئے استعمال کرنے کی پالیسی نے اسے اپنے ہمسائیوں سے کاٹ دیا ہے اور خود داخلی طور پر اس کی وجہ سے شدید مسائل سے دوچار ہے۔ سوم، فوجی اقتدار کے نتیجے میں پاکستان کے چھوٹے صوبوں میں نسلی کشیدگی میں بہت زیادہ اضافہ ہو جاتا ہے۔ مشرف کے دور نے پاکستان کی ترقی میں حائل پیچیدگیوں کو بھی آشکار کر دیا ہے جو تجزیہ کاروں کو الجھاتی چلی آئی ہیں۔ پاکستان ایسی ریاست ہے جہاں ایک فوجی ڈکٹیٹر اپنے سیاسی پیشرووں کے برعکس زیادہ سہولت کے ساتھ اپنی لبرل میڈیا پالیسی پر کاربند ہو سکتا ہے۔ ایک ایسی ریاست ہے جہاں ایک بلوچ سردار جسے اپنی رعایا کی زندگی اور موت پر بھی قدرت حاصل ہوتی ہے ریاست کے ‘‘استحصال’’ کے خلاف قومی جدوجہد کی علامت بن سکتا ہے۔ ایک ریاست جو بنیادی معاشی و انتظامی افعال پر عمل درآمد کرنے کی اہلیت کے حوالے سے بیک وقت ‘‘سخت’’ بھی ہے اور ‘‘نرم’’ بھی۔

نائن الیون اوراس کے مابعد اثرات

نائن الیون کے بعد امریکہ اور اس کے مغربی اتحادیوں کی جانب سے شروع کی گئی ''دہشت گردی کے خلاف جنگ'' نے مشرف کے پاکستان پر اتنے ہی بھرپور اثرات مرتب کیے جتنے افغان جنگ نے ضیاء الحق کے پاکستان پر کیے تھے۔دونوں مواقع پر پاکستان کو ایک ایسی جدوجہد کے دوران فرنٹ لائن سٹیٹ کا کردار ادا کرنا پڑے جس کے اثرات خطے کی حدود سے ماوراء تھے۔گوکہ نائن الیون نے مشرف کی بین الاقوامی ساکھ کو بحال کردیا اور بے پناہ وسائل کے بہاؤ کا رخ ملک کی جانب ہوگیا تاہم اس کے ساتھ ہی اس نے ریاست کی قائم بالذات دفاعی پالیسیوں کو خطرے سے دوچار کردیا۔

افغان طالبان کی حمایت سے ہاتھ کھینچ لینے اور کشمیر میں جاری ''جہاد'' کے شعلوں پر پانی ڈالنے کے حوالے سے پاکستانی رائے عامہ منقسم ہے۔اس کے بعد ۲۰۰۴ میں طالبان کے خلاف قبائلی علاقوں میں فوجی آپریشن نے نا صرف اسے اپنے سابق لے پالکوں کے مقابل لاکھڑا کیا بلکہ رائے عامہ کا ایک بڑا حصہ بھی مشرف حکومت کے خلاف ہوگیا۔اگر ماضی کا دور ہوتا تو اس کا کوئی خاص اثر نہ ہوتا لیکن اس اثنا میں مشرف نے اپنی حکومت کو جمہوری قرار دلوانے کیلئے پاکستان میں ایک لبرل میڈیا بھی قائم کردیا تھا۔

یہ ایک بہت رنگین وسنگین داستان ہے کہ کیسے اور کن حالات میں پرویز مشرف کو اپنے طاقت ور کور کمانڈروں کو افغانستان میں سابق لے پالک طالبان کے خلاف یکسو کرنے میں کامیابی حاصل کی (۶)۔اس فیصلے کے پیچھے معاشی کمزوریاں جن کے ساتھ ۳۸ ارب ڈالر کا بیرونی قرضہ جڑا ہوا تھا نیز امریکہ اور بھارت کی جانب سے درپیش خطرہ اس فیصلے کے پیچھے محرک کے طور پر موجود تھا۔سرکاری حلقوں میں اس فیصلے کو ''یوٹرن'' کا نام دیا گیا۔یہ فیصلہ سطحی طور پر درست تھا کیونکہ پاکستان سعودی عرب اور یو اے ای سمیت ان تین ملکوں میں شامل تھا جنہوں نے افغانستان میں طالبان کی

حکومت کو تسلیم کررکھا تھا۔ہم اس سے قبل جائزہ لے چکے ہیں کہ طالبان کو پاکستان کے علاقائی مفادات کے تحفظ کا ذریعہ سمجھا جاتا تھا اور کم ازکم جزوی حد تک ان کے عروج کو پاکستانی ریاست کی جانب سے فراہم کیے جانے والے تعاون کا شاخسانہ قرار دیا جاتا تھا۔تاہم اس کے باوجود طالبان نے کبھی بھی خود کو پاکستان کا حقیقی ہمدرد اور دوست ثابت نہیں کیا۔طالبان کے دور میں افغانستان کا دورہ کرنے والی پاکستان کی فٹ بال ٹیم کو اس وقت شدید خفت کا سامنا کرنا پڑا جب طالبان نے نیکریں پہننے اور داڑھی نہ رکھنے کے جرم میں سرعام ان کے سرمنڈوا دیئے تھے۔علاوہ ازیں پاکستان کی اپیل کے باوجود طالبان نے فروری ۲۰۰۱ میں بامیان میں مہاتما بدھ کے دو ہزار سال پرانے مجسمے کو بموں سے تباہ کردیا تھا۔جب اسامہ بن لادن کو سوڈان چھوڑنے پر مجبور کیا گیا اور اس نے افغانستان میں پناہ حاصل کرلی تو اس کے اور القاعدہ کے ساتھ طالبان کے روابط اتنے گہرے ہوگئے کہ پاکستان کیلئے طالبان کی ''سٹریٹجک اثاثے'' کی حیثیت ختم ہوگئی تھی۔

پاکستان نے نومبر ۲۰۰۱ میں امریکہ کے آپریشن اینڈیورنگ فریڈم کے سلسلے میں امریکہ طیاروں کیلئے اپنی فضائیں کھولتے ہوئے اورانہیں اترنے کی سہولت فراہم کرتے ہوئے تعاون فراہم کیا تھا۔اس کے علاوہ افغانستان میں امریکی فوجوں کے ساتھ خفیہ معلومات کا تبادلہ کیا گیا اور انہیں لاجسٹک سپورٹ بھی فراہم کی گئی۔اس کے بدلے میں پاکستان کو صرف فوجی آمریت کی وجہ سے نہیں بلکہ نیوکلیئر عدم پھیلاؤ کی پالیسی کی مبینہ خلاف ورزیوں کی وجہ سے بھی بین الاقوامی برادری کی ناراضی سے نجات مل گئی۔امریکی اچھی طرح جانتے تھے کہ انا پرست ڈاکٹر عبدالقدیر خان جسے مشرف نے مارچ ۲۰۰۱ میں نیوکلیئر پروگرام کی سربراہی سے ہٹادیا تھا اور بعدازاں اسے گھر میں نظر بند کردیا تھا، لیبیا، ایران اور شمالی کوریا کے ساتھ ہونے والی خفیہ سودوں میں تنہا مجرم نہیں ہے(۷)۔

اس کے بعد فوجی و معاشی امداد کی فراوانی نے پاکستان کی بدحال معیشت کو خوب سہارا دیا۔۲۰۰۰ میں پاکستان کا فسکل قرضہ جی ڈی پی کے ۵ء۳ فیصد کے مساوی

ہو چکا تھا اور اس کا کل قرضہ جی ڈی پی کے ۹۲ فیصد کے مساوی ہو چکا تھا۔ یہ درست ہے کہ نائن الیون سے قبل آئی ایم ایف نے پاکستان کو ۵۹۶ ملین ڈالر قرضے کی منظوری دے دی تھی (۸)۔ تاہم یہ نائن الیون کے بعد ملک کی سٹینڈنگ تھی جس نے اس پر غیر ملکی امداد اور بیرون ملک پاکستانیوں کی جانب سے رقومات کی بھاری ترسیل (۹) کے دروازے کھولے نیز پاکستان کی معاشی ترقی میں تیز رفتاری لانے کیلئے پیرس کلب کے ڈونرز نے اپنے قرضے ری شیڈیول کیے تھے۔ بش انتظامیہ کی جانب سے پاکستان پر عائد اقتصادی پابندیاں کو ختم کر دیا جو قبل ازیں پاکستان کے ایٹمی دھماکوں اور بعد ازیں مشرف کی فوجی بغاوت کے بعد سے نافذ العمل تھیں۔ اس کے نتیجے میں پاکستان کو ۲۰۰۲ میں ۶۰۰ ملین ڈالر مالیت کے معاشی سپورٹ فنڈز مہیا کیے گئے تھے۔ معاشی صورتحال کی بہتری کے ساتھ ہی پاکستان کی ترقی کی شرح جو مشرف دور کی ابتدائی میں تین فیصد تھی بڑھ کر چھ فیصد سالانہ تک پہنچ گئی۔ اسی طرح پاکستان کے زرمبادلہ کے ذخائر جن کی مالیت صرف ۹۰۸ ملین ڈالر کی کم ترین سطح پر پہنچ چکی تھی اور جو محض ایک ماہ کی تجارت کا بوجھ اٹھا سکتے تھے، نئی صورتحال میں اچانک بڑھنا شروع ہوگئے اور ان کا حجم ۲۰۰۴ تک ۱۱ ارب ڈالر تک پہنچ گیا (۱۰)۔ پاکستان میں بڑھتی ہوئی خوشحالی کی ایک حیران کن مثال یہ ہے کہ ملک میں موبائل فون استعمال کرنے والوں کی تعداد میں اچانک اضافہ ہوگیا جو ۲۰۰۱-۷ کے عرصے کے دوران چھ لاکھ سے بڑھ کر پانچ کروڑ تک پہنچ گئی۔

پاکستانی معیشت میں سٹرکچرل کمزوریوں کی وجہ سے مشرف ترقی کی اس رفتار کو پائیدار بنیادوں پر قائم رکھنے کے قابل نہیں تھا۔ ان کمزوریوں میں ناصرف ٹیکس وصولی کی کم ترین شرح اور ناقص انفراسٹرکچر بلکہ کم انسانی سرمایہ بھی شامل تھا۔ پاکستان انسانی ترقی کے اشاریوں بشمول نوزائیدہ بچوں کی شرح اموات، پرائمری سکولوں میں داخلوں اور تعلیم پر صرف کیے جانے والے اخراجات کے اعتبار سے جنوبی ایشیا کے دوسرے ملکوں سے کہیں پیچھے ہے۔ ۲۰۰۷ میں شائع ہونے والی انسانی ترقی کی سرکاری رپورٹ میں اس صورتحال کو ان الفاظ میں ملخص کیا گیا ہے، ”پاکستان میں معاشی ترقی کو

ابھی تک اطمینان بخش حد تک حکومتی پالیسیوں کے تحت انسانی ترقی کے ساتھ جوڑنے میں کامیابی حاصل نہیں کی جا سکی ہے۔ درحقیقت پاکستان کی مشکلات کا سبب آمدنی کی تقسیم کے بارے میں پالیسیوں کی گروتھ پالیسیوں کے ساتھ یکسر بیگانگی ہے“ (۱۱)۔ اگر آبادی کا ایک تہائی حصہ خط غربت کے نیچے ہو اور نصف سے زیادہ آبادی کو تعلیم، صحت یا نکاسی آب جیسی بنیادی سہولیات تک رسائی حاصل نہ ہو تو معاشی ترقی خارجی واقعات اور دولت مند کنزیومرز کی جانب سے قرضوں کی مسلسل فراہمی کی محتاج ہوتی ہے (۱۲)۔ مشرف کی معاشی پالیسیوں کے نقاد اپنے اس موقف کے حوالے سے حق بجانب ہیں کہ قرضوں اور زرمبادلہ کے اعتبار سے ہونے والے میکرو اکنامک بہتری نائن الیون کے بعد پیش آنے والے حالات و واقعات کا شاخسانہ تھی (۱۳)۔

مشرف کو ضیاء الحق کی طرح بین الاقوامی سطح پر سیاسی اور معاشی شعبوں میں سانس لینے کی مہلت دی گئی تھی۔ اس نے ریڈیو اور ٹیلی ویژن کی نشریات کیلئے لائسنسوں کے اجراء اور اخبارات کے مدیران کے ہاتھ کھولتے ہوئے نیک نامی کمائی تھی۔ ان پالیسیوں نے اس کی حکومت کا لبرل ازم کے ساتھ وابستہ ہونے کا سطحی سا تاثر قائم کیا تھا۔ جہاں تک ٹیلی ویژن چینلوں کا تعلق ہے ان کو لائسنس دیئے جانے کے پیچھے یہ مجبوری بھی تھی کہ پاکستان کا ریاستی ٹی وی چینل پی ٹی وی کارگل کے حوالے سے بھارت کے ساتھ میڈیا وار لڑنے میں ناکام ہوگیا تھا اور یہ ثابت ہو چکا تھا کہ صرف پرائیویٹ چینل ہی غیر ملکی سیٹیلائٹ پرووائیڈرز کا توڑ کر سکتے ہیں جنہوں نے پرانے سٹائل کی ٹی وی پالیسنگ کو بدل کر رکھ دیا تھا۔ نئے میڈیا نے ناصرف لبرل آوازوں کو سنائی دیئے جانے کا موقعہ فراہم کیا تھا بلکہ عسکری گروپوں کے ترجمانوں کی بات بھی سنی جانے لگی تھی۔ جب فوج نے وزیرستان میں ملٹری آپریشن کیا تو اس کے نتیجے میں ہونے والے کولیٹرول ڈیمج کا چرچا بھی ان چینلوں پر کیا گیا۔ اگر پرانے زمانے کے میڈیا نے سروائیو کیا ہوتا تو ایسا ہونا بعید از قیاس تھا کہ مشرف اپنی امریکی نوازی کی وجہ سے اس قدر زیادہ غیر مقبول ہوجاتا۔ اس صورتحال کے نتیجے میں جیو جیسی نجی ٹیلیویژن کمپنیاں آہستہ آہستہ حکومت کی آنکھوں میں کھٹکنے لگیں۔ جب انہوں نے ۲۰۰۷ کی وکلاء تحریک

میں کھل کر پرویز مشرف کے خلاف چیف جسٹس افتخار محمد چوہدری کا ساتھ دیا تو حکومت
ان کی دشمن بن گئی۔ مشرف کی جانب سے ایمرجنسی کے نفاذ نے جہاں میڈیا اور سیاسی
مخالفین پر بندشیں عائد کی گئیں وہیں مشرف کی بین الاقوامی ساکھ کو بھی شدید نقصان
پہنچا۔ یہ وہی وقت تھا جب سرحد کے آر پار ہونے والی دہشت گردی کے حوالے سے
پاکستان کی مبہم پالیسیوں کے نتیجے میں واشنگٹن اور لندن کی فرسٹریشن اپنی انتہا کو پہنچ چکی
تھی (۱۴)۔ اپنے اقتدار کے آخری سالوں میں اپنی فوجی کی حمایت یافتہ حکومت کو حقیقی
جمہوریت کے ساتھ تبدیل کرنے کے سلسلے میں مشرف پر بے پناہ دباؤ آ گیا۔ مغربی
تجزیہ کاروں اور پاکستانی لبرلز دونوں نے اس بات پر زور دیا ہے کہ جمہوریت نا صرف
پاکستان کے دیرینہ عدم استحکام کے مسئلے بلکہ افغانستان کے ساتھ لگنے والے بارڈر سے
درآمد ہونے والی دہشت گردی کے خاتمے کی کلید ہے۔ زاہد حسین نے ان جذبات کو
اپنے اس فقرے میں سمو دیا ہے کہ "عسکریت پسندی اور اسلامی انتہا پسندی کے خلاف
جنگ صرف لبرل جمہوریت کے تحت ہی لڑی اور جیتی جا سکتی ہے" (۱۵)۔

بعد از نائن الیون زمانے میں پاکستانی ریاست کو عسکری گروپوں کے خلاف
شدید الجھے ہوئے اور بھرپور لڑائیوں میں ملوث ہونا پڑا تھا جو یا تو روایتی طور پر پاکستانی
حدود کے اندر اپنی کمین گاہوں سے نکل کر ریاست کے خلاف لڑتے تھے یا دسمبر ۲۰۰۱
میں تورا بورا کے مقام پر بنائی گئی القاعدہ کی امریکی فوج کے قبضے کے بعد پاکستان کی
حدود کے اندر گھس گئے تھے۔ گو پاکستانی ریاست نے غیر ملکی جنگجوؤں اور القاعدہ کے
لڑاکوں کے خلاف پہلے سیکورٹی اور بعد ازاں ملٹری آپریشن تو کیے لیکن اس نے دانستہ طور
پر افغان طالبان اور کشمیر کے جہادیوں کو چھیڑنے سے گریز کیا۔ یہ بات طے شدہ ہے کہ
آئی ایس آئی کے کچھ لوگ اور کچھ فوجی کمانڈر افغان طالبان کے بارے میں ہمدردانہ
رویہ رکھتے تھے کیونکہ ان کے آپس میں دیرینہ مراسم تھے۔ انہیں پناہ فراہم کرنے کی
پالیسی بنیادی طور پر مشرف کی حقیقت پسندی اور انڈیا مرکزیت کی حامل دیرینہ سیکورٹی
حکمت عملی کے ساتھ کمٹ منٹ کا اظہار کرتی ہے۔ امریکہ کی جانب سے طالبان حکومت
کے اقتدار کو ختم کرنا پاکستان کیلئے کسی دھچکے سے کم نہ تھا کیونکہ اس کے بعد وہ کابل کے

تخت پر ایسی حکومت کو لے کر آیا جو غیر پشتون تھی اور اپنی حمایت کیلئے روایتی طور پر
بھارت کی جانب دیکھتی تھی۔ افغانستان میں بھارت کے بڑھتے ہوئے اثر و نفوذ کو
دیکھتے ہوئے کچھ دفاعی تجزیہ کاروں کے دماغوں میں پاکستان کو گھیرے میں لیے جانے
کے خدشات پیدا ہو گئے تھے۔ اگر ہم اس بات کو ذہن میں رکھیں کہ پاکستانی انٹیلی جنس
بلوچستان میں بھارتی کی بڑھتی ہوئی مداخلت سے پریشان ہے تو یقیناً ان خدشات کو بے
بنیاد نہیں کہا جا سکتا۔ پاکستان بھی کشمیری جہادی تنظیموں کو بدستور پناہ گاہیں فراہم کرتے
ہوئے بھارت کے خلاف جوابی ردعمل ظاہر کرنے کا خواہاں تھا تاکہ نئی دہلی پر دباؤ کو
برقرار رکھا جائے۔

امریکہ کی توجہ جب افغانستان سے عراق کی جانب مبذول ہو رہی تھی تو اس
موقعے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے وزیرستان میں موجود افغان طالبان نے افغانستان
میں گھس کر کارروائیاں تیز کر دی تھیں۔ کئی برسوں تک افغان طالبان لیڈر آزادانہ طور پر
اپنے کوئٹہ کے ہیڈ کوارٹر (جسے کوئٹہ شوریٰ کے نام سے جانا جاتا ہے) سے آزادانہ طور پر
نقل و حرکت کرتے رہے تھے۔ کشمیر میں بھی سرحد سے پار مداخلتوں کا سلسلہ ۲۰۰۱ میں
بھی جاری رہا تھا۔ ادھر پاکستان میں قائم تنظیموں لشکر طیبہ اور جیش محمد کی جانب سے اس
دلیرانہ موو نے کہ جہاد کو جموں و کشمیر کی بجائے بھارت کے اندر پھیلانا چاہیے اور اس
سلسلے میں لشکر طیبہ کی جانب سے ۱۳ دسمبر ۲۰۰۲ کو نئی دہلی میں بھارتی پارلیمنٹ پر حملے
نے مشرف حکومت کو اپنی پالیسی پر نظر ثانی کرنے پر مجبور کر دیا۔ لشکر طیبہ اور جیش محمد
دونوں اپنی ماضی کی کارروائیوں کے سلسلے میں فوج اور آئی ایس آئی سے لاجسٹک اور مالی
امداد وصول کرتی رہی تھیں۔ واشنگٹن اور نئی دہلی میں اس بات کو کسی صورت نظر انداز نہیں
کیا جا سکتا تھا۔

نئی دہلی میں بھارتی پارلیمنٹ پر بھرپور حملے نے دونوں ملکوں کو جنگ کے
دہانے تک پہنچا دیا تھا۔ اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی صورتحال نے مشرف کو مجبور
کر دیا کہ وہ لشکر طیبہ اور جیش محمد اور ان کے ساتھ ساتھ سپاہ صحابہ اور تحریک نفاذ فقہ
جعفریہ پر بھی پابندی عائد کر دے۔ ان کالعدم تنظیموں کے خلاف آپریشن نا صرف غیر

موثر رہا تھا بلکہ کسی نہ کسی حد تک آنکھوں میں دھول جھونکنے کے مترادف بھی تھا۔ایک رپورٹ کے مطابق لشکر طیبہ کا سربراہ حافظ سعید جب بھارتی پارلیمنٹ پر حملے کے بعد جیل میں ڈالا گیا تو وہاں بھی اس کی رسائی میں انٹرنیشنل فون تھا اور وہ امریکہ میں موجود اپنے حواریوں اور حمایتیوں کے ساتھ مسلسل رابطے میں تھا(۱۶)۔کالعدم قرار دیئے جانے کے باوجود یہ تنظیمیں نئے ناموں کے ساتھ اسی طرح موثر انداز میں اپنا کام کرتی رہیں نیز انہیں فلاحی تنظیموں کے روپ میں اپنے نئے قانونی کاموں کی بھی پوری آزادی حاصل تھی۔پابندی کے بعد سپاہ صحابہ ''اہل سنت والجماعت''، جیش محمد ''تحریک خدام الاسلام'' اور لشکر طیبہ ''جماعت الدعوۃ'' کے نام اپنا لیے۔وہ جہاد سے واپس آنے والوں کو ملازمتیں فراہم کرتی اور اپنے شہداء کے خاندانوں کی کفالت کرتی تھیں۔جماعت الدعوۃ کو ۲۰۰۵ میں آنے والے زلزلے اور بعد ازاں ۲۰۱۰ میں آنے والے سیلاب کے دوران فلاحی کام کرنے کی آزادی فراہم کی گئی تھی۔

۲۰۰۴ میں قبائلی علاقوں میں فوج اور فرنٹیئر کانسٹیبلری نے دہشت گردوں کے خلاف فوجی آپریشن کا آغاز کیا۔افغانستان میں موجود مغربی فوجوں پر شدید دباؤ تھا اور اس دباؤ کو کم کرنے کیلئے وہ افغان طالبان کو جڑ سے اکھاڑنے کے درپے تھیں جن کے جنوبی وزیرستان میں پناہ گزین القاعدہ اور غیر ملکی جنگجوؤں (جو زیادہ تر عرب، چیچن اور ازبک قومیتوں سے تعلق رکھتے تھے) کے ساتھ قریبی رابطے تھے۔پاکستانی فوج کو قبائلی علاقوں میں کیے جانے والے آپریشنوں کے دوران بھاری سیٹ بیک اور افغان جہاد کے ساتھ وابستگی رکھنے والے مقامی قبائلیوں کی جانب سے شدید مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا جو پختون ولی کی روایات کے مطابق کراس فائرنگ میں کام آنے والے اپنے عزیزوں کی موت کا بدلہ لینے اور اپنے مہمانوں کی حفاظت کرنے کے اصولوں پر کاربند تھے۔شدید مزاحمت اور مخاصمانہ مقامی رائے عامہ نے پاکستانی فوج کو جنوبی وزیرستان میں پے در پے امن معاہدے کرنے پر مجبور کردیا۔ان میں سے پہلا معاہدہ شکئی معاہدہ تھا جو اپریل ۲۰۰۴ میں عمل میں آیا تھا۔بعد ازاں جنوبی وزیرستان میں ۲۰۰۵ میں ایک اور معاہدہ بیت اللہ محسود کے ساتھ کیا گیا جسے سراروغہ معاہدہ کہا جاتا ہے۔

آخر کار ۲۰۰۷ میں بیت اللہ محسود نے مقامی پروطالبان سپورٹ کو تنظیمی صورت دے دی جس کا نام ''تحریک طالبان پاکستان'' رکھا گیا۔یہ تنظیم ۱۰ جولائی ۲۰۰۷ میں پاکستانی فوج کی طرف سے جانب سے اسلام آباد کی لال مسجد پر کیے جانے والے خونریز آپریشن کا براہ راست ردعمل تھی جس میں مبینہ طور پر ۱۵۰ افراد ہلاک ہوئے تھے۔اس ایپی سوڈ کے حالات و واقعات اور اس کے گرد لپٹے تنازعات کا اس باب میں آگے چل کر جائزہ لیا جائے گا۔تحریک طالبان نے مختلف قبائلی ایجنسیوں کے کمانڈروں کو اپنی تنظیم میں شامل کرلیا جو مقامی معاشرے کی اسلامائزیشن کیلئے سرگرم عمل تھے۔ان کے علاوہ ایسے کمانڈر بھی تھے جو القاعدہ اور انٹرنیشنل جہاد کے ساتھ وابستہ تھے۔ہم آگے چل کر دیوبندی مدارس اور مساجد کی جانب سے طالبان کو فکری سطح پر فراہم کی جانے والی امداد اور مقامی لوگوں کو ان کی حمایت پر اکسانے کے سلسلے میں ان کے کردار پر آگے چل کر بات کریں گے۔تحریک طالبان نے ابتدائی طور پر اپنی مالی پوزیشن کو بہتر بنانے کیلئے مقامی لوگوں پر ٹیکس عائد کیے جن کی نوعیت عطیات سے زیادہ بھتہ جیسی تھی۔اپنے عدم مرکزیت کے باوجود ٹی ٹی پی متحد اور بھرپور کارروائیاں کرنے کے قابل بن چکی تھی۔قبائلی علاقوں کے باہر کافی عرصہ پہلے سوات میں قائم ہونے والی تحریک نفاذ شریعت محمد نے ٹی ٹی پی کی چھتری تلے پناہ لے لی۔دوسری جانب جیش محمد، سپاہ صحابہ اور لشکر جھنگوی نے وہ تنظیم کھڑی کرلی جسے ''پنجابی طالبان'' کہا جاتا ہے۔تھوڑی ہی مدت کے بعد ٹی ٹی پی کی چھتری تلے ۴۰ کے قریب عسکری گروپ پناہ گزین ہوچکے تھے۔افغان جہاد کے ساتھ وابستہ ہونے کے ساتھ ساتھ ان عسکریت پسندوں کا پاکستانی ریاست کے ساتھ تصادم بڑھتا گیا، ساتھ ہی یہ تنظیمیں پاکستان میں اسلامی نظام نافذ کرنے کے معاملے میں زیادہ سے زیادہ سنجیدہ ہوتی چلی گئیں۔دوسری جانب افغان طالبان نے اپنی توجہ ڈیورنڈ لائن کے اس پار کارروائیوں پر جاری رکھی اور اس پر بھی کہ پاکستان میں ان کے محفوظ ٹھکانوں پر کہیں پاکستانی فوج قبضہ نہ کرلے۔

جنوبی وزیرستان میں جاری خونریز جنگ ۸۔۲۰۰۷ کے موسم سرما میں اپنی انتہا کو پہنچ گئی۔اکتوبر ۲۰۰۷ میں شمالی وزیرستان میں بھی پاکستانی فوج کے ساتھ طالبان کا

تصادم شروع ہوگیا جس کے دوران ۸۰ ہزار افراد کو اپنے گھربار چھوڑ کر محفوظ علاقوں کی طرف جانا پڑا۔ ۲۰۰۸ کے سال کے دوران پاکستانی فوج اور نیم فوجی دستوں کو باجوڑ اور مہمند ایجنسی کے عسکریت پسندوں کے خلاف بھی لڑائی کرنا پڑی۔ لیکن فوج کی سرگرمیوں میں اصل شدت مشرف کے اقتدار سے رخصت ہونے کے بعد آئی جب خیبر پختونخوا میں اے این پی کی حکومت قائم ہوگئی جس کے دوران ایک ایک کرکے امن معاہدے ختم ہونے لگے۔ وزیرستان میں آپریشن کا فیصلہ پشاور میں بڑھتے ہوئے دھماکوں اور خودکش حملوں کے نتیجے میں کیا گیا۔ دہشت گردی کا یہ سیلاب خیبر پختونخوا سے پھیل کر پنجاب میں بھی داخل ہونا شروع ہوگیا تھا۔ اس موقع پر کچھ مغربی مصنفین نے ایک بار پھر پاکستان کو ناکام ریاست قرار دینا شروع کردیا۔ دہشت گردی کی ان کارروائیوں کے دوران ہونے والی بڑے پیمانے پر ہلاکتوں کے باوجود طالبان کی پاکستانی ریاست پر قبضہ کرنے کے سلسلے میں ایک انچ آگے نہ بڑھ سکے جو فوج اور پنجاب کی آبادی کی پاکستانی ریاست کے ساتھ معاشی، ثقافتی اور سیاسی کمٹمنٹ کے سینگوں پر کھڑی تھی۔

واشنگٹن کے بھی پاکستان کی سلامتی کے ساتھ طویل مدتی سٹریٹجک مفادات وابستہ تھے جواب ایٹمی ریاست اور دہشت گردی کے خلاف جنگ میں امریکہ کا اہم ترین اتحادی بن چکا تھا۔ جیسا کہ ہم تذکرہ کرچکے ہیں کہ نائن الیون کے بعد کے عرصے میں امریکہ نے پاکستان میں بہت زیادہ مالی امداد فراہم کی تھی۔ بش انتظامیہ گزشتہ کئی سالوں سے مشرف کے ساتھ پینگیں بڑھا رہی تھی جس کے نتیجے میں اس کی اپنی پوزیشن مضبوط ہوچکی تھی۔ اس پالیسی کو جنوبی ایشیا کے امور کے ماہر سلیگ ہیریسن جیسے اہم امریکہ ناقد اور دیگر لوگوں کی جانب سے سراہا نہیں جارہا تھا (۱۷)۔ امریکہ نے 2002 میں بھارت اور پاکستان کو جنگ کے دھانے سے کھینچ کر دور کیا تھا اور دونوں ملکوں کے درمیان امن مذاکرات کی حوصلہ افزائی بھی کی تھی۔ تاہم مشرف کی صدارت کے آخری سالوں میں امریکہ اور پاکستان کے تعلقات میں تناؤ پیدا ہوچکا تھا جس کے اثرات دہشت گردی کے خلاف جنگ پر بھی پڑنا شروع ہوچکے تھے۔ ادھر کوئٹہ شوریٰ کی سرگرمیوں پر بھی نگاہ رکھی جانے لگی تھی اور یہ بھی حقیقت ہے کہ یہ مغرب کا دباؤ ہی تھا

جس کی وجہ سے پاکستان نے القاعدہ کے کئی جانے پہچانے کارندوں کو پکڑا تھا (۱۸)۔ اس دوران اگرچہ القاعدہ کی اہم شخصیات مثلاً شیخ خالد محمد (القاعدہ کی نمبر ۳ شخصیت) اور ملا عبیداللہ (طالبان دور کا وزیر دفاع) سمیت کئی ایک کو گرفتار کیا گیا تھا اور ابوحمزہ ربیعہ اور موسیٰ مارولی عروہ جیسے کئی اہم لوگوں کو ہلاک کیا گیا تھا اس کے باوجود بہت سے ایسے لوگ بھی تھے جو پاکستان کی سیکورٹی فورس کے ہاتھ نہ آسکے تھے۔ ۲۰۰۲-۴ کی درمیانی مدت میں حکومت پاکستان نے فضل الرحمٰن خلیل (حرکت المجاہدین) اور مولانا مسعود اظہر (جیش محمد) کو رہا کردیا تھا۔ دوسری جانب امریکہ کیلئے خاص طور پر یہ بات تشویشناک تھی کہ اسامہ بن لادن ابھی تک روپوش تھا۔ خود پر ہونے والی امریکی تنقید کا مشرف حکومت یہ کہہ کر جواب دیا کرتی تھی کہ اس نے مئی ۲۰۰۶ تک القاعدہ کے ۶۰۰ افراد کو پاکستان سے گرفتار کیا ہے جبکہ ایک ہزار کے قریب جنگجوؤں کو ہلاک کیا ہے۔ حکومت کی ان کارروائیوں کے جواب میں القاعدہ کا لیڈر ایمن الظواہری پاکستان میں اپنے ہمدردوں کو مسلسل مشرف کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے اور اسے دشمن اسلام ہونے کی حیثیت سے قتل کردینے پر اکساتا رہتا تھا۔ اس دوران مشرف پر کئی خودکش حملے ہوچکے تھے۔ سب سے تشویشناک بات یہ تھی دسمبر ۲۰۰۳ میں دو ہفتوں سے بھی کم مدت میں مشرف پر ہونے والے حملوں اور جولائی ۲۰۰۷ میں اسلام آباد انٹرنیشنل ائرپورٹ پر ہونے والی دہشت گردی کا کھرا کچھ فوجی اہلکاروں تک پہنچا تھا۔

امریکہ کے نزدیک افغانستان میں عسکریت پسندوں کے بہاؤ کو روکنے کے سلسلے میں اسلام آباد کی نیم دلانہ کمٹمنٹ کا حل اس نے پاکستان میں طالبان کے ٹھکانوں پر ریموٹ کنٹرول ڈرون طیاروں کے ذریعے میزائل فائر کرنے کی صورت میں ڈھونڈ لیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے پاکستانی سرزمین پر عسکریت پسندوں کے تعاقب میں ''سرگرم تعاقب'' کی دھمکی بھی دے دی۔ امریکہ کے اس رویئے کا پاکستان کی رائے عامہ پر مزید منفی اثر پڑا اور پاکستان میں امریکہ دشمن کے جذبات میں مزید تندی آگئی جو امریکہ کی معاشی امداد کے باوجود جاری و ساری تھے۔ ڈرون طیارے قبائلی علاقوں میں

ہمیشہ عسکریت پسندوں کو نشانہ نہیں بناتے تھے بلکہ اکثر اس کی زد میں عام شہری بھی آجاتے تھے۔مشرف کی پوزیشن سے امریکہ کی نفرت شدید طور پر تباہ کن ہوچکی تھی۔غالبًا اسی وجہ سے پاکستان سرعام تو ڈرون حملوں کی مزمت کرتا اور ان کے خلاف احتجاج کرتا تھا لیکن نجی طور پر وہ سی آئی اے کو معلومات فراہم کرتا تھا جن کے نتیجے میں القاعدہ کے کئی کمانڈر اور پاکستانی طالبان کا سربراہ بیت اللہ محسود کو ہلاک کرنے میں کامیابی حاصل ہوئی تھی۔ڈرون حملوں پر تو محض زبانی جمع خرچ سے کام چلایا جارہا تھا لیکن امریکہ کی ''سرگرم تعاقب'' (Hot Pursuit) کی پالیسی ایک حقیقی خطرے کی صورت میں سر پر منڈلا رہی تھی جس کے نتیجے میں خدشہ ظاہر کیا جارہا تھا کہ امریکہ اور پاکستان فوجی تصادم کی راہ پر نکل سکتے ہیں۔مشرف کے بعد کے دور میں جب طالبان نے سوات پر قبضہ کرلیا اور سافٹ سویلین اہداف کو تواتر کے ساتھ نشانہ بنایا جانے لگا تو پاکستان میں رائے عامہ اس پراپیگنڈے سے منہ موڑنے لگی کہ دہشت گردی کی وجہ یہ ہے کہ پاکستان امریکے کی جنگ لڑ رہا ہے۔تاہم بعد میں امریکہ کی جانب سے اسامہ بن لادن کو قتل کرنے کیلئے ایبٹ آباد پر کیے جانے والے ایکشن کے بعد رائے عامہ پھر پرانی پوزیشن پر واپس آگئی۔

بھارت کے ساتھ تعلقات

مشرف کے دور میں پاکستان کے بھارت کے ساتھ تعلقات حالت جنگ سے رخ بدل کر کشمیر پر ایک بڑے بریک تھرو تک جاپہنچے تھے۔اس سلسلے میں ''ہائی پوائنٹ'' جولائی ۲۰۰۱ میں ہونے والے آگرہ مذاکرات تھے اور اسلام آباد میں ہونے والی سارک سربراہی کانفرنس کے دوران مشرف اور بھارتی وزیر اعظم واجپائی کے درمیان ہونے والی ملاقات تھی جو جنوری ۲۰۰۴ میں طے پائی تھی جبکہ ''لو پوائنٹ'' پاکستانی اور بھارتی فوجوں کا بھارتی پارلیمنٹ میں حملے کے بعد آمنے سامنے آجانا تھا۔مشرف دور دونوں ملکوں کے درمیان دہائیوں پرانی شدید دشمنی کو ختم کرنے کے سلسلے میں کسی بھی فیصلہ کن تبدیلی تک پہنچے بغیر اختتام پذیر ہوگیا۔خطے میں امن کے فوائد کے

امکانات اسی طرح معدوم رہے جیسے ہمیشہ سے تھے۔اس تمام عرصے کے دوران اسلام آباد کی خارجہ پالیسی افغانستان کے بارے میں حکمت عملی میں تبدیلی لانے کے دباؤ کے باوجود ''انڈین خطرے'' پر مرتکز رہی۔اس دوران طالبان کو اقتدار سے نکال باہر کیا جانا پاکستان کیلئے ایک زبردست دھچکا تھا۔طالبان کی جگہ امریکہ سرپرستی میں قائم ہونے والی عبوری حکومت جس کی سربراہی حامد کرزئی کو سونپی گئی تھی، میں پاکستان دشمن شمالی اتحاد کے لوگوں کو بھر دیا گیا جنہیں اس سے پہلے بھارت، روس اور ایران کی بھرپور حمایت حاصل تھی۔بجائے اس کے کہ پاکستان کا سٹریٹجک گہرائی کا خواب پورا ہو، اس اسے افغانستان میں اپنے دیرینہ دشمن بھارت کے ساتھ دو بدو مقابلے کا خطرہ درپیش ہوگیا۔اسلام آباد نے دعویٰ کیا کہ جلال آباد اور قندھار میں قائم کیے جانے والے بھارتی قونصل خانے افغانستان میں بھارت کی بھاری موجودگی کا ثبوت ہیں اور ان کی مدد سے وہ پاکستان کے اندر کارروائیاں کررہا ہے۔اسی طرح یہ خبریں بھی گردش کررہی تھیں کہ بھارت ایران کے سرحدی شہر زاہدان میں قائم اپنے قونصل خانے کے ذریعے بلوچستان میں مسلح مداخلت کررہا ہے۔اس میں کوئی شک نہیں کہ بھارت نے انسانی ہمدردی کی بنیاد پر امداد کے بہانے اور افغانستان کی تعمیر نو کے منصوبوں کی تعمیر کے ذریعے جنگ کے بعد والے افغانستان میں اپنا بہت زیادہ اثر ورسوخ قائم کرلیا تھا۔پاکستان کی جانب سے حقانی نیٹ ورک کی سپورٹ کے ذریعے جو شمالی وزیرستان کے ہیڈکوارٹر میران شاہ میں اپنے ٹھکانوں سے افغانستان میں نیٹو/ایساف کی فوجوں پر حملے کرتا تھا، افغانستان اور بھارت کے خطرے کو کم کرنے کی کوشش کررہا تھا۔اس سلسلے میں پاکستان مستقبل میں پختون ماڈریٹ طالبان گروپوں کے ساتھ اپنے تعلقات کو استعمال کرنے کا خواہشمند تھا[19]۔گوکہ کرزئی کے بعد کے افغانستان میں اپنے سٹیک کے حصول کا خواہاں تھا لیکن وہ طالبان اقتدار کے ساتھ اپنے تجربے کی بنیاد پر جان چکا تھا کہ کلائنٹ سٹیٹ تخلیق کرنا ایک غیر حقیقی بات ہے۔

امریکہ نے پاکستان اور بھارت کو اپنے تعلقات میں بہتری لانے کیلئے بہت کوششیں کیں کیونکہ وہ ہرگز نہیں چاہتا تھا کہ القاعدہ ایسی صورتحال پیدا کردے جس کے

نتیجے میں دونوں نیوکلیئر قوتوں کے درمیان جنگ چھڑ جائے۔علاوہ ازیں یہ امریکہ کے مفادات کا بھی معاملہ تھا کیونکہ وہ ہرگز نہیں چاہتا تھا کہ پاکستان اور بھارت کے درمیان کشیدگی کے نتیجے میں مغربی سرحدوں پر پاکستانی فوج کی موجودگی میں کمی آجائے۔امریکہ کے دباؤ کے علاوہ ۲۰۰۲ سے کشمیر میں کنٹرول لائن کے پار عسکریت پسندوں کی دخل اندازی میں بھی بہت کمی واقع ہوئی جس کے نتیجے میں بھارت کا رویہ نرم پڑ گیا اور وہ دونوں ملکوں کے درمیان جامع مذاکرات پر آمادہ ہو گیا جنہیں کارگل کے بعد ترک کر دیا گیا تھا۔

مشرف کے مذاکرات میں فریق بننے کے امکانات کم تھے کیونکہ بھارت ایسے شخص کو نئی دہلی میں نہیں دیکھنا چاہتا تھا جو کارگل جنگ کا آرکیٹیکچر رہا ہو جس کے دوران دونوں اطراف کے ہزاروں افراد کو اپنی جانوں سے ہاتھ دھونا پڑے تھے۔تاہم اس کے باوجود مشرف نے کشمیر تنازعے کو حل کرنے کیلئے جو تجاویز پیش کیں ان میں گذشتہ سویلین لیڈروں سے بھی کہیں زیادہ لچک کا مظاہرہ کیا تھا۔اس نے نا صرف یہ اعلان کر دیا کہ کشمیر پر اقوام متحدہ کی قراردادوں کو جو گذشتہ چھ دہائیوں سے پاکستان کی خارجہ پالیسی کا محور و مرکز رہی تھیں، ایک جانب رکھا جا سکتا ہے بلکہ دسمبر ۲۰۰۵ میں سلسلہ وار تجاویز بھی پیش کیں جن میں سافٹ بارڈرز، کشمیر کو غیر فوجی علاقہ قرار دینا، سیلف گورننس اور کشمیر کے خطے کی نگرانی کیلئے مشترکہ نگرانی جیسے اقدامات شامل تھے۔ان اعلانیہ اعلانات کے ساتھ ساتھ مشرف حکومت بھارت کے ساتھ بیک ڈور ڈپلومیسی میں بھی مصروف رہی تھی جن کے نتیجے میں اپریل ۲۰۰۷ میں کشمیر کے تنازعے کے سلسلے میں پیش رفت ہوئی۔ایک سٹیٹس کو کی حامی ریاست کے طور پر بھارت کشمیر کے مسئلے کو پس پشت ڈالنے کا خواہشمند تھا اس کی بجائے وہ اعتماد سازی کے بہت سے اقدامات پر عمل درآمد چاہتا تھا۔جن میں اپریل ۲۰۰۵ میں کشمیر کے دونوں اطراف بس سروس کو شروع کیے جانے کا معاملہ بھی شامل تھا۔درحقیقت سفارتی تعلقات میں بہتری کے باوجود پاکستانی فوج بھارت کو ابھی تک سب سے بڑا سٹریٹجک خطرہ سمجھتی تھی۔

سیاسی مدوجزر

پرویز مشرف نے جنرل ضیاء کے بعد والے دور کو ''جعلی جمہوریت'' کا دور قرار دیا تھا۔اس کے کہنے کے مطابق یہ عرصہ کرپشن، معاشی نالائقی اور انتشار سے عبارت تھا۔اس نے ان ناکامیوں کا ذمہ دار دو شخصیات بے نظیر بھٹو اور نواز شریف کو ٹھہرایا تھا لہٰذا انہیں سیاست سے خارج کرنے کیلئے اس کے پاس یہ ایک ریڈی میڈ بہانہ تھا۔بے نظیر اس دوران دبئی میں خود ساختہ جلاوطنی میں رہیں جبکہ نواز شریف کو جولائی ۲۰۰۰ میں کرپشن، اغوا اور ہائی جیکنگ کا مجرم ٹھہرا دیا گیا۔اسے دسمبر کے مہینے میں اٹک جیل سے رہا کر دیا گیا اور اپنے افراد خانہ کے ساتھ سعودی عرب کے شہر جدہ جانے کی اجازت دے دی گئی۔گو کہ مشرف ابتدائی دنوں میں بین الاقوامی طور پر پسند کی جانے والی گڈ گورننس کی بولی بولتا تھا جس کے ذخیرہ الفاظ میں شفافیت، احتساب اور ایمپاورمنٹ جیسے الفاظ شامل تھے تاہم جلدی ہی اس کی جانب سے ''حقیقی جمہوریت'' کی عمارت تعمیر کرنے کی کوششیں سابق فوجی حکمرانوں کے آزمودہ نسخوں کے بوجھ تلے دب کر دم توڑ گئیں۔پاکستان کے فوجی حکمرانوں کے اقتدار کو طوالت دینے کیلئے نسخے کچھ یوں ہوتے ہیں: سیاسی مخالفین کو ڈسپلن سکھانے کیلئے احتساب کا عمل، جس کا ہرگز مقصد کرپشن کو کسی امتیاز کے بغیر جڑ سے اکھاڑنا نہیں ہوتا؛ سیاسی سرگرمیوں کو محدود کر دینا سیاسی پارٹیوں کو بائی پاس کرتے ہوئے عوام سے براہ راست رابطہ رکھنے کیلئے مقامی حکومتوں کے نظام کا قیام۔گو کہ ان ہتھکنڈوں سے اپوزیشن عارضی طور پر کمزور ہو جاتی ہے لیکن اس کے باوجود یہ فوجی حکمران اپنے حکومت کیلئے قانونی جواز کا انتظام نہیں کر پاتے جو اندرون اور بیرون ملک شدید تر ہوتی تنقید کی زد میں ہوتی ہے۔لہٰذا انہیں جمہوریت کے نام پر ایک سیاسی عمل شروع کرنا پڑتا ہے۔اس عمل کے دوران انہیں موقع پرست مذہبی اسٹیبلشمنٹ اور فیوڈل قوتوں کے ساتھ اتحاد تشکیل دینا پڑتے ہیں۔وراثتی سیاست کو بائی پاس کرنے کی کوشش میں مشرف کو بھی ان پرانے ہتھکنڈوں پر اترنا پڑا اور پنجاب میں اپنی پاور کو سہارا دینے کیلئے مثال کے طور پر گجرات کے

چودھریوں جیسی رشتے داریوں کے نیٹ ورک کی حامل اور بالادستی کی سیاست پر انحصار کرنا پڑا۔

اپنے مخصوص مفادات کو پورا کرنے کیلئے مشرف نے نواز شریف کے احتساب کمیشن کو قومی احتساب بیورو (نیب) کا نام دے دیا(۲۰)۔اس ادارے کو لیفٹیننٹ جنرل سید محمد امجد کی چیئر مین شپ میں سونپا گیا اور اسے ٹاسک دیا گیا کہ وہ کرپٹ سیاستدانوں، بیوروکریٹوں اور بزنس مینوں کے خلاف انکوائریاں شروع کرے۔اس کی بند کمروں والی عدالتوں اور صرف مخالف سیاستدانوں کے خلاف کرپشن کیسز کی سیریز شروع کرنے کے عمل نے ادارے کی ساکھ شروع میں ہی تباہ کردی۔قابل ذکر بات یہ ہے کہ جو سیاستدان کرپشن میں مشہور و معروف تھے لیکن جنہوں نے اپنی وابستگیاں فوجی حکومت کے ساتھ قائم کرلی تھیں کے خلاف کوئی انکوائری نہیں ہوئی۔عام طور پر یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ مشرف کی وفادار قاف لیگ کی تخلیق نیب کے دفتروں کے اندر عمل میں لائی گئی تھی(۲۱)۔دوسری جانب عدالتی کیسوں میں الجھائے جانے کے خوف نے انتخابات کے بعد پیپلز پارٹی کے ۲۰ منتخب ارکان کو اپنی پارٹی سے بغاوت کرتے ہوئے پیپلز پارٹی پیٹریاٹ کے نام سے ایک دھڑا بنا کر مشرف کے سائے میں پناہ لینا پڑی۔۲۰۰۲ کے انتخابات کے بعد بننے والی قومی اسمبلی میں مشرف کے وفاداروں کو اکثریت دلانے کے سلسلے میں مسلم لیگ قاف کے ساتھ الائنس بہت زیادہ اہمیت کا حامل تھا۔جہاں تک نیب کی شفافیت کا معاملہ ہے اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اپنے پہلے چار سالوں کے دوران اس نے ۵۲۲ لوگوں کو پراسیکیوٹ کیا جن میں سے صرف آٹھ افراد کا تعلق مسلح افواج سے تھا(۲۲)۔

مشرف نے سیاسی سرگرمیوں پر صرف نیب کے ذریعے پابندی نہیں لگائی بلکہ اس کیلئے ریاست کے خلاف بغاوت کے قوانین اور ایم پی او آرڈی ننس کا بے دریغ استعمال بھی کیا گیا۔۱۵ مارچ ۲۰۰۰ کو جاری ہونے والے ایک حکم نامے کے ذریعے فریڈم آف ایسوسی ایشن کو غصب کرلیا گیا۔اس حکم نامے کے تحت پبلک ریلیوں اور جلسے جلوسوں، مظاہرے کرنے اور ہڑتال کرنے پر پابندی عائد کردی گئی۔سیاسی سرگرمیوں پر

پابندی اکتوبر ۲۰۰۲ میں ہونے والے انتخابات سے کچھ ہی دیر پہلے اٹھائی گئی۔حتیٰ کہ انتخابات کے دوران بھی جلسے اور جلوس پابندی کی زد میں رہے۔جب ۲۰۰۷ میں مشرف حکومت شدید ترین مسائل میں گھر گئی تو پابندیوں کا ایک اور دور شروع ہوگیا۔۳ نومبر ۲۰۰۷ کو مشرف نے عجلت میں جاری کیے جانے والے ایک حکم نامے کے ذریعے ملک میں ایمرجنسی لگادی۔اس ایمرجنسی کا خاتمہ نئے انتخابات کی کیمپین چلانے کی مدت شروع ہونے سے صرف ایک دن پہلے ۱۵ دسمبر کو ہوا۔بعدازاں بے نظیر بھٹو کے قتل کے بعد ان انتخابات کو فروری ۲۰۰۸ تک ملتوی کردیا گیا۔

مقامی حکومتوں کی اصلاحات کیلئے مشرف حکومت نے ریٹائرڈ لیفٹیننٹ جنرل تنویر نقوی کی سربراہی میں نیشنل ری کنسیلیشن بیورو قائم کیا۔اس ادارے کے تحت وضع کردہ مقامی حکومتوں کے نظام میں بیوروکریسی اور صوبائی سیاستدانوں کی قیمت پر ضلعی سطح پر منتخب ضلعی ناظم کو بہت زیادہ اختیارات سے سرفراز کردیا گیا۔قابل ذکر بات یہ ہے کہ مقامی حکومتوں کے انتخابات کرانے کیلئے ضیاء الحق کے پرانے غیر جماعتی سٹائل کو اپنایا گیا۔ضلعی ناظم اس نظام کے تحت اس حد تک خود مختار تھے کہ وہ اپنے ضلع کو وصول ہونے والی گرانٹس کو بغیر حساب کتاب کے بے مہار انداز میں استعمال کرنے کیلئے آزاد تھے اس سلسلے میں بیوروکریسی اور صوبائی اسمبلی کے ارکان کو بھی بائی پاس کردیا گیا۔لیکن یہ ضلع ناظم بھی مشرف کو قوت فراہم کرنے میں اسی طرح ناکام ثابت ہوئے جس طرح ایوب خان کی بنیادی جمہوریت کے ارکان ثابت ہوئے تھے۔کچھ ناظمین نے دولت کمانے کے اس سنہری موقع سے خوب فائدہ اٹھایا اور اس قدر دولت سمیٹ لی کہ وہ صوبائی سطح کی سیاست میں حصہ لے سکیں۔مقامی حکومتوں کے نظام کے تحت ہونے والی ریفارمز نے بالادستی کی مسائل کو حل کرنے کی سیاست کی بجائے بالادستی کی سیاست کو مزید آگے بڑھایا۔

ان اصلاحات نے انتظامی اہلیت میں کوئی اضافہ نہیں کیا۔اس کے برعکس بیوروکریسی کی کمزوری اور ۲۰۰۲ کے آرڈی ننس میں تجویز کردہ پولیس ریفارمز کے ذریعے اصلاح احوال میں ناکامی نے گورننس کے انحطاط میں مزید اضافہ کردیا۔یہ انحطاط

خدمات کی فراہمی میں نااہلی اور ریاست کی جانب سے قانون کی حکمرانی قائم کرنے سے معذوری کے ذریعے نمایاں طور پر دیکھا جاسکتا تھا۔۲۰۰۷ میں شائع ہونے والی ٹرانسپیرنسی انٹرنیشنل کی رپورٹ میں انکشاف کیا گیا تھا کہ ساڑھے تین لاکھ نفوس پر مشتمل پولیس فورس پاکستان کے تمام سرکاری اداروں میں سے کرپٹ ترین ادارہ ہے(۲۳)۔ایلن کروگر اور جیتا ملی کووا جیسے مصنفین نے بیان کیا ہے کہ پاکستان میں دہشت گردی کی فصل اگانے کے سلسلے میں غربت سے کہیں زیادہ احساس محرومی اور فرسٹریشن کے عوامل کارفرما تھے(۲۴)۔

مقامی حکومتوں کے نظام کے تحت سیاست کو مقامیت تک محدود اور انتظامیہ کو مزید سیاست زدہ کردیا گیا۔صوبائی سطح پر غیر سیاسی ہونے کی وجہ سے برادریوں اور قبیلوں کے حوالے سے سیاست کی شناخت متعین ہوئی اور مقامی سیاست میں بالادستی کی پرانی سیاست زندہ ہوگئی۔یہ وہی عمل ہے جو ضیاء الحق نے اپنے دور میں کیا تھا۔جلدی ہی تھانہ کچہری سٹائل کی سیاست نے نچلی سطح سے اٹھ کر قومی سطح کو بھی اپنے رنگ میں رنگنا شروع کردیا۔اس کے ساتھ ہی مقامی انتظامیہ ماضی کی نسبت کہیں زیادہ سیاست کی باندی بن کر رہ گئی۔اس کی وجہ سے حکومت کی کارکردگی بہت نچلی سطح پر آگئی۔بجائے اس کے کہ مشرف کمزور اداروں کو مضبوط بنانے کی جانب توجہ دیتا اس نے اپنی پالیسیوں کی وجہ سے پاکستان کو اداروں کا قبرستان بنادیا(۲۵)۔سب سے خطرناک بات یہ ہوئی کہ مشرف دور میں حکومت کی رٹ سکڑنا شروع ہوگئی۔حکومت کی رسائی ناصرف پہلے سے نیم آزاد فاٹا میں ختم ہوئی بلکہ قبائلی علاقوں سے متصل شمال مغربی سرحدی صوبے اور جنوبی پنجاب کے اکثر علاقوں میں بھی حکومت کے کنٹرول میں بہت زیادہ کمی واقع ہوگئی۔اس وجہ سے عسکریت پسندوں کو اپنی کارروائیوں میں بہت سہولت حاصل ہوگئی جنہیں ماضی میں ریاست کی سرپرستی حاصل ہوتی تھی لیکن وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ وہ ریاست کے اثر سے آزاد ہوتے چلے گئے اور مشرف کے دور میں وہ کھل کر ریاست کے مقابل آگئے۔

اپنے پیشروؤں ایوب اور ضیاء الحق کی طرح مشرف بھی اپنی حکومت کیلئے

قانونی جواز تراشنے میں ناکام رہا تھا۔اس کی پاور بیس بیلٹ بکس کی بجائے بدستور فوج ہی رہی۔جب اس نے کسی طرح کی مقبول جوازیت پیدا کرنے کی کوشش کی تو اس کے نتیجے میں کئی اور مسائل پیدا ہوگئے۔جون ۲۰۰۲ میں اس نے خود کو قانونی جواز فراہم کرنے کیلئے ریفرنڈم کا ڈول ڈالا لیکن یہ اسی طرح کا دھاندلی زدہ اور جعلی ریفرنڈم تھا جیسا ضیاء الحق نے ۱۹۸۴ میں منعقد کرایا تھا۔اس ریفرنڈم میں دھوکہ دہی کا عنصر اس قدر واضح تھا کہ بعد میں مشرف کو اس سرکاری مداخلت پر معافی مانگنا پڑی جس کی وجہ سے ریفرنڈم کا نتیجہ ۹۸ فیصد تک ظاہر کیا گیا تھا۔اپوزیشن جماعتوں کا خیال ہے کہ اس ریفرنڈم میں پڑنے والے ووٹوں کی شرح کسی صورت میں پانچ فیصد سے زیادہ نہیں تھی جبکہ سرکاری طور پر اس کے نتائج ۷۰ فیصد ظاہر کیے گئے تھے۔اس صورتحال کو نیو یارک ٹائم نے ان الفاظ میں سمودیا تھا کہ ’’ریفرنڈم نے درحقیقت مشرف کے قد کاٹھ کو گھٹادیا ہے‘‘(۲۶)۔مشرف کے بعض اچھے اقدامات بھی اس کے دور میں ہونے والی بے قاعدگیوں کی گرد میں کھو گئے تھے۔ان اقدامات میں منتخب اداروں میں خواتین کی سیٹوں میں ۳۳ فیصد تک اضافہ، ووٹ دینے کی عمر اٹھارہ سال تک مقرر کرنا اور قومی وصوبائی اسمبلیوں کے ارکان کیلئے بی اے کی ڈگری کو لازمی قرار دینا شامل تھے۔تاہم سب سے زیادہ دور رس اثرات کی حامل اصلاحات نے جداگانہ انتخاب کے فرسودہ طریقے کو ختم کرکے ملک کی اقلیتوں کو سیاست کے مرکزی دھارے میں لایا گیا۔

اکتوبر ۲۰۰۲ میں ہونے والے انتخابات بھی اسی طرح ریاستی کنٹرول کے تحت ہوئے جیسے ریفرنڈم کا انعقاد کیا گیا تھا۔۲۸ جون کو منظور کیے جانے والے سیاسی جماعتوں کے ترمیمی ایکٹ جس میں سیاسی جماعتوں کی انتخابی اہلیت کو طے کیا گیا تھا، ملک کو واپس ضیاء دور میں لے جانے کا باعث بنا۔اس کے اگلے مہینوں میں ایک اور صدارتی آرڈی نینس جاری کیا گیا جس کے تحت وزیراعظم کے عہدے پر انتخاب کو دوٹرمز تک محدود کردیا گیا۔جس کے نتیجے میں بےنظیر اور نواز شریف خود بخود وزارت عظمیٰ کیلئے نااہل قرار پاگئے۔اس نے ان دونوں مقبول لیڈروں کو ۲۰۰۲ کے انتخابات

کے موقع پر پاکستان آنے کی اجازت دینے سے بھی انکار کر دیا۔ مشرف نے خود کو سیاسی اپوزیشن کے مقابلے میں زیادہ مضبوط بنانے کیلئے لیگل فریم ورک آرڈر (ایل ایف او) کا اجراء بھی کیا جس کے تحت نیشنل سیکورٹی کونسل تشکیل دی گئی اور وزیر اعظم کی برطرفی کا اختیار صدر کو دوبارہ تفویض کر دیا گیا۔

اس کے ساتھ ہی مشرف نے اپنے حقیقی اپوزیشن کو کھڈے لائن لگانے کیلئے مذہبی پارٹیوں اور پنجاب کی حکمران اشرافیہ کے موقع پرست عناصر کے ساتھ گٹھ جوڑ کر لیا۔ ۲۰۰۲ کے انتخابات میں صوبہ سرحد میں مذہبی پارٹیوں کی حیران کن کامیابی جس کے مطابق انہوں نے ۴۵ فیصد ووٹ حاصل کیے تھے اور قومی اسمبلی کی ۲۹ سیٹیں حاصل کی تھیں جہاں ایک جانب مشرف حکومت کی جانب سے دکھائی جانے والی ''ہاتھ کی صفائی'' کا نتیجہ تھا تو دوسری جانب یہ افغانستان میں امریکہ کی مداخلت کے عوامی سطح پر پائے جانے والے ردعمل کا بھی اظہار تھا۔ یہاں پر یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ ماضی میں ہونے والے کسی بھی الیکشن میں مذہبی پارٹیوں نے پانچ فیصد سے زیادہ ووٹ حاصل نہیں کیے تھے۔ چھ پارٹیوں پر مشتمل ایم ایم اے کو مرکزی پارٹیوں کو نیوٹرلائز کیے جانے کا فائدہ بھی پہنچا اور اس تاثر نے بھی اس کی قوت میں اضافہ کیا کہ انہیں فوجی اسٹیبلشمنٹ کی پشت پناہی حاصل ہے۔ حکومت اور اسٹیبلشمنٹ کی پشت پناہی کو اس حوالے سے بھی دیکھا جا سکتا ہے کہ ایم ایم اے کے امیدواروں کی ڈگریوں کے معاملے میں بھی حکومت نے نظریں چرائی تھیں۔ حکومت کی سیاسی فیاضی سے مستفید ہونے والوں میں دوسری بڑی جماعت ''کنگز پارٹی'' مسلم لیگ (ق) تھی جس نے قومی اسمبلی کی ۷۷ سیٹوں پر کامیابی حاصل کیا اور اسمبلی میں سب سے بڑی پارٹی بن کر سامنے آئی۔ اس پارٹی میں زیادہ تر مسلم لیگ نواز کے پرو اسٹیبلشمنٹ عناصر شامل تھے۔

اسمبلی میں ہارس ٹریڈنگ کے بعد مسلم لیگ (ق) نے بلوچ سیاست دان میر ظفر اللہ جمالی کی قیادت میں حکومت تشکیل دی۔ وہ اسی طرح مشرف کی کٹھ پتلی تھا جس طرح محمد خان جونیجو اپنی وزارت عظمیٰ کے ابتدائی دنوں میں ضیاء الحق کی کٹھ پتلی ہوا کرتا تھا۔ آگے چل کر چودھری شجاعت حسین کی تین ماہ کی عبوری وزارت عظمیٰ کے بعد میر ظفر

اللہ جمالی کی جگہ شوکت عزیز نے لے لی جو سٹی بنک کا سابق ایگزیکٹو تھا۔ شوکت عزیز کی سیاسی حیثیت اس سے کہیں کم تھی، سیاست دان کی بجائے وہ ایک ٹیکنو کریٹ تھا اور اس قسم کا ٹیکنو کریٹ تھا جنہیں ایوب دور سے فوجی حکومتیں سینے سے لگاتی آئی ہیں۔ اس نے پاکستان کے وزیر اعظم کی حیثیت سے حلف اٹھاتے ہی لوگوں کو گڈ گورننس کی فراہمی کیلئے صدر مشرف سے رہنمائی لینے کا اظہار کر دیا (۲۷)۔

مشرف نے مسلم لیگ قاف پر اپنا سخت کنٹرول قائم کر لیا تاہم اس نے اس پارٹی میں شمولیت اختیار نہیں کی جیسا کہ ایوب خان نے اپنی بنائی ہوئی کنونشن مسلم لیگ میں کی تھی۔ مشرف اپنی نوساختہ پارٹی کے اندرونی جھگڑوں کی ثالثی کرتا اور ایم کیو ایم جیسے حکومتی اتحادیوں کے ساتھ اس کے معاملات طے کرانے میں کردار ادا کرتا تھا۔ مشرف کی اس اپروچ نے عائشہ صدیقہ کے الفاظ میں ''مشرف کے دعوؤں کے برعکس جمہوری اداروں کو مضبوط کرنے کی بجائے سرپرستی کی سیاست (Clientelism) کو فروغ دیا'' (۲۸)۔ اس صورتحال کا ناگزیر نتیجہ مسلم لیگ قاف میں دھڑے بندی کی سیاست کا پیدا ہونا تھا۔ اس پارٹی میں جو گروپ مشرف کے زیادہ قریب تھا وہی طاقتور تھا۔ یوں سب سے زیادہ طاقتور دھڑا چودھری شجاعت حسین اور پرویز الٰہی کا تھا جس کے گرد جاگیرداری اور برادری کے تعلقات کا مضبوط تانا بانا قائم تھا۔ عملی طور پر مسلم لیگ کی کمزور پوزیشن کا انکشاف ۲۰۰۸ کے انتخابات میں ہوا۔ مشرف کی سرپرستی کی عدم موجودگی کے باعث مسلم لیگ قاف کی سپورٹ مسلم لیگ (ن) اور پیپلز پارٹی کے دوبارہ ظہور کے نتیجے میں بہت حد تک تحلیل ہوگئی۔

مسلم لیگ قاف سے کہیں زیادہ ایم ایم اے مشرف کیلئے مشکل پارٹنر ثابت ہوئی۔ خاص طور پر اس میں شامل جماعت اسلامی مشرف کے بطور آرمی چیف برقرار رہنے اور دو عہدوں پر چپٹے رہنے کی سخت ناقد تھی۔ جماعت اسلامی کو حکومت کی امریکہ نواز پالیسیوں پر بھی شدید اعتراضات تھے۔ بالآخر لال مسجد آپریشن کے بعد جماعت اسلامی نے ایم ایم اے میں اپنی حلیف مذہبی جماعت جے یو آئی (ف) اور پرویز مشرف سے فاصلے پیدا کر لیے۔ دوسری جانب ایم ایم اے کی صوبہ سرحد میں حکومت کی

جانب سے اسلامی قوانین کے نفاذ میں ناکامی نے انتہا پسند مذہبی گروپوں کو اس کا مخالف بنا دیا۔ اس کے ساتھ ہی ایم ایم اے حکومت صوبہ سرحد کے عوام کے مسائل کو حل کرنے اور ان کی آرزوؤں کی تکمیل میں بری طرح ناکام ثابت ہوئی۔ اس نے صوبے کی بگڑتی ہوئی معاشی حالات کے سدھار میں زیادہ دلچسپی لی نہ اس سلسلے میں اہلیت کا مظاہرہ کیا۔ ایم ایم اے کی حکومت کی ایک بڑی ناکامی سوات میں تحریک نفاذ شریعت محمدی کی بڑھتی ہوئی سرگرمیوں کی روک تھام کے سلسلے میں تھی۔ حکومت کی جانب سے عدم فعالیت کے مظاہرے نے خود ساختہ شریعت کے ان علمبرداروں کو سوات اور ملاکنڈ ایجنسی میں اپنے پاؤں جمانے کا موقع فراہم کر دیا۔ صوبے کے معاملات پر نگاہ رکھنا ایم ایم اے حکومت کی ذمہ داری تھی لیکن اس نے صوبے میں پلتی ہوئی مختلف قسم کی شورشوں کو دبانے کے سلسلے میں کوئی اقدام نہیں کیا۔

ہم پہلے بات کر چکے ہیں کہ فوجی حکومتوں نے نا صرف پاکستان کے سیاسی اداروں کی تنظیم سازی کے عمل کو کمزور کیا بلکہ سول سوسائٹی کی ان اداروں کو مضبوط کرنے کی صلاحیت پر بھی کاری ضرب لگائی تھی۔ مشرف اس حوالے سے ایوب اور ضیاء الحق سے مختلف تھا۔ اس نے نومبر ۲۰۰۷ کو لگائی جانے والی ایمرجنسی کے سوا کبھی میڈیا پر کریک ڈاؤن کیا نہ سول سوسائٹی کی تنظیموں کو ختم کرنے کی کوشش کی (۲۹)۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ مشرف کے لبرل ازم کا سب سے بڑا کارنامہ کہ اس نے وکلاء جیسے سول سوسائٹی کے اداروں کو آزادانہ کام کرنے کا موقع فراہم کیا خود اس کی حکومت کیلئے پھانسی کا پھندہ بن گیا۔

ریاست اور مرکز کے تعلقات

فوج کی پشت پناہی کی حامل حکومت نے ایک مرتبہ پھر پرانے ''پنجابائزیشن'' کے عمل کو شروع کر دیا۔ مشرف ڈیولوشن کے حوالے سے اپنے بلند و بالا نعروں کے باوجود مرکزیت کا اسی طرح حامی تھا جیسے ماضی کی حکومتیں تھیں۔ بلاشبہ مقامی حکومتوں کے نتیجے میں پیدا ہونے والی سیاست کی لوکلائزیشن نے جیسا کہ محمد وسیم نے نشاندہی کی

ہے ''بے مہار مرکزیت کو بڑھاوا دیا تھا'' (۳۰)۔ تاہم باوجود اس امر کے کہ وہ سیاسی جواز سے محروم تھا اس کے باوجود مشرف دور نے انتہائی حدود میں جا کر مرکزیت کی حامل انتظامیہ کے ہوتے ہوئے اوپر سے نیچے تک معاشرے کو جدید خطوط پر استوار کرنے کیلئے اپنا کردار ادا کیا تھا۔ مشرف کی جانب سے قومی مفاد کے دائرے میں رہتے ہوئے بلوچستان کو ترقی دینے کی کوششیں وہاں موجود سخت گیر اپوزیشن کے ہوتے ہوئے کامیاب نہ ہو سکیں۔ اسی طرح مشرف اپنے پیشرو ضیاء الحق کی طرح پاکستان کے سنگین شکل اختیار کرنے والے پانی اور بجلی کی فراہمی کے مسئلے کو کالا باغ کی تعمیر کے ذریعے حل کرنے میں بھی ناکام ثابت ہوا۔

۱۹۸۰ کی دہائی میں ضیاء الحق کے دور میں کالا باغ کے مقام پر ایک بڑے ڈیم کی تعمیر کا منصوبہ بنایا گیا تھا۔ اس منصوبے کے حامیوں کا کہنا تھا کہ اس ڈیم کی تعمیر کے نتیجے میں پیدا ہونے والی ہائیڈرو بجلی (۲۰۰۰ میگاواٹ سے زیادہ بجلی پیدا کرنے کی صلاحیت) کے ذریعے بجلی کی طلب اور رسد میں موجود خلیج کو ختم کیا جا سکتا ہے۔ جبکہ اس کے ساتھ ہی ملک کے دوسرے بڑے مسئلے یعنی پانی کو ذخیرہ کرنے کی صلاحیت میں بھی بہت زیادہ اضافہ ہو سکتا ہے۔ اس ڈیم کی تعمیر کیلئے بین الاقوامی اداروں کی جانب سے وسائل کی فراہمی کے وعدے کے باوجود صوبائی اپوزیشن نے اس کی شدید مخالفت شروع کر دی جس کی وجہ سے اس منصوبے پر کام کو روکنا پڑا۔ اس منصوبے کی سب سے شدید مخالفت صوبہ سندھ کی جانب سے ہوئی جہاں یہ خیال کیا جا رہا تھا کہ اس ڈیم کی تعمیر کے نتیجے میں سندھ کے زیریں علاقوں میں دریائے سندھ کے پانی کی فراہمی میں بہت زیادہ کمی ہو جائے گی اور وہاں کی زرخیز زمین ریگستان میں بدل جائے گی۔ سندھی اپوزیشن کا مزید کہنا تھا کہ دریائے سندھ کے بہاؤ میں کمی واقع ہونے کی وجہ سے سمندر کا پانی اندر تک آ جائے گا جس کے نتیجے میں سندھ کی سرزمین شدید سیلابوں کی لپیٹ میں آ جائے گی اور مینگروو کے جنگلات تباہ ہو جائیں گے۔ سندھ کے بعد دوسری بڑی مخالفت صوبہ سرحد سے آئی جہاں قوم پرست سیاستدانوں نے دعویٰ پیش کیا کہ کالا باغ ڈیم کی تعمیر کے بعد ضلع نوشہرہ کا بہت بڑا علاقہ پانی میں ڈوب جائے گا اور اس کے ساتھ ہی وہاں

سیم اور تھور میں بھی بہت زیادہ اضافہ ہو جائے گا۔ گو کہ ماہرین نے تجویز پیش کی کہ ان خدشات کو دور کرنے کیلئے ڈیم کی بلندی کو کم کیا جاسکتا ہے لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ کالا باغ ڈیم کی تعمیر کی شدید مخالفت کی اصل وجہ چھوٹے صوبوں کا پنجاب پر عدم اعتماد تھا۔ پنجاب کو اس ڈیم کی تعمیر سے سب سے بڑا Beneficiary قرار دیتے ہوئے الزام لگایا گیا کہ وہ دوسرے صوبوں کی قیمت پر اپنے مفادات کو حاصل کرنا چاہتا ہے۔ پنجاب اور مرکز کی طرف سے قومی مفاد کو صوبائی مفاد پر مقدم رکھنے کی اپیلوں کا بہرے کانوں پر کوئی اثر نہ ہوا۔

مشرف نے دسمبر ۲۰۰۵ میں کالا باغ ڈیم کا اعلان کر کے اس انجماد کو توڑنے کی کوشش کی۔ وہ یقیناً ملک کو اس آسانی کے ساتھ چلانے کا اہل نہیں تھا جس آسانی سے وہ فوج کو چلا سکتا تھا۔ اس اعلان پر سندھ اور صوبہ سرحد میں پیدا ہونے والے شدید ردعمل نے اسے چھ ماہ بعد ہی اپنی تجویز کو ترک کرنے پر مجبور کر دیا۔ کالا باغ ڈیم پر ایک الگ قسم کی سیاست کی جارہی تھی تاہم پانی کی فراہمی اور بجلی کی پیداوار کا مسئلہ جوں کا توں موجود تھا۔ یہ کوئی حیران کن بات نہیں ہے کہ ۲۰۰۸ کے بعد مرکز میں آنے والی زرداری کی پیپلز پارٹی کی حکومت نے اپنے سندھی سپورٹروں کو خوش کرنے کیلئے اس مسئلے کو چھیڑنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ تاہم ۲۰۱۰ میں آنے والے تباہ کن سیلاب نے ایک بار پھر ملک میں پانی کی مینجمنٹ کی شدید ضرورت کا احساس دلایا۔ ملک میں پانی کو ذخیرہ کرنے کا مسئلہ اس قدر سنگین صورت اختیار کر چکا ہے کہ ماضی میں اس کی توقع نہیں کی جارہی تھی۔ زرداری دور کے وزیر اعظم یوسف رضا گیلانی کا یہ بیان ریکارڈ پر ہے کہ ۲۰۱۰ کے سیلاب کی تباہ کاریوں سے بچا جاسکتا تھا اگر کالا باغ ڈیم تعمیر کر لیا جاتا۔ کالا باغ ڈیم کے منصوبے کو اگر بھلا دیا جائے جس کی تعمیر میں سب سے کم مدت یعنی چھ سال درکار ہیں تب بھی اعتماد کے فقدان نے حتیٰ کہ چھوٹے ڈیموں کی تعمیر کی فوری ضرورت کے راستے میں بھی رکاوٹیں کھڑی کرنے کا سلسلہ شروع کر رکھا ہے۔

بلوچستان میں بغاوت

مشرف کے دور میں ایک بڑے تعمیراتی منصوبے پر عمل ضرور تکمیل پذیر ہوا یعنی گوادر پورٹ۔ تاہم اس منصوبے نے بھی مرکز اور صوبے کے درمیان تناؤ میں اضافہ کر دیا۔ بلاشبہ یہ منصوبہ ان عوامل میں سے ایک ہے جو بلوچستان میں آزادی کے بعد سے بغاوت کے تیسرے راؤنڈ کا باعث بنے۔ فوج کی حمایت یافتہ حکومت کی جانب سے قومی مفاد کے نام پر بلوچستان کی ترقی کیلئے کی جانے والی کوششوں نے صوبے کی نوآبادیاتی حیثیت کے دیرینہ احساس کو تقویت بخشی۔ نائن الیون کے بعد کے منظر نامے میں بلوچستان میں مزید فوجی چھاؤنیوں کی تعمیر کو وہاں پنجاب کی حمایت یافتہ قابض قوت کی جانب سے بلوچستان پر قبضے کی کوششوں کے طور پر لیا گیا۔ مشرف کی جانب سے بلوچستان میں مذہبی پارٹیوں کی سرپرستی نے بھی بلوچستان میں مارجنلائزیشن کے جذبات کو ہوا دی۔ ان حالات میں بلوچستان کے علیحدگی پسند عناصر نے وہاں عسکریت پسندی کے ایک نئے دور کی ابتدا کر دی (۳۱)۔ مشرف بلوچ سرداروں کی بہت کم عزت کرتا تھا۔ اس کے خیال میں یہ لوگ صوبے میں شروع ہونے والے کسی بھی ترقیاتی منصوبے کی اس لیے مخالفت کرتے ہیں کہ اس کے نتیجے میں انہیں اپنی حاکمیت اور طاقت کے کمزور پڑنے کا خدشہ لاحق ہوتا ہے۔ یوں ان بلوچ سرداروں کے دعوے کہ وہ بلوچ حقوق اور بلوچستان کے مفادات کے نگہبان ہیں منافقت کے سوا کچھ نہیں۔ بھارت کی جانب سے بلوچستان میں علیحدگی پسندی کو ہوا دینے کی مبینہ کوششیں بھی حکومت کی جانب سے وہاں سخت گیر رویئے اپنانے اور صوبے میں شروع کیے جانے والے ترقیاتی منصوبوں میں بلوچ سرداروں کی مشاورت کو شامل نہ کرنے کا باعث تھیں۔

پاکستانی حکومت نے گوادر پورٹ کی تعمیر ساتھ بہت زیادہ سٹریٹجک اور معاشی اہمیت کو وابستہ کر دیا تھا۔ بحیرہ عرب کے دہانے پر واقع یہ گہرے پانیوں کی بندرگاہ پاکستان نیوی کو سٹریٹجک گہرائی فراہم کرتی ہے (یہ کراچی کی نسبت بھارت سے ۴۵۰

کلومیٹر مزید دوری پر واقع ہے)۔تعمیر کے بعد گوادر پورٹ ۲۰۰۸ میں فعال ہوئی تھی اور اس وقت اس کا انتظام سنگا پور کی ایک کمپنی کے حوالے کیا گیا تھا۔اس پورٹ کی تعمیر کا معاشی ہدف پاکستان کو تجارت کا ٹرانزٹ مرکز بنانا ہے خاص طور پر وسطی ایشیا سے تیل کی تجارت اور چین کے تیزی سے ترقی کرنے والے صوبے زنگ جیانگ کے حوالے سے۔بلوچ قوم پرستوں کا یہ خوف لاحق ہے کہ اس بندرگاہ کیلئے حاصل کیے جانے والے معاشی فوائد کو دوسرے صوبوں کی خوشحالی کیلئے استعمال کیا جائے گا۔وہ اس بندرگاہ پر تعمیراتی سرگرمیوں کے حوالے سے ملازمتوں کی تلاش میں آنے والی غیر بلوچ افرادی قوت کی وجہ سے بھی اپنے خدشات کا اظہار کرتے ہیں۔ان کی ایک اور شکایت یہ ہے کہ اس بندرگاہ کی تعمیر کیلئے بلوچوں سے سستے داموں اراضی خرید کر دوسرے صوبوں سے تعلق رکھنے والے دولت مند لوگوں کو مہنگے داموں بیچی جارہی ہے۔۳ مارچ ۲۰۰۴ کو گوادر پورٹ پر کام کرنے والے تین چینی انجینئروں کو ایک ریموٹ کنٹرول کار بم دھماکے میں ہلاک کر دیا گیا تھا۔دہشت گردی کے اس واقعے کی ذمہ داری بلوچ لبریشن آرمی نامی ایک علیحدگی پسند تنظیم نے قبول کی تھی (۳۲)۔یہ تنظیم ۲۰۰۰ سے مختلف قسم کی دہشت گردی کی کارروائیوں میں ملوث چلی آرہی ہے۔اس کی جڑیں ۷۷-۱۹۷۳ کے دوران جاری رہنے والی مسلح بغاوت میں تلاش کی جاسکتی ہیں جب اسے سوویت یونین کی جانب سے فنڈز فراہم کیے جاتے تھے۔کچھ تجزیہ کاروں کا خیال ہے کہ اس کے دوبارہ متحرک ہونے کے پیچھے بھارت کا ہاتھ ہے جو گوادر میں چین کے سٹریٹجک مفادات سے خوفزدہ ہے (۳۳)۔

۲۰۰۵ تک تشدد کی کارروائیوں میں بے پناہ اضافہ ہو چکا تھا اور یہ گوادر سے پھیل کر ڈیرہ بگٹی کے قبائلی علاقے کو اپنی لپیٹ میں لے چکی تھیں۔بگتی قبیلے کا یہ علاقہ قدرتی وسائل کے حوالے سے نہایت دولت مند ہے اور پورے ملک کی قدرتی گیس کی ایک تہائی ضروریات کو پورا کرتا ہے۔یہاں کے مطلق العنان سردار اکبر بگتی کو روایتی طور پر اسلام آباد کا وفادار سمجھا جاتا رہا ہے یہی وجہ ہے کہ بگٹیوں نے ۱۹۷۳ کے فوجی آپریشن کے دوران خود کا لاتعلق رکھا تھا۔بگتی سردار اکبر بگتی ۱۹۸۸ میں بلوچستان کے وزیر اعلیٰ

بنے تھے۔بعد میں انہوں نے اپنی پارٹی جمہوری وطن پارٹی کی بنیاد رکھی تھی جس کی طاقت بگتی قبیلے تک محدود تھی۔بگتی علاقے میں ایک فوجی افسر کی جانب سے ڈاکٹر شازیہ خالد کے ساتھ جنسی زیادتی کا مشہور واقعہ بگتیوں اور پاکستانی ریاست کے درمیان تنازعہ کا فوری باعث بنا تھا۔ڈاکٹر شازیہ خالد پر ۲ جنوری ۲۰۰۵ کو ایک فوجی افسر کی جانب سے جنسی زیادتی کا نشانہ بنایا گیا تھا۔یہ واقعہ سوئی کے مقام پر واقع پاکستان پیٹرولیم پلانٹ میں پیش آیا تھا جہاں ڈاکٹر شازیہ خالد سرکاری فرائض کے سلسلے میں قیام پذیر تھی۔نواب اکبر بگٹی نے اس واقعے کو بلوچ غیرت پر حملہ قرار دیا تھا کیونکہ شازیہ خالد بگتی قبیلے کی ''محفوظ مہمان'' تھی۔مشرف کی فوجی حکومت نے اپنے افسر کو بچانے کیلئے اس واقعہ کو دبانے کی کوشش کی تھی جس پر بگتیوں نے شدید اظہار ناراضی کیا۔کشیدگی جب اپنی انتہا کو پہنچی تو بگتی قبائلیوں نے گیس کی پائپ لائنز پر حملے شروع کر دیئے۔جب فوج نے معاملات کو افہام و تفہیم کے ساتھ حل کرنے کی بجائے بگتیوں پر لشکر کشی کرنے کا فیصلہ کیا تو نواب اکبر بگتی اپنی رہائش گاہ ڈیرہ بگتی کو چھوڑ کر پہاڑوں میں مقیم ہو گئے۔پاکستانی حکام کے مطابق وہ بھمبور کی پہاڑیوں میں پناہ گزین ہو کر وہاں سے بگتی عسکریت پسندوں کو ہدایات جاری کرتے تھے۔ایک سیٹلائٹ فون کال کے ذریعے پتا چلایا گیا کہ وہ کوہلو کے قریب ترتانی کے ایک پہاڑی غار میں روپوش ہیں جس کے بعد بمباری کر کے انہیں غار کے اندر ہی ہلاک کر دیا گیا۔بگتی نے ۲۶ اگست ۲۰۰۶ کو بلوچ کاز کے ہیرو کی حیثیت سے بلوچ شہید کا رتبہ حاصل کیا۔اس بہیمانہ کارروائی میں ان کے ساتھ دیگر ۳۸ افراد بھی اپنی جانوں سے گئے تھے۔اس وقت تک بغاوت کے شعلے بگتیوں سے پھیل کر ان کے حریف مری قبیلے تک جا پہنچے تھے۔جلد ہی مری قبائل کا علاقہ مسلح کارروائیوں کا مرکز بن گیا جس کے فوری بعد ۱۴ دسمبر ۲۰۰۵ کو کوہلو کے قریب ایف سی کی چیک پوسٹ پر ایک راکٹ داغا گیا۔اس وقت اس مقام پر پرویز مشرف بھی ایک جلسہ کے سلسلے میں موجود تھا۔اس کے بغیر ایف سی کے آئی جی شجاعت ضمیر کے ہیلی کاپٹر پر فائرنگ کی گئی۔تین دن کے بعد کوہلو اور اس سے متصل علاقوں پر بمباری کی گئی۔اس دوران مری قبیلے نے اپنے دیرینہ حریف بگتی قبیلے کے ساتھ اپنے

تنازعات طے کر لیے تاکہ ایک مشترکہ کاز کیلئے مل کر جدوجہد کی جا سکے۔

بلوچستان لبریشن آرمی (بی ایل اے) میں بھرتی کیلئے زیادہ تر مری قبیلے نے اپنے جنگجو فراہم کیے تھے ۳۴ جنہوں نے سیکورٹی فورسز، گیس پائپ لائنز، بجلی کے کھمبوں اور ریلوے ٹریکس کو دہشت گردی کی کارروائیوں کا نشانہ بنانا شروع کیا۔یکم مئی ۲۰۰۶ کو بی ایل اے نے کوئٹہ کی مرکزی ریلوے لائن پر کوہلو کے مقام پر ایک ریلوے اسٹیشن کو بم مار کر تباہ کرنے کی ذمہ داری قبول کی تھی۔اسی ماہ پرویز مشرف نے اس تنظیم کو دہشت گرد قرار دے کر اس کی سرگرمیوں پر پابندی لگا دی۔۲۰۰۶ میں بلوچستان کے اندر دہشت گردی کی ۲۷۷ کارروائیاں ہوئیں جن میں ۸۲ ایف سی کے جوانوں اور ۱۴۷ باغیوں سمیت ۴۵۰ افراد جاں بحق ہوئے تھے (۳۵)۔دہشت گردی کی کارروائیوں کا سلسلہ ۲۰۰۷ میں بھی جاری رہا۔اس حوالے سے مئی میں کئی ایک ریلوے لائنوں کو تباہ کیا گیا نیز بلوچستان اور ملک کے باقی حصوں کے درمیان کمیونیکیشن کے ذرائع کو نقصان پہنچایا گیا۔اس دوران بلوچستان میں پنجابی آباد کاروں کی ٹارگٹ کلنگ کا سلسلہ بھی جاری رہا۔چونکہ بلوچستان میں بھڑکنے والے بغاوت کے شعلوں کا ''دہشت گردی کے خلاف جنگ'' کے ساتھ کوئی تعلق نہیں تھا لہٰذا یہاں ہونے والے کارروائیوں کو بین الاقوامی رائے عامہ کی وہ توجہ حاصل نہ ہو سکی جو فاٹا کو نصیب ہوتی ہے۔بلوچستان وہ خطہ ہے جو مستقبل میں پاکستان کی ترقی کے سلسلے میں بے پناہ سٹریٹجک اور معاشی اہمیت کا حامل ہے۔

ریاست اور اسلام

مشرف نے پاکستان کو ایک ماڈریٹ اسلامی ریاست کے طور پر پیش کیا تھا جو انتشار زدہ مغربی ایشیا میں استحکام اور امن کے فروغ کا ذریعہ ثابت ہو سکتی ہے۔اس نے ملائشیا میں نومبر ۲۰۰۶ میں ہونے والی او آئی سی ملکوں کی سربراہ کانفرنس کے دوران اینلائیٹینڈ ماڈریشن کا تصور پیش کیا تھا۔اس نے مذہبی انتہا پسندی کو کاؤنٹر کرنے کیلئے صوفی اسلام کے پھیلاؤ کی ضرورت پر بھی زور دیا تھا۔نومبر ۲۰۰۶ میں اس نے لاہور

میں ایک پر ہجوم انٹرنیشنل صوفی کونسل کا افتتاح کیا تھا۔اسی حوالے سے تعلیم کے شعبے میں اصلاحات کی گئیں جن کا مقصد مذہبی سکولوں میں جدید نصاب کو رائج کرنا تھا۔منصوبے کے تحت ان مدارس میں غیر مذہبی مضامین پڑھانے والے اساتذہ کیلئے ۵۰ ملین ڈالر کے فنڈز مختص کیے گئے تھے۔تاہم اس کے ساتھ ہی بڑھتا ہوا فرقہ ورانہ تشدد، افغانستان اور بھارت کی جانب سے پاکستانی سرزمین سے کراس بارڈر دہشت گردی کی کارروائیوں کی پے در پے شکایات اور خودکش دھماکوں اور فدائین حملوں کا شدت پکڑتا سلسلہ پاکستان کے اس ''اعتدال پسند روشن خیالی'' کے امیج کا مذاق اڑانے کیلئے کافی ہے۔

عراق جنگ کے بعد پاکستان میں خودکش حملوں کا چلن متعارف کرایا گیا تھا۔اس سلسلے میں سب سے پہلا خودکش حملہ ۸ مئی ۲۰۰۲ کو کراچی کے شیرٹن ہوٹل کے باہر فرانسیسی نیول کے تعمیراتی کارکنوں سے بھری ایک بس پر ہوا تھا جس میں کئی ہلاکتیں ہوئی تھیں۔مشرف دور کے خاتمے تک اس طرح کے واقعات روزمرہ کا معمول بن چکے تھے۔ بین الاقوامی سطح پر پاکستان کا نام دہشت گردی کے لفظ کا مترادف بن چکا تھا۔''ساؤتھ ایشیا ٹیررازم پورٹل'' کے مطابق پاکستان میں تشدد کے واقعات میں ہونے والی ہلاکتوں کی تعداد ۲۰۰۳ میں ۱۸۳ سے بڑھ کر ۲۰۰۷ میں ۳،۵۹۹ تک جا پہنچی تھی (۳۷)۔مشرف نے اپنی حکومت کے جواز کو ایک جانب چھوڑ کر اس صورتحال میں خود کو ایک ایٹمی ریاست کو عدم استحکام سے دوچار کرنے کی کوششوں کیخلاف دیوار چین کے طور پر پیش کرنا شروع کر دیا تھا۔

حکومت کی کوششوں کے نتیجے میں بریلوی مدارس کی ''تنظیم المدارس پاکستان'' کے چیئرمین کی سربراہی میں بہت سے علماء نے ۱۹ مئی ۲۰۰۵ کو ایک فتویٰ جاری کیا تھا جس میں مسلمانوں کی عبادت گاہوں اور بے گناہ عوام پر خودکش حملوں کو حرام قرار دیا گیا تھا۔دوسری جانب دیوبندی علماء نے خودکش حملوں کی مذمت کرنے سے صاف انکار کر دیا تھا۔حکومت کی نااہلیت کا یہ عالم تھا کہ وہ اپنا پورا زور لگا کر بھی بے تحاشہ پھیلے ہوئے ''نفرت انگیز'' لٹریچر کو ختم نہ کرا سکی تھی۔۲۰۰۶ میں وزارت داخلہ کی جانب سے ۹۰ فرقہ ورانہ لٹریچر کی حامل کتابوں پر پابندی لگانا محض اشک شوئی تھی جبکہ معاملہ اس

سے کہیں زیادہ گھمبیر تھا۔مشرف کے پورے دور میں لشکر طیبہ یا مرکز دعوۃ والارشاد کی جانب سے شائع کیے جانے والے جریدوں ''مجلہ الدعوۃ'' اور ''غزوہ'' کی بلا روک ٹوک اشاعت جاری رہی تھی۔ان جریدوں میں جہادی مضامین اور دہشت گردوں کے مسلح حملوں کی تحسین و توصیف کی جاتی اور انہیں گلوری فائی کرکے پیش کیا جاتا تھا(۳۸)۔ان اخبارات اور جرائد سے کہیں زیادہ مہلک وہ زیر گردش سی ڈیز تھیں جن میں نام نہاد امریکی جاسوسوں کے سر قلم کرنے کی فلمیں ہوتی تھیں۔ان سی ڈیز کو مساجد کے باہر بنے بک سٹالز سے آسانی سے حاصل کیا جاسکتا تھا۔ریڈیو اسٹیشن بھی انتہا پسندانہ مواد کو براڈ کاسٹ کرنے کیلئے استعمال کیے جاتے تھے۔ان میں سب سے معروف ریڈیو اسٹیشن وہ تھا جو سوات میں ملا فضل اللہ نے قائم کررکھا تھا۔تاہم اس کے علاوہ فاٹا میں اگر سینکڑوں نہیں تو درجنوں کی تعداد میں ایف ایم ریڈیو کام کررہے تھے جسے عسکریت پسند اپنے پراپیگنڈے اور لوگوں تک اپنے احکامات پہنچانے کیلئے استعمال کرتے تھے۔

کیا واقعی حکومت نفرت کے اس سیلاب کو روکنے میں ناکام رہی تھی یا اس نے ایسا نہ کرنے کا فیصلہ کررکھا تھا؟ اسلام کے حوالے سے مشرف کے تصورات کے قلب میں ایک معقولیت پر مبنی اسلام کا تصور موجود تھا جو ریاست کی کارکردگی کے حوالے مفید ثابت ہوسکتا ہے۔مشرف ایم ایم اے کی مذہبی جماعتوں کے ساتھ اپنے اتحاد کو ختم نہیں کرسکتا تھا کیونکہ اسے ان کی ضرورت تھی۔اس کے ''اعتدال پسند روشن خیالی'' کے تصورات میں یہی وہ تضادات تھے جو اسے ناکامی کی طرف لے جارہے تھے۔وہ اپنی اتحادی مذہبی جماعتوں کو صرف اس حد تک ناراض کرنے کا خطرہ مول لے سکتا تھا جس حد تک اس کا امریکہ نواز موقف اجازت دے سکتا تھا۔لہٰذا اس نے ہر معاملے میں ایک محتاط روش اپنائی، چاہے یہ عسکریت پسندی کو کچلنے کا معاملہ ہو، ریاست کی زیر سرپرستی جاری اسلامائزیشن کا عمل ہو یا مدارس کے نصاب کو تبدیل کرنے کے سلسلے میں مغربی ممالک کے دباؤ سے عہدہ برا ہونے کا معاملہ ہو۔مشرف نے افغانستان اور کشمیر میں سٹریٹجک مفادات کو محفوظ بنانے کیلئے اسلامی انتہا پسندوں کو استعمال کرنے کی پالیسی کبھی

ترک نہیں کی تھی۔صرف یہ ہوا کہ نائن الیون کے بعد اس کی زیادہ احتیاط کے ساتھ اپنی پالیسی پر عمل کرنا پڑا۔جیسا کہ ہم پہلے تذکرہ کرچکے ہیں، اس کی پالیسی میں القاعدہ کے ساتھ وابستگی اختیار کرنے والی یا اسٹیبلشمنٹ کے کنٹرول سے آزاد ہوکر اپنے طور پر کام کرنے والی تنظیموں کو ان تنظیموں سے الگ کرنا تھا جو ابھی تک نیشنل سٹریٹجک اہداف کی تکمیل کیلئے سودمند تھی اور قابل استعمال تھیں۔

مشرف کے اپنے لبرل رویوں، شدت پکڑتے ہوئے فرقہ ورانہ تصادم اور اپنی حکومت کیلئے بین الاقوامی حمایت حاصل کرنے کی ضرورت کے اختلاط نے ابتدائی طور پر مشرف کو ضیاء کے زمانے سے جاری اسلامائزیشن کے عمل کے چند حصوں کو رول بیک کرنے پر آمادہ کیا تھا۔مئی ۲۰۰۰ میں مشرف نے محدود پیمانے پر اصلاحات متعارف کرانے کی کوشش کی گئی جن کے تحت پولیس حکام سے توہین رسالت آرڈی نینس کے تحت کارروائی کے اختیارات واپس لیے جانے تھے۔اس وقت بھی عدالتوں میں اقلیتوں اور مسلمانوں کے خلاف بہت سے ایسے کیسز زیر التوا تھے جن سے ظاہر ہوتا تھا کہ اس قانون کو بدنیتی کی بنیاد پر استعمال کیا جارہا ہے۔تاہم اس کے نتیجے میں مذہبی جماعتوں نے ہڑتالوں اور مظاہروں کا سلسلہ شروع کردیا جس کی وجہ سے دباؤ میں آکر اسے پچھلے قدموں پر جانا پڑا۔چار سال کے بعد اس نے ایک بار پھر حدود آرڈی نینس اور بلاس فیمی آرڈی نینس کا ''از سرنو مطالعہ'' کرنے کا فیصلہ کیا تاکہ ان قوانین کو غلط طور پر استعمال کیے جانے سے روکا جاسکے۔اس اعلان کے ساتھ ہی انسانی حقوق کیلئے ایک ادارہ ''قومی کمیشن برائے انسانی حقوق'' کے نام سے بھی قائم کردیا گیا(۳۹)۔

۲۰۰۶ میں جب انسانی حقوق کے کارکنوں اور عورتوں کے حقوق کیلئے کام کرنے والی تنظیموں کا اس حوالے سے دباؤ پڑا کہ حدود آرڈی نینس کے تحت زنا کے عمل میں صرف عورت کو سزا کا مستحق ٹھہرایا جاتا ہے جبکہ اس پر جنسی حملہ کرنے والا ملزم صاف بچ نکلتا ہے تو مشرف کو حدود آرڈی نینس کا دوبارہ جائزہ لینے پر مجبور ہونا پڑا۔حدود آرڈی نینس کو ختم کرکے مذہبی گروپوں کی ناراضی کا خطرہ مول لینے کی بجائے مشرف نے ''وومن پروٹیکشن بل'' متعارف کرادیا۔جب یکم دسمبر ۲۰۰۶ کو یہ بل قانون بنا تو اس

کے تحت زنا بالجبر کو سول لاء کے تحت پراسیکیوٹ کرنے کی اجازت دے دی گئی (۴۰)۔مشرف کے مخالفین نے اس قانون کو محض اشک شوئی قرار دیا۔یہ قانون عورتوں کی حفاظت میں یکسر ناکام ہوگیا تاہم اس کا مشرف کو فائدہ یہ ہوا کہ مغرب میں اس کا امیج بہتر ہوگیا۔

مشرف حکومت نے بہت احتیاط کے ساتھ مدارس کی اصلاح کا بیڑہ بھی اٹھایا۔اس بار بھی اس نے بین الاقوامی خوشنودی اور اندرون ملک سخت ردعمل کے خطرے کے درمیان توازن قائم کرنے کی کوشش کی۔گو کہ حکومت اکتوبر ۲۰۰۱ میں افغانستان میں امریکی فوجوں کے قبضے کے خلاف مذہبی پارٹیوں کے ایما پر ہونے والے شدید ترین احتجاج کو بھگت اور اس سے سنبھل چکی تھی اس کے باوجود اس راستے پر وہ ضرورت سے زیادہ محتاط روی کا مظاہرہ کررہی تھی۔نائن الیون کے بعد دہشت گردی اور انتہاپسندی کے فروغ میں مدارس کا کردار بین الاقوامی برادری کی سخت سکروٹنی میں آچکا تھا۔اس حوالے سے ابتدائی طور پر مغربی سوچ یہ تھی، جس پر بعد میں نظر ثانی کی گئی، کہ یہ مدارس ان غریبوں کو تعلیم کی فراہمی میں بہت اچھا کردار ادا کررہے ہیں جنہیں ریاست نے ان کے حال پر چھوڑ رکھا ہے۔ان اداروں میں تعلیم فرد کو Abuse ہونے پر مجبور کرتی تھی اور ایک ایسی فضا کا حصہ بناتی تھی جہاں عدم برداشت اور عسکریت پسندی کو پسندیدہ نظروں سے دیکھا جاتا تھا۔گو کہ تمام مدارس عسکری تربیت نہیں فراہم کرتے تاہم یہ تشدد کا نظریاتی جواز ضرور فراہم کرتے ہیں ۴۱۔فرقہ ورانہ تشدد کی بڑھتی ہوئی لہر نے مشرف کو اپنی وجوہات کی بنا پر اس سے سختی سے نمٹنے پر آمادہ کیا۔۲۰۰۰ میں ابتدائی طور پر فرقہ ورانہ دہشت گردی کے دوران ہونے والی ہلاکتوں کے بعد حالات اس نہج تک پہنچ گئے کہ خطرہ پیدا ہو چکا تھا کہ یہ لہر ریاست' کے کنٹرول سے باہر ہوجائے گی جیسا کہ نواز شریف کے آخری مہینوں کے دوران ہوا تھا۔۲۰۰۲ میں کہیں جاکر اس نے ایک آرڈی نینس جاری کیا جس میں مدارس فرقہ ورانہ نفرت کے پھیلاؤ اور عسکریت پسندی کو قابل سزا جرم قرار دیتے ہوئے اس کیلئے دو سال قید بامشقت تجویز کی گئی تھی۔اس آرڈی نینس میں ایک تین سالہ منصوبے کا بھی تذکرہ شامل کیا گیا تھا جس کے

تحت مدارس میں انگریزی اور سائنس کے مضامین کو نصاب کا حصہ بنانا لازمی قرار دیا گیا اور کہا گیا کہ حکومت اس مقصد کیلئے فنڈز اور تیکنیکی معاونت فراہم کرے گی۔ان اصلاحات پر عمل درآمد کیلئے مدارس کی رجسٹریشن کو لازمی قرار دیا گیا تھا۔تاہم اس آرڈی نینس کے جاری ہونے کے باوجود ان اصلاحات پر عمل کی رفتار بہت سست رہی جبکہ بہت بڑی تعداد میں مدارس نے رجسٹریشن کرانا بھی گوارا نہیں کی۔ملک میں موجود ۱۳،۰۰۰ مدارس میں سے بہت کم مدارس نے رجسٹریشن کرائی جبکہ باقی بہت بڑی تعداد نے ان اصلاحات کو امریکی ایجنڈا قرار دیتے ہوئے مسترد کردیا۔

دوسری جانب فاٹا میں محدود پیمانے پر اور مخصوص اہداف پر مرکوز فوجی آپریشنوں کے پیچھے سٹریٹجک دباؤ کارفرما تھا۔اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ایم ایم اے کو ساتھ ملائے رکھنے کی مشرف حکومت کی ضرورت نے ان عسکری گروپوں کی بہت زیادہ حوصلہ افزائی کی جو ملاکنڈ ڈویژن اور وفاقی دارالحکومت اسلام آباد میں اپنی مرضی کی شریعت نافذ کرنا چاہتے تھے۔ہم اسلام آباد کی لال مسجد کے تجزیے سے پہلے جس نے کلیدی ٹرننگ پوائنٹ کو جنم دیا، سب سے پہلے ملاکنڈ کی صورتحال پر بات کریں گے۔

سوات میں ہونے والے بغاوت کا قابو سے باہر ہوجانا ایک بڑے فوجی آپریشن کا متقاضی تھا جو اپریل ۲۰۰۹ میں نا صرف سوات بلکہ جنوبی وزیرستان میں بھی کیا گیا۔اس سے پہلے سوات میں ہونے والے واقعات کو مغرب سرحدی علاقوں سے پاکستان کے قلب میں طالبانیت کے پھیلاؤ کے طور پر دیکھتا تھا۔سوات میں جو کچھ ہوا وہ پشتون علاقوں میں موجودہ طالبانیت کے ساتھ جڑا ہوا تھا۔سوات اور ملاکنڈ ایجنسی میں تحریک نفاذ شریعت محمدی مولانا صوفی محمد کی زیرقیادت منظم ہوئی تھی جو جماعت اسلامی کا سابق رکن تھا۔ان علاقوں میں اس تحریک کی مقبولیت ابتداء میں اس قانونی خلا کی مرہون منت تھی جو سوات کی ریاست کا ۱۹۶۹ میں پاکستان کے ساتھ الحاق کیے جانے کے بعد وجود میں آیا تھا۔یہ خلا مقامی آبادی کے اس خیال کے بطن سے پھوٹا تھا کہ پرانے زمانے میں رائج ''رواج کا نظام'' جو کسی تنازعہ میں فریقین کو اجازت دیتا تھا کہ

وہ اپنا فیصلہ معاصر قوانین کے تحت کرالیں یا شریعت کے تحت کرالیں، وہ قانونی نظام لوگوں کو فوری انصاف فراہم کرنے کے سلسلے میں زیادہ کارآمد تھا جبکہ ''پاٹا'' کا فوجداری اور دیوانی نظام اپنے مقاصد پورے کرنے میں ناکام ہو چکا ہے۔وہاں پر شریعت کا مطالبہ صرف اسلامائزیشن کیلئے نہیں کیا جارہا تھا بلکہ اس لیے بھی کیا جارہا تھا کہ اس طرح مقامی آبادی کو فوری اور حقیقی انصاف ملنے کی توقع تھی (۴۲)۔

سوات کے پاکستان میں انضمام نے وہاں کرپشن اور غالب حیثیت کے حامل یوسف زئی قبیلے اور گجر قبیلے سے تعلق رکھنے والے غریب طبقات کے درمیان کشیدگی میں اضافہ کردیا۔اس تناظر میں ۱۹۹۵ سے ہی ٹی این ایس ایم پاکستانی ریاست کے خلاف مسلح جدوجہد شروع کرچکی تھی۔لہٰذا آگے چل کر سوات میں حالات و واقعات کی جو صورت پیدا ہوئی وہ بہت زیادہ حیران کن نہیں ہے۔تحریک نفاذ شریعت محمدی نے ناصرف قانونی اصلاحات کو بلکہ گجروں اور کمیوں جیسے غریب طبقات کے حقوق کو بھی اپنے ایجنڈے میں شامل کرلیا تھا۔یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے ریاست کے خاتمے سے قبل سوات میں زمینیں حاصل کرلی تھیں تاہم انہیں طویل عرصے سے یوسف زئی خانوں کی جانب سے دھمکیوں اور ہراساں کیے جانے کا سامنا تھا۔

۲۰۰۱ میں صوفی محمد نے اپنے پیروکاروں کو ہدایت کی کہ وہ افغانستان میں امریکی فوجوں کے خلاف طالبان کا ساتھ دینے کیلئے وہاں جاکر جہاد کریں۔وہ اپنے پیروکاروں کو لے کر افغانستان گیا تو وہاں انہیں زبردست ہزیمت کا سامنا کرنا پڑا جبکہ بہت سے لوگ اپنی جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھے۔جب مشرف نے بھارتی پارلیمنٹ پر حملے کے بعد عسکری تنظیموں کے خلاف کریک ڈاؤن کیا تو ٹی این ایس ایم پر بھی پابندی عائد کردی گئی اور صوفی محمد کو گرفتار کرلیا گیا۔اس کے داماد ملا فضل اللہ جس نے آگے چل کر اس علاقے میں طالبان کمانڈر مقرر ہونا تھا، نے وہاں شریعت کے نفاذ کی مہم شروع کردی۔اس کی زیر قیادت کالی پگڑیوں کی مہم شروع کردی گئی اور ساتھ ہی قبائلی علاقوں میں موجود دوسرے عسکری گروپوں کے ساتھ تعلقات استوار کرلیے گئے۔اس کے ان رابطوں کا اس وقت انکشاف ہوا جب اس کا ایک بھائی باجوڑ کے مقام ڈمہ ڈولا میں

القاعدہ کے ایک ٹھکانے پر ہونے والے ڈرون حملے میں ہلاک ہوا۔ایم ایم اے کی حکومت جس کی ذمہ داری تھی کہ وہ سوات اور ملاکنڈ کے دیگر علاقوں میں ٹی این ایس ایم کے پھیلاؤ کو چیک کرتی منہ دوسری جانب کیے کھڑی رہی۔ملا فضل اللہ نے ۲۰۰۷ میں تحریک طالبان پاکستان کے قیام کے بعد اعلان کردیا کہ تحریک نفاذ شریعت محمد طالبان کا جزو لاینفک ہے۔اس کا تحریک طالبان کا حصہ بننے کا اعلان نیز اس کے مسلح جنگجوؤں کی جانب سے لڑکیوں کے سکولوں کو بموں سے تباہ کرنے اور غیر قانونی ایف ایم ریڈیو کے ذریعے لوگوں کو اسلامی انقلاب پر اکسانے جیسے معاملات تھے جن کی وجہ سے مشرف کے آخری دنوں میں وہاں پر فوجی آپریشن شروع کیا گیا۔راہ حق کے نام سے ہونے والے فوجی آپریشن کے دوران ٹی این ایس ایم کے جنگجوؤں کے ساتھ ہونے والی معرکہ آرائی میں ۲۰۰ فوجی اور پولیس اہلکاروں کو ہلاک کردیا گیا تھا جبکہ فوج نے فضل اللہ کو پیچھے دھکیلتے ہوئے پہاڑوں میں پناہ لینے پر مجبور کردیا۔۲۰۰۸ کے انتخابات کے نتیجے میں برسر اقتدار آنے والی اے این پی سوات کے ٹی این ایس ایم کے جنگجوؤں کو شکست دینے کے معاملے میں اتنی بھی سنجیدہ نہ تھی جتنی ایم ایم اے کی حکومت تھی۔جیسا کہ ہم اگلے باب میں دیکھیں گے کہ مئی ۲۰۰۸ میں ہونے والے امن معاہدے نے فضل اللہ کو اس قابل کردیا کہ وہ سوات میں اپنی ری گروپنگ کرلے۔

کچھ مغربی ناقدین کا خیال ہے کہ جولائی ۲۰۰۷ کو اسلام آباد میں پیش آنے والا لال مسجد کا سانحہ اگر مشرف نے سٹیج نہیں کیا تھا تب بھی وہ اس کی جانب سے عسکریت پسندی کو جان بوجھ کر طاقت ور ہونے کا موقع فراہم کرنے کی پالیسی کا حصہ تھا جس کا واحد مقصد یہ تھا کہ وہ مغرب کو بتاسکے کہ وہ پاکستان میں طالبانیت کے پھیلاؤ میں واحد رکاوٹ ہے۔حقیقت امکانی طور پر کچھ یوں ہوسکتی ہے کہ ان باتوں کے اختلاط نے کہ ایم ایم اے کو ساتھ رکھنے کی ضرورت، اس بات کی آگہی کہ ایک آزاد میڈیا کسی بھی ایکشن میں سنسنی کے رنگ بھردے گا اور خوف کہ اس کا قبائلی علاقوں میں ردعمل سامنے آئے گا، مشرف کو عدم فعالیت کی پالیسی اپنانے پر آمادہ کردیا۔اس کے ساتھ ہی یہ بات بھی تھی کہ لال مسجد کے مولوی عبدالرشید غازی کے آئی ایس آئی کے ساتھ

بدستور روابط قائم تھے۔ان روابط نے رشید غازی کو مابعد نائن الیون صورتحال میں عسکریت پسندی کے خلاف محتاط انداز میں منتخب کردہ ریسپانس کو دیکھتے ہوئے تحفظ کا احساس دلا دیا تھا (۴۳)۔یہ بھی ممکن ہے کہ ان روابط نے اسے شریعت کے نفاذ کی مہم کے دوران اپنی حدود سے تجاوز کرنے اور جب آپریشن سے پہلے سٹینڈ آف کی صورتحال پیدا ہوئی تو اس دوران ہتھیار ڈالنے کی پیشکشوں کو ٹھکرانے پر مجبور کر دیا ہو۔موقر پاکستانی مبصرین قرار دیتے ہیں کہ اگر مسجد اور آئی ایس آئی کے ہیڈ کوارٹر کے درمیان فاصلے کو ذہن میں رکھیں تو یہ ناممکن تھا کہ ایجنسی لال مسجد کے احاطے میں اسلحہ کے ذخائر کو اکٹھا کیے جانے اور وہاں جیش محمد جیسی کالعدم عسکری تنظیموں کے جنگجوؤں کی موجودگی سے یکسر بے خبر ہوتی (۴۴)۔

اسلام آباد کی لال مسجد کو ۱۹۶۵ میں تعمیر کیا گیا تھا اور اس کے امام کے طور پر جنوبی پنجاب سے تعلق رکھنے والے ایک دیوبندی عالم مولانا محمد عبداللہ کو تعینات کیا گیا تھا۔اس کے فوج کے ساتھ قریبی تعلقات کی تاریخ ضیاء الحق کے دور تک جاتی ہے جب افغان جہاد کیلئے مدرسوں کے طالبعلموں کی بھرتی کا عمل اپنے عروج پر تھا۔لال مسجد بھی سخت گیر سنی فرقہ پرست جماعتوں کے ساتھ رابطے میں تھی۔مولانا عبداللہ کے سپاہ صحابہ کے ساتھ گہرے تعلقات تھے۔اسی وجہ سے اسے ۱۹۹۸ میں شیعہ عسکریت پسندوں نے قتل کیا تھا۔اس کے قتل کے بعد مسجد کا انتظام و انصرام اس کے بیٹوں عبدالعزیز اور عبدالرشید غازی نے سنبھال لیا تھا۔موخر الذکر جو قائد اعظم یونیورسٹی میں تاریخ کا طالبعلم تھا مسجد کا انتظام سنبھالنے تک سیکولر نظریات کا حامل تھا۔اسٹیبلشمنٹ کے ساتھ اپنے تعلقات کے باوجود لال مسجد کی انتظامیہ نائن الیون کے بعد مشرف کی پالیسیوں کے حوالے سے اس کی مخالفت پر کمر بستہ ہو گئی تھی۔۲۰۰۴ میں عبدالرشید غازی اسلام آباد میں سرکاری عمارتوں کو بم دھماکوں سے تباہ کرنے کی سازش میں ملوث ہونے کا الزام لگنے پر زیر زمین چلا گیا تھا۔کہا جاتا ہے کہ وہ القاعدہ کے رہنما ایمن الظواہری جیسی القاعدہ کی قدآور شخصیات کے ساتھ ذاتی مراسم استوار کر چکا تھا۔نیز ہر جمعہ کی نماز کے بعد لال مسجد کے باہر اسامہ بن لادن کے حق میں مسجد کی جانب سے مظاہروں کا

اہتمام کیا جاتا تھا (۴۵)۔

تاہم مسجد پر فوجی آپریشن کے سلسلے میں اشتعال انگیزی کی محرک عبدالعزیز کی اہلیہ ام حسان کی سرگرمیاں بنی تھیں جو مسجد کے ساتھ ملحق لڑکیوں کے مدرسے جامعہ حفصہ کا انتظام چلاتی تھی۔آپریشن سے قبل پیش آنے والے واقعات کے دوران جامعہ حفصہ کی برقع پوش اور لاٹھیوں سے مسلح طالبات نے قریب ہی واقع بچوں کی ایک لائبریری پر قبضہ کر لیا اور اس علاقے میں واقع ایک گھر سے ایک عورت کو اغوا کر لیا جس کے بارے میں ان کا کہنا تھا کہ وہ اپنے گھر میں جسم فروشی کا کاروبار کرتی تھی۔ان کا ابتدائی احتجاج جنوری ۲۰۰۷ میں شروع ہوا جب حکومت نے اسلام آباد میں غیر قانونی طور پر تعمیر کی جانے والی مساجد کو منہدم کرنے کا سلسلہ شروع کیا۔دلچسپ بات یہ ہے کہ سی ڈی اے نے کئی برسوں سے ان مساجد کی تعمیر و توسیع پر آنکھیں بند کیے رکھیں۔جامعہ حفصہ کی طالبات کے اقدامات نے لال مسجد کے مرد طالبعلموں کو حرکت میں آنے کیلئے پس منظر فراہم کر دیا تھا۔وہ قریبی آبپارہ مارکیٹ میں غیر قانونی طور پر سی ڈیز اور کیسٹوں کو جلا کر شریعت نافذ کرنے پر کمر بستہ تھے۔اس دوران ان کی پولیس کے ساتھ جھڑپوں کا سلسلہ بھی شروع ہوا۔اس دوران انہوں نے کئی پولیس اہلکاروں کو اغوا بھی کیا (۴۶)۔کئی ماہ کی خاموشی اور عدم فعالیت کے بعد فوج حرکت میں آئی اور ۱۰ جولائی ۲۰۰۷ کو مسجد پر دھاوا بول دیا۔اس دوران مبینہ طور پر ۵۰ طالبعلم ہلاک ہوئے جن میں عبدالرشید غازی بھی شامل تھا۔اسے اسلامی انتہا پسندوں کی جانب سے فوراً ہی بہادر جنگجو اور غازی شہید کا مرتبہ دے دیا گیا جس کے ساتھ ہی پوسٹروں پر اس کی تصویریں چھپنا شروع ہو گئیں اور مذہبی اجتماعات میں اور انٹرنیٹ پر اسے لوگوں کے جذبات کو برافروختہ کرنے کیلئے استعمال کیا جانا شروع ہو گیا۔

گو کہ فوجی آپریشن کامیاب رہا تھا لیکن اس کے نتیجے میں قبائلی علاقوں میں تحریک طالبان پاکستان کے نام سے ایک مسلح تنظیم وجود میں آگئی جس کی چھتری تلے ریاست سے بغاوت کو پوری شدت کے ساتھ شروع کر دیا گیا۔جب مولوی عبدالعزیز کو جیل سے رہا کیا گیا تو اس نے ایک انٹرویو میں اللہ کا شکر ادا کیا جس نے ملا فضل اللہ اور

صوفی محمد جیسے لوگ عطا کیے ہیں جو نفاذ شریعت کیلئے جدوجہد کررہے ہیں۔پنجاب سے تعلق رکھنے والے فرقہ پرست عسکریت پسندوں نے ناصرف تحریک طالبان کے ساتھ ہاتھ ملالیے بلکہ پہلی مرتبہ ریاست کے خلاف ہتھیار بھی اٹھالیے۔اس سلسلے میں انہوں نے ناصرف پختون علاقوں میں بلکہ پنجاب میں بھی دہشت گردی کی کارروائیوں کا آغاز کردیا۔جیسا کہ ہم اگلے باب میں جائزہ لیں گے کہ وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ یہ عسکری تنظیمیں بے خوف ہوتی چلی گئیں اور انہوں نے براہ راست فوج اور آئی ایس آئی پر بھی حملے شروع کردیے جنہوں نے سپاہ صحابہ اور لشکر جھنگوی جیسی تنظیموں کی پرداخت کرنے اور انہیں حفاظت مہیا کرنے میں ان کی مدد کی تھی۔لال مسجد آپریشن کے خلاف ردعمل اتنا شدید تھا کہ ہوتے ہوتے ہی نوبت آن پہنچی کہ اس سال جولائی کے ماہ میں ہر روز اوسطاً ایک خودکش حملہ کیا جانے لگا۔خودکش حملہ آور سیکورٹی فورسز، سرکاری عمارتوں اور پاکستان میں مغرب کی موجودگی کی نشانیوں کو اپنا ہدف بناتے تھے۔ان میں اسلام آباد کا میریٹ ہوٹل بھی تھا جسے ستمبر ۲۰۰۸ میں ایک خودکش حملے میں تباہ کیا گیا(۴۷)۔مشرف ایک اور قاتلانہ حملے میں بچ گیا لیکن سال ۲۰۰۸، جس کے اختتام پر بے نظیر بھٹو کو دہشت گردی کا شکار ہونا تھا، دو ہزار سے زیادہ دہشت گردی کی وارداتیں ہوئیں جن میں سات ہزار سے زیادہ لوگ ہلاک یا زخمی ہوئے (۴۸)۔

مشرف دور میں سول ملٹری تعلقات اور ملبس کا عمل

پاکستان آرمی کی ریاست، معیشت اور سوسائٹی کے اندر دخل اندازی کا اس کتاب میں تسلسل کے ساتھ تذکرہ کیا جاتا رہا ہے۔قومی مفاد کے نام پر ادارہ جاتی مفادات کو محفوظ بنانے کیلئے اس کی ایک کلیدی مفاداتی گروپ کی حیثیت سے ظہور کی تاریخ قیام پاکستان کے ابتدائی دور سے شروع ہوتی ہے۔ایوب خان اور ضیاء الحق کے ادوار میں ریاست کے معاملات چلانے کیلئے فوج کا کردار بڑھ کر بہت زیادہ ہوگیا تھا۔گو کہ اس کی طاقت اجارادارانہ نوعیت کی نہیں رہی جس کی ایک وجہ فوجی حکومتوں کا سیاسی وقانونی جواز حاصل کرنے میں ناکام رہنا ہے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ انہیں بہت

حد تک بیوروکریسی اور دیہی اشرافیہ پر سویلین اتحادیوں کی حیثیت سے انحصار کرنا پڑتا تھا۔مشرف دور میں فوجی کنٹرول بیوروکریسی کی قیمت پر بڑھایا گیا۔اگرچہ اس دور میں مذہبی جماعتیں جاگیردار اشرافیہ کی نسبت زیادہ متحرک انداز میں حکومت کے ساتھ وابستہ رہیں۔پاکستان کی انتظامی اور معاشی امور میں فوج کی شدت پکڑتے ہوئے کردار کی بات کرنے سے پہلے اس بات کا تذکرہ کرنا ضروری ہے کہ مشرف نے سیاست کے قلب میں اپنے کردار کو ادارہ جاتی حیثیت سے مستحکم کیا تھا۔

اس کام کو سب سے پہلے صدر کے قومی اسمبلی اور حکومت کو تحلیل کرنے کے آئینی اختیار کو واپس حاصل کرنے کے ذریعے سرانجام دیا گیا جو ضیاء کی وراثت کی نمایاں ترین خصوصیت ہے تاہم اسے نواز شریف نے اپنے دوسرے دور حکومت میں ختم کردیا تھا۔یہ اقدام اس وجہ سے زیادہ اہمیت کا حامل ہے کیونکہ مشرف نے چیف آف آرمی سٹاف اور صدر مملکت کی حیثیت سے دو عہدوں پر برقرار ہونے کی وجہ سے فوج اور صدر کے درمیان براہ راست رابطے جوڑ دیئے تھے۔۱۹۹۰ کی دہائی میں سویلین صدر بھی فوج کے ساتھ قریبی رابطے میں رہا کرتے تھے لیکن ایک قدم کے فاصلے پر۔مشرف نے ۲۰۰۴ میں لیگل فریم ورک آرڈر جاری کرکے آئین کا حصہ بنایا تھا جس کے تحت پاکستان میں صدارتی اختیارات کو یقینی بنایا گیا تھا۔دوم اسی سال یعنی ۲۰۰۴ میں مشرف نے نیشنل سیکورٹی کونسل تشکیل دے کر فوج کو گورننس کے معاملات میں مستقل کردار تفویض کردیا تھا۔یہ خیال کہ فوج کو قومی پالیسیوں کی تشکیل کے عمل میں مستقل کردار کا حامل ہونا چاہیے سول ملٹری تعلقات کے پیٹرن اور جمہوریت کے ٹرکش ماڈل سے اخذ کیا گیا تھا۔ترکی کے ماڈل کو پاکستان میں آزمائے جانے کا خیال سب سے پہلے ضیاء الحق کے دماغ میں آیا تھا۔مشرف کی جانب سے قومی سلامتی کونسل کی تشکیل فوج کے ان دیرینہ خدشات کا عملی اظہار تھا کہ قومی سلامتی امور کو منتخب سیاستدانوں کی صوابدید پر نہیں چھوڑا جاسکتا۔علاوہ ازیں قومی سلامتی کونسل فوج کے مفادات کی حفاظت کیلئے ایک آزمودہ پیٹرن کی حیثیت رکھتی ہے۔مذہبی جماعتوں کی جانب سے ہونے والی کچھ غلطیوں کے باوجود (۴۹) ۲۰۰۲ کے انتخابات نے ایک قومی اسمبلی کو جنم دیا تھا جو لازمی

طور پر پرو اسٹیبلشمنٹ تھی۔قومی سلامتی کونسل کے حامیوں کا کہنا تھا کہ یہ ادارہ لازمی طور پر ایک مشاورتی ادارہ ہے اور یہ کہ فوج کو گورننس کے معاملات میں دخیل کرنے سے جمہوریت مضبوط ہوگی اور چونکہ اس میں فوج کو بھی ملکی امور کی ذمہ داری لینا پڑے گی لہٰذا آئندہ کیلئے اس کی وجہ سے اقتدار پر فوجی قبضے کا سلسلہ رک جائے گا۔قومی سلامتی کونسل کی حمایت میں دلائل دیتے ہوئے یہ بات نظر انداز کردی جاتی ہے کہ اس ادارے کی موجودگی میں فوج کے شہریوں کو جوابدہ ہونے کے امکانات پہلے سے بھی کم ہوجاتے ہیں اور یہ ادارہ جمہوریت کے استحکام کی جانب قدم نہیں ہے بلکہ یہ جمہوریت کی کمزوری کو منعکس کرتا ہے۔

اس کے ساتھ ہی مشرف نے فوج اور سویلین کے درمیان عدم توازن کو ادارہ جاتی حیثیت دے دی تھی اور مشرف حکومت نے ناصرف فوج کی داخلی معیشت کے حجم میں بے پناہ اضافہ کردیا تھا بلکہ تمام اہم اداروں میں حاصر سروس اور ریٹائرڈ فوجی افسران کو تعینات کرکے فوج کی ریاستی امور میں مداخلت کو بھی بڑھادیا تھا۔ان اداروں میں ناصرف کمرشل اور کاروباری ادارے شامل تھے جہاں کہا جاسکتا ہے کہ کسی نہ کسی حد تک فوجی انداز کی مہارت اپنا کام دکھا سکتی ہو بلکہ مشرف اس حد تک چلا گیا کہ اس نے یونیورسٹیوں اور تھنک ٹینکس کی سربراہی بھی فوجی افسران کے سپرد کرنا شروع کردی تھی۔مشرف دور میں صرف سرکاری شعبے میں چار سے پانچ ہزار پوسٹوں پر فوجی افسران تعینات کیے جاچکے تھے۔

فوج کے اپنے پرانے ادارے جیسے فرنٹیئر ورکس آرگنائزیشن نے نجی شعبے کے ساتھ شراکت داریاں قائم کرتے ہوئے اپنے دائرہ کار کو بہت پھیلا دیا تھا۔مثال کے طور پر اس نے لاہور۔۔۔شیخو پورہ۔۔۔فیصل آباد موٹر وے کی تعمیر کیلئے نجی تعمیراتی اداروں حبیب رفیق گروپ اور سچل کنسٹرکشن کے ساتھ شراکت داری قائم کی تھی(۵۰)۔اس دور کی ایک اور نمایاں خصوصیت فوج کا رئیل اسٹیٹ کے کاروبار میں بہت زیادہ دلچسپی لینا تھا۔مثال کے طور پر ۲۰۰۲ میں ایک صدارتی حکم نامے کے ذریعے لاہور میں ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی کا قیام عمل میں لایا گیا جس نے ۱۹۲۵ سے قائم

کنٹونمنٹ کواپریٹو ہاؤسنگ سوسائٹی کی جگہ لے لی تھی۔فوج رئیل اسٹیٹ کے کاروبار میں تنہا Speculate نہیں کررہی تھی بلکہ عائشہ صدیقہ کے الفاظ میں ''اس کاروبار کو خاص طور پر نائن الیون کے بعد ملک میں معاشی سرگرمیوں کے بنیادی ذرائع میں سے ایک کی حیثیت حاصل ہوچکی تھی''(۵۱)۔تاہم فوج اس کی ایک بڑی سٹیک ہولڈر ضرور بن چکی تھی اور سب سے اہم یہ کہ اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ فوج اپنے معاشی مفادات کو آگے بڑھانے کیلئے سیاسی طاقت کو بے دریغ استعمال کررہی تھی۔فوج کی جانب سے شروع کی جانے والی ہاؤسنگ سکیموں میں جائیداد کی قیمتیں بہت زیادہ بڑھ گئیں کیونکہ انہیں سویلین رہائشی سکیموں کی نسبت محفوظ اور بہتر انفراسٹرکچر کی حامل سکیمیں سمجھا جاتا ہے(۵۲)۔

فوج کی طاقت کے مراکز کے ساتھ براہ راست وابستگی نے اس میں کرپشن کے راستے کھول دیے جس کی وجہ سے عوام میں فوج کی اخلاقی حیثیت بری طرح متاثر ہوئی۔مشرف کے دو عہدوں، آرمی چیف اور صدر مملکت، کے ساتھ چمٹے رہنے پر اصرار کی وجہ سے جب مشرف کی وقعت اور وقار میں کمی آئی تو اس کے نتیجے میں فوج کی ساکھ مزید متاثر ہوگئی۔فوج نے بعد میں عسکریت پسندوں کا مقابلہ کرنے اور جولائی اگست ۲۰۱۰ میں آنے والے تباہ کن سیلاب میں امدادی سرگرمیاں کرکے اپنی ساکھ کو کسی حد تک بہتر بنالیا۔تاہم یہ بھی اہم ہے کہ فوج کے پھلتے پھولتے معاشی مفادات کو صرف اور صرف منفی انداز سے نہ دیکھا جائے۔زیادہ تر فوجی کاروباری ادارے کافی حد تک درست انداز میں چلائے جارہے ہیں۔فوجی فاؤنڈیشن سابق فوجیوں اور ان کے اہل خانہ کی فلاح و بہبود کا خیال رکھتی ہے۔یہ ناصرف نئے ریکروٹس کی سپلائی کیلئے موزوں حالات پیدا کرتی ہے بلکہ مثال کے طور پر تعلیمی سہولتوں کی فراہمی کے ذریعے فوج کو ایسا ادارہ بننے کے قابل بناتی ہے جہاں میرٹ کو اولیت دی جاتی ہے۔یہ بات اس وقت مزید واضح ہوگئی جب نومبر ۲۰۰۷ میں فوج کے سربراہ کے طور پر جنرل اشفاق پرویز کیانی نے پرویز مشرف کی جگہ لی۔کیانی کے والد ایک نان کمیشنڈ آفیسر تھے۔

مشرف کا عروج وزوال

اپنے پیشروؤں کی طرح مشرف بھی سیاسی و قانونی جواز سے محروم تھا اور انہی کی طرح خود کو جائز قرار دلانے کیلئے پاپولر مینڈیٹ کیلئے ہاتھ پاؤں مارتا رہا تھا۔ وہ ایوب سے کہیں بہتر سیاست کا کھلاڑی تھا تاہم ضیاء الحق کی فطری عیاری سے محروم تھا۔ ۲۰۰۷ وہ سال تھا جب مشرف پارلیمانی انتخابات کا شیڈول آچکا تھا اور اس کے ساتھ ہی مشرف بطور صدر اپنے دوبارہ انتخاب کا خواہش مند تھا۔ تاہم یہ وہی سال بھی تھا جب امریکہ نواز موقف کی وجہ سے وہ عدم مقبولیت کی انتہاؤں کو چھور رہا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ اس کے مغربی اتحادی اسے بے نظیر کے ساتھ کسی سمجھوتے پر آمادہ کرنے کیلئے دباؤ ڈال رہے تھے تاکہ عسکریت پسندی کی بڑھتی ہوئی لہر کا مقابلہ کرنے کیلئے پاکستان میں لبرل اور جمہوری قوتوں کو سامنے لایا جاسکے۔ مشرف نا صرف فوج کی جانب سے پیپلز پارٹی کیلئے ناپسندیدگی کے جذبات کا حامل تھا بلکہ وہ ذاتی طور پر بھٹو خاندان، بے نظیر اور ان کے شوہر آصف علی زرداری سے نفرت کرتا تھا۔ اس کی اولین کوشش تھی کہ وہ بے نظیر کو اپنی شرائط پر پاکستان واپس آنے کی اجازت دینے سے پہلے دوسری صدارت کیلئے اپنی پوزیشن کو مضبوط کرلے۔ اس کیلئے اس نے مسلم لیگ قاف کی زیر قیادت اپنی وفادار پارلیمنٹ کو اپنی دوسری مدت کیلئے آمادہ کرنے کیلئے جوڑ توڑ شروع کردیا تھا۔ اس اقدام کے قابل مواخذہ جواز نے مین سٹریم پارٹیوں کی حوصلہ افزائی کی کہ وہ قومی اسمبلی، صوبائی اسمبلیوں اور سینٹ پر مشتمل بالواسطہ الیکٹورل کالج کا بائیکاٹ کردیں۔ اس الیکٹورل کالج نے ۶ نومبر کو مشرف کو دوسری مدت کیلئے منتخب کرلیا۔ اس اقدام سے مشرف اپنی پوزیشن کو بہتر بنانے میں کامیاب نہ ہوسکا جو مارچ ۲۰۰۷ میں سپریم کورٹ کے چیف جسٹس افتخار محمد چودھری کی مس کنڈکٹ اور اقرباء پروری کے الزام میں برطرفی کی وجہ سے انتہائی زیادہ کمزور ہوچکی تھی۔ چیف جسٹس نے بہت زیادہ آزادی کا مظاہرہ کیا تھا۔ مشرف کو خطرہ تھا کہ وہ اس کی صدارت کی دوسری مدت کے انتخاب کے عمل کیلئے قانونی خطرات نہ کھڑے کردے۔ مشرف کے اس اقدام نے بیک

فائر کیا اور ملک بھر کے وکلاء اگلے ہی روز چیف جسٹس کی حمایت میں سڑکوں پر نکل آئے۔ عدلیہ کی آزادی کے نام پر شروع ہونے والی وکلاء تحریک جلدی ہی اینٹی مشرف تحریک میں بدل گئی۔ یہ اس ''گو مشرف گو'' تحریک کی ابتداء کی جو بالآخر اس کی اقتدار سے علیحدگی پر منتج ہوئی۔

اپنے دوبارہ انتخاب کے فوری بعد مشرف بے نظیر بھٹو اور نواز شریف کو ملک میں واپس آنے سے روکنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ بے نظیر بھٹو ایمنسٹی ملنے اور اپنے خلاف کرپشن کے تمام مقدمات واپس ہونے کے بعد ۱۸ اکتوبر ۲۰۰۷ کو ملک میں واپس آچکی تھیں۔ ان کی فاتحانہ واپسی کو کراچی میں کارساز کے مقام پر ہونے والے ایک خود کش حملے کے ذریعے نقصان پہنچانے کی کوشش کی گئی جس میں پیپلز پارٹی کے ۱۳۶ کارکن جاں بحق اور ۴۵۰ کے قریب زخمی ہوئے تھے۔ دوسری جانب نواز شریف ۲۵ نومبر کو سعودی عرب میں اپنی جلاوطنی ختم کرکے کم ڈرامائی حالات میں ملک میں واپس آگئے۔ نہایت واضح بات تھی کہ مشرف کے پاس اقتدار میں رہنے کی ایک ہی صورت بچی ہے کہ وہ انتخابات سے کچھ ہی قبل سیاسی منظر میں داخل ہونے والے ان دونوں لیڈروں کے ساتھ افہام و تفہیم کی فضا پیدا کرے۔ ایک اور نامعقول فیصلے کے ذریعے اس نے خود کو بالکل ہی کونے میں دھکیل دیا اور یہ تھا ۳ نومبر کو ملک میں ایمرجنسی لگانے کا فیصلہ۔ ایمرجنسی نافذ کرنے کے اس فیصلے کے پیچھے نواز شریف اور بے نظیر کے خوف سے زیادہ یہ خوف کارفرما تھا کہ سپریم کورٹ کہیں دوسری مدت کیلئے اس کے حالیہ انتخاب کو کالعدم قرار نہ دیدے۔ جس میڈیا کو مشرف نے اپنے ابتدائی دنوں میں آزادی سے ہمکنار کرلیا تھا، ایمرجنسی کے نفاذ کے بعد مشرف نے پیمرا کے ذریعے اسی کا گلا گھونٹنے کی کوشش کی۔ مشرف نے ۲۰۰۸ میں پارلیمانی انتخابات سے کچھ ہی قبل ۱۵ دسمبر کو ایمرجنسی اٹھادی جب چیف جسٹس افتخار محمد چودھری کی عدلیہ کو معطل کرنے اور ججوں کو گھروں میں نظر بند کرنے کے بعد اس کے اپنے پسندیدہ ججوں پر مشتمل نئی سپریم کورٹ نے اس کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے اس کے صدارتی انتخاب کی توثیق کردی۔ اس سے قبل وہ ۲۸ نومبر کو اپنے آرمی چیف کے عہدے سے استعفیٰ دے چکا تھا جس کے بعد اس

نے فوج کی سربراہی جنرل اشفاق پرویز کیانی کو سونپ دی تھی۔ یہ فیصلہ جس کا اپوزیشن بہت عرصے سے مطالبہ کر رہی تھی، اس کی کریڈیبلٹی کو بحال کرنے کے سلسلے میں ناکافی ثابت ہوا تھا۔ اس کے برعکس اس نے فوجی کور کی عدم موجودگی میں اسے اپوزیشن کے مزید رحم و کرم پر چھوڑ دیا تھا۔ ایمرجنسی کے نفاذ نے اس کے اندرون اور بیرون ملک اس کی رہی سہی ساکھ کو بھی تباہ کر دیا۔ اس حوالے سے ۲۲ نومبر کو دولت مشترکہ نے پاکستان کی رکنیت کو معطل کر دیا تھا۔ مشرف نے دوسری مرتبہ صدارت کے عہدے پر فائز ہونے کیلئے اپنی جنگ تو جیت لی تھی لیکن وہ اپنی قبولیت کی جنگ بری طرح ہار گیا۔ یہ بات اس وقت کھل کر سامنے آگئی جب پارلیمانی انتخابات کے موقع پر اس کے مواخذہ کی کوششیں شروع کر دی گئی تھیں۔

راولپنڈی کے لیاقت باغ میں ۲۷ دسمبر ۲۰۰۸ کو ہونے والے ایک انتخابی جلسے کے دوران بے نظیر بھٹو کو قتل کر دیا گیا جس کے بعد ان انتخابات کو بھی ملتوی کرنا پڑا۔ سیاسی حریفوں کا دعویٰ ہے کہ اس قتل کے پیچھے پرویز مشرف کا ہاتھ تھا۔ اس دوران جاری ہونے والی رپورٹوں میں سیکورٹی کی ناکامی کی طرف نشاندہی کی گئی ہے جس کیلئے اسے جواب دہ ہونا پڑے گا (۵۳)۔ بے نظیر بھٹو کی موت کے بعد صدمے اور غم و غصے کے شدید جذبات کو دیکھتے ہوئے کچھ تجزیہ نگاروں نے پاکستانی فیڈریشن کی یونٹی پر بھی شکوک و شبہات کا اظہار کرنا شروع کر دیا تھا تاہم بعد میں یہ شکوک خیال خام ثابت ہوئے۔ بے نظیر بھٹو کی موت کا ایک نتیجہ ضرور نکلا کہ اسٹیبلشمنٹ کیلئے انتخابات میں دھاندلی کرنا ناممکن ہو گیا۔ یقینی طور پر فروری ۲۰۰۸ کو ہونے والے انتخابات کے نتیجے میں پیپلز پارٹی کو ہمدردی کا ووٹ پڑا جبکہ نواز شریف کی مسلم لیگ نے قاف لیگ کی قیمت پر اپنے گڑھ پنجاب میں اپنی کھوئی ہوئی طاقت دوبارہ حاصل کر لی (۵۴)۔ ملک میں سیاسی منظر نامے کا ۲۰۰۲ سے پہلے کا پیٹرن واپس آ گیا جس میں مذہبی پارٹیوں کو دوبارہ اپنے اصل سائز میں سمٹنا پڑا۔ صوبہ سرحد میں ان انتخابات میں بڑی پارٹی بن کر ابھری۔ وقت کی عجیب و غریب کروٹ کے نتیجے میں بے نظیر بھٹو کے شوہر اور پیپلز پارٹی کے نئے منتخب ہونے والے شریک چیئرمین آصف علی زرداری پاکستانی سیاست میں

سب سے بڑے کھلاڑی بن کر ابھرے (۵۵)۔

جب نواز شریف نے پیپلز پارٹی کی قیادت میں مخلوط حکومت میں شامل ہونے کا فیصلہ کیا تو مشرف کے تابوت میں آخری کیل ٹھونکی گئی۔ گو کہ دونوں جماعتوں کے درمیان تعاون کی فضا زیادہ دیر باقی نہ رہ سکی اس کے باوجود دونوں پارٹیوں نے اس بات کو یقینی بنا لیا کہ وہ قومی اسمبلی اور سینٹ میں مشرف کے مواخذے کی قرارداد کے حق میں دو تہائی اکثریت کا انتظام کر لیں گی۔ مشرف نے ۱۸ اگست کو یقینی مواخذے سے بچنے کیلئے از خود استعفیٰ دے دیا۔ اس نے قرار دیا کہ اس کے خلاف الزامات بے بنیاد اور غلط ہیں اور یہ کہ صدارت سے اس کا استعفیٰ قومی اتحاد کی ضرورت کے تحت تھا۔ جمہوری استحکام کیلئے پاکستان کا طویل سفر ایک نئے مرحلے میں داخل ہو گیا۔

حرف آخر

نو سال پر محیط مشرف دور کی ملی جلی وراثت کا اظہار اس بات سے ہوتا ہے کہ جہاں ایک جانب سیاسی حریفوں اور سول سوسائٹی کے گروپوں نے اس کی رخصتی پر جشن منایا وہیں کاروباری طبقے اور عوام کے ایک حصے نے چپ سادھ لی۔ بعد ازاں مشرف نے بیرون ملک جانے کو ترجیح دی جہاں اس نے سیاست میں واپسی کیلئے ایک نئی پارٹی آل پاکستان مسلم لیگ (اے پی ایم ایل) کی بنیاد رکھی۔ زرداری حکومت کے دوران ملک میں انتشار کی حالت اور عدم تحفظ میں اضافے کے احساس کے نتیجے میں یہ مرحلہ بھی آیا کہ جب مشرف نے اکتوبر ۲۰۱۰ میں اپنی پارٹی منظم کی تو اس وقت تک بہت سے لوگوں کے نزدیک اس کا دور قدرے استحکام اور بہتر گورننس کے جزیرے قرار پایا جانے لگا۔ سیاست میں یادداشت ہمیشہ مختصر اور دھوکا دینے والی ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مشرف کی جانب سے پارٹی کے قیام کے وقت بہت سے لوگوں کے جذبات وہ نہیں تھے جو اس کی سیاسی منظر سے رخصتی کے وقت پائے جاتے تھے۔

۲۰۰۸ میں ایسا دکھائی دیتا تھا کہ چاہے حالات کی نبض پر اس کا ہاتھ نہ ہو پھر بھی اس نے اپنی آستین میں کچھ پتے ضرور چھپا رکھے ہیں۔ اس نے پاکستان کی گورننس

اور معیشت کو بہتر بنانے کا وعدہ کیا تھا لیکن وہ اپنے بعد آنے والوں کیلئے مسائل کے انبار چھوڑ کر گیا۔ وہ اپنے تئیں پاکستان کا خود ساختہ نجات دہندہ تھا لیکن عملی طور پر وہ ۱۹۴۷ سے موجود پاکستان کے بنیادی مسائل کو بھی حل کرنے میں کامیاب نہ ہو پایا تھا۔ اس کے دور میں سیاسی ادارے پہلے سے کہیں زیادہ کمزور ہو چکے تھے اور صوبوں میں مرکزیت کے خلاف پائے جانے والے جذبات کسی بڑی چارہ گری کے منتظر تھے۔ اس کے دور میں ضیاء الحق کی اسلامائزیشن کو رول بیک کرنے کی کوششیں ضرور ہوئی تھیں لیکن یہ بہت زیادہ نیم دلی کے ساتھ کی گئیں۔ اس کے ساتھ ہی مشرف حکومت کی مذہبی جماعتوں اور مذہبی انتہاپسندوں کے بارے میں مبہم پالیسیوں کے باعث ''شریعتائزیشن'' کے چیلنج سنگین صورت اختیار کر گئے تھے۔ بھارت کے ساتھ تعلقات میں بہتری کی ابتدائی امیدیں ''جامع مذاکرات'' کے عمل کو ساتھ لے کر گہرے پانیوں میں غرق ہو گئی تھیں۔ اس کے ساتھ ہی مقامی حکومتوں کے حوالے سے اصلاحات کے ذریعے عوام کو ایمپاور کرنے کی توقعات بھی پانی پر لکھی لکھائی ثابت ہوئی تھیں۔ ان تمام حالات کو دیکھتے ہوئے اس کے دور حکومت کا شاید سب سے بہتر خلاصہ یہی ہو سکتا ہے کہ اس دور میں شور بہت مچایا گیا لیکن عمل بہت کم کیا گیا۔ پاکستان کو آج بھی ان دیرینہ مسائل کا سامنا ہے جنہوں نے آزادی کے بعد سے اس کی معاشی و سیاسی ترقی کے آگے دیوار استوار کر رکھی ہے۔ اگر مشرف دور میں پاکستان ناکام ریاست نہیں تھی تو کم از کم وہ غیر فعال ریاست ضرور تھی۔

☆☆☆

حوالہ جات

۱۔ Owen Bennet Jones, "Pakistan: Eye of the Storm" (New Haven: Yale, 2002)

۲۔ Hassan Abbas, " Pakistan's Drift into Extremism: Allah, the Army and America's War on Terror" (Armonk, NY: M. E. Sharpe, 2008)

۳۔ A. Z. Hilali, " US-Pakistan Relationship: Soviet Invasion of Afghanistan" (Ashgate, 2005)

۴۔ مثال کے طور پر حسن عباس اس حقیقت پر توجہ مرکوز کرتا ہے کہ مشرف کی جانب سے ''روایتی اور انقلابی'' کا ناخوشگوار ملغوبہ اسے 'ہر کام کا ماسٹر' اور 'غریب آدمی کا اتاترک' ثابت کرتا ہے۔ Hassan Abbas, " Pakistan's Drift into Extremism: Allah, the Army and America's War on Terror"

۵۔ See, Shahid Javed Burki, "Changing Perception, Altered Realities: Pakistan's Economy Under Musharraf 1999 - 2006" (Oxford: Oxford University Press, 2007)

۶۔ پرویز مشرف کی خود نوشت اس حوالے سے رنگا رنگ بیان کی حامل ہے ملاحظہ کیجئے، P. Musharraf, "In the Line of Fire: A Memoir (London: Simon and Schuster, 2006)

۷۔ اے کیو خان نیٹ ورک کی جانب سے نیوکلیئر عدم پھیلاؤ کو محدود کیے جانے کے بارے میں مزید جانکاری کیلئے ملاحظہ کیجئے، Adrian Levy and Catherine Scott-Clarke " Deception: Pakitan, United States and the Global Nuclear

Weapons Conspiracy (London: Atlantic Books, 2007); Shuja Nawaz "Crossed Swords: Pakistan, its Army and the War Within" (Oxford: Oxford University Press, 2008)

۸۔ See Robert Loonery "Failed Economic Take Offs and Terrorism in Pakistan: Conceptualizing a Proper Role for US Assistance", Asian Survey (November -December, 2004)

۹۔ بیرون ملک پاکستانیوں کو خدشہ لاحق تھا کہ نائن الیون کے بعد مغربی ممالک کی حکومتیں ان کے اثاثوں کو منجمد کر دیں گی۔۲۰۰۲ تک بیرون ملک پاکستانیوں کی ملک میں ترسیلات ۵۔۳ ارب ڈالر تک پہنچ گئی تھیں۔

۱۰۔ Robert Loonery "Failed Economic Take Offs and Terrorism in Pakistan

۱۱۔ Meboob ul Haq "Human Development in South Asia 2007: A Ten Years Review" (Karachi: Oxford University Press, 2008)

۱۲ See Jawaid Bukhari "Consumer Focused Growth: Frozen Mind-sets", Dawn International Edition 25 August 2003

۱۳۔ Masooda Bano, "What Reforms", News International, 15 November 2002

۱۴۔ Sjuan Gregory, "Towards a Containment Strategy in the Fata"

۱۵۔ Zahid Hussain, "Frontline Pakistan: The Path to Catastrophe and the Killing of Benazir Bhutto (London: I. B Taurus, 2008)

۱۶۔ Hassan Abbas, " Pakistan's Drift into Extremism: Allah, the Army and America's War on Terror"

۱۷۔ See Selig H. Harrison, "Global Terrorism: US Policy after 9/11 and its Impact on the Dometic Politics and Foreign Relations of

Pakistan", in Rajshree Jetley (ed), "Pakistan in Regional and Global Politics" (New Delhi: Routledge, 2009)

۱۸۔ See Hussain Haqqani, "Pakistan: Between Mosque and Military (Lahore: Vanguard, 2005)

۱۹۔ See Imtiaz Ali, "The Haqqani's Network and Cross-Border Terrorism in Afghanistan" Terrorism Monitor (24 March 2008)

۲۰۔ ریفارم کمیشن جسے نواز شریف نے معاشی و سیاسی بے ضابطگیوں کی تحقیقات کیلئے قائم کیا تھا کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ سیاسی جبریت کیلئے محض ایک آلہ تھا۔ S.P. Cohen, "The Idea of Pakistan" (New Delhi: Oxford University Press, 2005)

۲۱۔ Ayesha Siddiqa, "Military Incorporation: Inside Pakistan's Military Economy" (London: Pluto Press, 2007)

۲۲۔ S. P. Cohen, "The Idea of Pakistan"

۲۳۔ Trasparency International, "Global Corruption Barometer 2007 (6 December 2007)

۲۴۔ Alan B. Krueger and Jita Malekova, "Education, Poverty, Political Voilence and Terrorism: Is There a Casual Connection?" (Cambridge MA: National Bureau of Economic Research, 2002)

۲۵۔ اس اصطلاح کو شاہد جاوید برکی نے تراشا تھا See, Shahid Javed Burki, "Changing Perception, Altered Realities: Pakistan's Economy Under Musharraf 1999 - 2006"

۲۶۔ روزنامہ ڈان، انٹرنیشنل ایڈیشن، ۲ مئی ۲۰۰۲۔

۲۷۔ روزنامہ ڈان، انٹرنیشنل ایڈیشن، ۲۸ اگست ۲۰۰۴۔

۲۸۔ Ayesha Siddiqa, "Military Incorporation: Inside Pakistan's

"Military Economy"

۲۹۔ عائشہ صدیقہ جیسے ناقدین کا کہنا ہے کہ ۲۰۰۷ سے بھی پہلے مشرف حکومت نے امتیازی طور پر ان صحافیوں کو نشانہ بنانا شروع کر دیا تھا جنہوں نے اس حد تک اپنی لائن کراس کی تھی کہ اس کے نتیجے میں انہیں ہراساں کرنے اور بعض صورتوں میں "غائب" کیے جانے کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ Ayesha Siddiqa, "Military Incorporation: Inside Pakistan's Military Economy"

۳۰۔ Muhammad Waseem, " Democratization in Pakistan: A Study of the 2002 Elections (Karachi: Oxford University Press, 2006)

۳۱۔ See F.Grare, "The Resurgence of Baloch Nationalsim", South Asia Project Pakistan (January 2006)

۳۲۔ روزنامہ ڈان، انٹرنیشنل ایڈیشن، ۷ مئی ۲۰۰۴۔

۳۳۔ Muhammad Amir Rana, "Baloch Insurgency - A Backgrounder, South Asia Net Pakistan, PIPS (19 April 2004)

۳۴۔ مری فیملی بی ایل اے کیلئے نا صرف لیڈر شپ فراہم کرتی رہی ہے (پہلے خیر بخش مری اور اب بالاچ مری) بلکہ اس کیلئے فنڈز بھی اکٹھے کرتی رہی ہے (ہر بیار مری) یہ فیملی عظیم تر بلوچستان کے ساتھ کمیٹڈ ہے جو ایران، پاکستان اور افغانستان کے بلوچ علاقوں پر مشتمل ہے۔

۳۵۔ ساؤتھ ایشیا ٹیررازم پورٹل، پاکستان اسیسمنٹ ۲۰۰۸
www.satp.org/satporgt/countries/pakistan/index.htp

۳۶۔ یہ ملٹری کمانڈو سٹائل حملے تھے اور پاکستان کے اندر سیکورٹی اسٹیبلشمنٹ کے خلاف تھے جن کے نئی دہلی اور ممبئی میں شدید اثرات رونما ہوئے تھے۔

۳۷۔ www.satp.org/satporgt/countries/pakistan/index.htp

۳۸۔ انٹرنیشنل میڈیا سپورٹ، میڈیا ان پاکستان (جولائی ۲۰۰۹)۔

۳۹۔ ڈان انٹرنیشنل ایڈیشن، ۱۶ مئی ۲۰۰۴۔

۴۰۔ نیو یارک ٹائمز ۱۶ نومبر ۲۰۰۶ See Salman Masood, "Pakistan Moves towards Altering Rape Laws"

۴۱۔ See for example, International Crisis Group Reports: International Crisis Group, 2004 "Pakistan Reforming the Education Sector"

۴۲۔ See Robert Nichols, "Challenging the State: 1990's Religious Movements in th NWFP", in Craig Baxter and Charles Kennedy (eds) "Paksitan, 1997 (Boulder, CO: Westview Press,1998)

۴۳۔ David Hansen, "Redical Rhetoric - Modern Behaviours: Perception of Islam, Shari'a and the Radical Dimentsions Among Inhabitants of Islamabad and Rawalpindi in the Post 9/11 Pakistan Reality" Unpublished Ph.D Thesis, University of Oslo, June 2010

۴۴۔ ایضاً۔

۴۵۔ ایضاً۔

۴۶۔ Ian Talbot, "Pakistan: A Modern History" (London: Hurst, 2009)

۴۷۔ کچھ تجزیہ کاروں کا خیال ہے کہ میریٹ ہوٹل پر حملہ پاک فوج کی جانب سے باجوڑ میں کیے جانے والے آپریشن شیر دل کا ردعمل تھا۔

۴۸۔ Sartaj Aziz, "The Economic Cost of Extremism" in Usama Butt and N. Elahi (eds) "Pakistan's Quagmire: Security, Strategy and the Future of Islamic Nuclear Nation (New York: Continuum, 2010)

۴۹۔ جب مشرف نے دسمبر ۲۰۰۶ کو حتمی طور پر وردی اتارنے کا وعدہ کیا تو ایم ایم اے قومی سلامتی کونسل کی حمایت کرنے پر تیار ہوگئی۔ بعد میں وہ اپنے وعدے سے مکر گیا مشرف کی جانب سے وعدہ خلافی اور پرو امریکن پالیسیوں پر مسلسل کاربند رہنے کے

نتیجے میں مشرف کے ایم ایم اے کے ساتھ میں کشیدگی آ گئی۔

۵۰۔ Ayesha Siddiqa, "Military Incorporation: Inside Pakistan's Military Economy"

۵۱۔ ایضاً۔

۵۲۔ مزید تفصیلات کیلئے دیکھیے ایضاً۔

۵۳۔ محترمہ بے نظیر بھٹو کی موت کے بارے میں اقوام متحدہ کی انکوائری رپورٹ۔www.
un.org/news/infocus/pakistan/un_bhutto_report

۵۴۔ نتائج کے تفصیلی مطالعے کیلئے ملاحظہ فرمایئے: Ian Talbot, "Pakistan: A Modern History"

۵۵۔ زرداری اپنے بیٹے بلاول کے ساتھ مشترکہ طور پر پیپلز پارٹی کی قیادت کر رہے تھے۔ بلاول اس وقت آکسفورڈ میں اپنی تعلیم مکمل کر رہا تھا۔

☆☆☆

8

طوفان سے بچ نکلنے کی کوشش

زرداری کا پاکستان

پاکستان میں ۲۰۰۸ میں ہونے والے انتخابات ۱۹۷۰ کے انتخابات کے بعد شفاف ترین انتخابات سمجھے جاتے ہیں۔ ان انتخابات نے غیر متوقع طور پر بے نظیر کے شوہر اور ایک نہایت متنازعہ شخصیت آصف علی زرداری کو پاکستان میں سیاسی قیادت کے منصب پر فائز کر دیا(۱)۔ ۱۹۸۸ کے انتخابات میں بے نظیر کی فتح کی طرح یہ توقعات کہ ۲۰۰۸ کے انتخابات پاکستان کو ایک نئے دور میں داخل ہونے میں مدد دیں گے جلد ہی فنا کے گھاٹ اتر گئیں۔ ایک مرتبہ پھر ایک طویل فوجی آمریت کے بطن سے محض ایک نحیف و نزار جمہوریت برآمد ہوئی۔ اس دور میں کرپشن کے الزامات ۱۹۹۰ کی دہائی کی یاد دلاتے رہے۔ اگرچہ اس مرتبہ ایسا دکھائی دے رہا تھا کہ صدر کے انتظامی اختیارات کی بجائے جیوڈیشل ایکٹوازم ایک جمہوری طور پر منتخب حکومت کو فارغ کر کے گھر بھیج دے گا۔ بعد از ۲۰۰۸ کے دور کی جھولی میں بھی ۱۹۹۰ کی طرح ہی معاشی بحران اور گورننس میں مسلسل زوال کے پتھر موجود تھے۔ ان دونوں معاملات میں "دہشت گردی کے خلاف جنگ" کے باعث شدت آ گئی تھی جس کے حوالے سے سرکاری اعداد و شمار کا کہنا ہے کہ ۰۹-۲۰۰۸ تک پاکستان کو اس جنگ کی وجہ سے ۳۱.۴ ارب ڈالر کا نقصان برداشت کرنا پڑا ہے(۲)۔ تاہم یہ غلط ہوگا اگر ہم زرداری کے دور کو محض نوّے کی دہائی کی ناکام جمہوریت کا پرتو قرار دیں۔ اس دور میں ماضی سے کچھ نہ کچھ سبق سیکھنے کے

اشارے ضرور ملتے ہیں جن میں سے ایک یہ ہے کہ اس مرتبہ پیپلز پارٹی اور مسلم لیگ نون ۱۹۹۰ کی دہائی کی طرح ایک دوسرے کے ساتھ دست و گریبان ہونے سے گریزاں رہیں۔اکثر و بیشتر سامنے آنے والے کشیدگی کے دورانیوں اور آمنے سامنے کی محاذ آرائی کے باوجود دونوں پارٹیوں نے فوج کے ساتھ راز و نیاز کر کے حکومت گرانے کا موقع فراہم کرنے کے برعکس اسے اپنے معاملات میں دخیل ہونے کا موقعہ فراہم نہیں کیا۔زرداری کی مفاہمت کی سیاست کے حوالے سے کمٹمنٹ محض زبانی کلامی ثابت نہیں ہوئی۔اس نے صدارتی اختیارات کو رول بیک کرنے کی کوشش کی نیز مرکز اور صوبوں کے درمیان دیرینہ رنجشوں کو کم کرنے کی بھی کوشش کی۔تادم تحریر یہ واضح نہیں ہے کہ کیا اس کا نتیجہ مضبوط وفاقیت کی صورت میں نکلے گا یا یہ مرکز گریز قوتوں کو مضبوط کرنے کا باعث ثابت ہوگی۔

آئینی کارنامے بدقسمتی سے مسلسل جاری سلامتی کے بحران کی گرد میں کھو گئے ہیں۔اس دوران سوات اور شمالی و جنوبی وزیرستان سمیت ملک کے کئی علاقوں میں حکومت کی رٹ بری طرح چیلنج ہوئی۔اس دوران عوام کی رائے عامہ نے بھی ۹۰-۲۰۰۸ کی نسبت کروٹ بدلی اور پہلے دہشت گردی کے خلاف جنگ کو امریکہ جنگ قرار دینے والے اب اس بات پر متفق ہوتے جا رہے ہیں کہ یہ پاکستان کی اپنی جنگ ہے۔اس دوران اسلامی انتہاپسندوں کو بھارت کے خلاف استعمال کرنے کی دہائیوں پرانی حکمت عملی پلٹ کر پاکستان کی جانب واپس آئی۔چاہے یہ اکتوبر ۲۰۰۹ میں راولپنڈی میں فوج کے ہیڈکوارٹرز پر ہونے والا حملہ ہو، یا ۲۲ مئی ۲۰۱۱ کو کراچی میں شاہراہ فیصل پر واقع مہران بیس پر ہونے والی کارروائی ہو،فوج پر انکشاف ہوا ہے کہ اس کی خود اپنی تنصیبات تک محفوظ نہیں ہیں۔موخر الذکر حملے میں فوج کے کمانڈوز کو ۱۷ گھنٹے تک دور رکھا گیا اور اس دوران دہشت گردوں نے دو P3c اورین طیاروں کو تباہ کر دیا۔دہشت گردانہ حملوں میں بڑھتی ہوئی انسانی ہلاکتوں اور امریکی فوجیوں کی ایبٹ آباد کے کمپاؤنڈ پر حملے اور اسامہ بن لادن کو قتل کرنے کی کارروائی کا بھی شدید ردعمل سامنے آیا اور اس کے بعد ایک بار پھر رائے عامہ میں تبدیلی واقع ہونے لگی۔

سلامتی کے بحران کے جلو میں گورننس کے بحران نے بھی منہ کھول رکھا تھا۔یہ بحران نتیجہ تھا وفاقی حکومت کی اہلیت اور یکجائی کے فقدان کا۔صدر زرداری کی مہارت محض ڈیل کرانے میں تھی نا کہ سٹریٹجک وژن کے اظہار میں۔کوارڈی نیشن میں فقدان کا کھلم کھلا اظہار میڈیا کے ذریعے ہو رہا تھا جو کہ سیاست کی ۲۴/۷ گھنٹے کی نیوز کوریج بن چکا تھا۔پاکستان کی تاریخ میں ابھی تک کوئی ایسی حکومت نہیں آئی جو اس قدر سخت سکروٹنی کا شکار رہی ہو۔میڈیا فرینزی اکیسویں صدی کی پہلی دہائی میں کیبل نیٹ ورک کے پھیلاؤ کا براہ راست نتیجہ تھی۔مشہور و مقبول ٹی وی میزبان یا اینکر حضرات مثلاً جیو ٹی وی کے کامران خان نے پاکستان میں مقبول عام رویوں کی تشکیل میں جس قدر اثر پذیری کا اظہار کیا ہے اس کا ایک دہائی پہلے تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔جولائی/اگست ۲۰۱۰ کے سیلاب عظیم کے دوران حکومت کی نااہلی اور صدر زرداری کی غیر حاضری کی میڈیا کوریج کو فیصلہ کن لمحات قرار دیا جا سکتا ہے۔جیوڈیشل ایکٹوازم میں ڈرامائی اضافہ، جو مشرف دور کی ایک اور وراثت ہے، نے محاصرے میں آئی ہوئی پریشان حال حکومت کا تاثر مضبوط کیا۔۱۹۹۰ کی دہائی میں سابق صدور کی جانب سے ''دستوری انقلاب'' رونما ہوتے دیکھے جاتے تھے۔جبکہ بعد از مشرف دور میں ایسا دکھائی دے رہا تھا جیسے کہ اس مرتبہ سپریم کورٹ کسی بھی وقت منتخب حکومت وقت کا دھڑن تختہ کر دے گی اور اس کے نتیجے میں ممکنہ طور پر فوجی حاکمیت کا دور واپس آجائے گا۔۱۹۹۰ کی دہائی میں صدر، وزیر اعظم اور آرمی چیف پر مشتمل ''ٹرائیکا'' ہوا کرتی تھی جو تمام تر اختیار و اقتدار کا سرچشمہ تھی لیکن اکیسویں صدی کی دوسری دہائی میں ایسا دکھائی دے رہا تھا کہ اقتدار کی تکوین بدل چکی ہے اور اب ایک نئی قسم کی ٹرائیکا ابھر رہی ہے جس میں طاقت کے مراکز ''صدر، چیف جسٹس اور آرمی چیف'' پر مشتمل ہیں۔

جمہوری استحکام کے چیلنج ۱۹۹۰ کی دہائی کے مقابلے میں خاصے مختلف اور شدید نوعیت کے حامل ہو چکے تھے۔اگرچہ نئی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ پاکستان کے ''تاریخ کے بوجھ'' سے نئے تسلسل جنم لے رہے تھے۔بعد از ۲۰۰۸ دور میں حکومتی کارکردگی کی کوئی بھی متوازن تخمینہ کاری میں سب سے پہلے معاشی و سلامتی کے امور کے حوالے

سے مشرف دور کی وراثتوں کو مدنظر رکھنا پڑے گا۔

معاشی وراثتیں

پیپلز پارٹی کی زیر قیادت مخلوط حکومت نے ۲۰۰۸ میں ایک انحطاط پذیر معاشی صورتحال ورثے میں پائی تھی۔ نائن الیون کے بعد قرضوں کی ری شیڈیولنگ اور ان کی ادائیگی میں آسانی کے ہمراہ بڑے پیمانے پر ملک میں آنے والی بیرونی سرمایہ کاری اور بیرون ملک پاکستانیوں کی جانب سے بھاری ترسیلات زر نے پاکستان میں ناپائیدار کنزیومرازم کو پیدا کرنے میں مدد فراہم کی تھی۔ ۲۰۰-۲۰۰۵ کے پانچ سالوں کے دوران پاکستان کی جی ڈی پی میں اضافے کی شرح ۱-۶ فیصد رہی ۳۔ حقائق کے برعکس اس معاشی بہتری کا تمام تر کریڈٹ جنرل پرویز مشرف اور اس کا ٹیکنوکریٹ وزیر اعظم شوکت عزیز لیتا رہا تھا۔ گوکہ انہوں نے بیرون ملک سے پاکستان میں دولت کے بہاؤ کی حوصلہ افزائی کی تھی لیکن اس کے باوجود اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انہوں نے ملک کے دیرینہ معاشی مسائل کو حل کرنے کی جانب کوئی توجہ نہ دی جن میں ٹیکس ادائیگی کی کم ترین شرح، ٹیکسٹائل پر بہت زیادہ انحصار کا حامل ایکسپورٹ سیکٹر اور انسانی ترقی کی شرمناک ترین شرح شامل ہیں۔ مشرف حکومت نے ۲۰۰۶-۷ کے بعد سے شدید سیاسی دباؤ اور بگڑی ہوئی سلامتی کی صورتحال پر توجہ مرکوز کیے ہوئے تھی، بڑھتے ہوئے بجٹ کے قرضے اور غیر ملکی زرمبادلہ کے ذخائر کے حوالے سے خطرے کے سگنلز کو یکسر نظر انداز کر دیا۔ ملک میں اشیاء کی بڑھتی ہوئی قیمتوں اور افراط زر کا بیرونی قرضوں پر یہ اثر پڑا کہ ان کے حجم میں اضافہ ہوگیا کیونکہ ریاست مسلسل ایندھن اور کھانے پینے کی اشیا پر سبسڈری دیتی رہی تھی۔ ۲۰۰۸ کے انتخابات آتے آتے مشرف کے دور کی ابتدا میں ہونے والی معاشی ترقی تمام ہو چکی تھی (۴)۔ پاکستان کے سلامتی اور معاشی بحران ایک دوسرے کے ساتھ نہایت قریبی تعلق رکھتے ہیں۔ براہ راست بیرونی سرمایہ کاری مسلسل زوال آمادہ تھی جبکہ خودکش حملوں کی لہر نا صرف انسانی جانوں کے زیاں کا باعث بن رہی تھی بلکہ اس نے انفراسٹرکچر اور ملازمت کے مواقع کو بھی اپنی تباہ کاریوں

کی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ شمالی وزیرستان میں عسکریت پسندوں کی رٹ نے وسعت اختیار کی تو قبائلی علاقوں کے لڑکوں اور لڑکیوں کے تعلیمی مستقبل پر تاریک سائے منڈلانے لگے۔

پیپلز پارٹی کی حکومت بعد از انتخابات دور میں مسلم لیگ نون کے ساتھ سیاسی کشمکش اور صدارتی کردار میں الجھی رہی۔ یوں اس نے بڑھتے ہوئے معاشی بحران کو قرار واقعی اہمیت نہ دی۔ ۲۰۰۸ کے موسم خزاں تک تیل کی بڑھتی ہوئی قیمتوں نے افراط زر میں ۲۵ فیصد تک اضافہ کر دیا؛ اسی اثنا میں بنکنگ کے داخلی بحران نے سر اٹھایا تو غیر ملکی سرمایہ کاری گھٹ گئی؛ روپے کی قدر میں شدید کمی اور برآمدات میں تباہ کن صورتحال اس وقت پیدا ہوئی جب خوراک اور توانائی کی درآمدی قیمتوں میں اضافہ ہو رہا تھا۔ اس صورتحال کے نتیجے میں غیر ملکی قرضے کے حوالے سے پاکستان کے دیوالیہ ہونے کے آثار نمایاں ہونے لگے (۵)۔ نومبر ۲۰۰۸ تک غیر ملکی زرمبادلہ کے ذخائر کم ہو کر تقریباً ۳ء۴ ارب ڈالر رہ گئے تھے۔ جو کہ محض ایک مہینے کی درآمدات کیلئے کافی تھے (۶)۔ جب اس سال اکتوبر میں چین کے دورے کے دوران واضح ہو گیا کہ چین کسی صورت پاکستان کو بیل آؤٹ نہیں کرے گا تو صدر زرداری کو اپنے سابقہ موقف سے روگردانی کرتے ہوئے آئی ایم ایف سے رجوع کرنا پڑا۔ کرنٹ اکاؤنٹ کے خسارے کے معاملے میں استحکام پیدا ہوا جو مالی سال ۲۰۰۷-۸ میں جی ڈی پی کی ۸ء۵ کی شرح سے کم ہو کر ۲۰۰۹-۱۰ میں دو سے تین فیصد تک رہ گیا۔ بجٹ کا خسارہ بھی کم ہوا اور افراط زر نومبر ۲۰۰۸ کی انتہائی سطح ۲۵ فیصد سے کم ہو کر ۱۳ فیصد رہ گیا۔ اس عرصے میں بہتر ہوتی ہوئی معیشت نے پورٹ فولیو سرمایہ کاری میں ابھار دیکھا۔

اس کے باوجود ۲۰۱۰ کے سیلاب کی ہمہ گیر تباہ کاریوں سے بھی پہلے سیکورٹی کی صورتحال نے معیشت پر اپنے منحوس سائے دراز کرنا شروع کر دیئے تھے۔ ترقی کی سست رفتار شرح اور اس کے ساتھ ہی دائمی حالت اختیار کرتی افراط زر کے نتیجے میں ملک میں غربت اور معاشی ناہمواری میں بہت زیادہ اضافہ ہو گیا۔ یہ صورتحال ۱۹۹۰ کی دہائی کے جمہوری وقفے سے ملتی جلتی تھی (۷)۔ جولائی ۲۰۱۰ میں آئی ایم ایف کے مشن نے جس

کی قیادت عدنان مزاری کر رہے تھے، بے مہار اخراجات، بڑھتے ہوئے افراط زر، ریونیو کی اصلاحات کے عنقا ہونے اور پاور سیکٹر کی بری کارکردگی پر کھل کر اپنی تشویش کا اظہار کیا(۸)۔

جولائی۔اگست ۲۰۱۰ میں آنے والے سیلاب عظیم نے پاکستانی سرزمین کے پانچویں حصے کو پانیوں میں ڈبو دیا تھا۔جب اس سیلاب نے جنوب کا رخ کیا تو یہ دو کروڑ لوگوں کی زندگیوں کو متاثر کر چکا تھا۔اس دوران سیلاب کے تند و تیز دھاروں نے آٹھ لاکھ ۷۵ ہزار مکانات کو جزوی یا کلی طور پر نقصان پہنچایا اور فصلوں کو تقریباً ایک ارب ڈالر مالیت کے مساوی نقصان پہنچایا(۹)۔اس سیلاب کا باعث صوبہ خیبر پختونخوا کے بالائی علاقوں اور آزاد کشمیر میں ہونے والی غیر معمولی اور طوفانی بارشیں جو تواتر کے ساتھ ۷۲ گھنٹے جاری رہیں۔خیبر پختونخوا میں صرف دس روز کے دوران مون سون کی کل اوسط بارشوں سے چار گناہ زیادہ بارشیں ہوئیں۔اس کے نتیجے میں دریائے کابل اور دریائے سوات میں پانی کے طوفانی ریلے بہہ نکلے جنہوں نے وادی سوات کو غرقاب کر دیا۔اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر بیراجوں کا نظام درمیان میں نہ پڑتا تو دریائے سندھ اور دریائے کابل کی ڈاؤن سٹریم میں کہیں زیادہ طوفانی صورتحال ہوتی۔مظفر گڑھ کا ضلع اس سیلاب کے نتیجے میں بہت بری طرح تباہ ہوا جس کا باعث یہ تھا کہ تونسہ بیراج اور اس سے نکلنے والی نہروں کے بندوں میں کٹاؤ سے پانی کا رخ مظفر گڑھ کی طرف ہو گیا تھا۔یہ ضلاع پنجاب کے دیگر اضلاع کے مقابلے میں سب سے زیادہ متاثر ہوا تھا جہاں سے ۲۵ لاکھ لوگوں کو اپنے گھروں کو خیر باد کہنا پڑا جبکہ سینکڑوں دیہات مکمل طور پر تباہ ہو گئے۔اس کے ساتھ ہی ملک میں انجینئرنگ کے نظام میں خامیوں، نئے ڈیموں اور بیراجوں کی ضرورت اور دریا کے بندوں کی حفاظت میں بری طرح ناکامی کے سلسلے میں محکمہ آبپاشی کے اہلکاروں کی مجرمانہ غفلت پر رائے زنی کی جانے لگی۔اس سیلاب کے آنے سے یہ بھی انکشاف ہوا کہ ملک میں حفاظتی بندوں کی مضبوطی کے بارے میں بہت سی سکیمیں محض کاغذوں پر اپنا وجود رکھتی ہیں(۱۰)۔یہ بھی کھل کر سامنے آ گیا کہ دریاؤں میں جمع ہونے والی سلٹ کو نکالنے میں ناکامی نے بھی سیلاب کی تباہ کاریوں میں کلیدی کردار ادا

کیا تھا۔اس کے ساتھ ہی تسلسل کے ساتھ یہ شکایات بھی آنے لگیں کہ بالائی سندھ میں سرکاری اہلکاروں نے جان بوجھ کر شہروں کو بچانے کیلئے نہروں کے کناروں میں شگاف ڈال دیئے تھے اور پانی کے بہاؤ کا رخ دیہی آبادیوں کی طرف کر دیا تھا۔جب سیلاب سندھ میں مزید آگے بڑھا تو یہ شکایات بھی سامنے آئیں کہ جاگیرداروں نے اپنی زمینوں کو بچانے کیلئے پانی کا رخ غریب آبادیوں کی جانب کر دیا جس کے باعث وہاں زیادہ تر نقصان پہلے سے تباہ حال غریب آبادی اور ان کے کھیتوں اور مال مویشیوں کا ہو(۱۱)۔ڈیرہ اللہ یار خان اور اس کے ملحقہ ضلع جعفر آباد کی جانب سیلاب کا رخ کیے جانے کے باعث بلوچستان اور سندھ کے صوبوں کے درمیان کشیدگی بھی پیدا ہوئی۔اس حوالے سے بلوچ حکام کا دعویٰ تھا کہ سندھی اہلکاروں نے سیلاب کا رخ بلوچستان کی جانب کرنے کیلئے نہروں میں شگاف ڈالے اور دریائے سندھ کے بند توڑے تھے(۱۲)۔

سیلاب کے نتیجے میں نا صرف بہت بڑے پیمانے پر ریسکیو اور ریلیف آپریشنوں کی ضرورت پیش آئی بلکہ معاشی تجزیہ کاروں کے مطابق اس کے نتیجے میں ۲۰۰۹ کے معاشی بحران سے ملک کی بحالی بھی بہت بری طرح متاثر ہوئی تھی۔اس سیلاب کے باعث پہلے سے کمزور انفراسٹرکچر کو بری طرح نقصان پہنچنے اور بجلی کی فراہمی کی صورتحال میں شدید ابتری کے علاوہ پنجاب اور سندھ میں چاول اور کپاس کی کھڑی فصلیں تباہ ہو گئیں۔صرف پنجاب میں ۱۶ لاکھ ایکٹر رقبے پر کھڑی فصلیں زیر آب آئیں(۱۳)۔سب سے زیادہ کپاس پیدا کرنے والے ضلع رحیم یار خان میں تباہ کاری کے بعد اندازے لگائے گئے تھے کہ ماضی کی نسبت یہاں ۱۱-۲۰۱۰ کے مالی سال میں ۲۰ فیصد کم کپاس کی فصل پیدا ہوئی(۱۴)۔جنوبی پنجاب کے دیگر کپاس پیدا کرنے والے اضلاع میں بھی اس سے ملتی جلتی صورتحال تھی جس کی وجہ سے پاکستان کی ٹیکسٹائل انڈسٹری بری طرح متاثر ہوئی جو پاکستان کی برآمدات میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتی ہے۔یہ تباہی اس وقت ہوئی جب پاکستان کی افرادی قوت پہلے سے بے روزگاری اور نامساعد حالات کی شکار تھی(۱۵)۔یہ واضح ہے کہ اگلے برسوں میں اگر گروتھ کی شرح

بہت زیادہ نہ ہوئی تو پاکستان کو اس حوالے سے ایک اور بحران کا سامنا کرنا پڑے گا(۱۶)۔

سیکورٹی کی وراثت

معاشی صورتحال کی طرح سیکورٹی کی صورتحال نے بھی نئی منتخب ہونے والی حکومت کی کارکردگی بہت بری طرح متاثر کی۔۲۰۰۷ کے بعد سے اب تک القاعدہ کے ساتھ وابستہ عسکری گروپوں نے پاکستان کے ''کافر'' حکمرانوں کے خلاف کارروائیاں تیز کردی ہیں۔ریاست نے ماضی میں ایسی حالات پیدا کردیئے تھے کہ جہادی تنظیمیں ناصرف معاشی خودمختاری حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئی تھیں بلکہ انہوں نے خودکو مقامی سوسائٹی کے ساتھ اختلاط میں بھی کامیابی حاصل کرلی تھی۔مزید براں یہ کہ جیسا کہ اسامہ بن لادن کی پاکستان میں طویل روپوشی سے ظاہر ہوتا ہے سیکورٹی کے ڈھانچے میں موجود چھوٹے سیلوں نے اپنے کمانڈروں کے کنٹرول سے ماوراء ہوکر اپنے ایجنڈے پر عمل کرنے کی صلاحیت پیدا کرلی تھی۔ریاست کو اسلامی انتہاپسندوں کے خفیہ استعمال کی حکمت عملی کی قیمت بہر طور ادا کرنا تھی۔

آزادی کے بعد پاکستان کی پوری تاریخ نسلی تشدد اور بغاوتوں سے بھری پڑی ہے۔مشرف دور میں دو نئی باتیں ہمارے سامنے آئیں۔اول، ۲۰۰۶ کے بعد خودکش حملوں کا سلسلہ اور دوم، قبائلی علاقوں میں پہلی مرتبہ پاکستانی فوج کی تعیناتی۔پاکستانی فوج کو مسلسل اسلامی انتہاپسندوں کے ساتھ لڑنا پڑا۔یہ تصادم جیسا کہ ہم گزشتہ باب میں دیکھ چکے ہیں، جولائی ۲۰۰۷ میں اسلام آباد کی لال مسجد جو عسکریت پسندوں کا گڑھ تھی میں ہونے والے سانحے کے بعد شدت پکڑ گیا۔

فروری ۲۰۰۸ میں ہونے والے انتخابات جو بے نظیر بھٹو کے قتل کی وجہ سے موخر کردیئے گئے تھے، خودکش حملوں کی گرم بازاری کے دوران ہوئے تاہم انتخابات غیر متوقع طور پر پرامن ماحول میں تکمیل پذیر ہوگئے۔صوبہ خیبر پختونخوا میں پختون نسل پرست اے این پی کے اقتدار میں آنے کے بعد توقعات پیدا ہوئی تھیں کہ دیرپا

مذاکرات کے نتیجے میں قبائلی علاقوں میں امن کے قیام کا خواب شرمندہ تعبیر ہوسکے گا۔اس سے پہلے مشرف دور میں قبائلی شدت پسندوں کے ساتھ ہونے والے مذاکرات میں سے زیادہ تر کچھ ہی عرصہ چل پائے تھے۔۲۰۰۹ کے بعد سے وہاں ہونے والی فوجی مداخلت مشرف دور سے کہیں بڑے پیمانے پر تھی۔جس کا جواب عسکریت پسندوں نے پاکستانی شہروں میں خودکش حملوں سے دیا تھا۔

بڑے پیمانے پر فوجی آپریشنوں کا فیصلہ ملاکنڈ میں امن وامان کی بگڑتی ہوئی صورتحال کے پس منظر میں کیا گیا تھا۔اس موقع پر سیاستدانوں اور عوام دونوں نے محسوس کیا کہ دہشت گردی محض ایک خارجی عمل نہیں ہے نا یہ امریکہ کی افغانستان میں مداخلت کا نتیجہ ہے اس کے برعکس یہ ایک ناسور ہے جو ہمارے داخل سے ابھرا ہے اور اس کی وجہ سے پاکستان کے وجود کو خطرہ لاحق ہوچکا ہے۔تاہم یہ بھی طے ہے کہ سلامتی کے معاملے میں پیپلز پارٹی کی حکومت کے دوران پیدا ہونے والی قومی یکجہتی پر زیادہ خوش فہمی پر مبنی اندازے نہیں قائم کرنے چاہئیں۔بعد میں ہونے والے سروے رپورٹوں میں انکشاف کیا گیا تھا کہ درپیش صورتحال کے باوجود ٹی ٹی پی، فرقہ پرست گروپوں اور طویل مدت سے کشمیر جہاد سے وابستہ عسکری گروپوں کو عوام کے ایک حصے کی بدستور حمایت حاصل تھی (۱۷)۔

تحریک طالبان پاکستان کا قیام دسمبر ۲۰۰۷ کو عمل میں لایا گیا تھا جس کے اندر متعدد گروپ بیت اللہ محسود کی زیر قیادت اکٹھے تھے جس کی طاقت کا مرکز جنوبی وزیرستان تھا۔پاکستانی ریاست کا دعویٰ تھا کہ بیت اللہ محسود ملک میں ہونے والے بہت سے خودکش حملوں کا ماسٹر مائنڈ تھا جن میں بے نظیر بھٹو پر ہونے والا خودکش حملہ بھی تھا۔ٹی ٹی پی کوئی جسد واحد نہیں ہے بلکہ وہ اپنی چھتری تلے موجود بہت سی انتہا پسند تنظیموں کے درمیان رابطے کا کام کرتی ہے۔انتخابات کی ہنگامہ آرا صورتحال کے بعد ۲۰۰۸ کے آخر میں دہشت گردی کی کارروائیوں کی نئی لہر شروع ہوئی تھی۔اس مرتبہ میدان کارزار سوات کا علاقہ بنا تھا جہاں تحریک نفاذ شریعت محمدی نے ۱۹۸۰ کی دہائی میں اپنے قیام کے بعد اپنی سرگرمیوں کا سلسلہ شروع کررکھا تھا۔اس تحریک کی حمایت

زیادہ تر دریائے سوات کے مغربی کنارے پر آباد گوجروں اور آجروں میں تھی۔ ملاکنڈ میں ہونے والی بغاوت میں ٹی این ایس ایم تنہا نہیں تھی بلکہ ٹی ٹی پی بھی اس کے ساتھ شانہ سے شانہ ملائے کھڑی تھی۔ درحقیقت سوات طالبان کی قیادت صوفی محمد کا داماد ملا فضل اللہ کر رہا تھا جو وہاں پر ملا ریڈیو کے نام سے مشہور تھا۔ اس نے وہاں پر ایک غیر قانونی ایف ایم ریڈیو قائم کر رکھا تھا جس کے ذریعے وہ اپنے طرز کی شریعت کا پراپیگنڈا کرتا رہتا تھا۔ اس نے اپنا تنظیمی ہیڈ کوارٹرز امام ڈھیری کی پہاڑیوں میں واقع اپنے مدرسے میں قائم کر رکھا تھا۔ سوات میں بغاوت کی موجودہ لہر ۱۹۹۰ کی دہائی کے مقابلے میں کہیں زیادہ بے رحم تھی تاہم دونوں کا مقصد ریاست کو نشانہ بنانا تھا اور اس سلسلے میں سواتی طالبان مسلسل بنیادوں پر سرکاری تنصیبات اور عمارتوں پر حملے کر رہے تھے۔ بغاوت کی موجودہ لہر میں ایک اور نئی بات خودکش حملوں کی شمولیت بھی تھی جس کے نتیجے میں ہلاکتوں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ مثال کے طور پر سواتی طالبان نے ۲۳ اگست ۲۰۰۸ کو چارباغ کے پولیس اسٹیشن پر خودکش حملہ کیا جس میں بہت سے پولیس اہلکاروں کی ہلاکتیں ہوئیں۔ بغاوت کی نئی لہر ۲۰۰۶ کے بعد شروع ہو چکی تھی جس کا ابتدائی طور پر مرکز سوات کا ایک گاؤں سیبوجینی تھا تاہم وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ اس لہر میں شدت آتی چلی گئی۔ پاکستانی فوج سب سے پہلے اکتوبر ۲۰۰۶ میں عسکریت پسندوں کی سرکوبی کیلئے وہاں تعینات کی گئی تھی۔

۲۱ مئی ۲۰۰۸ کو خیبر پختونخوا کی حکومت اور عسکریت پسندوں کے درمیان ایک امن معاہدے پر دستخط کیے گئے۔ اس معاہدے کا بڑے پیمانے پر خیر مقدم کیا گیا تاہم عسکریت پسندوں نے اسے ریاست کی کمزوری پر محمول کیا۔ صرف چھ ماہ کے بعد وہاں دوبارہ تشدد پھوٹ پڑا۔ اس دوران سوات میں ایک بریلوی پیر سمیع اللہ کو سواتی طالبان نے قتل کر دیا اور پھر کچھ دن کے بعد اس کی لاش کو قبر سے نکال کر مینگورہ کے ایک معروف چوک جسے اس وقت "خونی چوک" کا نام دیا گیا تھا، میں پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔ یہ عوامی گذرگاہ کا مقام طالبان کی جانب سے دی جانے والی پھانسیوں کے حوالے سے ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ وہاں پھانسی پر لٹکائے جانے والوں میں سوات کا ایک ضلعی کونسلر

بخت زیبا بھی تھا جس نے بچوں کے بین الاقوامی دن کے موقع پر اپنی تقریر میں طالبان کی جانب سے لڑکیوں کے سکولوں کو بموں سے تباہ کرنے کی مذمت کی تھی (۱۸)۔

اپنے عملی اقتدار کے عرصے کے دوران طالبان نے سوات اور ملاکنڈ ایجنسی میں لڑکیوں کے ۱۵،۰۰ سکولوں کو تباہ کر دیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی طالبان نے وہاں "برائی" کے خاتمے کیلئے بھی جہاد شروع کر دیا۔ اس سلسلے میں سوات کے موسیقاروں اور اداکاروں پر عرصہ حیات تنگ کیا جانے لگا۔ طالبان نے اس دوران ۲ جنوری ۲۰۰۹ کو ضلع مینگورہ کی ایک معروف رقاصہ کو قتل کر دیا جس کے بعد قاتلوں نے اس کی لاش کو اس کی سی ڈیز اور کرنسی نوٹوں سے ڈھانپ دیا (۱۹)۔ ان تمام اشتعال انگیزیوں اور ظلم کے باوجود اگلے ماہ سواتی طالبان کے ساتھ ایک اور امن معاہدے کا ڈول ڈالا گیا۔ اس مرتبہ صوفی محمد کو میڈی ایٹر بنایا گیا۔ اس معاہدے کے نتیجے میں حکومت نفاذ نظام عدل ریگولیشن کے اجرا پر رضامند ہو گئی جس کے تحت ملاکنڈ میں شریعت کا نفاذ عمل میں آنا تھا۔ جب نظام عدل ریگولیشن کو ووٹنگ کیلئے قومی اسمبلی میں پیش کیا تو پارلیمنٹ میں موجود تمام جماعتوں نے کھل کر اس کا خیر مقدم کیا صرف ایم کیو ایم واحد جماعت تھی جو اس کارروائی کے دوران غیر حاضر رہی۔ سول سوسائٹی کے بعض حلقوں نے اسے عسکریت پسندی کے سامنے ہتھیار ڈالنے کے مترادف قرار دیا (۲۰)۔ طالبان کی جانب سے اس معاہدے کی فوری بعد خلاف ورزی کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا۔ انہوں نے قریبی اضلاع بونیر اور لوئر دیر کی جانب پیش قدمی شروع کر دی اور عملی طور پر وہاں قبضہ کر لیا۔ طالبان کی اصل نیت کھل کر سامنے آنے کے بعد اپریل میں "آپریشن راہ راست" کا فیصلہ کیا گیا۔ طالبان کو کچلنے کیلئے سوات میں ۲۰،۰۰۰ ہزار فوجی تعینات کیے گئے۔ آپریشن سے پہلے فوج نے لوگوں سے درخواست کی کہ وہ اپنی سلامتی کے پیش نظر سوات چھوڑ کر محفوظ مقامات کی طرف چلے جائیں جس پر افرتفری کے عالم میں سوات سے شہریوں کا انخلا شروع ہو گیا۔ اس دوران ہزاروں شہری بے گھر ہو کر خیبر پختونخوا میں قائم کیے گئے پناہ گزین کیمپوں میں عارضی طور پر پناہ حاصل کرنے پر مجبور ہو گئے۔ اس کے فوری بعد سوات میں فوجی آپریشن شروع ہوا جس میں حکومت کے اعداد و شمار کے

مطابق ۴۴۰ فوجی افسران اور جوان کام آئے جبکہ ۴،۰۰۰ عسکریت پسند ہلاک ہوئے(۲۱)۔

بعد ازاں فوجی آپریشن کو جنوبی وزیرستان تک پھیلا دیا گیا جہاں اکتوبر ۲۰۰۹ کو ٹی ٹی پی کے محفوظ ٹھکانوں پر آپریشن شروع کردیا گیا۔۲۰۰۴ میں وہاں کیے جانے والے نیم دلانہ فوجی آپریشنوں کے برعکس جن کا اختتام کئی امن معاہدوں کی صورت میں ہوا جن میں سے کوئی بھی اپنے انجام کو نہ پہنچا، اس مرتبہ غیر متوقع طور پر فوج نے آپریشن ''راہ نجات'' شروع کیا جس میں اس نے تیزی سے پیش قدمی کی۔اس آپریشن کی کامیابی کیلئے ٹی ٹی پی کو علاقے میں موجود ملا نذیر اور حافظ گل بہادر کے دھڑوں سے کاٹ دیا(۲۳)۔ٹی ٹی پی پہلے ہی اگست کے مہینے میں ایک ڈرون حملے میں بیت اللہ محسود کی ہلاکت کے صدمے سے دوچار تھی۔اس آپریشن کے ابتدائی ۲۰ دنوں کے اندر ہی فوج نے جنوبی وزیرستان کے بڑے شہری مراکز اور کلیدی اہمیت کے دیہات پر قبضہ کرلیا۔عسکریت پسندوں نے وہاں جم کو فوج کا مقابلہ کرنے کی بجائے پسپائی اختیار کرنے اور فرار ہوکر ہمسائیہ شمالی وزیرستان چلے جانے میں عافیت سمجھی۔اس کے ساتھ ہی انہوں نے جوابی طور پر پشاور میں خودکش حملوں کا نیا سلسلہ شروع کردیا جسے دسمبر ۲۰۰۹ تک راولپنڈی اور پشاور تک پھیلا دیا گیا۔یہ خودکش حملے تسلسل کے ساتھ ۲۰۱۰ میں بھی جاری رہے۔

وزارت داخلہ کے کرائسس مینجمنٹ سیل کے مطابق ۲۰۱۰۔۲۰۰۹ کے دوران ہونے والے ۱،۹۰۶ حملوں میں ۱۸،۳۵ شہری جاں بحق جبکہ ۵،۱۹۴ زخمی ہوئے تھے(۲۴)۔تسلسل کے ساتھ جاری سلامتی کے بحران پر بین الاقوامی شہرت یافتہ جریدے ''فارن پالیسی'' نے جون ۲۰۱۰ میں امریکی حکومت کی جانب سے ایک انڈیکس شائع کیا تھا جس میں پاکستان کو دنیا کی دسویں ناکام ریاست قرار دیا گیا تھا۔اس فہرست میں صرف صومالیہ اور افغانستان پاکستان سے آگے تھے۔فہرست میں صومالیہ کا پہلا، افغانستان کا دوسرا اور پاکستان کا تیسرا نمبر تھا(۲۵)۔اس سے قبل اسی ماہ امریکہ کے دفتر خارجہ کے گلوبل پیس انڈیکس میں پاکستان کو دنیا کا پانچواں غیر مستحکم ترین ملک

قرار دیا گیا تھا۔اس فہرست میں عراق، صومالیہ، افغانستان اور سوڈان کو پاکستان پر سبقت حاصل تھی(۲۶)۔اس دوران پاکستانی حکومت سنجیدگی کے ساتھ آپریشن کا دائرہ شمالی وزیرستان تک پھیلانے پر غور کرتی رہی۔یہاں بہت سے عسکریت پسند گروپوں کے ٹھکانے تھے جن میں حقانی نیٹ ورک بھی شامل تھا جس کے بارے میں امریکہ کا خیال تھا کہ وہ القاعدہ کے ساتھ منسلک ہے اور مشرقی افغانستان میں امریکہ فوجوں پر ہونے والے حملوں میں وہ سب سے زیادہ سرگرم کردار ادا کررہا ہے۔

پاکستانی فوج اس سے قبل باجوڑ ایجنسی میں بھی کامیاب آپریشن کرچکی تھی۔

متنازعہ طور پر اس بات کے امکانات بھی پیدا ہوئے کہ فوج جنوبی پنجاب میں بھی فوجی آپریشن کرنے جارہی ہے کیونکہ اس بات کے بہت زیادہ شواہد ملے تھے کہ ۲۰۱۰ اور ۲۰۰۹ کے دوران ہونے والے بم حملوں اور خودکش دھماکوں میں صرف قبائلی علاقے میں موجود عسکری گروپوں کا ہاتھ نہیں ہے بلکہ اکثر وارداتوں میں جنوبی پنجاب سے تعلق رکھنے والے فرقہ پرست گروپ بھی ملوث رہے ہیں۔

گوکہ پنجاب میں مسلم لیگ نواز کی حکومت نے سختی کے ساتھ اس بات کی تردید کی کہ جنوبی پنجاب میں عسکریت پسندی کا وجود ہے تاہم اسلام آباد، راولپنڈی اور لاہور میں ہونے والے بم حملوں کے تناظر میں مغربی اور پاکستانی صحافی بار بار پنجابی طالبان کا نام لیتے رہے(۲۷)۔مثال کے طور پر پنجابی طالبان کو ستمبر ۲۰۰۸ میں میریٹ ہوٹل اسلام آباد میں ہونے والے بم حملوں میں ملوث بتاتا جاتا ہے جس میں ۵۰ افراد جاں بحق ہوئے تھے۔اسی طرح راولپنڈی میں جی ایچ کیو پر حملے جسے پاکستان کا ۱۰/۱۰ کہا جاتا ہے میں بھی پنجابی طالبان کے ملوث ہونے کے شواہد ملے تھے(۲۸)۔پنجابی طالبان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ کالعدم سپاہ صحابہ پاکستان (ایس ایس پی)، لشکر جھنگوی (ایل ای جے) اور جیش محمد (جے ای ایم) جیسی فرقہ پرست تنظیموں کا ایک ڈھیلا ڈھالا اتحاد ہے جو اس سے قبل کشمیر کے محاذ پر جہادی سرگرمیوں اور اندرون ملک فرقہ وارانہ تشدد میں ملوث رہا ہے(۲۹)۔

جبکہ اکتوبر ۲۰۰۹ میں جنوبی وزیرستان میں فوجی آپریشن کے جواب میں پنجابی

طالبان کے حملوں نے شدت پکڑلی تھی، ضروری ہے کہ سپاہ صحابہ، لشکر جھنگوی اور جیش محمد کی اورینٹیشن کو تاریخ کے تناظر میں ایک مرتبہ پھر سے جانچ لیا جائے۔۲۰۰۷ میں اسلام آباد کی لال مسجد پر فوجی آپریشن سے قبل یہ تنظیمیں ریاست کے دفاعی اداروں پر حملے نہیں کرتی تھیں(۳۰)۔ پنجاب میں اپنی بنیادیں رکھنے والی لشکر طیبہ اس سارے عمل کے دوران اس نیٹ ورک سے لاتعلق رہی اور اس نے پاکستان کی سیکورٹی فورسز پر حملے کرنے سے گریز کیا۔لشکر طیبہ کا ہیڈکوارٹر وسطی پنجاب میں جبکہ لشکر جھنگوی، سپاہ صحابہ اور جیش محمد کے ہیڈکوارٹرز جنوبی پنجاب کے علاقوں میں واقع ہیں(۳۱)۔ضیاء الحق کے ابتدائی دور میں جب ایران میں شیعہ انقلاب روپذیر ہوا تو اس کے ردعمل کے طور پر پاکستانی ریاست نے سنی اسلام کی سرپرستی شروع کردی تھی۔اس دوران لشکر طیبہ کی طرح پنجابی طالبان نیٹ ورک سے تعلق رکھنے والی دیگر مذکورہ تنظیموں کو بھی آئی ایس آئی نے ہرطرح سے سپورٹ فراہم کی تھی۔

پنجاب کے پانچ کلیدی اضلاع بہاولپور، بہاولنگر، ڈیرہ غازی خان، رحیم یار خان اور راجن پور کو قومی اور بین الاقوامی میڈیا میں پنجابی طالبان کے گڑھ کے طور پر جانا جاتا ہے۔ڈیرہ غازی خان میں ۲۰۰۹ میں ایک بڑا خودکش حملہ ہوا تھا جو فرقہ ورانہ نوعیت کا تھا۔اس حوالے سے ملنے والے شواہد کے مطابق اس میں مقامی سپاہ صحابہ اور ٹی ٹی پی کے بیت اللہ محسود کا مشترکہ طور پر ہاتھ تھا۔اس کی سٹریٹیجک لوکیشن بہت اہمیت کی حامل ہے۔ایک جانب یہ جنوبی وزیرستان کے قریب واقع ہے تو دوسری جانب اس کے ساتھ بلوچستان کی سرحد بھی لگتی ہے اس کے ساتھ ہی نیوکلیئر کی پیداوار کے حوالے سے سہولیات بھی اس کے قریب واقع ہیں جس کی وجہ سے مغربی مبصرین یہاں پر طالبانائزیشن کے پھیلاؤ کے حوالے سے خاص طور پر تشویش میں مبتلا ہیں۔وکی لیکس کے مطابق نومبر ۲۰۰۸ میں لاہور کے امریکی قونصل خانے کی جانب سے بھیجی جانے والی ایک کیبل میں کہا گیا تھا کہ جہادیوں کے دو یا اس سے زیادہ تربیتی کیمپ بہاولپور اور ایک ڈیرہ غازی خان کے قرب و جوار میں کام کررہے ہیں۔اسی کیبل میں یہ بھی انکشاف کیا گیا تھا کہ عرب ملکوں کی جانب سے جنوبی پنجاب کے اضلاع میں

انتہاپسندوں کو ۱۰۰ ملین ڈالر کی رقم بھیجی گئی ہے(۳۲)۔

جنوبی پنجاب صوبے کے دیگر علاقوں کی نسبت کہیں زیادہ غربت کی دلدل میں دھنسا ہوا ہے۔ڈیرہ غازی خان اور راجن پور کے اضلاع دیہی پنجاب میں پائی جانے والی غربت کے اعتبار سے علی الترتیب تیسرے اور پہلے نمبر پر ہیں(۳۳)۔تاہم ان اضلاع میں غربت کی پوزیشن اندرون سندھ، بلوچستان اور خیبر پختونخوا کے مقابل میں بدرجہا بہتر ہے۔اگر عام خیال کے مطابق غربت ہی دہشت گردی کو پروان چڑھانے کا واحد سبب ہوتا تو انے سب سے زیادہ سندھ میں فروغ پانا چاہیے تھا لیکن وہاں پر دہشت گردی کے سودے کا کوئی خریدار نہیں ہے۔

اگر پاکستانی مدارس اور عسکریت پسندی کے درمیان تعلق کو مدنظر رکھا جائے تو کچھ تجزیہ کاروں کے خیال میں ۱۹۸۰ کی دہائی سے دیوبندی مدارس کے پھیلاؤ کا جو اضلاع خاص طور پر ہدف رہے ہیں ان میں جنوبی پنجاب کے ڈیرہ غازی خان، رحیم یار خان، بہاولپور اور بہاولنگر اضلاع سرفہرست دکھائی دیتے ہیں۳۴۔۲۰۰۸ کے انٹیلی جنس بیورو کے اعداد و شمار کے مطابق رحیم یار خان ضلع میں ۵۵۹ مدارس ہیں جس کے بعد بہاولپور کا نمبر آتا ہے جہاں ۴۸۱ مدارس قائم کیے گئے تھے جبکہ تیسرے نمبر پر بہاولنگر ہے جہاں ۳۱۰ مدارس کام کررہے ہیں(۳۵)۔لاہور کے بعد بہاولپور میں پنجاب کے کسی بھی ضلع سے زیادہ مساجد تعمیر کی گئی ہیں۔ان علاقوں میں مساجد اور مدارس کے کھمبیوں کی طرح اگنے کے پیچھے ایک فیکٹر یہ ہے کہ یہ علاقے ہمیشہ سے روایتی طور پر صوفی اسلام کا گڑھ رہے ہیں۔صوفی اسلام میں مزارات کا بہت اہم کردار ہوتا ہے۔چونکہ دیوبندی اسلام کے پیروکار اسے غیر اسلامی سمجھتے ہیں لہٰذا انہوں نے اسے کاؤنٹر کرنے کیلئے اپنی توجہ کا مرکز انہیں علاقوں کو بنایا گیا۔اپریل ۲۰۰۹ میں اخبارات میں شائع ہونے والی رپورٹوں کے مطابق جیش محمد کے جنگجو بہاولپور، بہاولنگر اور رحیم یار خان کے اضلاع میں بڑے پیمانے پر بریلوی مسلک کی مساجد پر بزور قبضہ کررہے ہیں۔پاکستان کی مختلف جگہوں میں واقع صوفیوں کے مزارات پر بھی انہی لوگوں نے حملے کیے تھے۔اس سلسلے میں جولائی ۲۰۱۰ میں لاہور میں واقع داتا گنج بخش کے مشہور و

معروف مزار پر خودکش حملے کیے گئے تھے جن میں بہت سی ہلاکتیں ہوئی تھیں۔اس کے علاوہ خیبر پختونخوا میں بھی صوفی مزارات کو بم حملوں سے تباہ کیا گیا۔

گوکہ جنوبی وزیرستان سے ڈیرہ غازی خان ضلع میں بڑی تعداد میں طالبان کے روپوش ہونے کے معاملے پر بہت توجہ دی گئی ہے تاہم اس سلسلے میں قیام پاکستان کے وقت ہونے والی ہجرت بھی بہت زیادہ اہمیت کی حامل ہے۔اس جانب بہت کم توجہ دی گئی ہے تاہم یہ حقیقت ہے کہ تقسیم کے وقت ہجرت کا عمل اپنے اندر عسکریت پسندی کے آثار چھپائے ہوئے ہے۔یہ واضح ہو چکا ہے کہ بہاولپور جیسے اضلاع میں مقامی آبادی نہیں بلکہ ہندوستان سے آئے ہوئے مہاجر تھے جنہوں نے دیوبندی مساجد اور مدارس کے قیام میں سرگرم کردار ادا کیا۔جھنگ میں سپاہ صحابہ کے حوالے سے کیے جانے والے کام سے ظاہر ہوتا ہے کہ وسطی پنجاب کے اس ضلع میں مہاجر آبادی نے انتہا پسند سنی مسلک کی جڑیں مضبوط کرنے کیلئے کام کیا۔یہ وہ لوگ تھے جنہیں مقامی شیعہ زمینداروں نے طاقت کے حصول سے باز رکھا تھا۳۶۔اس میں کوئی شبہ نہیں کہ فرقہ پرستی اور کشمیر جہاد کیلئے سپورٹ ہندوستان سے مہاجرت کرکے آنے والی آبادی میں زیادہ مقبول تھی اور اسی نے انتہاپسندی کی فروغ کیلئے بنیادیں فراہم کی تھیں۔یہی معاملہ جنوبی پنجاب میں بھی تھا۔تاہم ایک فرق کے ساتھ کہ سنی انتہاپسندوں کا ہدف نا صرف شیعہ آبادی ہے بلکہ بریلوی بھی ان کے نشانے پر ہیں۔عسکریت پسندوں کو وہاں بھرتی کے مسائل کا سامنا نہیں کرنا پڑتا،صرف ڈیرہ غازی خان شہر میں مہاجر آبادی کی تعداد مقامی آبادی کے نصف کے برابر ہے۔اس حوالے سے مزید کام کرنے کی ضرورت ہے لیکن جو کچھ ہم جانتے ہیں وہ ہمارے ان اندازوں کی توثیق کیلئے کافی ہے۔ایک اور اہم بات یہ ہے کہ ۲۰۰۰ میں جیش محمد کی بنیاد رکھنے والے مسعود اظہر نے بہاولپور شہر میں پرورش پائی تھی (۳۷)۔اسی طرح لشکر طیبہ اور اب الدوۃ والارشاد کے امیر حافظ محمد سعید کا خاندان بھی ۱۹۴۷ میں مشرقی پنجاب کی سرزمین سے ہجرت کرکے آیا تھا۔اگرچہ جیش محمد ۲۰۰۱ سے کالعدم ہے لیکن اس کے باوجود بہاولپور شہر میں جسے یہ لوگ دارالجہاد قرار دیتے ہیں، یہ بہت مضبوط حیثیت کی حامل ہے۔

۲۰۱۰ میں آنے والے سیلاب نے زیادہ تر جنوبی پنجاب کے ان علاقوں میں تباہی مچائی تھی جو غربت، پسماندگی اور مذہبی انتہاپسندی کا گڑھ ہیں۔کچھ تجزیہ نگاروں نے اس خدشے کا اظہار کیا ہے کہ سیلاب کی تباہ کاریوں کے نتیجے میں وہاں غربت اور روزگار کی کمی کے مسائل زیادہ شدید صورت اختیار کرلیں گے اور فرقہ پرست عسکری گروہوں کو نوجوانوں کی فرسٹریشن اور احساس محرومی کو اپنے مقاصد کیلئے استعمال کرنے میں زیادہ آسانیاں ہوں گی۔اس وقت کی اخباری رپورٹوں کے مطابق جماعت الدعوۃ کے فلاحی ونگ ''فلاح انسانیت فاؤنڈیشن'' نے سیلاب کے دوران ان علاقوں میں بڑے پیمانے پر امدادی سرگرمیوں میں حصہ لیا تھا۔گوکہ یہ فلاحی سرگرمیاں وہاں لازمی طور پر اس لیے نہیں کی گئی تھیں کہ وہاں سے نئی ریکروٹنگ کی جائے تاہم یہ سرگرمیاں ریاست کی اس ناکامی کو ضرور منکشف کرتی ہیں کہ وہ اپنے شہریوں کے دلوں اور دماغوں کو جیتنے کے سلسلے میں اس کے حصے میں ہمیشہ سے آتی رہی ہے (۳۸)۔اسی قسم کی صورتحال ۲۰۰۵ میں آزاد کشمیر اور صوبہ خیبر پختونخوا کی ہزارہ ڈویژن میں آنے والے ہولناک زلزلے کے فوری بعد پیش آئی تھی۔

پیپلز پارٹی اور مسلم لیگ نون کے متعدد رہنماؤں بشمول وزیراعلیٰ پنجاب شہباز شریف نے ۲۰۱۰ کے سیلاب کے بعد خبردار کیا تھا کہ ریاستی اداروں کی جانب سے ریلیف اور بحالی کے مناسب اقدامات کی غیر موجودگی میں انتہا پسند گروپوں کی آبادی کے ایک بڑے حصے پر گرفت مزید مضبوط ہوجائے گی (۳۹)۔سیلاب کی تباہ کاریوں کے دوران سیلابی پانی میں گھرے مظفر گڑھ میں بے گھر اور بے یارومددگار نوجوانوں کی طرف سے امدادی قافلوں کے ٹرکوں کو جادے والا کے مقام پر روک کر لوٹ مار کرنا اسی فرسٹریشن اور احساس محرومی کا اظہار ہے۔اس واقعے کے بعد پاکستان پاورٹی الیویشن فنڈ اور دیگر اداروں کو عارضی طور پر اپنی ریلیف سرگرمیاں معطل کرنا پڑی تھیں (۴۰)۔

۲۰۱۰ کے سیلاب کے دوران متاثرہ علاقوں میں عام آبادی کے ساتھ ساتھ عسکری گروپوں کی کمیونیکیشن کا نظام تباہی کا شکار ہوا تھا۔اس کے باوجود ۴ اگست کو پشاور کی چھاؤنی کے قلب میں ایک خودکش حملہ کیا گیا جس میں فرنٹیئر کانسٹیبلری کے کمانڈنٹ

صفوت غیور جاں بحق ہوئے تھے۔یہ حملہ نا صرف یہ ظاہر کرتا ہے کہ اس وقت بھی ٹی ٹی
پی کا آپریشنل نیٹ ورک فعال تھا بلکہ یہ ٹی ٹی پی کی سفاکیت کا اظہار ہے کہ قومی
ایمرجنسی کی حالت بھی اسے اپنی کارروائیاں جاری رکھنے سے باز نہیں رکھ سکتی۔
اسامہ بن لادن کے قتل والے واقعے کے بعد ایسے شواہد ملتے ہیں کہ لشکر طیبہ
نے القاعدہ کے ساتھ اپنے دیرینہ مراسم ختم کر دیئے تھے بلکہ انہی دنوں اس نے ٹی ٹی پی
کے ساتھ بھی فاصلے بڑھا لیے تھے۔اس سے قبل لشکر طیبہ پنجابی طالبان کے ساتھ بھی
لاتعلقی کا اظہار کر چکی ہے۔لشکر طیبہ کے پاکستانی حکام کے ساتھ، شواہد کے مطابق،
روابط برقرار ہیں اور وہ بھارت کے خلاف ایک کارآمد اثاثے کے طور پر ان کی سپورٹ
حاصل کیے۔علاوہ ازیں سعودی حکام بھی اسے اپنے مقاصد کیلئے کارآمد سمجھتے ہیں۔ٹی ٹی
پی القاعدہ کے ساتھ تعلق کی وجہ سے سعودی عرب کے خلاف ہے، اسی قدر جس قدر کوئی
انتہاپسند شیعہ ہوسکتا ہے اور وہ موقع ملنے پر پاکستان میں سعودی مفادات پر حملے بھی
کر سکتی ہے۔قابل ذکر بات یہ ہے کہ اس نے ۱۶ مئی ۲۰۱۱ کو کراچی میں ایک سعودی
سفارت کار کو گولیاں مارے جانے کے واقعے میں مبینہ حملہ آوروں کو اپنی بھرپور حمایت کا
یقین دلایا تھا(۴۱)۔

سیاسی اور آئینی ڈویلپمنٹ

۲۰۰۸ کے انتخابات کے بعد شدت سے یہ امید پیدا ہوئی تھی کہ تبدیل شدہ
حالات میں پاکستان آزادی کے بعد بری گورننس، مطلق العنانیت، علاقائی کشیدگی اور
عدم استحکام کے سائیکل کو ختم کر دے گا نا صرف اس لیے کہ مین سٹریم پارٹیوں نے
مشرف کے حواریوں کو بری طرح پچھاڑ دیا تھا بلکہ اس لیے بھی کہ پیپلز پارٹی اور مسلم
لیگ نون ایک دوسرے کے ساتھ مل کر آگے بڑھیں گی۔اس وقت اس بات کا کھل کر
اظہار کیا جا رہا تھا کہ ۱۹۹۰ کی دہائی میں دونوں پارٹیوں نے آپس کی لڑائیوں میں
جمہوری استحکام کو بری طرح نقصان پہنچایا تھا۔بے نظیر بھٹو کی موت دونوں پارٹیوں کی
قیادت کو اس قدر قریب لے آئی تھی جتنی کہ پہلے کبھی وہ اس دوسرے کے اس قدر قریب

نہ آئی تھیں۔انتخابات کے بعد پیپلز پارٹی اور مسلم لیگ نون کی مخلوط حکومت گو کہ بہت
مختصر ثابت ہوئی تھی لیکن دونوں پارٹیوں نے مشرف کو مواخذے کی دھمکی دے کر اقتدار
سے علیحدہ ہونے پر مجبور کر کے ایک دوررس نتائج کا حامل کام کیا تھا۔آصف علی زرداری
مشرف کے جانشین صدر بنے تھے اور مسلم لیگ نون نے کوئی خاص مزاحمت نہیں کی
تھی۔مسلم لیگ نون نے وزیراعظم یوسف رضا گیلانی کی حکومت سے علیحدگی اختیار کر لی
تھی کیونکہ آصف علی زرداری اعلیٰ عدلیہ کے ججوں بشمول چیف جسٹس افتخار محمد چودھری
جنہیں جنرل مشرف نے ۳ نومبر ۲۰۰۷ کو ایمرجنسی لگانے کے بعد معطل کر کے گھروں
میں نظر بند کر دیا تھا، کو بحال کرنے میں لیت ولعل سے کام لے رہے تھے۔ان ججوں کی
بحالی کی شرط مارچ ۲۰۰۸ میں بھوربن کے مقام پر طے پانے والے ایک معاہدے کی
اہم ترین شق تھی جس کے بعد مسلم لیگ نون نے پیپلز پارٹی کے ساتھ حکومت میں
شمولیت اختیار کر لی تھی۔آصف علی زرداری کی جانب سے بھوربن معاہدے کی خلاف
ورزی کے خلاف بطور احتجاج مسلم لیگ نون حکومت سے باہر آ گئی اور دونوں مرکزی
پارٹیوں کے درمیان ایک بار پھر کشیدہ صورتحال جنم لینے لگی۔نوازشرف اور زرداری کے
درمیان ججوں کی بحالی کے مسئلے پر پیدا ہونے والے اختلاف نے سب سے بڑے
صوبے پنجاب کی مخلوط حکومت پر بھی اپنے اثرات مرتب کرنا شروع کر دیئے جہاں پیپلز
پارٹی جونیئر حیثیت سے میاں شہباز شریف کی قیادت میں بننے والی حکومت میں مسلم
لیگ نون کے ساتھ شریک اقتدار تھی۔پنجاب میں دونوں پارٹیوں کے درمیان شدید
کشیدگی کا ماحول طول پکڑنے لگا۔اس دوران اس وقت کی سپریم کورٹ میں بیٹھے
مشرف کے پسندیدہ ججوں نے شریف برادران کو اسمبلی کی رکنیت کیلئے نااہل قرار دے
دیا۔اس کے فوری بعد صدر آصف علی زرداری نے فاش غلطی کا ارتکاب کرتے ہوئے ۲۵
فروری ۲۰۰۹ کو گورنر راج نافذ کر دیا۔
پنجاب میں گورنر راج کے نفاذ کے بعد مسلم لیگ نون بطور احتجاج سڑکوں پر
آ گئی اور اس نے معزول ججوں کی بحالی کیلئے سخت عوامی احتجاج شروع کر دیا۔اسی دوران
میاں نواز شریف نے ججوں کی بحالی پر حکومت کو مجبور کرنے کیلئے وکلاء اور اپوزیشن کی

دیگر جماعتوں کے ساتھ مل کر لاہور سے اسلام آباد کی طرف لانگ مارچ کی کال دے دی۔ لانگ مارچ شروع ہوا تو امن وامان کی صورتحال کو شدید خطرات لاحق ہو گئے۔ اس پر آرمی چیف اشفاق پرویز کیانی نے وزیر اعظم یوسف رضا گیلانی کے ساتھ ملاقات کی۔ دونوں کے درمیان نامعلوم مدت تک جاری رہنے والی اس ملاقات کے نتیجے میں پیپلز پارٹی نے اپنی اس پوزیشن سے یوٹرن لیا کہ وہ کسی بھی صورت ججوں کی بحالی کیلئے کسی کی بلیک میلنگ میں نہیں آئے گی اور فوری طور پر ۲۱ مارچ کو چیف جسٹس افتخار محمد چودھری سمیت تمام ججوں کو بحال کرنے کا اعلان کر دیا۔ اس اعلان کے نتیجے میں دونوں جماعتوں کے درمیان بڑھتی ہوئی محاذ آرائی کا خاتمہ ہو گیا۔ جلدی ہی صدر آصف علی زرداری نے پنجاب سے گورنر راج اٹھا لیا اور پنجاب کی وزارت اعلیٰ پر میاں شہباز شریف واپس آ گئے۔ تاہم پیپلز پارٹی کی جانب سے پنجاب کی حکومت کو برطرف کرنے کے دور رس اثرات اس وقت دیکھے گئے جب ستمبر ۲۰۰۹ کے آخر میں شہباز شریف نے آرمی چیف کے ساتھ راولپنڈی میں ایک خفیہ ملاقات کی ۴۲۔ جب یہ خبر عام ہوئی تو کہا گیا کہ مسلم لیگ نون فوج کے ساتھ مل کر صدر زرداری کو اقتدار سے باہر کرنا چاہتی ہے۔ ۱۹۹۰ کی دہائی میں بھی بے نظیر بھٹو اور میاں نواز شریف فوج کا سہارا لے کر جمہوریت کو غیر مستحکم کرنے کا کام کر چکے۔

تاہم یہ کہنا غلط ہوگا کہ ۱۹۹۰ کی دہائی کی غلطیوں کو من وعن دہرایا جا رہا ہے۔ اس حوالے سے دونوں جماعتیں بلوغت کا مظاہرہ کر چکی تھیں جب مئی ۲۰۰۶ میں بے نظیر بھٹو اور میاں نواز شریف کے درمیان میثاق جمہوریت پر دستخط کیے گئے تھے۔ اس معاہدے میں یہ شق بھی شامل تھی کہ دونوں جماعتیں ماضی کے برعکس ایک دوسرے کو اکاموڈیٹ کریں گی اور ایک دوسرے کی حکومت کو غیر مستحکم کرنے کی کسی بھی کوشش سے گریز کریں گی۔ اسی طرح موجودہ دور میں بھی اپریل ۲۰۱۰ میں دونوں جماعتوں نے مل کر پارلیمنٹ میں اٹھارہویں ترمیم منظور کی تھی۔ دیگر باتوں کے علاوہ اس ترمیم کے ذریعے وزیر اعظم کو برطرف کرنے کے صدارتی اختیار کا خاتمہ کر دیا گیا تھا جسے پارلیمانی جمہوریت کی ایک بڑی کامیابی قرار دیا گیا تھا۔ اگرچہ مذکورہ ترمیم کے تحت صوبہ سرحد کا

نام تبدیل کر کے صوبہ خیبر پختونخوا رکھنے کے معاملے پر ہزارہ ڈویژن کے بڑے شہروں ایبٹ آباد اور مانسہرہ میں تشدد پھوٹ پڑا تھا۔

فروری ۲۰۰۹ میں صدر زرداری کی جانب سے پنجاب حکومت کو برطرف کر کے وہاں گورنر راج نافذ کرنے کے بلنڈر کے سوا صدر زرداری اپنے کلیدی الفاظ "مفاہمت کی سیاست" پر مسلسل کاربند رہے۔ پنجاب میں مسلم لیگ نون کی حکومت سے قطع نظر، مخلوط حکومتوں کے دوران مرکز اور صوبوں کے درمیان تعلقات کبھی بھی مثالی نہیں رہے ہیں۔ پیپلز پارٹی کے مرکز اور صوبہ سندھ میں اپنی اتحادی جماعت ایم کیو ایم کے ساتھ دوستی اور کشیدگی کا چکر چلتا رہا۔ دونوں جماعتوں کے درمیان کشیدگی ہی تھی جس کی وجہ سے پیپلز پارٹی کو متنازعہ این آر او قومی اسمبلی میں پیش کرنے سے باز رہنا پڑا۔ یوں عام معافی کے اس بل کا معاملہ سپریم کورٹ پر چھوڑنا پڑا جس نے اسے منسوخ قرار دے دیا۔ ایم کیو ایم نے ملاکنڈ ڈویژن کیلئے نفاذ عدل ریگولیشن کی بھی سخت مخالفت کی اور اس بل پر ووٹنگ کے دوران اس کے ارکان دانستہ طور پر ایوان سے غیر حاضر رہے۔ ایم کیو ایم کی دیرینہ بے اعتباری اور اس کی جانب سے آخر کار مخلوط حکومت سے باہر آجانے کی وجہ سے پیپلز پارٹی کو مسلم لیگ (ق) کے ساتھ اتحاد بنانا پڑا۔ یہ پیپلز پارٹی کی جانب سے مفاہمت کی سیاست کا شاخسانہ نہیں تھا بلکہ اقتدار میں رہنے کی مجبوری تھی۔

۱۹۹۰ کی دہائی میں پارٹی کی کمزور ادارہ سازی اور روایتی سیاسی تنگ نظری کی وجہ سے جمہوری استحکام کو سخت دھچکا لگا تھا۔ جہاں تک پارٹی کو تنظیمی طور پر مضبوط کرنے کا تعلق ہے فروری ۲۰۰۸ کے انتخابات کے بعد بھی اس سلسلے میں کوئی کوشش نہیں کی گئی۔ پاکستان کی سیاسی پارٹیاں اپنی تنظیموں کے اعتبار سے غیر جمہوری ہیں جہاں طاقت کا بہاؤ اوپر سے نیچے کی طرف ہوتا ہے۔ شریف برادران کی مسلم لیگ نون پر مضبوط گرفت آصف علی زرداری کی جانب سے پیپلز پارٹی پر کنٹرول کی آئینہ دار ہے۔ وہ اپنی صدارت کے پورے عرصے کے دوران اپنے وفاداروں کے جھرمٹ میں گھرے رہے اور اس عمل کے دوران بے نظیر بھٹو کے بہت سے ساتھی دور کر دیئے گئے یا وہ دور ہونے پر مجبور ہو گئے۔

اس دور میں پارلیمانی زندگی میں بھی کوئی تبدیلی دیکھنے میں نہیں آئی۔قومی اسمبلی اور صوبائی اسمبلیوں کے ارکان نے عوامی خدمت کا رویہ اپنانے کی بجائے کرائے داروں جیسا رویہ اپنائے رکھا۔ان اسمبلیوں میں بھی جاگیرداروں کی برتری کی وجہ سے بامعنی ٹیکسیشن اور زرعی اصلاحات کا ذکر شجر ممنوع رہا۔موجودہ صورتحال میں بھی ملک کی ۱۰ فیصد آبادی ۲۵ فیصد قومی آمدنی پر قابض ہے۔پیپلز پارٹی آئندہ بھی اپنے ووٹروں اور سپوٹروں کو مایوس کرتی رہے گی اگر اس نے اپنے بلند آہنگ دعوؤں کو عمل کے ساتھ ہم آہنگ نہ کیا۔اس سلسلے میں ضروری تھا کہ پیپلز پارٹی کی حکومت بے نظیر انکم سپورٹ پروگرام جیسے مقبول اقدامات اٹھانے کی بجائے غربت کی دیرینہ وجوہات کی جانب توجہ دیتی۔صدر زرداری کی قیادت میں پیپلز پارٹی اس سے کہیں زیادہ رجعت پسند مینجیریل بن چکی ہے جتنی وہ اس کی مرحوم بیوی کی قیادت میں ہوا کرتی تھی۔

تسلسل سے جاری معاشی عدم توازن نے نسلی،لسانی اور اسلامی انتہاپسندی کو پروان چڑھایا ہے(۴۳)۔۲۰۰۸ سے جاری جمہوری عہد نے فوجی اخراجات کو لگام ڈالنے کی بجائے اس میں اضافہ ہی دیکھا ہے۔۱۱-۲۰۱۰ کے مالی سال میں دفاعی بجٹ بڑھ کر ۴۴۲،۲ ارب روپے ہو چکا تھا۔ بڑھتی ہوئے دفاعی اخراجات کی ایک اہم وجہ سوات اور قبائلی علاقوں میں کیے جانے والے فوجی آپریشن بھی تھے۔سرکاری اعداد و شمار کے مطابق ۲۰۱۰-۲۰۰۱ کے درمیانی عرصے کے دوران پاکستان نے عسکریت پسندی اور دہشت گردی کے ساتھ جنگ کے دوران ۴۳ ارب ڈالر کی خطیر رقم خرچ کی تھی(۴۴)۔

ماضی کے تمام ادوار کی طرح آج بھی صورتحال یہ ہے کہ بڑھتے ہوئے دفاعی اخراجات اور قرضوں کی ادائگی کی وجہ سے سماجی شعبے کیلئے بہت کم رقم بچتی ہے جبکہ ٹیکس چوری کا ماحول بھی موجود ہے۔تعلیم پر اٹھنے والے اخراجات پاکستان کے اقتصادی سروے ۱۰-۲۰۰۹ کے مطابق جی ڈی پی کا صرف ۲،۰۰ فیصد ہیں جبکہ اگر بھارت اور بنگلہ دیش کے ساتھ ان کا موازنہ کیا جائے تو یہ اخراجات افسوسناک حد تک کم ہیں۔بھارت میں تعلیم پر جی ڈی پی کی ۳،۳ فیصد اور بنگلہ دیش میں ۲،۶ فیصد خرچ کیا

جارہا ہے(۴۵)۔اسامہ بن لادن کے قتل کے حوالے سے ۱۸ جون ۲۰۱۰ کو قومی اسمبلی کے بجٹ اجلاس کے دوران دفاعی بجٹ کے حوالے سے ہونے والی بحث میں پاکستان مسلم لیگ نواز نے فوج کو شدید تنقید کا نشانہ بنایا تھا۔دفاعی اخراجات کے حوالے سے ملک میں ناصرف شفافیت بلکہ فوجی افسران کی بھاری تنخواہوں اور شاہانہ مراعات کو بھی بھارتی فوج کے افسران کے مطابق رکھنے کے مطالبات کیے جارہے ہیں ۴۶۔حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کے اقدامات کے ذریعے بھارت کے سماجی شعبے پر کیے جانے والے اخراجات کو میچ نہیں کیا جاسکتا۔اس کیلئے ضروری ہے کہ ملک میں ٹیکس ادائگی کا ماحول بنایا جائے اور سب سے اہم یہ کہ زرعی آمدنی کو قابل ٹیکس قرار دیا جائے۔

جہاں ایک طرف تعلیم پر کم اخراجات پاکستان کے دوررس جمہوری استحکام اور ترقی کے امکانات کو دھندلا رہے ہیں وہیں دوسری جانب بہت زیادہ افراط زر ان اخراجات کو مزید دم گھونٹ رہی ہے۔دوسری طرف توانائی کا بحران بھی شدت اختیار کرتا جارہا ہے۔کروڑوں پاکستانیوں کی روزمرہ زندگی بجلی اور پانی کے شارٹ فال کے باعث المناک ہوچکی ہے۔پیپلز پارٹی کی حکومت کے آخری برسوں میں بجلی کی عدم فراہمی نے لوگوں کو سڑکوں پر آکر احتجاج کرنے پر مجبور کردیا تھا۔بجلی کی قلت پاکستانیوں کو غربت کی دلدل سے نکالنے کیلئے درکار معاشی ترقی کی شرح کو محدود سے محدود تر کررہی ہے(۴۷)۔

گذشتہ سالوں کے دوران آنے والے سیلابوں کے دوران پیپلز پارٹی کی جانب سے ہنگامی صورتحال سے نمٹنے میں نااہلی نے اس کی مقبولیت کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا ہے۔حکومت پر اعتماد کے فقدان کا انداز اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ ۲۰۱۰ اور ۲۰۱۱ کے دوران آنے والے تباہ کن سیلابوں کے دوران صدر کے قائم کردہ فلڈ ریلیف فنڈ میں بہت کم رقم جمع ہو پائی تھی جبکہ بین الاقوامی امداد بھی حکومت کی بجائے این جی اوز اور اقوام متحدہ کی ایجنسیوں کے ذریعے تقسیم کی گئی تھی۔دریں اثنا ۲۰۰۵ میں آنے والے تباہ کن زلزلے کی طرح ان سیلابوں کے دوران فوج کے کردار نے ایک مرتبہ پھر ثابت کردیا ہے فوج ہی پاکستان کا سب سے زیادہ منظم،مضبوط اور موثر ادارہ

ہے۔سیلابوں سے بھی پہلے مشرف دور کے آخر میں فوج بہت حد تک اپنے امیج کو بحال کرنے میں کامیاب ہو چکی تھی۔ایک امریکی سروے (پی ای ڈبلیو) کے مطابق پاکستانی عوام میں فوج کی حمایت میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔سروے میں انکشاف کیا گیا ہے کہ ۲۰۱۰ میں فوج کی ریٹنگ ۸۴ فیصد تک پہنچ چکی تھی جبکہ ۲۰۰۷ میں یہ ریٹنگ ۶۸ فیصد تھی (۴۸)۔فوج کی عزت اور وقار میں اضافے کی وجہ ناصرف (سابق) آرمی چیف جنرل اشفاق پرویز کیانی کی زیر قیادت فوج کا پیشہ ورانہ کردار ہے بلکہ فوج کی اثر پذیری بھی ہے۔یہ سویلین حکومت کے غیر ذمہ دارانہ طرز عمل کے بالکل برعکس ہے۔مثال کے طور پر جب ۲۰۱۰ کے سیلاب کے دوران ملک کا پانچواں حصہ سیلابی پانی میں ڈوبا ہوا تھا صدر زرداری یورپ کی سیاحت میں مصروف تھے۔

عدالتی فعالیت (جیوڈیشل ایکٹوازم)

عدالتی فعالیت مشرف دور کا ایک اہم ورثہ ہے۔تادم تحریر صورتحال یوں ہے کہ کچھ مبصرین نئی توانائیوں سے سرشار سپریم کورٹ کی بڑھتی ہوئی خود بینی و خود نمائی کو جمہوریت کیلئے ایک ممکنہ خطرہ قرار دے رہے ہیں۔زرداری حکومت کے دوران یہ خطرہ سر پر منڈلاتا رہا کہ سپریم کورٹ زرداری حکومت کو نااہل قرار دے کر فوج کی مداخلت کیلئے راستہ ہموار کر سکتی ہے۔پیپلز پارٹی کی مخلوط حکومت اور سپریم کورٹ میں بڑھتی ہوئی محاذ آرائی کی جڑیں چیف جسٹس (اب سابق) افتخار چودھری کی سیاست کے رنگ میں رنگی ہوئی سرگرمیاں تھیں جو ۱۲ مارچ ۲۰۰۹ کو ان کی بحالی سے پہلے تک جاری تھیں۔صدر زرداری نے عدلیہ کی بحالی میں دانستہ طور پر تاخیر کی جس کے بعد انہیں نواز شریف کے دباؤ اور لانگ مارچ کے موقع پر فوج کی مداخلت کے بعد بادل نخواستہ ججوں کی بحالی پر رضامند ہونا پڑا۔بحالی کے بعد سپریم کورٹ نے عوامی مفاد کے مقدمات کی جانب بھرپور توجہ مبذول کی جس کی وجہ سے انہیں بھرپور عوامی حمایت حاصل ہوئی۔پارلیمنٹ کے ساتھ اپنی محاذ آرائی کے دوران سپریم کورٹ نے اٹھارہویں ترمیم میں ججوں کی تعیناتی کے طریقہ کار کو مسترد کر دیا اور معاملہ دوبارہ نظر ثانی کیلئے پارلیمنٹ میں بھیج

دیا۔اس مسئلے کو حل کرنے کیلئے پارلیمنٹ نے ۱۹ ویں ترمیم منظور کی اس کے باوجود دونوں اداروں کے درمیان کھنچاؤ کم نہ ہو سکا۔

حکومت اور سپریم کورٹ کے درمیان اصل وجہ تنازعہ این آر او بنا۔مشرف اور بےنظیر بھٹو کے درمیان طے پانے والے قومی مفاہمتی آرڈیننس (این آر او) کے تحت اس وقت کی حکومت نے صدر زرداری سمیت ۸،۰۰۰ لوگوں کو مقدمات سے چھوٹ دے دی تھی۔یہ وہ لوگ تھے جن پر یکم جنوری ۱۹۸۶ اور ۱۲ اکتوبر ۱۹۹۹ کے درمیان کرپشن اور دیگر سنگین جرائم کے تحت مقدمات قائم تھے۔اسی این آر او کی بدولت بےنظیر بھٹو کو ملک واپس آنا نصیب ہوا تھا۔جولائی ۲۰۰۹ میں سپریم کورٹ نے این آر او سمیت جنرل مشرف کی جانب سے جاری کردہ ۳۶ آرڈیننسوں کی پارلیمانی منظوری کیلئے ۲۸ نومبر کی ڈیڈ لائن مقرر کی تھی۔جب حکومت مسترد کیے جانے کے خوف سے اس بل کو پارلیمنٹ میں نہ لا سکی تو سپریم کورٹ نے اسے شروع سے منسوخ کرتے ہوئے حکومت کو ہدایت کی کہ وہ ان تمام لوگوں پر مقدمات از سر نو کھول دے۔دوسری جانب حکومت کا طرز عمل یہ تھا کہ وہ کھلے عام تو سپریم کورٹ کے فیصلوں پر من و عن عمل کی یقین دہانی کراتی لیکن عملی طور پر وہ ہر ممکن حد تک تاخیری حربے استعمال کرتی۔یوں اداروں کے درمیان کشیدگی کی صورتحال مسلسل جاری رہتی۔اس صورتحال کے نتیجے میں گورننس بھی بد سے بدتر ہوتی چلی گئی جو بعد از ۲۰۰۸ دور کی نمایاں ترین خصوصیت ہے (۴۹)۔دوسری جانب سپریم کورٹ نے بھی ۳ نومبر ۲۰۰۷ کو مشرف کی جانب سے ایمرجنسی کے نفاذ کے بعد جو عزت و وقار اور عوامی مقبولیت حاصل کی تھی، حکومت کے ساتھ محاذ آرائی کے نتیجے میں اس میں بھی خاصی کمی واقع ہوگئی (۵۰)۔

مرکز اور صوبے

مرکز اور صوبوں کے درمیان کشیدگی پاکستان کی پوری تاریخ پر محیط ہے جس نے سیاسی ترقی کے عمل کو بہت بری طرح نقصان پہنچایا ہے۔زرداری کے دور صدارت میں اس مسئلے کو حل کرنے کیلئے کئی نسخے آزمائے گئے ہیں جن میں صوبوں کی تعداد میں

اضافہ، ان کے انتظامی اختیارات میں اضافہ اور مالی عدم مرکزیت وغیرہ شامل ہیں۔گلگت بلتستان کو ملک کے پانچویں صوبے کی حیثیت دینا، صوبہ سرحد کا نام تبدیل کر صوبہ خیبر پختونخوا رکھنا، اٹھارہویں ترمیم کے تحت کنکرنٹ لسٹ کا خاتمہ اور ساتویں قومی مالیاتی کمیشن ایوارڈ کا معاہدہ ایسے اقدامات ہیں جنہیں مختلف حوالوں سے اہم واقعات قرار دیا جائے گا۔صوبوں کی کمزور پڑتی انتظامی اہلیت نا صرف اس قسم کے اندیشے پیدا کرتی رہتی ہے کہ کیا وہ اٹھارہویں ترمیم کے بعد اپنی نئی ذمہ داریاں اٹھانے کے قابل ہوں گے نیز کیا دیر طلب اصلاحات ریاست کی جانب سے اپنے شہریوں کو زندگی کی بنیادی سہولیات میں نااہلیت کے بعد ریاست اور شہریوں کے درمیان حائل ہونے والی خوفناک خلیج کو کم کرنے میں مددگار ثابت ہوسکیں گی یا نہیں۔مرکز اور صوبوں کے درمیان تعلقات کا توازنِ نو (Rebalacing) طویل عرصے سے درپیش سیاسی جواز کے مسائل کو شاید حل نہ کرپائے تاہم یہ پاکستانی سیاست میں یکجائی اور ہم آہنگی کی ضرورت کو کسی نہ کسی حد تک پورا کرنے کے سلسلے میں ایک اہم پیش رفت ضرور ثابت ہوسکتا ہے۔

ان سوالیہ نشانات کے باوجود دسمبر ۲۰۰۹ میں قومی مالیاتی کمیشن ایوارڈز کی متفقہ منظوری کو صدر زرداری کا ایک اہم کارنامہ تصور کیا جاسکتا ہے۔۱۹۷۹، ۱۹۸۴ اور ۲۰۰۰ میں منعقد ہونے والے مالیاتی کمیشن ایوارڈز ڈیڈ لاک کی صورتحال کا شکار ہوگئے تھے جبکہ ۲۰۰۹ کا ایوارڈ مرکز اور صوبوں کے درمیان افہام وتفہیم کی بہتر فضا کی جانب ضرور اشارہ کرتا ہے۔یہ ایوارڈ دو اور ایسی اہم ڈویلپمنٹ کی جانب بھی اشارہ کرتا ہے جو اسے ماضی سے جدا کرتی ہیں۔اول یہ کہ انکم ٹیکس، سیلز ٹیکس، دولت ٹیکس، کیپٹل گین ٹیکس اور کسٹم ڈیوٹیوں کی مد میں اکٹھا ہونے والے ٹیکس ریونیو کی تقسیم میں صوبوں کے حصے میں مشرف دور کے ۴۷٫۵ فیصد کی نسبت مالیاتی کمیشن ایوارڈ کے پہلے سال (۲۰۱۰) میں ۵۶ فیصد تک اضافہ ہوا ہے۔اس کے نتیجے میں صوبوں کو اضافی طور پر ۷۰ ارب روپے منتقل ہوئے ہیں۔دوم یہ کہ ماضی میں مالیاتی کمیشن میں صوبوں کے حصے کا واحد معیار آبادی ہوا کرتا تھا جبکہ اس ایوارڈ میں صوبوں کیلئے فنڈز مختص کرنے کے ضمن میں سندھ اور بلوچستان کی تجویز پر غربت، ریونیو جنریشن اور شہری و دیہی آبادی کی Density

کو بھی شامل کیا گیا ہے۔یوں اس ایوارڈ میں مالیاتی عدم مرکزیت کو اہمیت دی گئی ہے بلکہ چھوٹے صوبوں کی جانب سے پاکستان کی ''پنجابائزیشن'' کی شکایت کو بھی رفع کردیا گیا ہے۔

این ایف سی ایوارڈ کے فوری بعد پارلیمنٹ نے آئین میں اٹھارہویں ترمیم پر کام شروع کردیا اور طویل غور وخوض کے بعد متفقہ طور پر اس کی منظوری دیدی۔جہاں ایک جانب اس آئینی ترمیم میں پارلیمنٹ اور حکومت کو تحلیل کرنے اور آئین کی معطلی کے صدارتی اختیارات کے خاتمے کے علاوہ وزیراعظم پر تیسری مدت کیلئے انتخاب پر پابندی کو ختم کردیا گیا ہے(۵۱) وہیں دوسری جانب ۱۹۷۳ میں آئین کی منظوری کے وقت سے موجود صوبائی کنکرنٹ لسٹ کا خاتمہ کرکے طاقت کی عدم مرکزیت کی جانب قدم بڑھایا گیا ہے۔اس کنکرنٹ لسٹ کے خاتمے کے نتیجے میں اس میں موجود اہم موضوعات بشمول تعلیم، صحت، آبادی، لیبر، سوشل ویلفیئر اور سیاحت کے اختیارات صوبوں کو تفویض کردیئے گئے ہیں۔تاہم صوبوں کی ان ذمہ داریوں میں اضافے کے ساتھ ہی یہ خدشات بھی ابھر کر سامنے آگئے ہیں کہ صوبے نئی ذمہ داریوں مثال کے طور پر ہائر ایجوکیشن کمیشن جو اٹھارہویں ترمیم سے قبل وفاقی حکومت کی ذمہ داری تھی، جیسے معاملات سے عہدہ براہونے کے قابل بھی ہوپائیں گے یا نہیں۔اس سے بھی اہم یہ کہ پاکستان میں آبادی کے ٹائم بم فیکٹر کو مدنظر رکھا جائے تو یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ صوبے بہبود آبادی کی وفاقی وزارت کے پروگراموں پر درست انداز میں عمل پیرا ہوسکیں گے یا نہیں۔

مشترکہ مفادات کی کونسل میں صوبوں اور وفاق کی نمائندگی میں بھی اضافہ کے ذریعے صوبوں کی طاقت میں بھی اضافہ ہوگیا ہے۔ایک اور اہم تبدیلی یہ رونما ہوئی ہے کہ تیل، گیس اور معدنیات وغیرہ پر مشتمل خام مال پر پہلے کلی طور پر وفاق کی اجارہ داری ہوتی تھی، اب ان پر اختیار صوبوں کو منتقل کردیا گیا ہے۔اس اقدام کے ذریعے خاص طور پر بلوچ علیحدگی پسندوں کی وفاقی حکومت کے خلاف شکایات کا ازالہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

پیپلز پارٹی کی حکومت اور خارجہ تعلقات

پاکستان میں ۲۰۱۰ میں آنے والے سیلاب عظیم کے بعد بھارت کی جانب سے ۵۰ لاکھ ڈالر کی امدادی رقم کی فراہمی کی پیشکش اس حقیقت پر پردہ ڈالنے کی کوشش تھی کہ جمہوری عمل نے دونوں ملکوں کے درمیان تعلقات کو بہتر نہیں کیا۔ اسی طرح ۱۵۰ ملین ڈالر کی امریکہ کی جانب سے مالی امداد کی پیش کش دہشت گردی کے خلاف جنگ میں شریک دو اہم اتحادی ملکوں کے درمیان پائے بڑھتے ہوئے اعتماد کی بجائے اس جانب اشارہ تھی کہ واشنگٹن میں پاکستان کی سلامتی کے بارے میں تشویش پائی جاتی ہے۔ امریکہ میں یہ آگہی بھی پائی جاتی ہے کہ پاکستان اپنی جغرافیائی اور سٹریٹجک اہمیت کے حوالے سے اس قدر اہم ملک ہے کہ اسے ناکام ہوتے نہیں دیکھا جاسکتا۔ اس حوالے سے امریکہ اس کے سویا اس سے زیادہ ایٹم بموں کو بھی نظر انداز کرسکتا ہے اور پاکستان کی یہی اہمیت تھی جس نے اسامہ بن لادن کے وقوعے کے بعد کیپٹل ہل میں پائے جانے والے شدید غم وغصے کے باجود امریکہ کو پاکستان کی فوجی اور اقتصادی امداد کو معطل کرنے سے روک دیا تھا۔

پاکستان میں جمہوریت کے حوالے سے مسائل کا تاریخی طور پر نا صرف اس کی اشرافیہ کے کلچر کی حامل سیاست اور ناہموار سماجی و معاشی ڈھانچے کے ساتھ تعلق رہا ہے بلکہ یہ اس کے خارجہ تعلقات کے ساتھ بھی جڑے ہوئے ہیں۔ امریکہ نے تاریخی طور پر اس کے تین فوجی حکمرانوں ایوب خان، ضیاء الحق اور پرویز مشرف کے ساتھ قریبی تعلقات قائم کررکھے تھے اس امر کے باوجود کہ ان تینوں نے جمہوری طرز حکمرانی اور سیاسی جواز کے مطالبات کو پورا کرنے کی کبھی کوشش نہیں کی تھی۔ بے نظیر بھٹو نے خاص طور پر امریکہ میں اپنے تعلقات کو استعمال کرتے ہوئے مغرب میں اس یقین کو تقویت بخشنے کی بھرپور کوشش کی تھی کہ صرف جمہوریت ہی پاکستان کے استحکام کی ضمانت ہوسکتی ہے۔ یہاں یہ بات دہرائے جانے کے لائق ہے کہ لندن اور واشنگٹن دونوں نے مشرف دور میں بے نظیر کی وطن واپسی کیلئے ہونے والی پس پردہ کوششوں میں اہم کردار

ادا کیا تھا ۵۲۔ بدقسمتی سے بے نظیر کے قتل نے مغرب کی ان توقعات پر پانی پھیر دیا کہ وہ مشرف کے ساتھ مل کر دہشت گردی کے خلاف جنگ میں فرنٹ لائن سٹیٹ کے طور پر پاکستان کے استحکام کیلئے کام کریں گی۔ اس کے شوہر میں نہ اتنی قابلیت تھی اور نہ اس کے مغرب میں اس حد تک تعلقات تھے جتنے بے نظیر نے بنا رکھے تھے۔ تاہم اس کے باجود مغرب نے آصف علی زرداری کو ہلاشیری دی اور اسے انتہاپسندوں کے چیلنج کے سامنے کھڑے ہونے کی ہمت دلائی۔ اس کے ساتھ ساتھ امریکہ نے پینٹاگون کے ذریعے پاکستانی فوج کے ساتھ بھی اپنے چینل کھلے رکھے تھے۔ جنرل کیانی کا امریکہ کے جوائنٹ چیفس آف سٹاف کے چیئرمین ایڈمرل مائیک ملن کے ساتھ اس وقت بھی قریبی رابطہ تھا جب مارچ ۲۰۰۹ میں پنجاب میں عدم استحکام کی صورتحال پیدا ہوچکی تھی۔

افغانستان کے ساتھ تعلقات کے ضمن میں بھی پیپلز پارٹی کی حکومت امریکہ کیلئے کسی نہ کسی حد تک فائدہ مند ثابت ہورہی تھی کیونکہ زرداری اور کرزئی کے درمیان مشرف دور کی نسبت زیادہ خوشگوار تعلقات استوار ہوچکے تھے۔ یہ تعلقات اوباما انتظامیہ کی افغان پاک حکمت عملی کے حوالے سے بہت زیادہ اہمیت کے حامل تھے کیونکہ امریکہ طالبان باغیوں کے ساتھ رابطوں کیلئے پاکستان کے اثر و رسوخ کو استعمال کرنا چاہتا تھا۔ امریکہ القاعدہ کے ساتھ لاتعلقی اختیار کرنے اور تشدد کی مذمت کرنے کی شرط پوری کرنے کی صورت میں افغان باغیوں کو مرکزی دھارے میں لانے کیلئے انہیں مالی ترغیبات، ملازمتیں اور مقدمات سے معافی کی پیش کش کررہا تھا۔ مفاہمت کی پالیسی کے بغیر امریکہ اور نیٹو افواج سے افغان نیشنل آرمی کو سیکورٹی ذمہ داریوں کی حوالگی ۲۰۱۴ سے قبل ناممکن العمل تھی۔ اسامہ بن لادن کی ہلاکت، نام نہاد "عرب بہار" اور القاعدہ کے ہیڈکوارٹرز کی جنوبی یمن میں منتقلی کے نتیجے میں امریکہ کیلئے افغانستان کی سٹریٹجک اہمیت کم ہوچکی تھی۔ تاہم امریکہ ۱۹۹۰ کی دہائی میں افغانستان کو بے یار و مددگار چھوڑ دینے کے تجربے کو دہرانا نہیں چاہتا کیونکہ اس کے جانے کے بعد افغانستان میں خانہ جنگی کا چھڑ جانا یقینی امر ہے۔ جس کے خطے کی صورتحال پر شدید اثرات رونما ہونے کا اندیشہ کم ہے۔

جنوری ۲۰۱۱ میں سابق صدر برہان الدین ربانی کی زیر قیادت اعلیٰ سطحی افغان امن کونسل کے پاکستان آنے اور اس کے نتیجے میں افغانستان اور پاکستان کی سیاسی قیادت کا ایک دوسرے کے ساتھ انٹرایکشن ایک ایسا عمل تھا جو مشرف دور کی کشیدگی کے دوران ممکن نہیں تھا۔

دوسری جانب پاکستان کے افغانستان میں اپنے مفادات ہیں جن میں امریکہ انخلا کے بعد مستقبل کے سیاسی منظر نامے میں پختونوں کا مرکزی کردار اور افغانستان میں بھارت کے بڑھتے ہوئے معاشی وسیکورٹی مفادات میں کمی لانا شامل ہے۔ بھارت کے افغانستان میں بڑھتے ہوئے اثر و رسوخ کی ایک مثال مئی ۲۰۱۱ میں اس وقت سامنے آئی جب وزیر اعظم من موہن سنگھ نے افغان پارلیمنٹ کے مشترکہ اجلاس سے خطاب کیا تھا۔ کچھ مبصرین کا خیال ہے کہ نئی دہلی کا افغانستان میں ۲۰۰۱ کے بعد سے بڑھتے ہوئے مفادات اور اثر و رسوخ پاکستان کے ساتھ اس کی اسی طرح کی کشیدگی کا باعث بن سکتے ہیں جیسی کشمیر کے حوالے سے پہلے سے موجود ہے۵۳۔

۲۰۰۸ کے انتخابات کے بعد پاکستان اور بھارت کے درمیان تعلقات میں مزید کسی طرح کی کوئی گرمجوشی دیکھنے میں نہیں آئی سوائے اس امر کہ پاکستان میں جمہوریت کی بحالی کے بعد دونوں ملکوں کی قیادت کے لہجوں میں قدرے نرمی آ گئی ہے اور بھارت پاکستان کے فوجی لیڈروں کی بجائے سویلین قیادت کے ساتھ زیادہ بہتر محسوس کرتا ہے۔ جہاں تک دونوں ملکوں کے درمیان مکالمے کی بات ہے تو وہ ممبئی حملوں کے بعد سے بدستور انتہاپسندی کے یرغمالی بنے ہوئے ہیں۔ ۷ جولائی کو کابل میں بھارتی سفارتخانے پر بم حملہ ہوا تھا۔ بھارت کا دعویٰ ہے کہ اس میں آئی ایس آئی کا خفیہ ہاتھ کارفرما ہے۔ ادھر پاکستان کے سابق سیکورٹی ایڈوائزر محمود درانی کا یہ اعترافی بیان بھی ریکارڈ پر ہے کہ ''اگر پاکستانی حکومت براہ راست ملوث نہیں تھی تو بھی اس کے کچھ ''برے لوگوں'' کے ساتھ تعلقات ضرور قائم ہیں اور ممکن ہے کہ یہ واردات ان میں سے کسی نے کی ہو''۵۴۔ اس سے قبل ۲۶ نومبر ۲۰۰۸ میں ممبئی میں ہونے والے حملے جن میں لشکر طیبہ کو ملوث کیا گیا ہے دونوں ملکوں کے درمیان تعلقات کے سلسلے میں

شدید دھچکا ثابت ہو چکے ہیں۔

جولائی ۲۰۱۰ میں دونوں ملکوں کے خارجہ سیکرٹریوں کے درمیان مذاکرات کے دوران بھی دہشت گردی کا مسئلہ ہی ایجنڈے پر غالب رہا تھا۔ دہشت گردی کے مسائل اور افغانستان کا مستقبل نیز طویل عرصے سے جاری کشمیر کا تنازعہ جیسے مسائل ۲۰۱۴ تک کے عرصے میں دونوں ملکوں کے تعلقات کی نوعیت کا تعین کریں گے۔ اگر پاکستان نے ثابت قدمی کا مظاہرہ کیا تو وہ امریکہ کے انخلا کے بعد افغانستان میں اپنی کھوئی ہوئی حیثیت کو کسی نہ کسی حد تک بحال کرنے میں کامیاب ہوسکتا ہے۔ تاہم اگر جہادیوں نے افغانستان سے فارغ ہونے کے بعد کشمیر کی طرف اپنا رخ کرلیا تو پاکستان اور بھارت کے درمیان تعلقات میں بگاڑ ناقابل تلافی حد تک پیدا ہوسکتا ہے۔ ایبٹ آباد اپی سوڈ کے بعد مئی ۲۰۱۱ کے بعد سے دونوں ملکوں کے درمیان سفارتی اور سٹریٹجک تعلقات کے حوالے سے فال آؤٹ آیا۔

سول ملٹری تعلقات

ایبٹ آباد میں ۲ مئی کو رونما ہونے والے ڈرامائی واقعے نے پاکستان میں سول ملٹری تعلقات کے حوالے سنجیدہ بحث چھیڑ دی ہے۔ کیا ۱۹۷۱ کے بعد سے فوج کے اثر و رسوخ کو کم کرنے کے سنہری موقع سے پھر ہاتھ دھولیا گیا ہے؟ کیا ڈرامائی طور پر سویلین دباؤ کی بجائے فوجی قوت میں کمی بتدریج رونما ہوگی؟ کیا فوج کی دیرینہ یونٹی خطرے میں پڑ چکی ہے؟ کیا اس کے نچلی سطح کے افسران ماضی کی نسبت زیادہ ریڈیکل ہو چکے ہیں؟

گو کہ کچھ مغربی مبصرین ۵۵ پاکستانی فوج کو گھیرے میں آئی ہوئی فوج کی طرح پیش کررہے ہیں تاہم اس کی شرمندگی کے بوجھ سے نکلنے کی صلاحیت کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا جس کا مظاہرہ اس نے ۱۶ دسمبر ۱۹۷۱ میں جنگ ہارنے اور بھارتی فوج کے سامنے ہتھیار ڈالنے جیسی بدترین صورتحال کے دوران کیا تھا۔ ایبٹ آباد کمیشن کے رپورٹ کچھ بھی ہو توقع یہی ہے کہ فوج نہیں چاہے گی کہ وہ عام ہو جیسا اس نے حمود

الرحمٰن کمیشن رپورٹ کے ساتھ کیا تھا۔ سروے پول اسی بات کی جانب اشارہ کرتے ہیں کہ فوج کو اپنے اس دعوے میں، چاہے اس کی عملی حقیقت کچھ ہی ہو، کہ وہ پاکستان کی خودمختاری کو برقرار رکھنے کیلئے ناگزیر ہے، عوام کی حمایت حاصل ہے۔ بن لادن کے معاملے میں پارلیمنٹ کو ایک سیکورٹی بریفنگ دیتے ہوئے فضائیہ کے سربراہ ائر مارشل راؤ قمر سلیمان نے انکشاف کیا تھا کہ بلوچستان میں موجود شمسی ائربیس کا کنٹرول پاکستان کے پاس نہیں یو اے ای کے پاس ہے۔ دوسری جانب وکی لیکس میں اس بات کا انکشاف بھی کیا گیا ہے کہ پاکستانی فوج نا صرف ڈرون حملوں کے سلسلے میں امریکہ سے تعاون کر رہی تھی بلکہ اس کی خواہش تھی کہ ان حملوں میں اضافہ کردیا جائے۔ ایک اور وکی لیکس میں انکشاف کیا گیا تھا کہ جنرل اشفاق پرویز کیانی نے امریکہ کی سنٹرل کمانڈ کے کمانڈنٹ ایڈمرل ولیم فالن کے ساتھ ایک ملاقات میں پوچھا تھا کہ کیا وہ شورش زدہ علاقوں میں پریڈیٹر کی مسلسل کوریج کیلئے تعاون فراہم کرسکتے ہیں۔ رپورٹ کے مطابق فالن نے اس کے جواب میں اس درخواست کے سلسلے میں معذرت کرلی تھی (۵۶)۔

۲ مئی ۲۰۱۱ کو اسامہ بن لادن کی موت سے پیدا ہونے والے حالات فوج کیلئے اتنی خفت کا باعث نہیں ہوسکتے تھے جتنا یہ انکشاف کہ اسامہ گذشتہ پانچ سالوں سے اونچی دیواروں اور خاردار تاروں والے ایک احاطے میں رہ رہا تھا جو ملٹری اکیڈمی کاکول سے کچھ ہی دوری پر واقع ہے۔ اسامہ کی موت کے گرد گھومتے حالات و واقعات بین الاقوامی آبزرورں کے اس دیرینہ خیال کی توثیق کرتے ہیں کہ پاکستان کی سیکورٹی اسٹیبلشمنٹ میں "دوطرفہ دیکھنے" کی صلاحیت موجود ہے۔ جب سینٹر جان کیری اور اس وقت کی وزیر خارجہ ہیلری کلنٹن اپنے دورہ پاکستان کے دوران معاملات کو بہتر صورت دینے کی کوشش کررہی تھیں، اس وقت کیپٹل ہل میں غصہ کی کیفیت موجود تھی۔ دوسری جانب وزیراعظم یوسف رضا گیلانی سیکورٹی سروس پر الزام لگا رہے تھے کہ وہ اس کام میں معاون تھی یا نااہل تھی (۵۷)۔ ساری صورتحال میں حکومت تحقیقاتی کمیشن تشکیل دینے میں لیت و لعل سے کام لے رہی تھی۔ حکومت نے فوج پر تنقید کرنے کا کام مسلم لیگ نون کے سربراہ نواز شریف پر چھوڑ رکھا تھا۔ نواز شریف ۷ مئی کو اپنی ایک پریس

کانفرنس میں اس حد تک گئے کہ انہوں نے مطالبہ کردیا کہ دفاع اور سیکورٹی کے اخراجات کو منظوری کیلئے پارلیمنٹ میں پیش کیا جائے۔ اس صورتحال کے بارے میں پیپلز پارٹی کا رویہ اپنی سروائیول کی فکر کرنے کے سوا کچھ اور نہیں تھا۔ جولائی ۲۰۰۸ میں جب صدر زرداری نے آئی ایس آئی پر سویلین کنٹرول کی بات کی تو فوج نے فوری طور پر اس کوشش کو ناکام بنادیا۔ اسی طرح وزیراعظم گیلانی نے جب ممبئی حملوں کے بعد بھارت کے مطالبے پر آئی ایس آئی کے سربراہ کو بھارت بھیجنے کا وعدہ کیا تو اسے سختی کے ساتھ مسترد کردیا گیا۔ حکومت اور فوج کے درمیان خفی انداز میں جاری ٹینشن ستمبر ۲۰۰۹ کو کیری لوگر بل کے معاملے پر سطح آب پر آگئی تھی۔ اس میں موجود یہ تجویز کہ پاکستان کو پانچ سال کیلئے سویلین ایڈ کی صورت میں دی جانے والی ۱۰ء۵ ارب ڈالر کی رقم اوباما کے حکومت میں آنے سے پہلے بل میں شامل کی جاچکی تھی۔ اوباما انتظامیہ نے محض اسے افغانستان اور پاکستان کے بارے میں نئی حکمت عملی کے ساتھ جوڑا تھا۔ اس امداد کی ایک شرط واضح طور پر فوج پر سویلین نگرانی کی متقاضی تھی (۵۸)۔ زرداری نے امریکی کانگریس سے اس بل کی منظوری کو اپنے دور کی سب سے بڑی کامیابی بتایا تھا۔ حکومت کو فوری طور پر پچھلے قدموں پر جانا پڑا جب فوج نے ۷ اکتوبر کو کور کمانڈروں کے ایک اجلاس کے بعد کھلے عام اس پر اعتراضات کیے تھے۔

پیپلز پارٹی کی جانب سے کسی اقدام کے اٹھائے نہ جانے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ایبٹ آباد واقعے کے بعد کچھ بھی نہیں بدلا ہے۔ پاکستان کے اندر مسلم لیگ نواز کی جانب سے کی جانے والی تنقید کی کوئی سابقہ مثال پیش نہیں کی جاسکتی۔ یہ اس بات کا اشارہ ہے کہ میاں نواز شریف کی قیادت میں مستقبل میں بننے والی مسلم لیگ نواز کی حکومت فوجی اخراجات پر سویلین کنٹرول کے سلسلے میں ضرور پیش رفت کرے گی۔ فی الحال تو سویلین کنٹرول کی کوئی صورت نہیں تاہم فوج پر بڑھتی ہوئی تنقید اور ایبٹ آباد واقعے کے حوالے سے پارلیمنٹ کے ان کیمرہ اجلاس میں اس وقت کے آئی ایس آئی کے سربراہ شجاع پاشا کے اپنی کمزوریوں کے اعترافات اور جوابدہی پر قبولیت کا اظہار ہے کہ سویلین بالادستی کے حوالے سے فوج کی مزاحمت میں کمی آچکی ہے۔

پاکستان آرمی کے یونیفائیڈ کمانڈ سٹرکچر میں اس بات کی کوئی گنجائش موجود نہیں کہ ایشیاء، افریقہ اور لاطینی امریکہ کی طرح کوئی کرنل کے رینک کا افسر اٹھ کر فوجی انقلاب برپا کردے۔ تاہم اس کے درمیانے درجے کے افسروں کی تبدیل ہوتی ہوئی سماجی کمپوزیشن فوج ان خدشات کی جانب ضرور اشارہ کررہی ہے کہ فکری حوالے سے اس طرح کی تقسیم عمل میں آسکتی ہے کہ اس کے جونیئر رینک افسران تو مذہبی انتہاپسندی کا شکار ہوں لیکن سینئر افسران کنزرویٹو سوچ کے حامل ہوں۔ فوج کی گیریزن اجلاسوں کے بارے میں غیر مصدقہ رپورٹوں کے مطابق ایبٹ آباد واقعے کے بعد جنرل کیانی کو اپنے پرو امریکہ موقف پر تنقید کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ امریکہ کے ساتھ اس واقعے کے بعد پیدا ہونے والی کشیدگی کے بعد جس میں امریکہ انخلاء کے مکمل ہونے تک مزید اضافے کا خدشہ ہے، پاکستانی فوج کو علاقائی صورتحال کے حوالے سے متعدد خدشات لاحق ہیں جنہیں مغرب کے ساتھ طویل المعیاد تعاون کے ساتھ ہی رفع کیا جاسکتا ہے۔

حرفِ آخر

جولائی اگست ۲۰۱۰ کے سیلاب کی قومی ابتلا سے بھی پہلے پاکستان کی تیسری جمہوری ٹرانزیشن بحرانوں کے ساتھ نبرد آزما تھی۔ ان میں سے کچھ بحران تو حسب سابق خود حکومت کے اپنے پیدا کردہ تھے جبکہ کچھ خارجی عوامل کا نتیجہ تھے اور یہ دونوں قسم کے بحران ریاست کی معیشت اور اس کے اداروں کی کمزوریوں کو واشگاف کررہے تھے۔ دوسری جانب ۲۰۰۸ کے انتخابات کے بعد جنم لینے والی خوش فہمیاں بھی اپنی موت مرچکی تھیں۔ حقیقت یہ ہے کہ کوئی ایک پارلیمنٹ بنیادی معاشی اور ادارہ جاتی اصلاحات جو جمہوری استحکام کیلئے سازگار ہوں کو انجام پذیر کرنے کیلئے ناکافی ہے۔ فاٹا جیسے روایتی طور پر پسماندہ علاقوں میں، جہاں شرح خواندگی نہ ہونے کے برابر ہو، صحت اور صاف پانی جیسی بنیادی سہولیات پاکستانی اوسط سے کہیں نیچے ہوں، بھرپور ترقیاتی سرگرمیاں درکار ہوتی ہیں (۶۰)۔ جنوبی پنجاب میں عسکریت پسند محض غربت اور جاگیرداروں کی جانب سے غریب طبقات کو دبا کر رکھنے کا شاخسانہ نہیں ہے بلکہ وہاں موجود بے تحاشا

فرقہ پرستی اس کے ایک اہم محرک کے طور پر موجود ہے۔ ان مسائل کو راتوں رات حل نہیں کیا جاسکتا۔ اس کیلئے اداروں کی تعمیر کا طویل مدتی عمل اور سیاسی کلچر میں بنیادی تبدیلی درکار ہوتی ہے۔

قومی سطح پر جمہوری استحکام میں ایک اور بڑی رکاوٹ سیاسی پارٹیوں کے اندر موجود غیر جمہوری رویئے اور غیر جمہوری ساخت ہے۔ آج بھی پارٹی کی سیاست افراد کے گرد گھومتی ہے۔ یہ بات نئی نسل کی لیڈرشپ کے ابھرنے اور ''آؤٹ آف باکس'' سوچنے کے عمل میں سب سے اہم رکاوٹ ہے۔ سیاسی کلاس میں اہلیت کا معیار افسوسناک حد تک کم ہے جس کی وجہ سے یہ دائمی سوچ ابھی تک رائج چلی آتی ہے کہ فوج ہی واحد ادارہ ہے جو کارآمد ہے۔

ایبٹ آباد میں اسامہ بن لادن کی ہلاکت کا واقعہ بہت بڑا تھا۔ اس نے ناصرف پاکستان کو بین الاقوامی طور پر سپاٹ لائٹس میں کھڑا کردیا ہے بلکہ اس کے نتیجے میں فوج پر داخلی طور پر بھی شدید تنقید سامنے آئی ہے۔ بدلے ہوئے حالات میں فوج اور سویلین حکومتوں کے درمیان بڑھتی ہوئی افہام وتفہیم کی فضا بہت خوش آئند ہے اور یہ پاکستان کے اچھے مستقبل کے حوالے سے شدید اہمیت کی حامل ہے۔ اس کے اثرات نہ صرف پورے خطے بلکہ بین الاقوامی برادری میں بھی محسوس کیے جائیں گے۔

☆☆☆

حوالہ جات

۱۔ آصف علی زرداری جنہوں نے دسمبر ۱۹۸۷ میں بے نظیر سے شادی کی تھی دعویٰ کرتے ہیں کہ ان کے خلاف تمام الزامات سیاسی نوعیت کے ہیں۔ وہ اپنے خاندان اور دوستوں کو ضرور نوازتے رہیں ہیں تاہم ان پر ''مسٹر ٹین پرسنٹ'' ہونے کا الزام مبالغہ آرائی پر مبنی ہے۔ انہوں نے کرپشن اور فوجداری کے مختلف مقدمات کے تحت ۱۱ سال کا عرصہ جیل میں گذارا ہے۔ ۲۰۰۴ کے وسط میں جب انہیں مقدمات سے ضمانت ملی تو وہ علاج کیلئے بیرون ملک روانہ ہوگئے تھے۔

۲۔ Sartaj Aziz, "The Economic Cost of Extremism" in Usama Butt and N. Elahi (eds) "Pakistan's Quagmire: Security, Strategy and the Future of Islamic Nuclear Nation (New York, Continuum, 2010)

۳۔ Hilary Synnott, "Transforming Pakistan: Ways out of Instability (Abingdom: Routledge, 2009)

۴۔ ۲۰۰۴ میں پاکستان کی جی ڈی پی کی شرح ۶۔۸ فیصد تک پہنچ چکی تھی۔ ایضاً۔

۵۔ پاکستان کے کرنٹ اکاؤنٹ میں تیزی سے کمی کی تفصیلات جاننے کیلئے ملاحظہ کیجئے ڈان (کراچی) کی ۲۳ اکتوبر ۲۰۰۸ کی اشاعت میں شائع شدہ رابرٹ لونی کا مضمون "Failed Take-Off: An Assessment of Pakistan's October 2008 Economic Crisis" Paksitan Security Research Unit Breaf.

۶۔ جولائی ۲۰۰۷ میں ان کی حجم ۳۔۱۳ ارب ڈالر تھا۔ Hilary Synnott, "Transforming Pakistan: Ways out of Instability

۷۔ William. B. Milam, "Bangladesh and Pakistan: Flirting with Failure in South Asia" (London: Hurst, 2009)

۸۔ روزنامہ ڈان انٹرنیشنل ایڈیشن، ۱۹ جولائی ۲۰۱۰۔

۹۔ روزنامہ ڈان انٹرنیشنل ایڈیشن، ۱۴ اگست ۲۰۱۰۔

۱۰۔ روزنامہ ڈان انٹرنیشنل ایڈیشن، ۱۳ اور ۱۶ اگست ۲۰۱۰۔

۱۱۔ روزنامہ ڈان انٹرنیشنل ایڈیشن، ۱۶ اگست ۲۰۱۰۔

۱۲۔ Saeed Shah in Guardian.co.uk, 15 August 2010

۱۳۔ روزنامہ ڈان انٹرنیشنل ایڈیشن، ۱۳ اگست ۲۰۱۰۔

۱۴۔ روزنامہ ڈان انٹرنیشنل ایڈیشن، ۱۸ اگست ۲۰۱۰۔

۱۵۔ Hilary Synnott, "Transforming Pakistan: Ways out of Instability

۱۶۔ ملاحظہ کیجئے کتاب ہذا میں شامل اختتامیہ میں ''آبادی کا ٹائم بم''۔

۱۷۔ Asad Hashim, "Public Support for Militancy", Dawn, International Edition, 22 June 2010

۱۸۔ Robert Nicholas, "Class, State and Power in the Swat Conflict", Unpublished Paper, Association of Asian Studies Conference, Honolulu, 2 April 2011

۱۹۔ ایضاً۔

۲۰۔ N. Ellahi, "The Existential Threat: Tehreek e Taliban Pakistan (TTP) and Alqueda in Pakistan" in Usama Butt and N. Elahi (eds) "Pakistan's Quagmire: Security, Strategy and the Future of Islamic Nuclear Nation (New York, Continuum, 2010)

۲۱۔ Hilary Synnott, "Transforming Pakistan: Ways out of Instability ۔ ہلاک ہونے والے عسکریت پسندوں کی تعداد میں کسی حد تک مبالغہ آرائی ہوسکتی ہے۔

۲۲۔ in Pakistan" in Usama Butt and N. Elahi (eds) "Pakistan's Quagmire: Security, Strategy and the Future of Islamic Nuclear Nation (New York, Continuum, 2010) Brain Cloughley, "Insurrection, Terrorism and Pakistan Army"

۲۳۔ ڈان انٹرنیشنل ایڈیشن، ۱۸ اکتوبر ۲۰۰۹۔

۲۴۔ ڈان انٹرنیشنل ایڈیشن، ۷ جون ۲۰۱۰ء۔

۲۵۔ ڈان انٹرنیشنل ایڈیشن، ۲۲ جون ۲۰۱۰ء۔

۲۶۔ ڈان انٹرنیشنل ایڈیشن، ۱۳ جون ۲۰۱۰ء۔

۲۷۔ Katja Riikonen, "Punjabi Taliban and the Sectarian Groups in Pakistan", PSRU Brief 12 February 2010

۲۸۔ ڈان انٹرنیشنل ایڈیشن، ۱۱ اکتوبر ۲۰۰۹ء۔

۲۹۔ Hassan Abbas, "Defining the Punjabi Taliban Network", CTC Sentinel (April 2009)

۳۰۔ P.K. Upadhyay, "From FATA to South Punjab: The Looming Leap of Islamic Radicalism in Pakistan", Institute of Defence Studies and Analyses, 30 November 2009

۳۱۔ پنجاب کی کئی ایک قسم کی کلاسیفکیشنز ہیں جو انتظامی وجغرافیائی سرحدوں، زرعی اور ثقافتی زون میں بٹی ہوئی ہیں۔جنوبی پنجاب کا علاقہ بہاولنگر، بہاولپور، ڈیرہ غازی خان اور رحیم یار خان پر مشتمل ہے۔ اس میں بھکر، جھنگ، خانیوال، لیہ، لودھراں، ملتان، راجن پور اور وہاڑی کے اضلاع کو بھی شامل کیا جاتا ہے۔

۳۲۔ "Southern Punjab Leaks" in Dawn, International Edition, 24 May 2011

۳۳۔ Aftab, " Poverty and Militancy"

۳۴۔ Ayesha Siddiqa, "Terror's Training Gounds", Newsline (September 2009)

۳۵۔ ایضاً

۳۶۔ Tahir Kamran, "Contexualising Sectarian Militancy in Pakistan: A Case Study of Jhang", Journal to Islamic Studies, (2009)

۳۷۔ وہ کشمیر میں لڑنے والی جہادی تنظیموں حرکت الانصار اور حرکت المجاہدین میں شامل تھا لیکن اس سے پہلے وہ سپاہ صحابہ میں سرگرم رہا تھا۔

۳۸۔ ڈان انٹرنیٹ ایڈیشن،، ۲۱ اگست ۲۰۱۰ء۔

۳۹۔ ڈان انٹرنیٹ ایڈیشن،، ۱۵ اگست ۲۰۱۰ء۔

۴۰۔ ایضاً۔

۴۱۔ Pervez Hoodbhoy, "Pakistan After Usama June 2011" www.himalmag.com/components/content/

۴۲۔ ڈان انٹرنیٹ ایڈیشن، ۱۳ اکتوبر ۹۰۰۹ء۔

۴۳۔ بلوچستان کی قوم پرستی کے پیچھے معاشی استحصال اور سیاسی مارجنلائزیشن کے احساسات کارفرما ہیں۔

۴۴۔ ڈان انٹرنیٹ ایڈیشن، ۱۳ جون ۲۰۱۰ء۔

۴۵۔ ڈان انٹرنیٹ ایڈیشن، ۵ جون ۲۰۱۰ء۔

۴۶۔ ڈان انٹرنیٹ ایڈیشن، ۱۹ جون ۲۰۱۰ء۔

۴۷۔ اقتصادی سروے ۲۰۱۰-۲۰۰۹ کے مطابق بجلی کی کمی کے باعث ۲۰۱۱-۲۰۱۰ کے مالی سال میں جی ڈی پی کی دو فیصد شرح میں کمی ہوئی تھی۔ ڈان انٹرنیٹ ایڈیشن، ۵ جون ۲۰۱۰ء۔

۴۸۔ زرداری کی مقبولیت کی ریٹنگ صرف ۲۰ فیصد تھی اور کیانی کی ۶۱ فیصد۔ مسلم لیگ نواز کے ۷۰ فیصد سے زیادہ سپورٹروں نے فوج کے سربراہ کے بارے میں مثبت خیالات کا اظہار کیا تھا۔ جبکہ پیپلز پارٹی کے سپورٹروں میں سے ۵۹ فیصد نے کیانی کے بارے میں مثبت رائے ظاہر کی تھی۔ ڈان انٹرنیٹ ایڈیشن، ۲ اگست ۲۰۱۰ء۔

۴۹۔ Muhammad Waseem, "Judging Democracy in Pakistan: Conflict Between the Executive and the Judiciary", Unpublished Paper, University of Southamptom, 13 April 2011

۵۰۔ ایضاً۔

۵۱۔ مشرف کی جانب سے نواز شریف کی واپسی کے سلسلے میں حائل رکاوٹوں کو ہٹادیا گیا تھا۔

۵۲۔ Hilary Synnott, "Transforming Pakistan: Ways out of Instability

۵۳۔ بھارت نے ۲۰۰۱ کے بعد سے افغانستان میں تعمیراتی سرگرمیوں کیلئے ۷۵۰ ملین ڈالر کا سرمایہ فراہم کیا ہے۔وہاں اس کے چار ہزار سے زیادہ سویلین اور سیکورٹی ورکر کام کررہے ہیں اور سڑکوں کی تعمیر اور افغان پولیس اور بیوروکریسی کی تربیت کے سلسلے میں تعاون فراہم کررہے ہیں۔پاکستان کا دعویٰ ہے کہ بھارت کی افغانستان میں موجودگی اس کے مفادات کے خلاف ہے۔اس کی وجہ سے خاص طور پر بلوچستان میں امن و امان کی صورتحال میں مزید بگاڑ پیدا ہورہا ہے۔ Hilary Synnott, "Transforming Pakistan: Ways out of Instability

۵۴۔ وکی لیکس کیبل ۳ جون ۲۰۱۱ء۔

۵۵۔ See for Example Declan Walsh, "In the Shadow of Bin Laden: Pakistan Still Reeling from the Raid that Killed Alqaida Chief", Guardian (London), 2 June, 2011

۵۶۔ وکی لیکس کیبل ۳ جون ۲۰۱۱ء۔

۵۷۔ Pervez Hoodbhoy, "Pakistan After Usama June 2011" www.himalmag.com/components/content/

۵۸۔ ان میں جو دیگر شرائط شامل تھیں وہ یوں ہیں: فوج کے اندر بھرتیوں اور ترقیوں پر سویلین کنٹرول کے علاوہ دفاعی بجٹ کی پارلیمانی نگرانی بمع اس بات کی تصدیق کہ فوج سیاسی اور عدالتی عمل کو غصب نہیں کررہی ہے۔

۵۹۔ مثال کے طور پر فاٹا میں خواندگی کی شرح ۱۷.۵ فیصد ہے جبکہ پاکستان کے دیگر علاقوں میں یہ مجموعی طور پر ۴۴ فیصد ہے۔

۶۰۔ Hilary Synnott, "Transforming Pakistan: Ways out of Instability

☆☆☆

اختتامیہ

مستقبل میں طویل مدتی چیلنج،

توقعات اور امکانات

پاکستان کے منظر نامے کے تازہ ترین مطالعات اگلے تین چار برسوں پر مشتمل مستقبل قریب پر توجہ مبذول کرتے ہیں(آ۔اگر پاکستان کی نازک صورتحال اور اسے درپیش ۱۹۷۹ میں سوویت فوجوں کے افغانستان پر قبضے، نائن الیون اور ایبٹ آباد میں اسامہ بن لادن کی ہلاکت جیسے سیاہ واقعات پر نظر دوڑائی جائے تو ایسا قابل فہم بھی ہے۔افغانستان سے نیٹو فوجوں کے انخلا کے بعد کی صورتحال کے پاکستان پر پڑنے والے اثرات پر فی الحال کوئی بات نہیں کی جاسکتی۔کیا اس کے بعد طالبان کے غلبے کا حامل افغانستان پاکستان میں کراس بارڈر دہشت گردی کا منبع بن جائے گا جس کا مقصد اسلام آباد میں موجود ''کافر'' حکومت کا خاتمہ ہوگا؟ کیا تصادم کے بعد کے افغانستان میں بھارت اور پاکستان مشترکہ مفادات کی دریافت میں کامیاب ہوجائیں گے یا کیا ان کی دیرینہ دشمنی پر بے اعتمادی کی ایک اور تہہ جم جائے گی؟

حالات میں مزید تغیر وتبدل پیدا کردینے والا واقعہ امریکہ پر ہونے والا ایک اور حملہ ہوسکتا ہے جس کے تانے بانے پاکستان کے ساتھ جڑتے ہوں۔جب ملک کے بعید مستقبل کے بارے میں اندازے لگانے کی کوششیں کی جائیں گی تو فطری طور پر یہ خدشات وسوالات اپنے جلو میں سکوت کے وقفے لے کر آئیں گے۔تاہم اس کے باوجود ایک وسیع تر منظر کو بھی نگاہوں کے سامنے رکھنا ضروری ہے جو سلامتی کی صورتحال

کے ساتھ جڑے تجزیوں کی محدودیت سے فرار کی راہ فراہم کرسکے اور اس کے ساتھ ہی اس بات کا تعین کیا جاسکے کہ کیا اس کتاب میں جن طویل مدتی رجحانات کا تذکرہ کیا گیا ہے وہ حتمی طور پر پاکستان کی ہر قسم کی بحرانی صورتحال سے نکلنے کی صلاحیت کو ختم تو نہیں کردیں گے۔

کچھ عناصر نے معاصر واقعات کی بھیڑ بھاڑ سے دامن بچاتے ہوئے انقلابی خطوط پر ادارہ جاتی، معاشی اور ثقافتی تقلیب کی ضرورت پر زور دیا ہے اگر پاکستانی ریاست مستقبل میں آبادی کے مختلف نوعیت کے دباؤ سے سروائیو کرنا چاہتی ہے جو اپنے ساتھ خوراک، پانی اور توانائی کی شدید قلت لے کر آئیں گے (۲)۔ مستقبل کے ایک ہولناک منظر نامے کے مطابق اگلے بیس برسوں میں پاکستان کی آبادی ۲۲ کروڑ افراد سے تجاوز کرجائے گی جس میں پانی کی قلت دریائے سندھ کے موجودہ بہاؤ سے دوتہائی ہوجائے گی، اس کے ساٹھ لاکھ نوجوان بے روزگار ہوں گے اور تین کروڑ بچے بنیادی تعلیم سے بھی محروم ہوں گے (۳)۔ اس کی نیم بے روزگار نوجوانوں کا ہجوم اور قلیل پانی کی تقسیم پر آپس میں جھگڑتے صوبے پاکستان کی بقاء پر اس سے کہیں بڑے سوالیہ نشانات چسپاں کردیں گے جتنے کہ اس وقت دہشت گردی کی وجہ سے موجود ہیں۔ ان طویل المعیاد چیلنجوں سے عہدہ برا ہونے کیلئے ایک سابق سول سرونٹ تسنیم احمد صدیقی کے الفاظ میں "اس کے سوا کوئی راستہ نہیں کہ پاکستان اپنے اندر بہتر تبدیلیاں لے کر آئے" (۴)۔

ہم اس کتاب میں تسلسل کے ساتھ جائزہ لے چکے ہیں کہ پاکستان کی تاریخ سیاسی اداروں کی تعمیر، سماجی و معاشی عدم توازن اور عدم مساوات کو دور کرنے اور ملک کیلئے ایک ویژن کی تخلیق کیلئے ایڈہاک ازم سے ماوراء ہونے کے حوالے سے ضائع شدہ مواقع سے اٹی پڑی ہے۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ یہاں کی جاگیردار اور سیاسی اشرافیہ جس نے اب تک سیاسی اسلام کی پیش رفت کو روک رکھا ہے، خدشہ ہے کہ ملک کو درپیش آبادی اور ماحول کے حوالے سے درپیش دیرینہ چیلنجوں کے سامنے بدستور دیوار بن کر کھڑی رہے گی۔

کیا پاکستان اپنے موجودہ سیکورٹی کے مسائل سے باہر آنے میں کامیاب ہوسکے گا تاکہ وہ اگلی دو یا تین دہائیوں میں درپیش ماحولیاتی اور آبادیاتی چیلنجوں پر پورا اتر سکے؟ کیا ریاست توانائی اور پانی کی قلت کے بے پناہ دباؤ اور وقفے وقفے سے آنے والے سیلابوں اور خشک سالیوں کے نیچے کچلی جائے گی؟ پاکستان میں عام طور پر یہ خیال پایا جاتا ہے کہ علاقائی سلامتی اور پاکستان کی نیوکلیئر حیثیت کے حوالے بہت سے سیکس رکھتی ہے اور کبھی پاکستان کو ناکام ریاست میں تبدیل نہیں ہونے دے گی۔ اس خیال کو پاکستان کی جانب سے گورننس اور معیشت کے حوالے سے نیم دلانہ اور ناکام اصلاحات کے باوجود آئی ایم ایف کی جانب سے مسلسل "بیل آوٹ" کرنے کے پیٹرن کی وجہ سے تقویت ملتی ہے۔ بین الاقوامی امداد پر انحصار نے نا صرف انحصاریت کے رجحان کو پختہ کردیا ہے بلکہ پاکستان کی سرمایہ کاری اور برآمدات پر مبنی معیشت کی جانب توجہ دینے کی بجائے داخلی طور پر معاشی ابتری کے باوجود صارفیت کو مزید ہوا دی ہے۔ جس چیز کو ملیحہ لودھی "مانگے تانگے کی ترقی" (۵) کا نام دیتی ہیں، اس نے ٹیکس اصلاحات کی ترغیبات میں کمی کردی ہے اور تسنیم احمد صدیقی کے الفاظ میں "فرسودہ سیاسی نظام" کو دائمی حیثیت بخشنے میں مدد کی ہے جس میں "سپر سٹرکچر۔۔۔اپنے اردگرد موجود زمینی حقائق سے لاتعلق ہوتا جارہا ہے" (۶)۔

آبادی کا ٹائم بم اور نوجوانوں کی فوج ظفر موج

جیسا کہ ہم تعارف کی ذیل میں دیکھ چکے ہیں کہ پاکستان کی موجودہ آبادی امکانی طور پر ۲۰۵۰ میں بڑھ کر ساڑھے ۳۳ کروڑ ہوجائے گی جس کے ساتھ ہی پاکستان کو آبادی کے لحاظ سے دنیا کے چوتھے بڑے ملک کا درجہ حاصل ہوجائے گا۔ اگر پیدائش کی موجودہ شرح کو کم نہ کیا گیا تو یہ تعداد ۴۶ کروڑ تک بھی پہنچ سکتی ہے۔ آبادی کا اس قدر شدید دباؤ ملکی وسائل پر بوجھ بن جائے گا۔ حتیٰ کہ اس وقت بھی ہر چار میں سے ایک بچہ خوراک کی کمی کا شکار ہے۔ کم وبیش تین کروڑ ساٹھ لاکھ افراد خط غربت کے نیچے زندگی بسر کررہے ہیں جبکہ نصف آبادی ان پڑھ ہے۔ روایتی طور پر افرادی قوت کی

دوسرے ملکوں کو برآمد واحد ایسا ذریعہ رہی ہے جس کی وجہ سے پاکستان اپنی آبادی میں اضافے کے مسئلے کو کسی نہ کسی حد تک حل کرتا چلا آرہا ہے۔ تاہم مستقبل میں یہ آپشن نہیں چلے گا۔ جب تک شہری ترقی کی منصوبہ بندی نہیں کی جاتی اور روزگار کے مواقع میں اضافہ نہیں کیا جاتا موجودہ رجحانات شدید ماحولیاتی، سیاسی اور سماجی چیلنجوں کو جنم دینے کا باعث ثابت ہوں گے۔ معاشی ترقی کی بلند شرح کو حاصل کرنا کافی نہیں بلکہ ضرورت اس بات کی ہوگی کہ اگر کسی بڑی پولرائزیشن سے بچنا ہے تو اسے طویل عرصے تک برقرار رکھا جائے۔

تقدیر پرستی کے حوالے سے ایک خیال یہ بھی ہے کہ غربت اور رجعت پسندانہ اسلامی اقدار کا اختلاط شرح پیدائش کو کم کرنے کے حوالے سے ناقابل عبور رکاوٹیں پیش کرتا ہے۔ یقینی طور پر پاکستان ایوب دور سے آج تک خاندانی منصوبہ بندی میں کامیابی کی مایوس کن تاریخ کا حامل ہے۔ بنگلہ دیش کے تجربے سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ اگر خواتین کی معاشی خودکفالت کا بندوبست کیا جائے تو غربت کے عالم میں بھی شرح پیدائش میں کمی آجاتی ہے۔ ۱۹۷۹ کے بعد سے ایران میں بھی شرح پیدائش میں کافی حد تک کمی آئی ہے جبکہ انڈونیشیا میں بھی بہت عرصے سے شرح پیدائش نیچے آچکی ہے۔ یہ وہ ممالک ہیں جن کے ساتھ ایک اسلامی ملک ہونے کے حوالے سے پاکستان کا موازنہ کیا جاتا ہے (۷)۔ حقیقت یہ ہے کہ ایران اور انڈونیشیا دونوں ملکوں میں شرح پیدائش پاکستان کے مقابلے میں نصف کے قریب ہے۔ پاکستان کے شہری علاقوں کا جائزہ لیا جائے تو ایسا دکھائی دیتا ہے کہ یہاں ثقافتی مزاحمت سے کہیں زیادہ مانع حمل طریقوں کے موثر نہ ہونے کا مسئلہ درپیش ہے۔ یہاں مانع حمل خدمات کی طلب اور ان کی رسد (۲۵) فیصد میں حائل خلیج دنیا میں سب سے زیادہ ہے۔ یہاں گرین سٹار سوشل مارکیٹنگ جو نجی شعبے میں 2011 سے خاندانی منصوبہ بندی کی ۴۰ فیصد خدمات فراہم کررہی ہے (۸)۔ جیسے پرائیویٹ اداروں کے ذریعے مانع حمل خدمات کی فراہمی میں اضافے کا بہت سکوپ ہے۔

پاکستان میں آبادی کے مسائل اسے مستقبل میں درپیش چیلنجوں کے حوالے

سے کلیدی اہمیت کے حامل ہیں۔ بحران سے بچنے کیلئے عمل ضروری ہے نیز عمل کے ذریعے ہی چیلنج کو موقع میں تبدیل کیا جاسکتا ہے۔ تاہم حالات کی سنجیدگی کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ صرف خاندانی منصوبہ بندی کی سہولیات اس صورتحال سے عہدہ براہونے کیلئے ناکافی ہیں۔ ان کے ساتھ ساتھ تعلیم اور غربت میں کیلئے بھی اقدامات کرنا ہوں گے تاکہ ان سہولیات و خدمات کو موثر بنایا جاسکے۔ یہ طے شدہ حقیقت ہے کہ عورتوں کی معاشی عمل میں شرکت شرح پیدائش اور غربت میں کمی کا باعث بنتی ہے اور ان میں اضافے کا ایک اہم سبب کنبے کا بڑا ہونا ہے۔ اس کے ساتھ ہی تعلیم کی اہمیت بھی مسلمہ ہے کیونکہ صرف یہی ایک چیز پاکستان کے حال اور مستقبل میں نوجوانوں کی بہت بڑی تعداد کو سماجی بوجھ کی بجائے کارآمد اثاثوں میں بدل سکتی ہے۔

۱۹۴۷ میں حاصل ہونے والی آزادی کے بعد سے تعلیم کی فراہمی میں ناکامی پاکستانی ریاست کی جانب سے اپنی داخلی قوت کے حصول میں ناکامی کی آئینہ دار ہے۔ یہ ناکامی نتیجہ ہے ”اخلاص کے خلا“ اور ”عمل درآمد“ کے خلا کا۔ طویل عرصے سے پاکستان اپنی تعلیم پر بجٹ میں جی ڈی پی کا صرف دو فیصد مختص کرتا چلا آرہا ہے۔ انتظامی نااہلی جو کرپشن کے دروازے کھولتی ہے، کی موجودگی میں یہ بات یقینی ہے کہ یہ قلیل وسائل بھی بہت ناقص اور بھونڈے طریقے سے استعمال اور مختص کیے جاتے ہیں۔ اس کا نتیجہ بڑے پیمانے پر بالغوں کے ان پڑھ ہونے، صنفی اور علاقائی عدم مساوات اور تعلیم کے غیر مربوط سرکاری، نجی اور مذہبی نظاموں کی صورت میں سامنے آیا ہے۔ جنوبی ایشیا کے خطے میں صرف افغانستان ایسا ملک ہے جو تعلیم کے میدان میں پاکستان سے پیچھے ہے۔ اس کا ایک اور نتیجہ یہ ہے کہ پاکستان دنیا میں سب سے بڑے نوجوانوں کے ہجوم، جس کی تعداد میں ۲۰۲۰ کے بعد بے پناہ اضافہ ہوجائیگا کی ضروریات اور مسائل سے عہدہ براہونے کیلئے بالکل تیار نہیں ہے (۹)۔

۱۹۷۰ کے بعد سے سرکاری سکولوں میں تعلیم کے انحطاط اور عسکریت پسندی کی نئی لہر کے تناظر میں مذہبی سکولوں کے پھیلاؤ میں روز افزوں اضافے کے بارے میں بہت کچھ لکھا جاچکا ہے۔ پاکستان کا ایک اور سٹیریو ٹائپ امیج یہ ہے کہ یہ ایسا معاشرہ

ہے جو علم کے حصول میں بہت کم دلچسپی رکھتا ہے۔ پاکستان میں تعلیم کی ڈیمانڈ صرف پھولتے پھلتے نجی شعبے کی کسوٹی پر پرکھی جا رہی ہے۔ تاہم یہ تنہا تعلیم تک رسائی کے اس کارِ عظیم کا بار نہیں اٹھا سکتا جو پاکستان کے مستقبل کے منظر نامے کیلئے شدید اہمیت کی حامل ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ماضی کی ناکامیوں کی تعلیم کیلئے وسائل مختص کرنے اور گورننس کو بہتر بنانے کے ذریعے تلافی کی جائے۔ پاکستان تعلیم تک رسائی بڑھانے کیلئے ترقی پذیر ملکوں کے تجربات سے بھی فائدہ اٹھا سکتا ہے جہاں مشروط کیش ٹرانسفر جیسے پروگراموں کے ذریعے بھی سکولوں میں داخلے کی شرح میں اضافہ کیا گیا ہے۔ اگر تباہی سے بچنا ہے تو پاکستان کو سخت سیاسی فیصلے کرنا ہوں گے اور کم از کم اوسط درجے کے ترقی پذیر ملکوں جتنے اخراجات تعلیم پر صرف کرنا ہوں گے۔

تعلیم کیسے فراہم کی جاتی ہے اور یہ کن اقدار کی حوصلہ افزائی کرتی ہے، ان باتوں کا خیال رکھنا بھی پاکستان کیلئے اکیسویں صدی کے چیلنج قبول کرنے کے حوالے سے بہت اہمیت کا حامل ہے۔ مدارس کے نصاب میں ریفارمز کی بہت عرصے سے کوششیں جاری ہیں تاہم یہ ہمیشہ غیر موثر ثابت ہوئی ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ریاست کی جانب سے پڑھائی جانے والی ٹیکسٹ بکس کو ایسے فرسودہ مواد سے پاک کرنا ضروری ہے جو سماجی ہم آہنگی اور علاقائی تعلقات میں رکاوٹیں پیش کرنے کا سبب ہے(۹)۔ ان سب کے پیچھے اولاً پاکستان کی اوریجن اور اس کی تاریخ کے بارے میں زیادہ حقیقی اور بالغ اپروچ کا ہونا ضروری ہے اور ثانیاً تعلیم کی حوصلہ افزائی کیلئے تنقیدی سوچ کو دبانے کی بجائے اسے پروان چڑھانا ضروری ہے۔

تعلیم کی فراہمی اور اس کے معیار میں بہتری لانے سے پاکستان اس قابل ہوجائے گا کہ وہ نوجوانوں کی فوج ظفر موج کو حالات کا سامنا کرنے کے قابل بنا سکے۔ ایک پڑھی لکھی آبادی ناصرف انفرادی شخصیت میں رنگ بھر سکتی ہے اور فرد کو طریقے سلیقے سے جینا سکھا سکتی ہے بلکہ اس کی معاشی ترقی کو بام عروج پر پہنچا سکتی ہے۔ پاکستان اپنے افراد کی توانائیوں کو منفی اور تباہ کن سمت دینے کی بجائے مثبت سمت دے کر مجموعی طور پر پھیلتے ہوئے سماجی تحرک اور کاروباری سرگرمیوں میں بے پناہ اضافہ

کر سکتا ہے۔ تاہم بلاشبہ اس کیلئے ضروری ہوگا کہ تعلیم کیلئے زیادہ بجٹ مختص کرنے کے ساتھ ساتھ اسے نہایت موثر انداز میں بیتج کرے اور اس انداز میں خرچ کرے کہ اس سے موجودہ علاقائی، دیہی وشہری اور صنفی عدم توازن اور عدم مساوات کے مسائل کو حل کیا جا سکے۔ اس مقصد کے حصول کیلئے ضروری ہے کہ ٹیکنیکل ایجوکیشن اور ماضی کے رویوں کے برعکس نان یونیورسٹی ایجوکیشن پر توجہ مبذول کی جائے۔ اس وجہ سے سکولوں میں حاضری کا مسئلہ بھی کافی حد تک حل ہوجائے گا جو موجودہ حالات میں پرائمری سکولوں کی صورت میں ۵۰ فیصد اور سیکنڈری سکولوں میں صرف ۲۵ فیصد ہے۔

عورتوں کی تعلیم کی اہمیت کو کسی صورت گھٹا کر پیش نہیں کیا جا سکتا۔ پاکستان اس وقت گلوبل جینڈر انڈیکس میں شامل ۱۳۰ ممالک میں سے ۱۲۷ نمبر پر ہے جہاں ہر تیسری بالغ عورت ان پڑھ ہے اور ہر پانچویں عورت افرادی قوت کا حصہ ہے۔ یہ ناصرف انتہا درجے کی ناانصافی ہے بلکہ پوٹینشل ٹیلنٹ کا بے دریغ زیاں بھی ہے۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ یہ غریب اور بڑے خاندانوں کے سائیکل کو دائمی حیثیت دینے کے مترادف ہے۔ عورتوں کی تعلیمی تقلیب پاکستان کی پہلے سے جاندار سول سوسائٹی کے پھیلاؤ میں اضافے کا باعث بنے گی لیکن اسے اکثر وہ دانشور نظر انداز کر دیتے ہیں جو سیکورٹی ایشوز اور ''ریاست بحران میں ہے'' قسم کی تھیوریوں میں پھنسے رہتے ہیں(۱۱)۔ اس سے افرادی قوت کی معاشی مسابقت میں ملک کی رینکنگ میں ڈرامائی بہتری بھی آئے گی (جو تازہ ترین عالمی مسابقتی انڈیکس میں شامل ۱۳۴ ملکوں میں سے ۱۰۱ ویں نمبر پر ہے)۔ شاہد جاوید برکی نے ناصرف انفرمیشن ٹیکنالوجی بلکہ صحت، انٹرٹینمنٹ، تعلیم اور پبلشنگ کے شعبوں میں بیرون ملک خدمات کی فراہمی کے سلسلے میں پاکستان کے مواقع کی نشاندہی کی ہے تاہم شرط یہ ہے کہ اس کیلئے کافی حد تک پڑھی لکھی افرادی قوت دستیاب ہو(۱۲)۔ اگر عدم مساوات کے مسئلے کو حل نہ کیا جائے تو متنوع سیاسی نتائج کی حامل بڑے پیمانے پر سماجی بیداری کیلئے عورتوں کی تعلیم دو دھاری تلوار بھی ثابت ہوسکتی ہے(۱۳)۔

سماجی انصاف کی آگہی کی موجودہ سطح کے حوالے سے بھی یوں دکھائی دیتا ہے

کہ نوجوانوں کی ایک بڑی تعداد اپنے سماج سے لاتعلق ہوتی جارہی ہے۔۲۰۰۹ میں
برٹش کونسل نے ایک سروے کیا تھا جس میں ملک بھر کے مختلف طبقات سے تعلق رکھنے
والے ۱،۵۰۰ نوجوانوں کو شریک کیا گیا تھا (۱۴)۔اس سروے کی رپورٹ میں انکشاف
کیا گیا تھا کہ پاکستانی نوجوانوں کی ایک بہت بڑی تعداد ملک اور اس کے اداروں سے
مایوسی کا اظہار کررہی ہے (۱۵)۔سروے میں سوالات کا جواب دیتے ہوئے صرف ۱۵
فیصد نوجوانوں نے اس امید کا اظہار کیا تھا کہ ملک درست سمت میں آگے بڑھ رہا
ہے (۱۶)۔صرف ۱۰ فیصد کا خیال تھا کہ پاکستان مجموعی طور پر بہتر کارکردگی کا مظاہرہ
کررہا ہے اور صرف ۱۰ فیصد نوجوانوں نے ملک کی قومی حکومت پر اپنے اعتماد کا اظہار کیا
تھا (۱۷)۔اس سروے سے نا صرف کرپشن اور بری گورننس کے مسائل عیاں ہوتے ہیں
بلکہ پالیسی ڈویلپمنٹ میں نوجوانوں کو مکمل طور پر نظر انداز کیے جانے کا بھی اندازہ ہوتا
ہے۔یہ اگر ہماری اجتماعی تنوطیت مستقبل پر اپنے سائے ڈالنے سے باز رہے تو یہ وہ
مسائل ہیں جو حل طلب ہیں۔یقینی یہی وہ مائنڈ سیٹ ہے جو مستقبل میں کسی فوجی
مداخلت کی حمایت پر آمادہ ہوسکتا ہے، جس کے ہم نے ماضی میں تباہ کن سیاسی، معاشی
اور خارجہ پالیسی کے حوالے سے اثرات دیکھے ہیں۔پاکستان کی اگلی نسل کو نا صرف اچھی
تعلیم اور ملازمت کے مواقع کی ضرورت ہے بلکہ ایک متحرک شہری بننے کیلئے بھی مواقع
کی ضرورت ہے۔قومی زندگی کے بہت سے دیگر شعبوں کی طرح پاکستان اس معاملے
میں بھی دوراہے پر کھڑا ہے۔برٹش کونسل نے دانش مندی کے ساتھ خبردار کیا ہے کہ
صرف بین الجماعتی اتفاق رائے پیدا کرکے ہی آئندہ نسل کی ضروریات کو حقیقی معنوں
میں پورا کیا جاسکتا ہے اور پالیسیوں کے تسلسل کو یقینی بنایا جاسکتا ہے (۱۸)۔

پانی اور توانائی کی سیکورٹی

آبادی کے ٹائم بم کے ساتھ ساتھ پاکستان مستقبل میں ممکنہ طور پر توانائی اور
فراہمی آب کی قلت کا سامنا کرنے جارہا ہے۔ایک طرف تو یہ بڑھتی ہوئی آبادی کی وجہ
سے بڑھتی ہوئی طلب کا شاخسانہ ہے تو دوسری طرف ماحولیاتی تبدیلیاں اور گورننس اور

مینجمنٹ کی ناکامیاں بھی اس پر اپنے اثرات مرتب کررہی ہیں۔ملک بھر میں مستقل لوڈ
شیڈنگ کا عذاب موجودہ ڈومیسٹک بجلی کے شارٹ فال کا نتیجہ ہے جو اندازے کے
مطابق چار سے چھ گیگاواٹ ہوچکا ہے۔پانی کی کمی کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے
کہ ٹینکروں کے ذریعے پانی کی سپلائی کی طلب فراہمی آب کے نظام کے مساوی ہوچکی
ہے۔پانی کی دستیابی 1950 کی دہائی سے کم ہونا شروع ہوچکی ہے جو پانچ ہزار کیوبک فی
کس ہوا کرتی تھی اور اب تقریباً ۱،۵۰۰ کیوبک فی کس ہوچکی ہے۔خدشہ ہے کہ ۲۰۲۰
تک یہ سپلائی گھٹ کر ۸۵۰ رہ جائے گی جس کا مطلب ہے کہ ملک ''خشک'' ہوجائے
گا۔بدترین کیس سیناریو کے مطابق پانی کی قلت کا ایک نتیجہ صوبوں کے درمیان اور پھر
پاکستان اور بھارت کے درمیان بھی ''پانی کی جنگ'' چھڑ سکتی ہے۔بھارت کی جانب
سے دریائے چناب پر تعمیر کیے جانے والے بگلیہار ڈیم کی وجہ سے پہلے ہی دونوں ملکوں
کے درمیان کشیدگی میں اضافہ ہوچکا ہے۔

جنوبی ایشیا میں پانی باہمی تعاون کا ذریعہ بھی بن سکتا ہے اور تصادم کا منبع بھی
ثابت ہوسکتا ہے۔تاریخی طور پر پاکستان اور بھارت کے درمیان اگر کوئی ایک معاہدہ ایسا
ہے جو طویل مدت سے حقیقی معنوں میں موثر ہے تو وہ ۱۹۶۰ میں ہونے والا انڈس
واٹر ٹریٹی۔اب اس معاہدے پر پاکستان کی جانب سے کافی لے دے ہورہی ہے کیونکہ
بھارت انڈس کے معاون دریاؤں پر ڈیم تعمیر کررہا ہے۔تاہم اس کے باجود معاہدے کی
طوالت نا صرف مستقبل میں پانی کی مینجمنٹ کے موثر معاہدوں کے سلسلے میں امید کی
جھلک دکھاتی ہے بلکہ یہ امکانات بھی پیدا کرتی ہے کہ اس سمت میں پیش رفت دونوں
ملکوں کے درمیان دیگر معاملات کے حوالے سے بھی اعتماد سازی کی فضا کو بڑھانے کا
باعث بنے گی۔پانی کے معاملے پر بھارت کے اپنے خدشات ہیں کیونکہ بالائی ملک
ہونے کی حیثیت تبت پر دریاؤں کا رخ موڑ کر خود بھارت کیلئے پانی کے مسائل پیدا
کررہا ہے۔

اگر پانی کی علاقائی سیکورٹی کے حوالے سے پاکستان کیلئے صورتحال اتنی گھمبیر
نہ ہو جتنی پہلی نظر میں دکھائی دیتی ہے تو اس بات کی امید بھی رکھنی چاہیے کہ داخلی طور پر

اس کیلئے پانی کی سپلائی دستیاب رہے گی۔اس خوش گمانی کو مالیاتی حوالے سے بے انتہا مہنگے اور ماحولیاتی حوالے سے سخت نقصان دہ بڑے ڈیموں کی تعمیر کے ذریعے نہیں بلکہ موجودہ ٹیکنالوجی کو اپ گریڈ کرکے حقیقت کا روپ دیا جاسکتا ہے۔ملک میں موجود نہروں کو پختہ بنا کر پانی کو زیادہ بہتر انداز میں ذخیرہ کیا جاسکتا ہے اور بھاری پیمانے پر نقصانات سے بچا جاسکتا ہے (غالبًا سپلائی کے ۳۰ فیصد کے مساوی)۔پانی کو محفوظ کرنے کی ٹیکنالوجی میں مزید ایڈوانس بھی ہوا جاسکتا ہے۔اگر چاول کی فصل کیلئے کم پانی خرچ کرنے والی اقسام کا انتخاب کیا جائے تو پانی کی طلب کو مزید کم کیا جاسکتا ہے(۱۹)۔

پاکستان میں توانائی کے موجودہ بحران کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ طویل مدتی منظرنامے میں یہ اتنا ہی گھمبیر ہوگا جتنا اس وقت ہوتا ہوا دکھائی دے رہا ہے۔ملک میں متبادل توانائی کے بہت بڑے بڑے ذخائر موجود ہیں جن میں کوئلے کا ذخیرہ بھی ہے۔سندھ میں تھر کے ریگستان میں واقع تھر کول مائنز فیلڈ جو ۹،۰۰۰ مربع میل پر پھیلی ہوئی ہے اور ۱۷۵ ارب ٹن کوئلے کی حامل ہے دنیا میں کوئلے کا دوسرا سب سے بڑا ذخیرہ ہے۔یہ مستقبل میں توانائی کی اتنی ہی فراہمی کے قابل ہے جتنا کہ مثلاً سعودی عرب کے تیل کے ذخائر ہیں۔پاکستان میں ۱۹۷۰ کی دہائی تک ہائیڈرو الیکٹرک کی پیداوار ۷۰ فیصد تک ہوا کرتی تھی جواب کم ہوکر ۳۰ فیصد رہ گئی ہے۔چین ان دنوں پاکستان میں کوئلے، ہائیڈرو الیکٹرک اور نیوکلیئر پاور پروڈکشن میں سرمایہ کاری کررہا ہے۔بجلی کی پیداوار میں اضافے کے دوران ماحولیاتی خدشات کو بھی مدنظر رکھنا ہوگا۔اس مسئلے کو جزوی طور پر کمیونٹی بیسڈ چھوٹے ہائیڈروالیکٹرک منصوبے بنا کر اور خیبر پختونخوا کے بعض علاقوں میں مائیکرو ونڈ ٹربائنیں لگا کر حل کیا جاسکتا ہے۔

پانی کی فراہمی کی طرح بجلی کی کمی بھی فرسودہ انفراسٹرکچر، بجلی کی بے دریغ چوری اور ناقص مینجمنٹ کا شاخسانہ ہے۔بجلی کی پیداوار میں ہونے والا ۳۰ فیصد کے قریب نقصان انہی وجوہات کی بنا پر قوم کو برداشت کرنا پڑتا ہے۔ملک میں اب تک آنے والی حکومتیں بجلی کی چوری کو روکنے میں ناکام رہی ہیں جس کی وجہ یہ ہے کہ بجلی

چوری میں زیادہ تر سیاسی اثر ورسوخ رکھنے والے بڑے زمیندار اور فیکٹری مالکان شامل ہیں۔

پانی کی طرح بجلی کی پیداوار بھی ہمسائیہ ملکوں کے درمیان سیاسی محاذ آرائی کا باعث بن سکتی ہے یا بصورت دیگران کے درمیان تعاون کی فضا پیدا کرنے میں مددگار ثابت ہوسکتی ہے۔ترکمانستان۔افغانستان۔ پاکستان۔انڈیا پائپ لائن مستقبل میں ان ملکوں کے درمیان انہی دوقسم کے تعلقات میں سے کسی ایک کا باعث بنے گی۔یہ پائپ لائن ناصرف پاکستان اور بھارت کی جانب سے درآمدی گیس پر بڑھتے ہوئے انحصار سے عہدہ برا ہوسکتی ہے بلکہ انہیں مشترکہ سیکورٹی مفادات کے رشتے میں بھی پروسکتی ہے۔پاکستان کی جیو پولیٹیکل سٹریٹجک صورتحال جس کی اس نے خاص طور پر گذشتہ تین دہائیوں میں بھاری قیمت ادا کی ہے آگے چل کر جیو اکنامک اثاثے میں بھی تبدیل ہوسکتی ہے۔

لہٰذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ پاکستان کے مستقبل کے چیلنج زبردست مواقع میں بھی تبدیل ہوسکتے ہیں۔اس بات کے زیادہ امکانات نہیں ہیں کہ پاکستان آسانی کے ساتھ استحکام کی منزل حاصل کرسکے گا کیونکہ اس کے حصول کیلئے اسے گورنس میں کچھ بنیادی تبدیلیاں لانا پڑیں گی۔آگے چل کر ہم اسی معاملے پر بات کریں گے۔

قومی اتفاق رائے کی ضرورت

ایک حالیہ جائزے میں کہا گیا ہے کہ پاکستان کے مختلف ادوار میں بھارت کے ساتھ ہونیوالے تصادم ناصرف تحریک آزادی سے وراثت میں ملنے والی کمزور ادارہ سازی بلکہ نظریاتی کمزوری کا بھی نتیجہ ہیں۔ اسلام کے ساتھ مبہم قسم کی وابستگی کو ایک جانب رکھ کر دیا جائے تو تحریک پاکستان ''منفی قوم پرستی'' سے عبارت ہے جس کے اندر مستقبل کے بارے میں کوئی وژن موجود نہیں تھا ۲۰۔یقینی طور پر پاکستان کو آئندہ سالوں میں ''قومی مقصد'' کی ضرورت درپیش ہوگی اگر یہ تیزی سے بڑھتی ہوئی آبادی کیلئے تعلیم، خوراک، روزگار اور سماجی انصاف کی فراہمی کے مشکل ترین کام کو ممکن العمل بنانا

چاہتا ہے۔یہ کام ایک ایسے ملک میں کوارڈی نیشن اور کوآپریشن کا متقاضی ہے جس کی تاریخ باہمی تصادموں اور تنگ نظری سے بھری پڑی ہے۔بدقسمتی سے پاکستان میں بھارت کی فوجی بالا دستی کی مزاحمت کرنے کے سوا کسی اور پالیسی میں تسلسل نہیں پایا جاتا۔کیا پاکستانی لیڈروں کی نئی نسل چھ دہائیوں پر مشتمل تاریخ کے بوجھ سے آزاد ہونے کی اہلیت رکھتی ہے؟حالات کا جبر ممکنہ طور پر پاکستانی لیڈروں اور عوام کو اسی طرح قومی اتفاق رائے کی سمت میں دھکیل سکتا ہے جیسے انہوں نے ۲۰۰۹ میں سوات پر ٹی ٹی پی کے قبضے کے بعد عسکریت پسندی کے خاتمے کیلئے قومی اتفاق رائے کا مظاہرہ کر کے دکھایا تھا۔حالیہ برسوں میں ابھرنے والا طاقتور میڈیا اس سلسلے میں اپنا کردار ادا کر سکتا ہے تاہم اس کی کوئی ضمانت نہیں دی جا سکتی۔

تبدیلی کو موثر بنانے کیلئے ایک جانب سماجی انصاف اور ترقی کے تسلسل اور دوسری جانب علاقائی سلامتی اور جمہوری عمل کے درمیان جڑت کے سلسلے میں ہونے والی ماضی کی سیاسی غلطیوں کی جانب ایمانداری سے توجہ دینے کی ضرورت ہے۔پاکستان کو تبدیلی کی شاہراہ پر ڈالنے کیلئے وقوع پذیر ہونے والا قومی اتفاق رائے اس قومی مکالمے سے ابھر سکتا ہے جس کے قلب میں زیادہ جامع اور سب کو ساتھ لے کر چلنے والی معاشی ترقی کی پالیسی اور ایک توسیعی سیکورٹی پالیسی براجمان ہو۔مجوزہ معاشی پالیسی میں اس بات کا ادراک کرنا ہوگا کہ ماضی میں ہونے والی فوری گروتھ۔۔۔اگرچہ ماضی میں اس کی وجہ سے اسے عارضی طور پر اپنے ہمسائیہ ملکوں پر سبقت بھی حاصل رہی ہے۔۔۔اس کے مڈل انکم سٹیٹس کو بڑھانے میں ناکام رہی ہے کیونکہ اس کے دوران انسانی ترقی کو یکسر نظرانداز کر دیا جاتا رہا ہے۔گلوبلائزیشن سے بھرپور فائدہ اٹھانے کیلئے مطلوبہ اہلیت کی حامل افرادی قوت کی کمی پاکستان کا مسئلہ رہا ہے۔مستقبل کے ترقی کے ماڈل میں عدل وانصاف اور سماجی جڑت جیسے بین الاقوامی مسابقت کے تقاضوں کو عدم مساوات کی جگہ دینا ہوگی۔جہاں تک سیکورٹی پالیسی کا تعلق ہے تو اس سلسلے میں اس بات کا ادراک ضروری ہے کہ ماضی میں اسلحہ کی دوڑ میں بھارت کو پیچھے چھوڑنے کی تگ ودو،اسلامی انتہاپسندوں کو خفیہ ہتھیار کے طور پر استعمال کرنے کا خبط اور جنوبی ایشیا میں

دشمنیاں پالنے کی روش کے باعث تاریخی طور پر پاکستان کو فرقہ وارانہ جھگڑوں، معاشی انحصاریت اور جمہوری ناتوانی کی صورت میں بھاری قیمت ادا کرنا پڑی ہے۔مستقبل میں قومی سلامتی کی پالیسی میں نا صرف روایتی اور نیوکلیئر حوالے سے سیکورٹی کو مدنظر رکھا جائے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ ایسی سیکورٹی پالیسی تشکیل دی جائے جس میں خوراک، پانی اور توانائی اور جرائم سے تحفظ جیسے معاملات کا احاطہ کیا گیا ہو۔اور ریاست ان تمام چیزوں کو ماحولیاتی تحفظ اور سیاسی قوت کے تناظر میں فراہم کرے(۲۱)۔

بھارت کی جانب سے پاکستان کو سیکورٹی خطرات اگلی دو یا تین دہائیوں تک جاری رہیں گے کیونکہ بھارت علاقائی اور عالمی معاشی قوت بننے کے عمل میں لگا رہے گا۔یہ عمل اسے فوجی قوت میں اضافہ کرنے پر بھی مجبور کرے گا اور اس کے نتیجے میں پاکستان اپنے دیرینہ حریف کے ساتھ روایتی اور نیوکلیئر ہتھیاروں میں توازن پیدا کی کوششوں میں اس کے اخراجات میں ڈرامائی طور پر اضافہ ہوجائے گا۔بڑھتی ہوئی آبادی کے ساتھ حالات کی یہ صورت اس کے عدم استحکام میں اضافہ کر دے گی یا بصورت دیگر اس کیلئے نئے مواقع کی تخلیق کا باعث بنے گی۔نئی دہلی میں یقیناً کچھ ایسے ہاکس بھی موجود ہیں جو پاکستان کو اس جال میں پھانسنے کے جتن کرتے رہیں گے۔

متبادل صورتوں کی تلاش میں پاکستان چین کے ساتھ مزید گہرے معاشی، سفارتی اور فوجی تعلقات قائم کرے گا۔تاہم یہ اسی صورت میں ممکن ہوسکے گا اگر پاکستان نے یوغر علیحدگی پسندوں کے مسئلے سے نجات دلانے میں چین کی بھرپور مدد کرے گا۔اگر چین اور بھارت کے درمیان تعلقات میں گہرائی آئی تو یہ یقیناً پاکستان کیلئے تشویش ناک بات ہوگی۔بھارت کے ساتھ پانی کے تنازعات کو حل کرنے کے سلسلے میں بہت کم گنجائش موجود ہے۔

گورننس کو بہتر بنانے کی ضرورت

مختلف مصنفین نے پاکستان میں گورننس کے حوالے سے مختلف ترجیحی فہرستیں بنا رکھی ہیں جن میں خدمات کی فراہمی میں بہتری لانا، ٹیکس اکٹھا کرنے کی صلاحیت میں

اضافہ کرنا، مختلف ریاستی اداروں بشمول بیوروکریسی، فوج، پولیس، ریاست کے زیر انتظام چلنے والی کارپوریشنوں، سیاسی جماعتوں اور انتخابی عمل کی کارکردگی میں بہتری لانا شامل ہے(۲۲)۔اس فہرست میں معاشی زندگی میں خاص طور پر خسارے میں چلنے والے ریاستی اداروں کی نجکاری میں انتہا درجے کی شفافیت لانے کو بھی شامل کیا جاسکتا ہے۔تبدیلیوں کی سمت ''کرائے دارانہ ذہنیت'' کی حامل سیاسی اشرافیہ کے مفادات کی قیمت پر شہریوں کو ایمپاور کرنے اور تعلیم وصحت کیلئے دستیاب وسائل میں اضافے کی جانب ہونا ضروری ہے۔کسی ایک شعبے یا کسی ایک قسم کی اصلاحات میں کامیابی دوسرے شعبوں یا دوسری قسم کی اصلاحات میں کامیابی کی حوصلہ افزائی کرے گی۔مثال کے طور پر اگر ریاست اپنے شہریوں کے حوالے سے زیادہ ذمہ دارانہ رویہ اپنالے اور بنیادی سہولتوں کی فراہمی میں پروایکٹو ہوجائے تو ٹیکس کی ادائیگی کے سلسلے میں پائی جانے والی مزاحمت خود بخود کم ہوجائے گی۔اسی طرح جمہوری حکومتوں کی طرف سے سیاسی جواز میں اضافے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اس کے بعد فوجی مداخلت کے خطرات ختم ہوجائیں گے۔جیسے کشمیر کے تنازعے کا حل ایک یا ایک سے زیادہ نسلوں کی دوری پر ہے اسی طرح سول ملٹری تعلقات کو معمول کی سطح پر لانا بھی ''ہنوز دلی دور است'' والا معاملہ ہے۔کتاب کے پورے متن میں ہم نے دیکھا ہے کہ فوجی مداخلت ہمیشہ سیاسی ترقی، قومی یکجہتی اور پائیدار معاشی ترقی کیلئے خطرہ ثابت ہوتی ہے۔جمہوری استحکام اسی صورت میں ممکن ہوسکتا ہے جب سویلین کو فوج پر بالادستی حاصل ہو اور دفاعی اخراجات ناصرف شفاف ہوں بلکہ سیاسی ڈیبیٹ کیلئے دستیاب ہوں۔فوجی اثر ورسوخ پر کنٹرول صرف پاکستان کے متفق علیہ مستقبل کے سیکورٹی ماحول کے تناظر میں ہی ممکن ہوسکتا ہے۔

حرف آخر

آبادی اور ماحولیات کے دباؤ کی وجہ سے پاکستان کو مستقبل میں گھمبیر مسائل کا سامنا ہے۔یہ مسائل موجودہ سیکورٹی صورتحال سے بھی کہیں زیادہ سنگین چیلنج پیش

کرتے دکھائی دے رہے ہیں۔اس بات کے زیادہ امکانات موجود نہیں ہیں کہ پاکستان اپنی مصائب سے بھری تاریخ کے دوران جس انداز سے معاملات سے عہدہ برا ہوتا آیا ہے اس انداز کے ساتھ یہ مستقبل میں ان چیلنجوں پر پورا اتر سکے گا۔اگلی دو دہائیوں میں مستقبل کی کسی تباہ کن صورتحال سے بچنے کیلئے قومی پالیسی کی سمت میں ڈرامائی تبدیلی ناگزیر ہوگی۔صورتحال میں سدھار کی تمام تر ذمہ داری پاکستان کے رہنماؤں اور عوام کو مل جل کر اٹھانا ہوگی تاہم اس کے بیرونی ہمدرد مالی اور تیکنیکی امداد کے ذریعے راستے کی دشواریوں کو آسان بنا سکتے ہیں۔مستقبل کا مستحکم اور پائیدار ترقی کی بنیادوں پر کھڑا پاکستان اپنے عوام کیلئے بے پناہ فوائد کا حامل ثابت ہوگا۔اس کے ساتھ ہی یہ جنوبی ایشیا کیلئے بھی اپنی معاشی قوتوں کا کام میں لانے کے سلسلے میں معاون ثابت ہوسکتا ہے۔ایٹمی قوت کی ناکامی ناصرف علاقائی بلکہ بین الاقوامی نتائج کی حامل ثابت ہوگی۔جب تک پاکستان معاشی پائیدادی اور جمہوری استحکام کی جانب قدم نہیں بڑھاتا اس وقت تک یہ بین الاقوامی تشویش میں اضافے کا باعث بنا رہے گا۔

☆☆☆

حوالہ جات

۱۔ کتاب ہذا کا تعارفی حصہ ملاحظہ فرمایئے۔

۲۔ Ahmed Fafooqi, "Rethinking the National Security of Pakistan: The Price of Strategic Myopia (Aldeshot: Ashgate, 2003) ; Tasnim Ahmed Siddiqui, " Towards Good Governance (Karachi: Oxford University Press, 2001); Maleeha Lodhi, "Pakistan Beyond the Crises State" (ed) (London: Hurst, 2011)

۳۔ یہ اعداد و شمار شہزاد خان اور معید یوسف کی کتاب "Education as a Strategic Imperative" اور Maleeha Lodhi, "Pakistan Beyond the Crises State" (ed) (London: Hurst, 2011) سے لیے گئے ہیں۔

۴۔ Tasnim Ahmed Siddiqui, " Towards Good Governance (Karachi: Oxford University Press, 2001)

۵۔ Maleeha Lodhi, "Pakistan Beyond the Crises State" (ed) (London: Hurst, 2011)

۶۔ ایضاً۔

۷۔ خاندانی منصوبہ بندی کے حوالے سے پاکستان، ایران اور بنگلہ دیش کے درمیان موازنے کیلئے ملاحظہ کیجئے: Mehtab S. Karim, "Pakistan's Demographic Scenario, Past and Present: Population Growth and Policies with Lessons from Iran and Bangladesh" in Michael Kugleman and Robert M. Hathaway (eds), " Reaping the Dividends: Overcomming Pakistan's Demographic Challenges (Washington: Woodrow Wilson Internationa Centre for Scholars, 2011)

۸۔ See Sojail Agha, "The Role of the Private Sector on Reproductive Health Service Delivery in Pakistan", in Michael Kugleman and Robert M. Hathaway (eds), " Reaping the Dividends: Overcomming Pakistan's Demographic Challenges

۹۔ Shehzad Khan and Moeed Yusuf, "Education as a Strategic Imperative", in Maleeha Lodhi, "Pakistan Beyond the Crises State" (ed) (London: Hurst, 2011)

۱۰۔ See Moeed Yusuf, "A Society on the Precipice? Examining the Prospects of Youth Radicalization in Pakistan" in Michael Kugleman and Robert M. Hathaway (eds), " Reaping the Dividends: Overcomming Pakistan's Demographic Challenges

۱۱۔ Christina Fair, " Can the US Secure an Insecure State?" (Santa Monica, CA: Rand, 2010)

۱۲۔ شاہد جاوید برکی کا کہنا ہے کہ صرف آئی ٹی سیکٹر اپنے طور پر ۱۵۔۲۰۱۳ تک ۲۰ ارب ڈالر کی برآمدات کے قابل ہوسکتا ہے۔ Shahid Javed Burki, "Historical Trends in Pakistan's Demographic and Population Policies" in Michael Kugleman and Robert M. Hathaway (eds), " Reaping the Dividends: Overcomming Pakistan's Demographic Challenges

۱۳۔ تجزیہ کاروں نے فوجی آمریت، علاقائی تنہائی اور اسلامی انقلاب کی بطور ممکن نتائج کے نشاندہی کی ہے۔

۱۴۔ www.britishcouncil.pk/pakistan-next-generation-report.pdf

۱۵۔ See also Herald, "Youth Speak" (January 2010)

۱۶۔ www.britishcouncil.pk/pakistan-next-generation-report.pdf

۱۷۔ ایضاً۔

۱۸۔ ایضاً۔

۱۹۔ پاکستان کے پانی کے بحران کے بارے میں تفصیلی مطالعے کیلئے ملاحظہ کیجئے:

Anatol Lieven, "Pakistan: A Hard Country (London: Allen Lane, 2011)

۲۰۔ Maya Tudor, "Twin Births, Divergent Democracies: The Social and Institutional Origing of Regime Outcomes in India and Pakistan" Unpublished Princeton University PhD. Thesis, 2010

۲۱۔ Ahmed Fafooqi, "Rethinking the National Security of Pakistan: The Price of Strategic Myopia (Aldeshot: Ashgate, 2003)

۲۲۔ مزید مطالعے کیلئے ملاحظہ کیجئے ملیحہ لودھی کی مذکورہ بالا کتاب میں موجود مختلف مضامین۔

☆☆☆

اگر پاکستان وہ سب کچھ محفوظ رکھنا چاہتا ہے جو اس کی قیمتی متاع ہے یعنی اپنے لوگوں کی کشادہ دلی اور مہمان نوازی اور اپنے نوجوانوں کا جوش وجذبہ تو اسے اپنے سماجی وسیاسی اداروں میں انحطاط کو روکنا ہوگا۔ پاکستان کو درپیش حقیقی خطرات کی نشاندہی کیلئے دستیاب آسان نسخوں کو ایک جانب رکھتے ہوئے زیر مطالعہ کتاب میں گذشتہ چھ دہائیوں میں پاکستانی تاریخ میں پیش آنے والی بڑی واقعاتی کروٹوں اور رجحانات کا ازسرنو جائزہ لیا گیا ہے۔ اس عمل کے دوران افواج پاکستان کی معاشی اور سیاسی میدانوں میں مضبوط ہوتی ہوئی مورچہ بندی، عوامی زندگی میں اسلام کے پیچیدہ کردار، مرکزی اور مقامی شناختوں کے درمیان بڑھتے ہوئے تناؤ اور جمہوریت کی طلب نیز داخلی پالیسی اور ترقی پر مرتب ہونے والے جیوپولیٹیکل اثرات پر خصوصی توجہ مرکوز کی گئی ہے۔
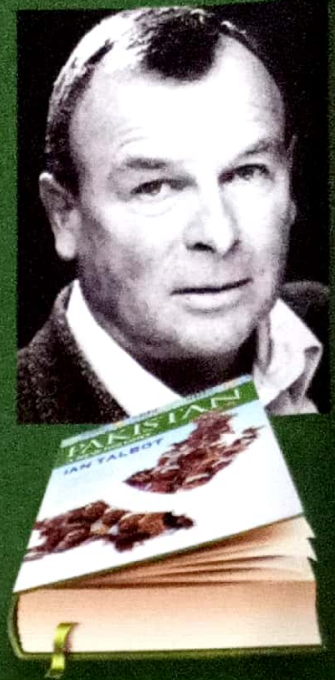
گو کہ آئن ٹالبوٹ کی تحقیق کا محور پاکستان کی بہت سی ناکامیاں ہیں جن میں مستحکم گورننس کا انہدام، مثبت سیاسی و معاشی ترقی کا زوال اور سب سے بڑھ کر ایک جداگانہ مسلمان ریاست کے تحفظ کیلئے اہداف کی عدم تکمیل شامل ہیں، اس کے باوجود اس کی زیر نظر کتاب واضح طور پر ملک کی ایک نئی صبح بیداری کے بھرپور امکانات کی نوید سناتی ہے۔ ٹالبوٹ کا کہنا ہے کہ یہ ناکامیاں لوح ازل پر لکھی تحریر نہیں ہیں نہ ایسی مہلک سوچ تاریخی واقعات کی پیچیدگی، انفرادی کرداروں کے عمل اور ریاست کے اپنے بے پناہ وسائل کے ساتھ کوئی مطابقت رکھتی ہے۔ اس بات کا ادراک کرتے ہوئے کہ ایک گھمبیر بحران بدستور پاکستان کو گھیرے ہوئے ہے، آئن ٹالبوٹ کی حساس تاریخی اپروچ اس بات کو واضح کرتی ہے کہ پاکستان کیلئے سازگار مواقع ابھی تک اپنا دامن پھیلائے ہوئے ہیں جن میں ریاست کیلئے اپنی ترجیحات اور اداروں کی درستی کے ساتھ ساتھ سیاسی و معاشی مقاومت کو ازسرنو مستحکم کرنے کے امکانات موجود ہیں۔

تخلیقات Publishers

تخلیقات: 6۔ بیگم روڈ، لاہور فون: 042-37238014

Email: takhleeqat@yahoo.com www.takhleeqatbooks.com